THE BATTLE FOR GOD

خُدا کے لئے جنگ

یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں بنیاد پرستی کا تاریخی جائزہ

www.kitabosunnat.com

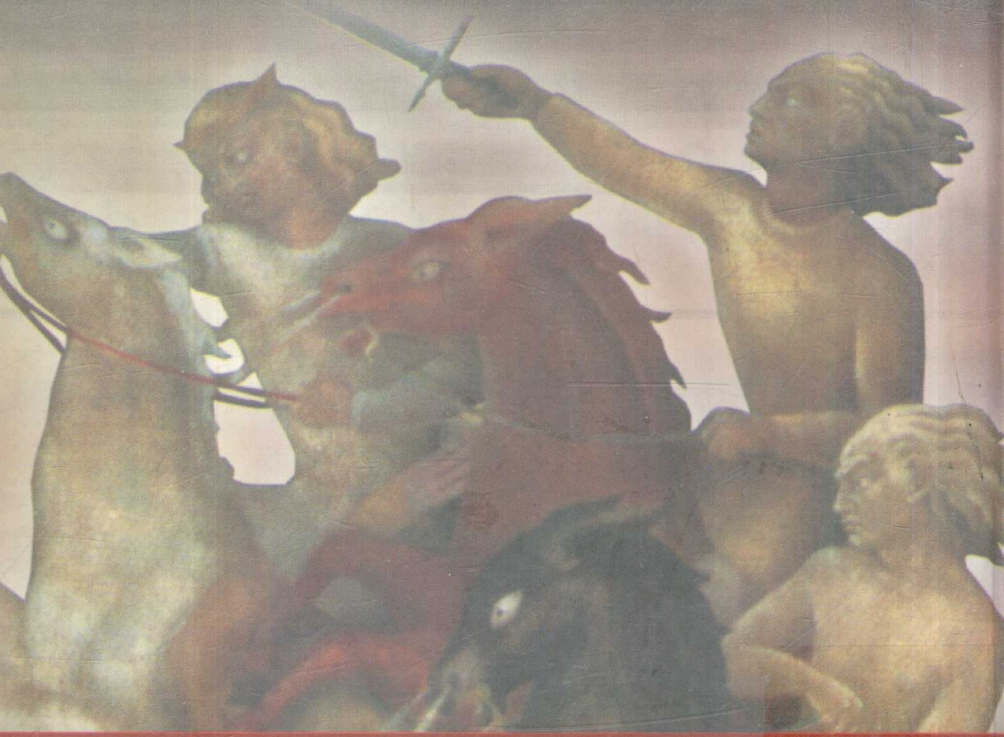

کیرن آرمسٹرانگ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

خدا کے لیے جنگ

THE BATTLE FOR GOD

یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں بنیاد پرستی کا تاریخی جائزہ

مصنفہ: کیرن آرمسٹرانگ

مترجم: محمد احسن بٹ

www.KitaboSunnat.com

نگارشات پبلشرز

حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38- مین اردو بازار لاہور | 24- مزنگ روڈ لاہور

فون 7240593 فیکس 042-5014066 | فون 7322892 فیکس 042-7354205

e-mail:nigarshat@yahoo.com

www.nigarshatpublishers.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

A translation of

"The Battle For God"

Written By:

Karren Armstrong

Translated By:

Muhammad Ahsan Butt

Published By:

Asif Javed

All rights reserved. No part of this book may be reproduced in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying, recording or by any information storage retrieval system, without prior permission from the publisher.

ISBN: 969-479-123-5

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: خدا کے لیے جنگ

مصنفہ: کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ: محمد احسن بٹ

ناشر: آصف جاوید

برائے: نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ، لاہور

PH:0092-42-7322892 FAX:7354205

فرسٹ فلور، حبیب ایجوکیشنل سنٹر، 38۔ مین اردو بازار لاہور

PH:0092-42-5014065 FAX:7354205

مطبع: المطبعۃ العربیۃ، لاہور

سال اشاعت: 2007ء

قیمت: =/300 روپے

المكتبة الحقانية

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست

- عرض ناشر 12
- ''خدا کے لیے جنگ'' ——— محمد احسن بٹ 13
- تعارف ——— کیرن آرمسٹرانگ 15

حصہ اول	پرانی اور نئی دنیا	25

باب اوّل: یہودی بنیاد پرستی کا تاریخی پس منظر (1700ء-1492ء) 26

- سقوطِ غرناطہ: سائنسی اور عقلیت پسندانہ جدیدیت کا نقطۂ آغاز 26
- مسلم اندلس کی شکست: یہودیوں کے لیے المیہ 31
- لیوریائی قبالہ 34
- یہودی عورتوں کی اولین ترجمان 41
- آلام کا سمندر 42
- جابرانہ جدیدیت کا نتیجہ 44
- میرانو یہودی: انوکھے نظریات کے پرچارک 45
- پہلا سیکولر یہودی فلسفی 52
- گیٹو یہودیوں کی الگ دنیا 55
- اسلامی دنیا میں یہودیوں کا مقام 56
- کوزاکوں کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام 56

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- یہودی مسیحا کا ظہور 57
- یہودی مسیحا کا قبول اسلام 61
- دونمیہ: بظاہر مسلمان اور خفیہ طور پر یہودی 63
- جنسی آزادی کو فروغ دینے والا خفیہ یہودی فرقہ 64
- یہودی: تشکیک پسندی، دہریت اور منفیت پرستی کے پیشرو 65

باب دوم: اسلامی بنیاد پرستی کا تاریخی پس منظر (1700ء-1492ء) 66

- اسلام ایک عالمی طاقت 66
- تین ہمعصر عظیم اسلامی سلطنتیں 66
- قدامت پسند معاشرے کی خصوصیات 68
- عثمانی سلطنت 71
- اسلام ایک عملی مذہب 73
- حج: مسلمان مرد و زن کا وجودی سقوط 73
- عثمانیوں کی حیرت انگیز فتوحات کی وجہ 75
- ابن تیمیہؒ: ایک انقلابی مصلح 76
- باطنی تحریکیں 77
- مصر میں علماء کے عروج کا تاریخی جائزہ 78
- عثمانی سلطنت کا زوال 80
- مراکشی صوفی مصلح احمد ابن ادریس 81
- نئے صوفیا 82
- ایران میں علماء کے عروج کا تاریخی جائزہ 83
- سانحۂ کربلا 84
- صفوی دورِ حکومت اور علماء 91
- جدید مغرب کی اسلامی دنیا پر اولین یورش 99

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب سوم: عیسائی بنیاد پرستی کا تاریخی پس منظر (1700ء۔1492ء) 101

- جدیدیت کا آغاز 101
- ایجادات اور ان کے اثرات 103
- جمہوریت' رواداری اور عالمگیر انسانی حقوق 104
- جدیدیت: بے بسی اور فنا کے خوف کی خالق 106
- لوتھر کے نظریات 108
- کیلون کے نظریات 109
- ابتدائی جدید دور کے سائنسدان 109
- نیوٹن: قدامت پسندانہ روح کا گرویدہ 111
- فرانسس بیکن کے نظریات 113
- اساطیری سوچ کی موت 115
- ساحری کا عظیم جنون 120
- ایک خوفناک شگاف 120
- بحران کے دوران 121
- امریکہ میں بنیاد پرستی 123
- امریکی مذہبی زندگی کی جذباتی انتہا پسندی 125
- نفرت کا مذہب' اشتعال کی الٰہیات 128
- اعلانِ آزادی 129
- امریکہ اور ایران کے انقلاب میں مماثلت 130
- امریکہ میں مذہب اور روشن خیالی میں کشمکش 135
- ملازم اور تاریخ کی موت 141
- یورپ کی مختلف کہانی — ہیگل 144
- کارل مارکس 145
- ڈارون: دہریت کا اسم ثانی 146
- عیسائیت اور سائنس کے مابین صلیبی جنگ 148

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم: جدیدیت سے یہودیوں اور مسلمانوں کا تصادم (1870ء-1700ء) 151

- یہودیت کا دشمن جدید نظام 151
- ''بیشت'' کا ظہور 152
- مسنیگڈم 155
- ہسکلاہ 157
- ماسکیلم 159
- نپولین اور یہودی 160
- یہودی اصلاحی تحریک 162
- فنا کا خوف 166
- ایلٹنگلا بیگین 166
- درمیانی راستے پر چلنے والے یہودی 169
- مصر پر نپولین کا قبضہ 170
- نپولین اور مصری علماء 172
- مصر میں انتشار کا دور اور علماء 173
- محمد علی کا مصر 174
- مصری علماء اور جدیدیت 178
- عثمانی سلطنت میں جدید اصلاحات 180
- نہر سوئز کی تعمیر 181
- ایران: یورپی پاور گیمز کا مہرہ 186
- ایران میں علماء کا کردار 188
- شیخی تحریک 190
- بابی تحریک 193

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ دوم	بنیاد پرستی	198

باب پنجم: ابتدائی بنیاد پرست تحریکیں (1900ء-1870ء) 199

- خوف، خالی پن اور بے معنویت کا دور 199
- آرزوئے مرگ 200
- امریکہ کی ابتر صورتحال 202
- امریکی پری ملینیل ازم 203
- تاریخ کا اختتام 203
- امریکی بنیاد پرستی کا بانی 212
- سائنسی نسل پرستی 215
- یہودی: خوف کی علامت 216
- یہودی بنیاد پرستی کا آغاز 217
- صیہونیت 218
- اسلامی بنیاد پرستی کا آغاز 222
- جمال الدین افغانی 227
- مسلمان ملکوں پر نوآبادیاتی غلبہ 232
- محمد عبدہٗ کے افکار 235
- مصر میں عورت کی معاشرتی حیثیت 239

باب ششم: سیکولرازم اور قدامت پسندانہ مذہب کا ٹکراؤ (25-1900ء) 242

- پہلی عالمی جنگ اور اس کے اثرات 242
- بنیاد پرستی: ایک مابعد جدید مذہبیت 244
- جنگِ عظیم اور امریکی پری ملینیل ازم 248
- جنگ عظیم اور لبرل 249
- امریکہ میں ''ورلڈز کرسچین فنڈامینٹلز ایسوسی ایشن'' کا قیام 251

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- کیا بنیاد پرست جیتیں گے؟ 252
- شہرۂ آفاق سکوپس مقدمہ 253
- پینٹی کوسٹل ازم 258
- ''شیطان کی آخری صف'' 262
- صیہونیت اور روایتی یہودیت 262
- لیبر زائیونزم (Labor Zionism) 264
- ربی کک 265
- بنیاد پرست یہودی پارٹی ایگودات اسرائیل کا قیام 271
- بنیاد پرستی کس طرح عمل کرتی ہے 273
- اسلامی دنیا میں سیکولر جدیدیت اور قدامت پسندانہ مذہب میں کشمکش 274

باب ہفتم: ردِّ ثقافت (1925-60ء) 284

- نئی سیکولر روحانیت 284
- ہولوکاسٹ 285
- قدامت پسند یہودی اور جدیدیت 287
- اسرائیل: شیطان کی تخلیق 290
- امریکی پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں کا جدیدیت پر جوابی حملہ 302
- آخری نسل کشی 307
- حسن البنا کی عوامی تحریک 308
- اخوان المسلمون کا قیام 310
- حسن البنا کے چھ نکات 311
- ریاست کے اندر ریاست 313
- ''النقبہ'' 314
- اخوان المسلمون کا دہشت گرد ونٹ 315

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- حسن البنا کا قتل 316
- جمال عبدالناصر کا دورِ حکومت 316
- ناصر پر قاتلانہ حملہ 318
- ایران پر سیکولرازم کا حملہ 318
- رضا شاہ کا دورِ حکومت 319
- قم کا احیاء 320
- آیت اللہ خمینی کی قم میں آمد 321
- محمد رضا کی تخت نشینی 322
- آیت اللہ سید مصطفیٰ کاشانی کی ایران واپسی 323
- تیل کا بحران 324

باب ہشتم: سیکولر جدیدیت اور بنیاد پرستی کے مابین جنگ (74-1960ء) 327

- ہپی تحریک 327
- ایڈمنڈ برک کا ردِ انقلاب کا نظریہ 329
- مصر میں ناصر کا سائنسی سوشلزم 330
- ابوالاعلیٰ مودودی اور مصر 332
- سید قطب: سُنّی بنیاد پرستی کے بانی 334
- ایران کا سفید انقلاب 340
- بیگانگی کا شکار ایرانی 341
- ساواک کے مظالم 342
- ''غرب زدگی'' 342
- شاہ کے آمرانہ اقدامات پر ایرانی علماء کا ردِ عمل 343
- خمینی کی انقلابی سرگرمیاں 344
- علی شریعتی کی انقلابی جدوجہد 349

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- خمینی کا ''ولایتِ فقیہہ'' کا نظریہ 353
- بنیاد پرست صیہونی 356
- امریکہ کے آمادۂ جنگ بنیاد پرست 365
- امریکی معاشرے میں بنیاد پرستی کا عروج 369
- پروٹسٹنٹ بنیاد پرست بمقابلہ سیکولر ہیومنزم 370

باب نہم: بنیاد پرستوں کا حملہ (1974-79ء) 379

- بنیاد پرستانہ حملہ اور سیکولروں کی حیرت 379
- عقیدے کی جدید صورتیں 380
- گش ایمونم 381
- لیکوڈ پارٹی کا دورِ حکومت 387
- سادات کا دورِ حکومت اور بنیاد پرست مصری 391
- شکری مصطفیٰ کی تحریک 394
- جماعتِ اسلامیہ 397
- پردہ 399
- ایران کی حالتِ زار 403
- ایرانی شعراء اور انقلابی جدوجہد 404
- مصطفیٰ خمینی کی پراسرار ہلاکت 404
- شیطانِ بزرگ 405
- شاہ کے انجام کا آغاز 407
- علماء: انقلاب کے قائد 407
- خمینی کی واپسی 412
- امریکہ میں بنیاد پرستی کا احیاء 412

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دہم: بنیاد پرستی کی شکست؟ 419

- مذہب چلا ہوا کارتوس نہیں ہے 419
- ایران: انقلاب کے بعد 420
- خمینی اور علماء میں اختلافات 424
- عراق کے ساتھ جنگ 425
- سلمان رشدی کے خلاف فتویٰ 425
- خمینی کی وفات 526
- انور سادات کا قتل 427
- نیا صدر: حسنی مبارک 430
- مصر کی موجودہ صورتحال 430
- اسرائیل: بنیاد پرستی میں شدت 432
- غزہ کی پٹی میں ''الجامعہ'' کا قیام 441
- ''اسلامی جہاد'' 442
- انتفاضہ 442
- حماس 442
- اوسلو معاہدے پر اسرائیل میں ردِعمل 443
- یتزاك رابن کا قتل 443
- امریکہ میں نفرت اور تقسیم 445
- ''آپریشن ریسکیو'' 447
- ری کنسٹرکشن موومنٹ 448
- امریکی بنیاد پرستوں اور لبرل لوگوں میں ڈھکی چھپی جنگ 450
- انتہا پسند امریکی عیسائی 450
- کرسچین آئیڈینٹٹی 451
- پس لفظ 453

☆☆☆

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرضِ ناشر

''خدا کی تاریخ'' اور ''مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال'' کے بعد شہرۂ آفاق خاتون تاریخ داں کیرن آرمسٹرانگ کی تیسری کتاب کا ترجمہ ''خدا کے لیے جنگ'' کے عنوان سے قارئین کی نذر ہے۔

''نگارشات'' کا مشن اردو داں قارئین کو عالمی سطح کی وقیع کتابوں کے معیاری تراجم ارزاں داموں مہیا کرنا ہے۔ زیرِنظر کتاب ایک اہم عصری مسئلے کا عالمانہ جائزہ ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی کے حوالے سے مغرب ہمیشہ شدید تنقید کرتا آیا ہے۔ اب ایک مغربی مصنفہ نے ہی یہودی اور عیسائی بنیاد پرستی کے تاریک ترین گوشوں کو عیاں کردیا ہے۔ یقیناً قارئین اس کتاب کو انتہائی معلومات افزا پائیں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

”خدا کے لیے جنگ“

عالمی شہرت یافتہ برطانوی مؤرّخ کیرن آرمسٹرانگ کی منفرد موضوع پر لکھی گئی کتاب Battle For God کا اردو ترجمہ ”خدا کے لیے جنگ“ کے نام سے پیش ہے۔ اردو قارئین اس سے قبل کیرن آرمسٹرانگ کی دو کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں: (1) خدا کی تاریخ (2) مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال۔

زیرِنظر کتاب میں فاضل مصنفہ نے بیسویں صدی کے ایک اہم ترین سیاسی و مذہبی مظہر ”بنیاد پرستی“ کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے تینوں توحیدی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) میں بنیاد پرستی کے آغاز، ارتقاء اور اس کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ کا نظریہ ہے کہ سیکولر اور سائنسی عقلیت پسندی کی بنیاد پر استوار جدیدیت کے فروغ سے قدامت پسند مذہبی افراد میں فنا کا خوف، بیگانگی اور اندیشگی پیدا ہوتی ہے، جو انہیں بنیاد پرستی کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ انہوں نے 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کو بنیاد پرستی کا نقطۂ آغاز قرار دے کر تینوں مذاہب میں عہد بہ عہد رونما ہونے والے مختلف انتہاپسند فرقوں، تنظیموں اور تحریکوں کے ساتھ ساتھ بنیاد پرست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریہ سازوں کے حوالے سے ٹھوس تاریخی حقائق پیش کیے ہیں۔

انہوں نے اسرائیل' امریکہ اور مصر و ایران کو بالترتیب یہودی' عیسائی اور اسلامی بنیاد پرستی کے مطالعے کی خاطر منتخب کیا ہے۔ ان کا اسلوب نہ صرف سائنسی' عقلی اور غیر جانبدارانہ ہے بلکہ انہوں نے یہودی اور عیسائی بنیاد پرستوں کے فنا پرستانہ رجحانات کو زیادہ دیانت داری سے عیاں کیا ہے۔

کیرن آرمسٹرانگ نے بنیاد پرستی کو مذہبی انداز میں جدیدیت کو اپنانے کی کوشش بھی قرار دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے اس نقطۂ نظر پر علمی مباحثہ ضرور ہونا چاہیے۔

جس مذہبی رجحان کو بنیاد پرستی قرار دیا جاتا ہے' وہ ابھی مٹا نہیں ہے اور ہمارے فہم کے مطابق اکیسویں صدی کے ربع اول میں اس کی مابعد جدید صورتیں عالمی نظام کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کریں گی۔

قارئین ! اس بے مثال تحقیقی شاہکار کا مطالعہ کیجئے اور نوعِ انسان کے مابین مساوات' ہمدردی اور بھائی چارے جیسی اقدار کے فروغ کی دعا کیجئے۔

محمد احسن بٹ

مارچ 2003ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعارف

بیسویں صدی کے اواخر کا ایک انتہائی چونکا دینے والا واقعہ ہر بڑی مذہبی روایت میں ایک عسکریت پسندانہ ایمان کا ظہور تھا' جو ''بنیاد پرستی'' (Fundamentalism) کے نام سے معروف ہے۔ اس کا ظہور کافی حد تک صدمہ پہنچانے والا تھا۔ بنیاد پرستوں نے مسجدوں میں نماز ادا کرنے والے لوگوں پر گولیاں برسائی ہیں' اسقاطِ حمل کے شفاخانوں میں مصروفِ کار ڈاکٹروں اور نرسوں کو قتل کیا ہے' اپنے صدور کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور حد تو یہ ہے کہ ایک طاقتور حکومت کا تختہ الٹ چکے ہیں۔ یہ فقط قلیل تعداد میں دہشت گرد ہیں جو کہ اس نوع کی دہشت گردانہ کارروائیاں کرتے ہیں' تاہم انتہائی پرامن اور قانون پر عمل کرنے والے افراد بھی الجھن کا شکار ہو رہے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جدید معاشرے کی بہت سی انتہائی مثبت اقدار کی مخالفت پر اڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بنیاد پرست جمہوریت' تکثیریت' مذہبی رواداری' قیامِ امن' اظہار کی آزادی یا چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو تسلیم نہیں کرتے۔ عیسائی بنیاد پرست زندگی کے آغاز کے حوالے سے حیاتیات اور طبیعیات کی دریافتوں کو مسترد کرتے ہیں اور اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ کتابِ پیدائش اپنی تمام تر تفاصیل کے ساتھ سائنسی طور پر درست ہے۔ ایک ایسے زمانے میں کہ جب بہت سے لوگ ماضی کی زنجیریں اتار پھینک رہے ہیں' یہودی بنیاد پرست ہمیشہ سے کہیں زیادہ اپنے الوہی قانون پر شدید کٹڑ پن کے ساتھ عمل پیرا ہیں اور مسلمان عورتیں' مغربی عورتوں کی آزادیوں سے قطعِ تعلق کرتے ہوئے' اپنے آپ کو پردے تک محدود کر رہی ہیں۔ مسلمان اور یہودی بنیاد پرست سیکولر تنازعے کے طور پر شروع ہونے والے عرب اسرائیلی تنازعے کی تعبیر مذہبی انداز سے کرتے ہیں۔ مزید برآں بنیاد پرستی عظیم توحیدی مذاہب تک ہی محدود نہیں ہے۔ بدھ' ہندو اور حد تو یہ ہے کہ کنفیوشسی بنیاد پرستیاں (Fundamentalisms) بھی موجود ہیں جو کہ لبرل کلچر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی' تکالیف سہ کر حاصل کردہ' بصیرتوں کو رد کرتی ہیں' جو کہ مذہب کے نام پر لڑتی اور قتل و غارت کرتی ہیں اور مذہب کو سیاست اور قومی جدوجہد کی اقلیم میں لانے کے لیے کوشاں ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس مذہبی احیاء کو بہت سے پیروکار حاصل ہو گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے وسط میں اس امر کو عموماً یقینی تصور کیا جاتا تھا کہ سیکولرازم مٹ نہیں سکتا اور یہ کہ عالمی واقعات میں عقیدہ کوئی بڑا کردار دوبارہ کبھی ادا نہیں کرے گا۔ یہ فرض کیا گیا تھا کہ جیسے ہی انسان زیادہ عقلیت پسند ہوں گے انہیں یا تو مذہب کی مزید ضرورت نہیں ہوگی یا پھر وہ اسے اپنی زندگیوں کی شخصی اور نجی حدوں میں ہی رکھنے پر قناعت کریں گے۔ تاہم 1970ء کے عشرے کے اواخر میں بنیاد پرستوں نے سیکولرازم کی اس اجارہ داری کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا اور مذہب کو اس کی حاشیے والی حالت سے نکال کر مرکز میں لانا شروع ہو گئے۔ کم از کم اس حوالے سے وہ نمایاں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ مذہب دوبارہ ایک ایسی قوت بن چکا ہے جسے کوئی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی۔ بنیاد پرستی شکستوں سے دوچار ہو چکی ہے تاہم یہ کسی طور بے اثر نہیں ہوئی ہے۔ یہ اب جدید منظر کا لازمی حصہ ہے اور یقیناً مستقبل کے ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں ایک اہم کردار ادا کرے گی۔ چنانچہ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس نوع کی مذہبیت کے کیا معانی ہیں' یہ کن وجوہات کے تحت اور کس طرح پروان چڑھی' یہ ہمارے کلچر کے حوالے سے ہمیں کیا بتا سکتی ہے اور ہمیں اس سے معاملہ کرنے کے لیے بہترین اقدام کیسے اٹھانا چاہیے۔

تاہم آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں اس اصطلاح ''بنیاد پرستی'' پر مختصراً نگاہ ضرور ڈالنی چاہیے' جس پر کہ بہت زیادہ تنقید کی جا چکی ہے۔ اس اصطلاح کو سب سے پہلے امریکی پروٹسٹنٹوں نے استعمال کیا تھا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ان میں سے بعضوں نے زیادہ ''لبرل'' پروٹسٹنٹوں سے ممتاز کرنے کے لیے اپنے آپ کو ''بنیاد پرست'' کہنا شروع کر دیا۔ ان کی رائے میں ''لبرل'' پروٹسٹنٹ عیسائی عقیدے کو مکمل طور پر مسخ کر رہے تھے۔ بنیاد پرست اساسیات کی طرف واپس جانا اور عیسائی روایت کی ''بنیادوں'' کو دوبارہ فوقیت دینا چاہتے تھے' جنہیں وہ انجیل کی لفظی تعبیر اور مخصوص بنیادی فلسفوں کی قبولیت کے موافق ٹھہراتے تھے۔ ''بنیاد پرستی'' کی اصطلاح کا اطلاق دیگر عالمی عقائد کی اصلاحی تحریکوں پر اس انداز سے کیا گیا ہے جو کہ بہت زیادہ غیر تسلی بخش ہے۔ یہ ایسا باور کراتا دکھائی دیتا ہے کہ بنیاد پرستی اپنے ہر روپ میں یکساں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر ''بنیاد پرستی'' ایک منفرد قانون ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اپنی حرکیات کی حامل ہے۔ مذکورہ اصطلاح یہ تاثر بھی دیتی ہے کہ بنیاد پرست خلقی طور پر روایت پسند ہیں اور ماضی سے چپکے جڑے ہوئے ہیں' حالانکہ ان کے تصورات جوہری طور پر جدید اور انتہائی اختراعی ہیں۔ ممکن ہے امریکی پروٹسٹنٹ ''بنیادوں'' کی طرف لوٹنے پر مائل رہے ہوں' تاہم انہوں نے ایسا کچھ ایک بالخصوص جدید طریقے سے کیا تھا۔ یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ اس عیسائی اصطلاح کا اطلاق ان تحریکوں پر درست انداز سے نہیں کیا جا سکتا' جن کی ترجیحات بالکل مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمان اور یہودی بنیاد پرست فلسفے سے سروکار نہیں رکھتے' جو کہ جوہری طور پر ایک عیسائی مسئلہ ہے۔ ''بنیاد پرستی'' کا عربی میں لفظی ترجمہ ''اصولیہ'' ہے' یعنی اسلامی قانون کے مختلف ضابطوں اور اصولوں کا مطالعہ۔ مغرب میں جن لوگوں کو ''بنیاد پرست'' کا خطاب دیا جاتا ہے' ان میں سے بیشتر لوگ اس اسلامی سائنس میں محو نہیں ہیں بلکہ بالکل مختلف دلچسپیاں رکھتے ہیں۔ چنانچہ اصطلاح ''بنیاد پرستی'' کا استعمال گمراہ کن ہے۔

تاہم دوسرے لوگ بس یہی دلیل دیتے ہیں کہ اسے پسند کیا جائے یا نہیں' لفظ ''بنیاد پرستی'' ہی استعمال ہونا ہے۔ اور میں اتفاق کرتی ہوں: یہ اصطلاح کامل تو نہیں ہے تاہم یہ ان تحریکوں کا ایک مفید عنوان ہے' جو' اپنے اپنے اختلافات کے باوجود' ایک مضبوط خاندانی مشابہت کی حامل ہیں۔ مارٹن ای۔ مارٹی اور آر۔ سکاٹ ایپلبی اپنے چھ جلدوں والے بنیاد پرستانہ پروجیکٹ میں اس امر پر بحث کرتے ہیں کہ تمام ''بنیاد پرستیاں'' ایک مخصوص طریقۂ کار پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ وہ روحانیت کی جنگ آزما صورتیں ہیں' جو کہ ایک مفروضہ بحران کو حل کرنے کے لیے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ وہ ایسے دشمنوں کے ساتھ تنازعے میں الجھی ہوئی ہیں' جس کی سیکولر پالیسیاں اور عقائد خود مذہب کے دشمن دکھائی دیتے ہیں۔ بنیاد پرست اس جنگ کو ایک روایتی سیاسی جدوجہد تصور نہیں کرتے' بلکہ اسے خیر و شر کی کائناتی جنگ سمجھتے ہیں۔ وہ فنا ہو جانے کے خوف کا شکار ہیں اور ماضی کے خاص فلسفوں اور افعال کی بحالی کے ذریعے اپنی محصور شناخت کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نجاست سے بچنے کی خاطر وہ ایک ردِ کلچر (Counterculture) خلق کرنے کے لیے مرکزی دھارے والے معاشرے سے الگ ہو جاتے ہیں' تاہم بنیاد پرست بے عمل خواب دیکھنے والے لوگ نہیں ہوتے ہیں۔ وہ جدیدیت کی عملیت پسندانہ عقلیت پرستی (Pragmatic Rationalism) کو جذب کر چکے ہیں اور وہ اپنے کرشماتی لیڈروں کی رہنمائی میں ان ''بنیادوں'' کو اجالتے ہیں تاکہ ایک ایسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آئیڈیالوجی خلق کریں جو کہ عقیدہ رکھنے والوں کو ایک لائحہ عمل مہیا کرے۔ آخر کار وہ لڑتے ہیں اور ایک زیادہ تشکیک پسند ہوتی ہوئی دنیا کو دوبارہ مذہبی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں جدید کلچر کے اس عالمی ردعمل کے مفاہیم کو جاننے کے لیے تین توحیدی عقائد یہودیت' عیسائیت اور اسلام میں رونما ہونے والی چند ایک تحریکوں ہی پر توجہ مرکوز کرنے کی خواہشمند ہوں۔ ان کا ایک دوسرے سے الگ الگ مطالعہ کرنے کے باوجود میں ان کے ارتقا کا کھوج تاریخ وار' پہلو بہ پہلو لگانا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ چنیدہ بنیاد پرستیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس مظہر کا انتہائی گہرائیوں تک جائزہ لوں گی' بہ نسبت اس کے کہ جو زیادہ عمومی' جامع تجزیئے سے ممکن ہو۔ میں نے جن تحریکوں کو منتخب کیا ہے' وہ ہیں امریکی پروٹسٹنٹ بنیاد پرستی' اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی' مصر میں' جو کہ سُنّی ملک ہے' اور ایران میں' جو کہ شیعہ ملک ہے' مسلم بنیاد پرستی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ میرے اخذ کردہ نتائج کا اطلاق بنیاد پرستی کی دوسری صورتوں پر بھی ضرور ہوسکتا ہے' تاہم مجھے یہ واضح کرنے کی امید ہے کہ یہ سب خاص تحریکیں' جو انتہائی غالب اور مؤثر ہیں' کس طرح مشترکہ خوفوں (Fears)' اندیشگیوں (Anxieties) اور خواہشوں سے ابھری ہیں' جو کہ جدید سیکولر دنیا میں زندگی کی کچھ مخصوص دشواریوں کا غیر معمولی حل دکھائی نہیں دیتیں۔

ہر عہد اور ہر روایت میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے ہیں' جنہوں نے اپنے دور کی جدیدیت سے جنگ کی ہے۔ مگر جس بنیاد پرستی پر ہم غور کریں گے' وہ جوہری طور پر بیسویں صدی کی تحریک ہے۔ یہ اُس سائنسی اور سیکولر کلچر کا ردِعمل ہے' جو پہلے پہل مغرب میں ظاہر ہوا تھا' لیکن دنیا کے مختلف حصوں میں جڑیں پکڑ چکا ہے۔ مغرب نے تہذیب کی ایک سراسر بے نظیر اور مکمل طور پر مختلف قسم کو پروان چڑھایا ہے' لہٰذا اس کا مذہبی ردعمل بھی منفرد رہا ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں رونما ہونے والی بنیاد پرست تحریکوں کا جدیدیت کے ساتھ لازم و ملزوم والا تعلق ہے۔ خواہ وہ مغرب کی سائنسی عقلیت پسندی کو رد کرتی ہوں تاہم وہ اس سے فرار نہیں ہوسکتیں۔ مغربی تہذیب نے دنیا کو تبدیل کردیا ہے۔ کوئی بھی شے — مذہب سمیت — دوبارہ ویسی نہیں ہوسکتی ہے۔ پورے کرۂ ارض کے لوگ ان نئی صورتِ حالات سے نبرد آزما ہو رہے ہیں اور اپنی مذہبی روایتوں کو دوبارہ آنکنے پر مجبور رہے ہیں' جن کو ایک بالکل مختلف قسم کے معاشرے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

قدیم دنیا میں بھی ایک ایسا ہی عبوری دور آیا تھا' جو اندازاً 700 ق۔م سے 200

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ق۔م تک محیط رہا' جسے مؤرخین محوری دور کہتے ہیں' کیونکہ وہ انسانیت کے روحانی ارتقا کا محور تھا۔ وہ دور سومیر' جو اب عراق ہے' اور قدیم مصر میں شروع ہونے والے' ہزاروں برس پر محیط معاشی اور چنانچہ معاشرتی اور ثقافتی ارتقاء کی پیداوار اور حاصل تھا۔ تیسری اور چوتھی ہزاری قبل از مسیح کے لوگ فقط اپنی فوری ضرورتوں کو پورا کرنے والی فصلیں ہی اگانے کی بجائے زرعی اضافی پیداوار حاصل کرنے کے اہل ہو گئے تھے' جس سے وہ تجارت کر سکتے تھے اور اضافی آمدنیاں حاصل کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں اولین تہذیبیں تشکیل دینے' فنون کو پروان چڑھانے اور طاقتور ہوتے ہوئے سیاسی ادارے یعنی شہر' شہری ریاستیں اور بالآخر سلطنت خلق کرنے کا اہل بنا دیا۔ زرعی معاشرے میں' اقتدار بالخصوص مقامی بادشاہ یا پروہت تک ہی مرتکز نہیں رہتا' بلکہ اس کا محلِ وقوع کم از کم کسی حد تک ہر کلچر کے سرچشمۂ دولت' یعنی منڈی کو منتقل ہو جاتا ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں لوگ جاننے لگے کہ پرانی مظاہر پرستی' جو اُن کے آباؤ اجداد کے خوب کام آ چکی تھی' ان کی صورتحال کے لیے پوری طرح موزوں نہیں رہی۔

محوری دور کے شہروں اور سلطنتوں میں شہری زیادہ وسیع تناظر اور کشادہ آفاق حاصل کر رہے تھے' جنہوں نے پرانے مقامی متوں (Cults) کو محدود اور تنگ نظر بنا دیا تھا۔ لوگ الوہی ہستی کو بہت سے مختلف دیوتاؤں میں ظہور پذیر دیکھنے کی بجائے' ماورائیت اور تقدس کے ایک آفاقی واحد سرچشمے کی پرستش زیادہ سے زیادہ کرنے لگے۔ ان کے پاس فرصت زیادہ تھی اور یوں وہ ایک باثروت داخلی زندگی کو پروان چڑھانے کے قابل تھے' اسی لیے ان میں ایک ایسی روحانیت کی تمنا بیدار ہوئی جس کا مکمل طور پر انحصار خارجی صورتوں پر نہیں تھا۔ انتہائی حساس لوگ معاشرتی ناانصافی سے پریشان تھے' جو کہ زرعی معاشرے کا جزوِ لازم لگتی تھی' اس کا انحصار جن کسانوں کی محنتِ شاقہ پر تھا' انہیں اعلیٰ کلچر سے مستفید ہونے کا کوئی موقع حاصل نہیں تھا۔ نتیجتاً مصلحین ابھرے' جنہوں نے تلقین کی کہ رحمدلی و مہربانی روحانی زندگی کا لازمہ ہے: ہر ایک انسان میں تقدس کا مشاہدہ کرنے کی اہلیت' نیز معاشرے کے زیادہ کمزور افراد کی عملی دیکھ بھال کرنے پر آمادگی' مسلمہ ایمان کا امتحان بن گئیں۔ اپنے بڑے اختلافات کے باوجود محوری دور کے ان مذاہب میں کافی چیزیں مشترک تھیں: ان سب نے قدیم روایت کی اساس پر ایک آفاقی' واحد ماورائیت کا تصور وضع کیا' انہوں نے ایک داخلی روحانیت کو فروغ دیا اور عملی ہمدردی کی اہمیت پر زور دیا۔

آج ہم ویسے ہی عبوری دور سے گزر رہے ہیں۔ اس کی جڑیں سولہویں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سترہویں صدی کے جدید عہد میں پیوست ہیں' جب مغربی یورپ کے لوگوں نے معاشرے کی ایک مختلف صورت کو ڈھالنا شروع کیا' جس کی اساس زرعی اضافی پیداوار پر نہیں بلکہ ایسی ٹیکنالوجی پر تھی' جو انہیں اپنے وسائل کو لامتناہی حد تک استعمال کرنے کے قابل بناتی تھی۔ پچھلے چار سو سال میں ہمہ گیر معاشرتی' سیاسی اور دانش ورانہ انقلابات کے ساتھ معاشی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں' بشمول حق کی فطرت کا مکمل طور پر مختلف سائنسی اور عقلیت پسندانہ تصور صورت پذیر ہونے کے؛ اور مکرر کہا جاتا ہے کہ ایک ریڈیکل مذہبی تبدیلی ضروری ہو چکی ہے۔ ساری دنیا کے لوگ اسے اپنے اپنے ڈرامائی حد تک مکمل طور پر تبدیل شدہ حالات میں تلاش کر رہے ہیں' عقیدے کی پرانی صورتیں ان کے لیے مزید کارآمد نہیں رہیں: وہ ویسی روشن خیالی اور ڈھارس مہیا نہیں کر سکتیں' جن کی کہ ایسا لگتا ہے انسانوں کو ضرورت ہے۔ نتیجتاً مرد و زن مذہبی بننے کے نئے طریقوں کو پانے کی کوشش کر رہے ہیں' محوری دور کے پیغمبروں اور مصلحین کے مانند' وہ ماضی کی بصیرتوں کی اس طور صورت گری کی کوشش کر رہے ہیں' جو کہ انسانوں کو آگے اس نئی دنیا میں لے جائے گی' جسے وہ اپنے لیے خلق کر چکے ہیں۔ بنیاد پرستی — خواہ اسے ایسا کہنا بظاہر کتنا ہی متضاد کیوں نہ لگے — انہی جدید تجربوں میں سے ایک ہے۔

ہم یہ خیال کرنے کی طرف مائل ہیں کہ ماضی کے لوگ (کم و بیش) ہمارے جیسے تھے' تاہم حقیقت میں ان کی روحانی زندگیاں مختلف ہوتی تھیں۔ خاص طور پر یوں کہ انہوں نے سوچنے' بات کرنے اور علم حاصل کرنے کے دو طریقے وضع کیے تھے' جنہیں علماء متھوس (Mythos) اور لوگوس (Logos) کہتے ہیں۔ دونوں جوہری حیثیت کے حامل تھے۔ انہیں حق تک رسائی کے لازمی طریقے تصور کیا جاتا تھا اور ہر ایک اپنا اپنا مخصوص حلقۂ استعداد رکھتا تھا۔ اسطورہ کو بنیادی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کا سروکار اس سے تھا' جسے ہماری ہستی میں لازماں اور مستقل تصور کیا جاتا تھا۔ اسطورہ زندگی کی شروعات' کلچر کی بنیادوں اور انسانی ذہن کی عمیق ترین سطحوں کی طرف جاتی تھی۔ اسطورہ کو عملی معاملات کی بجائے معانی سے سروکار تھا۔ ہم فانی مرد و زن بآسانی مایوسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تاوقتیکہ ہم اپنی زندگیوں میں کوئی معنویت نہ پائیں۔ کسی معاشرے کا متھوس لوگوں کو ایسا تناظر مہیا کرتا تھا' جو انہیں روزمرہ زندگی کا شعور دیتا تھا' وہ ان کی توجہ ابدی اور آفاقی کی طرف مرکوز کرواتا تھا۔ اس کی جڑیں ذہنِ لاشعور میں بھی تھیں۔ مختلف اساطیری کہانیاں' جن کو لفظی طور پر لیا جانا مراد نہیں تھا' نفسیات کی ایک قدیم صورت تھیں۔ جب لوگ دنیائے زیریں میں اُترے ہوئے' بھول بھلیوں میں الجھتے ہوئے یا عفریتوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے لڑتے ہوئے ہیروؤں کی کہانیاں سناتے تو وہ تحت الشعور کی اقلیم کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لاتے تھے' جس تک خالصتاً عقلی تحقیق کی رسائی نہیں ہے' مگر جو ہمارے تجربے اور کردار پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ اپنے جدید معاشرے میں اساطیر کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہمیں اپنی داخلی دنیا سے معاملہ کرنے میں مدد کے لیے تحلیلِ نفسی کی سائنس وضع کرنی پڑی۔

اسطورہ کا عقلی ثبوت نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کی بصیرتیں کافی وجدانی تھیں' فن (آرٹ)' موسیقی' شاعری یا مجسمہ سازی کی طرح۔ اسطورہ فقط تب ایک حقیقت بنی جب وہ مت' رسومات اور تقریبات میں ڈھلی' جنھوں نے پرستش کرنے والوں پر جمالیاتی اعتبار سے عمل کیا' ان کے اندر مقدس اہمیت کا شعور پیدا کرتے ہوئے نیز انہیں ہستی کے عمیق رُخوں کو سمجھنے کا اہل بناتے ہوئے۔ اسطورہ اور مت اس قدر غیر منفک تھے کہ یہ ایک عالمانہ بحث بن گئی ہے کہ اولیت کسے حاصل ہے: اساطیری بیانئے کو یا اس سے وابستہ رسم کو۔ اسطورہ تصوف سے بھی جڑی ہوئی تھی۔ تصوف یعنی ارتکاز کے مخصوص طریقوں کے ذریعے سائیکی میں اترنا۔ اسے وجدانی بصیرت کے حصول کے ایک طریقے کی حیثیت سے تمام کلچروں میں وضع کیا گیا ہے۔ مت یا صوفیانہ سرگرمی کے بغیر' مذہب کی اساطیر کوئی معنویت نہیں رکھتیں۔ وہ تجریدی رہیں گی اور ناقابل اعتبار دکھائی دیں گی' اسی طرح جس طرح کہ لکھی ہوئی موسیقی ہم میں سے بیشتر کے لیے مبہم ہی رہتی ہے اور اس کے حسن کو ہمارے سراہنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے اسے سازوں کے ذریعے پیش کیا جائے۔

ماقبل جدید دنیا میں لوگ تاریخ کے ایک مختلف تصور کے حامل ہوتے تھے۔ وہ واقعے کی بجائے کسی واقعے کی معنویت میں ہماری نسبت زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ تاریخی واقعات کو گزرے ہوئے زمانے میں رونما ہونے والے منفرد وقوعات کے طور پر نہیں دیکھا جاتا تھا' بلکہ مستقل' لازماں حقیقتوں کا خارجی ظہور تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا تاریخ خود کو دہراتی تھی' کیونکہ سورج تلے نیا تو کچھ نہیں تھا۔ تاریخی بیانئے اس ابدی جہت کو بیان کرنے کی کاوش ہوتے تھے۔ یوں' ہم نہیں جانتے کہ تب حقیقتاً کیا وقوع پذیر ہوا تھا جب قدیم بنی اسرائیل مصر سے فرار ہوئے اور انہوں نے سمندر کو پار کیا۔ اس کہانی کو ارادی طور پر ایک اسطورہ کی حیثیت سے تحریر کیا گیا ہے اور سمندری سفر کی رسومات' گہرائی میں غرقابی اور ایک نئی حقیقت خلق کرنے کے لیے دیوتاؤں کا ایک سمندر کو دو حصوں میں شق کر دینے کی کہانیوں سے جوڑا گیا ہے۔ یہودی اس اسطورہ کو ہر سال عید یہود (Passover Seder) کی رسومات میں تازہ کرتے ہیں'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو اس عجیب وغریب کہانی کو ان کی زندگیوں کا حصہ بنا دیتی ہیں اور اسے اپنانے میں مدد دیتی ہیں۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جب تک کسی تاریخی واقعے کو اس انداز سے اسطورہ نہ بنایا جائے اور ایک متاثر کن مت کی صورت میں ماضی سے آزاد نہ کیا جائے' تو وہ مذہبی نہیں بن سکتا ہے۔ یہ پوچھنا کہ خروج ٹھیک اسی طرح رونما ہوا تھا' جس طرح بائبل میں بیان کیا گیا ہے یا اس کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے تاریخی اور سائنسی ثبوت طلب کرنا اس کہانی کی نوعیت اور مقصد کو غلط سمجھنا ہے۔ یہ متھوس کو لوگوس سے خلط ملط کرنا ہے۔

لوگوس اتنا ہی اہم ہوتا تھا۔ لوگوس عقلی' عملیت پسندانہ اور سائنسی سوچ تھی جو مرد وزن کو دنیا میں بہتر عمل کرنے کا اہل بناتی تھی۔ ہوسکتا ہے آج ہم مغرب میں متھوس کا شعور گنوا بیٹھے ہوں' تاہم لوگوس سے ہم بہت مانوس ہیں' جو کہ ہمارے معاشرے کی بنیاد ہے۔ اسطورہ کے برعکس' اگر لوگوس کو مؤثر ہونا ہو تو اسے حقائق کے عین مطابق اور خارجی حقیقتوں کے موافق ہونا چاہیے۔ اسے مادّی دنیا میں لازماً مؤثر طور پر کارگر ہونا چاہیے۔ ہم اس منطقی' ہمہ گیر تعقل کو تب استعمال کرتے ہیں جب ہمیں اشیاء کو ممکن الوقوع بنانا ہو' کسی شے کو سمجھنا ہو' یا لوگوں کو کوئی خاص طرز عمل اپنانے پر قائل کرنا ہو۔ لوگوس عملی ہوتا ہے۔ اسطورہ کے برعکس' جو کہ شروعات اور بنیادوں کو لوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہے' لوگوس آگے کو بڑھتا ہے اور کوئی نئی شے پانے کی کوشش کرتا ہے: پرانی بصیرتوں کو مفصل بیان کرنے کی' ہمارے ماحول پر مضبوط تر گرفت پانے کی' کوئی تازہ شے دریافت کرنے کی اور کوئی انوکھی شے ایجاد کرنے کی۔

ماقبل جدید دنیا میں' متھوس اور لوگوس کو ناگزیر تصور کیا جاتا تھا۔ ہر ایک دوسرے کے بغیر کھوکھلا ہوتا۔ تاہم دونوں جوہری طور پر ممتاز تھے اور اساطیری اور عقلی طریقوں کو خلط ملط کرنا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ ان کے کام الگ الگ ہوتے تھے۔ اسطورہ عقلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بیانیوں کے تجربی مظاہرے کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ وہ معنی کا تناظر مہیا کرتی تھی جو ہماری عملی سرگرمیوں کو قابل قدر بناتا تھا۔ آپ سے یہ توقع نہیں ہوتی تھی کہ آپ متھوس کو کسی عملیت پسندانہ پالیسی کی بنیاد بنائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے تو نتائج تباہ کن ہوسکتے تھے' اس کی وجہ یہ تھی کہ جو سائیکی کی داخلی دنیا میں خوب کارگر ہوتی وہی خارجی دنیا کے معاملات میں جوں کی توں قابل اطلاق تھی۔ مثال کے طور پر جب پوپ اربن دوم نے 1095ء میں پہلا صلیبی لشکر اکٹھا کیا تو اس کا منصوبہ لوگوس کی اقلیم سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یورپ کے جنگجو آپس میں لڑنا اور مغربی عیسائیت کے سانچے کو توڑنا ختم کردیں اور اس کی بجائے اپنی توانائیاں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشرق وسطیٰ میں جنگ پر صرف کریں اور یوں اس کے چرچ کے اقتدار کو توسیع دیں۔ تاہم جب اس کی عسکری مہم لوک اساطیر' بائبلی قصوں اور الہامی فنتاسیوں سے الجھ گئی تو نتیجہ المناک نکلا— عملی طور' عسکری طور پر اور اخلاقی طور پر۔ صلیبی جنگوں کے طویل منصوبے میں حقیقت یہی رہی کہ جب بھی لوگوس حاوی ہوتا صلیبی کامیاب ہوتے۔ انہوں نے میدانِ جنگ میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا' مشرقِ وسطیٰ میں باقی رہ سکنے والی نوآبادیاں قائم کیں اور مقامی آبادی کے ساتھ زیادہ مثبت انداز میں ربط رکھنا سیکھا۔ تاہم جب صلیبیوں نے ایک اساطیری یا متصوفانہ وژن کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنانا شروع کیا تو انہیں عموی طور پر شکست کا سامنا ہوا اور انہوں نے ہولناک مظالم ڈھائے۔

لوگوس کی محدودیتیں بھی تھیں۔ وہ انسانی درد یا دکھ کا مداوا نہیں کرسکتا تھا۔ عقلی دلائل المیے کا کوئی ادراک نہیں پاسکتے۔ لوگوس انسانی حیات کی حتمی قدر کے حوالے سے سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ کوئی سائنس داں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والی اشیاء تو بنا سکتا تھا اور طبیعی کائنات کے حوالے سے نئے حیرتناک حقائق تو دریافت کرسکتا تھا مگر وہ زندگی کی معنویت کی توضیح نہیں کرسکتا تھا۔ ایسا اسطورہ اور مت کے لیے ہی مخصوص تھا۔

تاہم اٹھارہویں صدی تک یورپ اور امریکہ کے لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ایسی تحیرانگیز کامیابی حاصل کرچکے تھے کہ وہ یہ سوچنے لگے کہ حق کا واحد راستہ لوگوس ہے اور متھوس کو باطل اور توہمانہ قرار دینے لگے۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ جس نئی دنیا کو خلق کررہے تھے' وہ پرانی اساطیری روحانیت سے متناقض تھی۔ ہمارا مذہبی تجربہ جدید دنیا میں تبدیل ہوچکا ہے اور چونکہ لوگ بڑھتی ہوئی تعداد میں صرف سائنسی عقلیت پسندی ہی کو سچ تصور کرتے ہیں اس لیے وہ اپنے عقیدے کی متھوس کو لوگوس میں ڈھالنے کی اکثر کوشش کرچکے ہیں۔ بنیاد پرستوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی ہے۔ یہ الجھاؤ مزید مسائل کا پیش خیمہ بنا ہے۔

ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہماری دنیا کس طرح تبدیل ہوچکی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا پہلا حصہ آپ کو واپس پندرہویں صدی کے اواخر اور سولہویں صدی میں لے جائے گا' کہ جب مغربی یورپ کے لوگ اپنی نئی سائنس کو پروان چڑھانا شروع کرچکے تھے۔ ہم ماقبل جدید زرعی تہذیب کے اساطیری ایمان کا بھی جائزہ لیں گے تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ عقیدے کی پرانی صورتیں کس طرح کارفرما تھیں۔ بہادر نئی دنیا میں روایتی طور پر مذہبی ہونا دشوار ہوتا جارہا ہے۔ جدیدیت پذیری ہمیشہ ایک تکلیف دہ عمل رہا ہے۔ جب معاشرے کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادی تبدیلیاں دنیا کو اجنبی اور ناقابل شناخت بنا دیتی ہیں تو لوگ خود کو بیگانہ اور کھویا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ ہم یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں' یہودیوں اور مصر اور ایران کے مسلمانوں پر جدیدیت کے اثرات کو کھوجیں گے۔ تب ہم یہ دیکھنے کے قابل ہوں گے کہ جب انیسویں صدی کے اواخر میں بنیاد پرستوں نے عقیدے کی اس نئی صورت کو خلق کرنا شروع کیا تو وہ کیا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بنیاد پرست محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان قوتوں کے خلاف جنگ کر رہے ہیں جو ان کی انتہائی مقدس اقدار کے لیے خطرہ ہیں۔ جنگ کے دوران جنگ لڑنے والوں کے لیے دشوار ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مؤقف کو سراہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ جدیدیت پذیری معاشرے میں اختلافات کا پیش خیمہ بنی ہے' تاہم بعض اوقات تنازعے میں شدت نہ پیدا ہونے کا بھی' ہمیں دوسرے فریق کے درد اور نقطۂ نظر کو بھی سمجھنے کی کوشش لازماً کرنی چاہیے۔ ہم لوگ — بشمول میرے — جو کہ جدیدیت کی آزادیوں اور حاصلات سے لطف اندوز ہوتے ہیں' مذہبی بنیاد پرستی کا سبب بننے والے رنج کو سمجھنا دشوار پاتے ہیں۔ تاہم جدیدیت کو ایک آزادی کی بجائے ایک جارحانہ حملے کے طور پر زیادہ لیا گیا ہے۔ یہودیوں سے زیادہ کم لوگوں ہی نے جدید دنیا میں صعوبتیں جھیلی ہیں' اس لیے پندرہویں صدی کے اواخر میں مغربی عیسائیت والے جدیدیت پذیر معاشرے سے ان کے شدید ٹکراؤ سے آغاز کرنا موزوں ہوگا' جو کچھ یہودیوں کی طرف سے بہت سی ایسی حکمت عملیوں' انداز و اطوار اور اصولوں کی پیش بندی کا پیش خیمہ بنا' جو کہ بعدازاں نئی دنیا میں عام ہو گئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ اول

پرانی اور نئی دنیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

یہودی بنیاد پرستی کا تاریخی پس منظر

(1492ء-1700ء)

سقوطِ غرناطہ: سائنسی اور عقلیت پسندانہ جدیدیت کا نقطۂ آغاز:

1492ء میں سپین میں تین اہم واقعات رونما ہوئے۔ اس زمانے میں تو انہیں غیر معمولی سمجھا گیا تھا' تاہم اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ پندرہویں صدی کے اواخر' نیز سولہویں اور سترہویں صدی کے دوران مغربی یورپ میں آہستہ آہستہ اور تکلیف دہ انداز میں جنم لینے والے نئے معاشرے کی خصوصیات تھے۔ ان برسوں نے ہمارے جدید مغربی کلچر کا ارتقاء دیکھا' لہٰذا 1492ء ہماری کچھ پریشانیوں اور مخمصوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ان واقعات میں سے پہلا واقعہ 2/جنوری کو اس وقت رونما ہوا جب بادشاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیل کی افواج نے غرناطہ کی شہری ریاست کو فتح کیا۔ وہ دونوں کیتھولک حکمران تھے' جن کی شادی حال ہی میں اراگون اور کیسٹیل کی پرانی بادشاہتوں کو متحد کر چکی تھی۔ ہجوم نے عمیق جذبات کے ساتھ عیسائی پرچموں کو شہر کی فصیل کے اوپر فتح مندانہ انداز میں لہراتے ہوئے دیکھا اور جیسے ہی خبر پھیلی پورے یورپ میں فاتحانہ گھنٹیاں بجنے لگیں کیونکہ غرناطہ عیسائی دنیا میں آخری مضبوط اسلامی مرکز تھا۔ مشرق وسطیٰ میں اسلام کے خلاف صلیبی جنگیں ناکامی سے دوچار ہو چکی تھیں تاہم مسلمانوں کو کم از کم یورپ سے تو نکال باہر کیا جا چکا تھا۔ 1499ء میں سپین میں رہنے والے مسلمانوں سے کہا گیا کہ یا تو وہ عیسائیت قبول کر لیں یا پھر سپین سے نکل جائیں۔ اس طرح چند صدیوں تک یورپ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اس انتہائی اہم سال کا دوسرا واقعہ 31 مارچ کو تب رونما ہوا جب فرڈیننڈ اور ازابیل نے فرمانِ بے دخلی پر دستخط کیے' جس کو اس لیے وضع

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا گیا تھا کہ سپین کو یہودیوں سے نجات دلائی جائے۔ یہودیوں کو بھی کہا گیا کہ یا تو عیسائیت قبول کر لیں یا سپین سے نکل جائیں۔ بہت سے یہودیوں کو ''الاندلس'' (جیسا کہ پرانی مسلمان مملکت کو کہا جاتا تھا) سے اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے عیسائیت قبول کر لی اور سپین ہی میں رہے' تاہم 80 ہزار یہودی سرحد پار کر کے پرتگال چلے گئے جبکہ 50 ہزار یہودی نئی مسلمان عثمانی سلطنت کو فرار ہو گئے' جہاں ان کا استقبال گرمجوشی سے کیا گیا۔ تیسرا واقعہ ایک ایسے شخص سے متعلق ہے جو کہ غرناطہ پر عیسائی قبضے کے وقت موجود تھا۔ اگست میں فرڈیننڈ اور ازابیل کا ایک متوسل کرسٹوفر کولمبس بحری جہاز پر سپین سے ہندوستان تک کا تجارتی راستہ تلاش کرنے کے لیے روانہ ہوا مگر اس کے بجائے اس نے امریکہ کو دریافت کر لیا۔

یہ واقعات ابتدائی جدید عہد کی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ بے رحمی اور ہلاکت انگیزی کی بھی ترجمانی کرتے ہیں۔ جیسا کہ کولمبس کے بحری سفر نے بھرپور انداز میں ظاہر کیا کہ یورپ کے لوگ ایک نئی دنیا کے سرے پر موجود تھے۔ ان کے آفاق وسیع ہو رہے تھے' وہ جغرافیائی' دانشورانہ' سماجی' معاشی اور سیاسی اعتبار سے اب تک غیر معلوم اقالیم میں داخل ہو رہے تھے۔ آئندہ ان کے کارنامے انہیں کرۂ ارض کے مالک بنا دیں گے۔ تاہم جدیدیت ایک تاریک تر پہلو کی حامل بھی تھی۔ عیسائی سپین یورپ میں ایک سب سے زیادہ طاقتور اور ترقی یافتہ ملک تھا۔ فرڈیننڈ اور ازابیل ایک جدید مرکزی نظام حکومت والی ریاست تخلیق کرنے کے عمل میں تھے' جو کہ عیسائی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی نمودار ہو رہی تھیں۔ کوئی ایسا ملک پرانے خودمختارانہ اداروں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا' مثلاً گلڈ (Guild)' کارپوریشن یا یہودی کمیونٹی کو' جو کہ عہد وسطیٰ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ سپین کی یکجائی' جو کہ غرناطہ کی فتح سے تکمیل کو پہنچی تھی' کے تسلسل میں نسل کشی کا ایک عمل شروع ہوا جبکہ مسلمان اور یہودی اپنے گھروں سے محروم کر دیئے گئے۔ جدیدیت کچھ لوگوں کے لیے طاقت عطا کرنے والی' آزادی بخشنے والی اور ولولہ انگیز تھی۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کے لیے جدیدیت تشدد آمیز' جارحانہ اور تخریب کارانہ تھی ــــ اور ہے ــــ جیسے جیسے مغربی جدیدیت دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلی یہ سوچ بھی پیدا ہو گئی۔ جدیدیت کا عمل شعور بیدار کرنے اور انسانی اقدار کو فروغ دینے والا عمل تھا تاہم وہ جارحانہ بھی تھا۔ بیسویں صدی کے دوران' ایسے لوگ جنہوں نے ابتدا میں جدیدیت کو ایک حملہ تصور کیا تھا' بنیاد پرست بن گئے۔

پندرہویں صدی کے اواخر میں' یورپ کے لوگ اس تبدیلی کی ہمہ گیریت کی پیش

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنی نہیں کر سکے' جس کا آغاز انہوں نے کیا تھا۔ اگلے تین سو برسوں کے دوران یورپ نے نہ صرف اپنے معاشرے کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے تبدیل کیا بلکہ ایک دانش ورانہ انقلاب بھی برپا کیا۔ سائنسی عقلیت پسندی رواج پا گئی اور اس نے ذہن اور دل کی پرانی عادتوں کو بتدریج ختم کر دیا۔ ہم تیسرے باب میں عظیم مغربی قلب ماہیئت (Great Western Transformation)' جیسا کہ اس عہد کو کہا گیا ہے' کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں گے۔ تاہم اس کے مکمل نتائج کو سراہنے سے پہلے ہمیں لازماً یہ دیکھنا ہوگا کہ ماقبل جدید عہد کے لوگ دنیا میں کس طرح جیتے تھے۔ سپین کی یونیورسٹیوں میں طلباء اور اساتذہ نے اطالوی نشاۃ ثانیہ کے نئے تصورات پر گرمجوشی کے ساتھ بحث مباحثہ کیا۔ کولمبس کا بحری سفر مقناطیسی قطب نما جیسی سائنسی ایجادات یا علم فلکیات کی تازہ ترین بصیرتوں کے بغیر ناممکن تھا۔ 1492ء تک مغربی سائنسی عقلیت پسندی تحیر خیز حد تک اثر آفریں ہو رہی تھی۔ لوگ یونانیوں کے لوگوس کے امکانات کو پہلے سے کہیں زیادہ جامعیت کے ساتھ دریافت کر رہے تھے۔ جدید سائنس کی مدد سے یورپ کے لوگ ایک بالکل نئی دنیا دریافت کر چکے تھے اور ماحول پر ایک بے نظیر غلبہ و تسلط حاصل کر رہے تھے۔ تاہم انہوں نے متھوس کو ہنوز ترک نہیں کیا تھا۔ اگرچہ کولمبس سائنس سے آشنا تھا تاہم وہ قدیم اساطیری کائنات سے بھی جڑا ہوا تھا۔ شاید اس کا خاندان یہودی سے عیسائی ہوا تھا اور اسے یہودیت کی صوفیانہ روایت قبالہ (Kabbalah) میں ہنوز دلچسپی تھی' تاہم وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھا' اور عیسیٰؑ کی دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ جب وہ ہندوستان پہنچے گا تو یروشلم کو فتح کرنے کے لیے وہاں فوجی مرکز قائم کرے گا۔ یورپ کے لوگ جدیدیت کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر چکے تھے' تاہم وہ ہمارے معنوں میں ہنوز پوری طرح جدید نہیں ہوئے تھے۔ ان کے لیے عیسائیت کی اساطیر اب بھی ان کی عقلیت پسندانہ اور سائنسی دریافتوں کو معنویت عطا کرتی تھی۔

تاہم عیسائیت تبدیل ہو رہی تھی۔ سپین کے لوگ کونسل آف دی ٹرینٹ (1545-63ء) کی طرف سے شروع کی گئی ردِ اصلاح (Counter-Reformation) کی تحریک کے سرخیل بن گئے تھے۔ یہ ایک جدیدیت پسندانہ تحریک تھی جس نے پرانے کیتھولک ازم کو نئے یورپ کی بے روک اثر آفرینی سے ہم آہنگ کیا۔ جدید ریاست کی طرح چرچ بھی ایک زیادہ مرکزی ادارہ بن گیا۔ کونسل نے پوپ اور بشپ کے اختیارات کو تقویت دی۔ پہلی مرتبہ تمام عیسائیوں کی مذہبی پختگی کو جانچنے کے لیے دینی سوالنامہ جاری کیا گیا۔ پادریوں کو اعلیٰ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی تاکہ وہ زیادہ موثر انداز میں تبلیغ کر سکیں۔ عام عیسائیوں کا طریق عبادت اور دیگر عقیدتی اعمال تعقل پسندانہ ہو گئے اور ایک صدی پہلے تک معنویت کی حامل رسومات ترک کر دی گئیں۔ بہت سے سپینی کیتھولک ڈچ انسان دوست ڈیسڈیریئس ایراسمس (1536ء-1466ء) کی تحریروں سے متاثر تھے' جو بنیادوں کی طرف واپسی اختیار کر کے عیسائیت کو حیات نو عطا کرنا چاہتا تھا۔ اس کا نعرہ تھا Ad Fontes! یعنی ''سرچشموں کی طرف واپسی!'' ایراسمس کا ایقان تھا کہ اولین چرچ کا مصدقہ عیسائی عقیدہ عہد وسطیٰ کی بے روح الٰہیات کے انبار تلے دفن ہو چکا ہے۔ عیسائیوں نے پہلے والے زوائد کو ترک کر کے اور سرچشموں بائبل اور چرچ کے فادروں کی طرف لوٹتے ہوئے کتاب مقدس کے زندہ معانی کی بازیافت اور نئے جنم کا تجربہ کیا۔

رد اصلاح کی تحریک میں سپینیوں کا سب سے بڑا حصہ صوفیانہ تھا۔ جس طرح عظیم بحری جہاز راں طبیعی دنیا کے نئے علاقوں کو دریافت کر رہے تھے' بالکل اسی طرح آئبیریا کے صوفی روحانی دنیا کے دریافت کنندگان بن گئے۔ تصوف متھوس کی اقلیم سے تعلق رکھتا تھا اور وہ لاشعور کے احاطے میں بروئے عمل آتا تھا' جو کہ عقل کی رسائی سے باہر تھا اور اس کا تجربہ دوسرے ذرائع سے کیا گیا تھا۔ سپین کے صوفی مصلحین روحانیت کی اس شکل کو باضابطہ اور کم عجیب وغریب اور ناکافی مشیروں کی من کی موجوں کا کم پابند بنانا چاہتے تھے۔ جان آف دی کراس (91-1552ء) نے زیادہ مبہم اور توہم پرستانہ عقائد کو خارج کر دیا اور صوفیانہ طریقۂ کار کو مزید منظم بنایا۔ نئے عہد کے صوفیوں کو یہ جاننا ہوتا تھا کہ جب وہ ایک مرحلے سے ارتقا پا کر دوسرے مرحلے میں پہنچیں گے تو کیا متوقع ہے نیز انہیں داخلی زندگی کے مسائل اور خطرات سے نمٹنے کا طریقہ لازماً سیکھنا ہوتا تھا اور اپنی روحانی توانائیوں کو تخلیقی انداز میں برتنا ہوتا تھا۔ تاہم زیادہ جدید اور مستقبل میں رونما ہونے والے معاملات کی ایک علامت سابق فوجی اگنیٹیئس آف لویولا (1555ء-1491ء) کی قائم کردہ یسوع کی سوسائٹی (Society of Jesus) تھی' جو کہ فعالیت اور اثر آفرینی کی خصوصیات سے متصف تھی' جنہوں نے آگے چل کر جدید مغرب کے امتیازی اوصاف بن جانا تھا۔ اگنیٹیئس نے متھوس کی قوت کو عملی طور پر استعمال کرنے کا عزم کیا ہوا تھا۔ اس کے یسوعیوں (Jesuits) کے پاس اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ جان آف کراس کی وضع کردہ طویل مراقباتی مشقیں کریں۔ اس نے اپنی کتاب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Spiritual Exercises) میں اپنے پیروکاروں کو روحانیت کا ایک منظم، کارگر، تیس روزہ کریش پروگرام دیا۔ جب کوئی عیسائی حضرت عیسیٰؑ کے سانچے میں مکمل طور پر ڈھل جاتا تو اسے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ عمل کے لیے تیار ہونا پڑتا تھا۔ طریقے، ضابطے اور تنظیم پر یہ اصرار نئی سائنس سے مشابہت رکھتا تھا۔ خداوند کا تجربہ ایک ایسی حرکیاتی قوت کے طور پر کیا گیا جس نے تبلیغ کے لیے یسوعیوں کو، بالکل دریافت کنندگان کے مانند، ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ فرانسس زیویئر (1506-52ء) نے جاپان میں، رابرٹ ڈی نوبیلی (1577ء-1656ء) نے چین میں عیسائیت کی بھرپور تبلیغ کی۔ گویا ابتدائی طور پر جدید سپین نے مذہب کو چھوڑا نہیں تھا۔ تاہم وہ اپنی اصلاح کرنے اور جدیدیت کی رونما ہوتی ہوئیں بصیرتوں کو اپنے وژن کا جزو بنانے پر آمادہ تھا۔

چنانچہ ابتدائی طور پر جدید سپین جدیدیت کا پیشرو بن گیا۔ تاہم فرڈیننڈ اور ازابیل کو جدیدیت کی قوت کو محدود رکھنا پڑا۔ وہ اپنی سلطنت کو متحد کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ 1483ء میں انہوں نے اپنی متحدہ سلطنت میں نظریاتی پختگی کو فروغ دینے کے لیے ''سپینی دینی عدالت'' (Spanish Inquisition) قائم کی۔ وہ ایک جدید، مطلق ریاست تخلیق کرنے کی کوششیں تو کر رہے تھے تاہم اب بھی اس قدر وسائل کے حامل نہیں تھے کہ اپنی رعایا کو مکمل دانش ورانہ آزادی دیں۔ ریاست کی دینی عدالت کے اہل کاروں نے منحرفین کو ڈھونڈا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ ''بدعت'' (Heresy) چھوڑ دیں۔ Heresy کا ماخذ ایک یونانی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''اپنے طریقے پر عمل کرنا''۔ سپینی مذہبی عدالت کوئی قدیم نوعیت کا ادارہ نہیں تھا بلکہ ایک جدیدیت پذیر ادارہ تھا، جسے حکمرانوں نے قدیمی اتحاد پیدا کرنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ مذہب ایک دھماکہ خیز اور انقلابی قوت بن سکتا ہے۔ اسی طرح انگلستان جیسے ملکوں کے کیتھولک حکمران بھی کیتھولک ''منحرفین'' پر ستم ڈھا رہے تھے اور انہیں ریاست کے دشمن تصور کیا جاتا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ اس قسم کا جبر جدیدیت پذیری کے عمل کا حصہ رہا ہے۔ سپین میں یہودی مذہبی احتساب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اس باب میں ہم اس جارحانہ جدیدیت کے حوالے سے یہودیوں کے ردعمل پر روشنی ڈالیں گے۔ ان کا تجربہ دنیا کے دوسرے حصوں میں جدیدیت کے ردعمل کے بہت سے طریقوں کی وضاحت کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلم اندلس کی شکست: یہودیوں کے لیے المیہ:

الاندلس کی پرانی مسلم سلطنت کی تسخیر آئبیریا کے یہودیوں کے لیے ایک المیہ ثابت ہوئی تھی۔ اسلامی ریاست میں یہودیت' عیسائیت اور اسلام چھ صدیوں سے بھی زیادہ طویل عرصے تک امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہے۔ یہودیوں کے لیے تو بالخصوص سپین میں ایک ثقافتی اور روحانی نشاۃ ثانیہ برپا ہوئی اور باقی یورپ کی طرح یہاں انہیں ظلم وستم اور ہلاکت انگیزی کا سامنے نہیں کرنا پڑا۔ تاہم جوں جوں عیسائی فوجیں اسلامی علاقوں کو فتح کرتی گئیں ان کے ساتھ ساتھ سامیت دشمنی بھی پھیلتی گئی۔ 1378ء اور 1391ء میں اراگون اور کیسٹیل کے یہودیوں پر عیسائیوں نے حملے کیے۔ وہ انہیں گھسیٹتے ہوئے بپتسمہ کرنے کے مقامات پر لے جاتے اور موت سے ڈرا کر عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرتے۔ اراگون میں ڈومینیکن پادری ونسنٹ فیرر (1419ء-1350ء) کی تبلیغ کے نتیجے میں باقاعدگی سے یہودی دشمن فسادات ہوتے رہے۔ فیرر نے عیسائیوں اور یہودی ربیوں کے درمیان عوامی سطح پر مباحثے بھی کروائے' جن کا مقصد یہودیت کی تذلیل وتحقیر تھا۔ کچھ یہودی ظلم وستم سے بچنے کے لیے عیسائی ہو گئے۔ انہیں سرکاری طور پر "Convesos" (عیسائیت قبول کرنے والے) کہا جاتا تھا لیکن عام عیسائی انہیں Marranos یعنی ''خنزیر'' کہتے تھے' بعض عیسائیت قبول کرنے والوں نے اس اصطلاح کو فخر کی علامت کے طور پر قبول کر لیا۔ ربیوں نے یہودیوں کو عیسائیت قبول کرنے سے روکا تاہم عیسائیت قبول کرنے والے یہودی دولت مند اور کامیاب ہونے لگے۔ ان میں سے بعض تو اعلیٰ رتبے والے پادری بن گئے' دیگر کی شادیاں اونچے خاندانوں میں ہو گئیں اور بہت سوں نے تجارت میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ اس سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا اور وہ یہ کہ ''پرانے عیسائی'' نئے عیسائیوں کی ترقی سے مشتعل ہونے لگے۔ 1449ء سے 1474ء کے درمیانی عرصے میں میرانوؤں (Marranos) کے خلاف تسلسل کے ساتھ فسادات ہوتے رہے۔ انہیں قتل کیا گیا' ان کی املاک کو نذر آتش کیا گیا اور انہیں ان کے شہروں سے نکال دیا گیا۔

فرڈیننڈ اور ازابیل اس مسئلے سے پریشان ہو گئے۔ یہودیوں کے عیسائیت قبول کرنے سے ان کی سلطنت اتحاد کی بجائے تقسیم کی طرف جا رہی تھی۔ انہیں ان اطلاعات نے بھی پریشان کیا کہ ''نئے عیسائیوں'' میں سے بعض لوگ دوبارہ پرانے عقیدے کی طرف لوٹ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گئے ہیں اور خفیہ طور پر یہودیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نئے عیسائیوں کو دوبارہ یہودی ہونے سے روکنے کے لیے ایک خفیہ تحریک شروع کی۔ مذہبی محتسبوں کو ذمہ داری تفویض کی گئی کہ وہ اس قسم کے یہودیوں کی نشاندہی کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی پہچان یہ رکھی گئی کہ وہ خنزیر کھانے سے یا اتوار کے دن کام کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ مشتبہ لوگوں پر تشدد کیا جاتا کہ وہ اپنے کفر کا اعتراف کریں اور دیگر خفیہ طور پر دوبارہ یہودی ہونے والوں کے بارے میں اطلاع دیں۔ اس احتسابی کارروائی کے پہلے بارہ برسوں کے دوران 13000 نئے عیسائیوں کو قتل کر دیا گیا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں میں سے' جن کو قتل کیا گیا' جن کی املاک کو نذر آتش کیا گیا یا جنہیں حوالۂ زنداں کیا گیا' بیشتر راسخ العقیدہ کیتھولک تھے اور انہوں نے یہودیت کو دوبارہ قبول نہیں کیا تھا۔ اس ظلم وستم کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ نئے عیسائی اپنے نئے مذہب کے حوالے سے تلخ اور تشکیک زدہ ہو گئے۔

جب فرڈیننڈ اور ازابیل نے 1492ء میں غرناطہ کو فتح کیا تو انہیں اس شہری ریاست میں یہودیوں کی ایک نئی اور ٹھوس آبادی ورثے میں ملی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ صورتحال قابو سے باہر ہے اور یہودی مسئلے کے آخری حل کے طور پر انہوں نے فرمان بیدخلی جاری کر دیا۔ سپینی یہودیت تباہ کر دی گئی۔ تقریباً 70000 یہودیوں نے ظلم وستم سے بچنے کے لیے عیسائیت قبول کر لی اور مذہبی احتساب کا نشانہ بننے کے لیے سپین ہی میں رہ گئے' جبکہ باقی ماندہ ایک لاکھ تیس ہزار یہودی وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ساری دنیا کے یہودیوں نے سپینی یہودیوں کے المیے کو یروشلم میں واقع معبد کی 70ء میں ہونے والی بربادی کے بعد یہودیت کا سب سے بڑا المیہ تصور کرتے ہوئے رنج وغم کیا۔ 70ء میں ہونے والی بربادی کے نتیجے میں یہودیوں کو اپنے وطن سے ہاتھ دھونا پڑے تھے اور فلسطین کے باہر مختلف مقامات پر آباد ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد سے وطن بدری یہودیوں کے لیے ایک دردناک معاملہ رہی تھی۔ 1492ء میں سپین سے یہودیوں کے نکالے جانے سے پہلے ہی یہودیوں کو جلاوطن کرنے کا سلسلہ یورپ کے دوسرے حصوں میں پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ 1421ء میں انہیں ویانا اور لنز سے نکالا گیا۔ 1424ء میں کولون سے' 1439ء میں آگسبرگ سے' 1442ء میں باویریا سے اور 1454ء میں موراویا کے بڑے شہروں سے نکال دیا گیا۔ یہودیوں کو 1485ء میں پیروگیا سے' 1486ء میں ولیس نزا سے' 1488ء میں پارما سے' 1489ء میں میلان اور لوکا سے اور 1494ء میں ٹسکنی سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہودی رفتہ رفتہ مشرق کی طرف جانے لگے اور اپنے خیال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق پولینڈ میں ایک مضبوط مرکز قائم کرنے لگے۔ اس وقت وطن بدری یہودی صورتحال کا ایک ناگزیر اور ناقابل فرار جزو دکھائی دینے لگی تھی۔

یقیناً وہ سپینی یہودی یہی سوچتے تھے' جو کہ وطن بدری کے بعد شمالی افریقہ اور عثمانی سلطنت کے بلقانی صوبوں میں پناہ لے چکے تھے۔ وہ مسلم معاشرے سے مانوس تھے' تاہم سپین' یا جیسا کہ وہ اسے کہتے تھے' سیفاریڈ (Sefarad) سے بے دخلی نے گہرا نفسیاتی زخم لگایا تھا۔ ان سیفری یہودیوں نے محسوس کیا کہ وہ خود اور باقی ہر شے غلط مقام پر ہے۔ وطن بدری طبیعی کے علاوہ روحانی مسئلہ بن گئی۔ جلاوطنوں کے لیے وطن سے باہر کی دنیا مکمل طور پر ناآشنا ہوتی ہے اور اسی لیے بے معنی بھی۔ جارحانہ انداز میں جڑوں سے اکھاڑ دیا جانا' جو کہ معمول کے تمام احوال و کوائف کو برباد کر دیتا ہے' ہماری دنیا کو توڑ پھوڑ دیتا ہے' ہم سے ان مقامات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھین لیتا ہے جو ہماری شناخت بن چکے ہوتے ہیں اور ہمیں ایک مستقل طور پر اجنبی ماحول میں پھینک دیتا ہے' یہ ہمیں احساس دلا سکتا ہے کہ ہماری تو ہستی ہی خطرے کی زد میں ہے۔ جب جلاوطنی کے ساتھ انسانی بے رحمی بھی منسلک ہوتی ہے تو وہ ایک ایسی دنیا میں' جس کے حوالے سے فرض کیا جاتا ہے کہ اسے ایک منصف اور مہربان خداوند نے خلق کیا ہے' شر کے مسئلے کے حوالے سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔

سیفری یہودیوں کا تجربہ جڑوں سے اکھاڑے جانے اور بے وطنی کی ایک ایسی انتہائی صورت تھی جس کا تجربہ دیگر لوگوں کو اس وقت ہوا جب وہ جدیدیت پذیری کے جارحانہ عمل کی زد میں آئے۔ ہم دیکھیں گے کہ جب جدید مغربی تہذیب کسی غیر ملکی ماحول میں جڑیں پکڑتی تھی تو وہ کلچر کو اس شدت کے ساتھ تغیر سے دوچار کرتی تھی کہ بیشتر لوگ بیگانگی اور بے اساسی محسوس کرنے لگتے تھے۔ پرانی دنیا مٹ گئی ہوتی اور نئی دنیا اتنی اجنبی ہوتی کہ لوگ اپنے کسی زمانے میں آشنا ماحول کو پہچان نہیں پاتے اور اپنی زندگیوں کی معنویت کا احساس نہیں کر پاتے۔ بہت سے لوگ' سیفری یہودیوں کی طرح' اس امر کے قائل ہو جاتے ہیں کہ ان کی ہستی ہی معرض خطر میں ہے۔ انہیں فنا کا خوف لاحق ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ اپنے درد و اذیت اور الجھن میں وہی کرتے ہیں جو کہ سیفری یہودیوں نے کیا تھا اور مذہب کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی زندگیاں مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہوتی ہیں' اس لیے انہیں اپنے انقلابی انداز میں تبدیل شدہ حالات میں پرانی روایتوں کو کارگر بنانے کے لیے عقیدے کی نئی صورتوں کو تشکیل دینا پڑتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم اس عمل میں وقت لگتا ہے۔ سولہویں صدی کے اوائل میں جلاوطن یہودیوں نے محسوس کیا کہ روایتی یہودیت ان کے کام نہیں آ سکتی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ تباہی بے نظیر ہے اور انہیں ادراک ہوا کہ پرانے عقائد بے کار ہو چکے ہیں۔ کچھ یہودی مسیحا پرستی (Messianism) کی طرف مائل ہو گئے۔

یہودیوں کو صدیوں سے مسیحا' خاندانِ داؤد کے بپتسمہ دینے والے بادشاہ کا انتظار تھا کہ وہ آ کر ان کی طویل جلاوطنی کو ختم کرے گا اور انہیں ارضِ موعودہ کی طرف واپس لے جائے گا۔ بعض یہودی روایات کے مطابق اس کی آمد سے فوری پہلے فتنہ و فساد کا دور آئے گا اور بعض سیفری جلاوطن' جنہوں نے بلقان میں پناہ حاصل کی ہوئی تھی' یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اور ان کے یورپ کے دیگر یہودی بھائی جس رنج و الم سے دوچار ہیں' وہ ''مسیحا کی آمد سے پہلے کے وہی فتنہ و فساد'' ہیں' جن کی پیشگوئی ان کے بزرگ کر چکے تھے۔ دوسرے یہودیوں نے بھی' جو یہ محسوس کرتے تھے کہ جدیدیت کے آنے سے ان کی دنیا تباہ و برباد ہو چکی ہے' ہزاروں امیدیں قائم کر لیں۔ تاہم مسیحا پرستی مسائل پیدا کرتی ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ آج تک ہر ایک مسیحا پرست تحریک' جو کسی نجات دہندہ کی منتظر ہوتی ہے' مایوسی ہی سے دوچار رہی ہے۔ سیفری یہودی ایک زیادہ اطمینان بخش حال تلاش کر کے اس مخمصے سے بچ گئے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک نئی متھوس کو تشکیل دے لیا۔

لیوریائی قبالہ:

سیفری یہودیوں کا ایک گروپ بلقان سے فلسطین چلا گیا' جہاں وہ گیلیلی میں سیفیڈ (Safed) میں آباد ہو گئے۔ روایت یہ کہتی تھی کہ جب مسیح آئے گا تو وہ خود کو گیلیلی میں منکشف کرے گا اور پینی جلاوطن اسے سب سے پہلے خوش آمدید کہنے کے خواہش مند تھے۔ ان میں سے بعضوں کو یقین تھا کہ وہ ایک اشکنازی (Ashkenazic) یہودی آئزک لیوریا (1543-72ء) کے روپ میں مسیحا کو پا چکے ہیں۔ وہ سیفیڈ میں آباد تھا اور اس نے ایک نئی اسطورہ پیش کی تھی۔ اس نے قبالہ کے ایک نئے روپ کو متعارف کروایا جو آج بھی اس کے نام سے موسوم ہے۔ ہم جدید لوگ تو یہ کہیں گے کہ لیوریا نے ایک اسطورہ کو تخلیق کیا تھا' کہ وہ لوگوں کی لاشعوری خواہشات اور خوف سے مکمل طور پر آگاہ تھا اور اس نے انہیں مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسی تخیلاتی داستان گھڑی کہ جو نہ صرف سیفیڈ کے جلاوطنوں کے لیے بلکہ ساری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دنیا کے یہودیوں کے لیے راحت اور امید کی روشنی بن گئی۔ لیکن ہم اس رائے کا اظہار اس لیے کریں گے کیونکہ ہم بنیادی طور پر عقلیت پسندانہ تناظر میں سوچتے ہیں اور ماقبل جدید اساطیری تصور جہاں (ورلڈ ویو) کو سمجھنا دشوار پاتے ہیں۔ لیوریا کے پیروکار یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اس نے اس اسطورہ کو ''بنایا'' تھا بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اسطورہ نے خود کو اس پر منکشف کیا تھا۔ ایک ایسے بیرونی شخص کو جو کہ لیوریائی قبالہ کی رسومات اور سرگرمیوں میں شامل نہ ہو' یہ کہانی عجیب وغریب دکھائی دیتی ہے۔ مزید برآں یہ بائبل کی کتاب پیدائش والے تخلیق کے قصے سے مشابہت نہیں رکھتی۔ تاہم لیوریا کی بیان کردہ رسومات اور مراقباتی ریاضتوں میں مشغول سیفیڈ کے قبالائی (Kabbalist) کے لیے نیز جلاوطنی کے بہت عرصے بعد بھی اس کے صدمے سے دوچار یہودیوں کے لیے یہ متھوس مکمل طور پر بامعنی تھی۔ یہ ایک سچ کو منکشف یا ''بے نقاب'' کرتی تھی' جو کہ پہلے بھی عیاں تو تھا مگر جدید عہد کی ابتدا میں یہودی صورتحال کے حوالے سے اتنی قوت کے ساتھ نمایاں ہوا کہ اسے فوری طور پر مسلمہ حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس نے ان کی تاریک زندگی کو روشن کر دیا اور زندگی کو نہ صرف قابل برداشت بلکہ پُرمسرت بنا دیا۔

جب کوئی جدید شخص تخلیق کی لیوریائی اسطورہ سنے گا تو وہ فوراً دریافت کرے گا:

''کیا ایسا حقیقتاً واقع ہوا تھا؟'' اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعات انتہائی ناممکن دکھائی دیتے ہیں اور ثابت نہیں کیے جا سکتے ہیں لہٰذا ہم انہیں صریحاً جھوٹ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ تاہم ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہم حقیقت کا صرف عقلیت پسندانہ روپ ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہ احساس وشعور کھو چکے ہیں کہ ایک اور نوع کی حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم تاریخ کا ایک سائنسی تصور تشکیل دے چکے ہیں' ہم تاریخ کو منفرد واقعات کے ایک تسلسل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ تاہم ماقبل جدید دنیا میں تاریخی واقعات کو ابدی قوانین کی مثالیں تصور کیا جاتا تھا' ایک لازمان' مستقل حقیقت کا ظہور تسلیم کیا جاتا تھا۔ کسی تاریخی واقعے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بار بار رونما ہوگا' کیونکہ تمام ارضی واقعات ہستی کے بنیادی قوانین ہی کا اظہار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر بائبل میں درج ہے کہ اسرائیلیوں کے لیے کم از کم دو مرتبہ دریا معجزانہ طور پر منقسم ہوگیا۔ ایک اور معروف بائبلی تصور جلاوطنی کا ہے' ایسا لگتا ہے کہ اس نے پیمنی ایلیے کے بعد مکمل یہودی ہستی کو رنگ دیا تھا اور ہستی کی عین بنیاد کو ہی غیر متوازن ظاہر کر دیا تھا۔ لیوریائی قبالہ جلاوطنی کے مسئلے کا تجزیہ کرنے اور اس کی مکمل اہمیت کو منکشف کرنے کے لیے' دیگر تمام اساطیر کی طرح' دوبارہ آغاز کی طرف لوٹنے کی بات کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیوریائی اسطورہ میں تخلیقی عمل ایک رضا کارانہ جلاوطنی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز اس سوال سے ہوتا ہے کہ اگر خداوند ہر جگہ موجود ہے تو پھر دنیا کس طرح وجود رکھ سکتی ہے۔ اس کا جواب زِم زَم (Zim Zum) یعنی ''پسپائی'' کا نظریہ ہے۔ اس کے مطابق خداوند نے' جسے قبالائی آئن سوف (Ein Sof) یعنی ''بغیر حد والا'' کہتے ہیں' جو لامحدود اور ناقابل رسائی ہے' خود کو اپنے اندر محدود کرلیا تاکہ دنیا کو جگہ حاصل ہوجائے۔ چنانچہ تخلیق ایک الوہی بے رحمی سے شروع ہوئی تھی: آئن سوف نے خود کو اپنی مخلوق میں اور مخلوق کے لیے معلوم بنانے کی خاطر اپنے ایک حصے پر جلاوطنی لاگو کرلی۔ کتاب پیدائش کے باب اول میں بیان کیے گئے تخلیق کے منظم اور پُرامن عمل کے برعکس یہ اولین دھماکوں' بربادیوں اور جھوٹی شروعات کا ایک متشددانہ عمل تھا' جو کہ سیفری جلاوطنوں کو اس دنیا کے مطابق موزوں لگتا تھا' جس میں وہ جی رہے تھے۔ لیوریائی عمل کے ایک ابتدائی مرحلے میں آئن سوف زِم زَم (Zim Zum) کے بعد پیدا ہونے والے خالی پن کو الوہی روشنی سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دباؤ کی وجہ سے اسے پہنچانے والے ''برتن'' یا ''پائپ'' پھٹ جاتے ہیں۔ الوہی روشنی اس سارے پاتال میں گرتی ہے' جو کہ خداوند نہیں ہوتا۔ ''برتنوں کے ٹوٹنے'' کے بعد کچھ روشنی تو خداوند کی طرف واپس آجاتی ہے مگر باقی اس خداوند سے خالی اقلیم میں پھنسی رہ جاتی ہے' جسے خود آئن سوف نے زِم زَم (Zim Zum) کے عمل کے ذریعے اپنے آپ کو صاف کرکے باہر نکالا ہوتا ہے۔ اس تباہی کے بعد تخلیق کا رُخ غلط ہوجاتا ہے' اشیاء غلط مقام پر ہوتی ہیں۔ جب ایڈم (Adam) تخلیق ہوگا تو وہ اس صورتحال کو درست کر پائے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ الوہی جلاوطنی پہلی سبت کو ختم ہوئی۔ تاہم ایڈم نے گناہ کیا اور اس کے بعد سے مادی اشیاء میں پھنسی ہوئی الوہی روشنی اور شخینا (Shekhinah) یعنی موجود (Presence)' جو کہ زمین پر الوہی ہستی کی تفہیم کے لیے ہم سے سب سے نزدیک ہے' دنیا کے اندر ایک دائمی جلاوطنی کی حالت میں خداوند سے دوبارہ ملاپ کی شدید آرزو میں پھر رہے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ کہانی ہے لیکن اگر سیفیڈ کے قبالائیوں سے پوچھا جاتا کہ جو کچھ وہ مانتے ہیں کیا حقیقتاً وقوع پذیر ہوا تھا تو وہ اس سوال کو نامناسب قرار دیتے۔ اس اسطورہ میں بیان کیا گیا اولین واقعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو فقط ماضیٔ بعید میں رونما ہوا ہو' یہ تو ہر زمانے میں رونما ہونے والا واقعہ ہے۔ ہم کسی ایسے تصور یا واقعے کے لیے کسی لفظ کے حامل نہیں ہیں کیونکہ ہمارا عقلیت پسندانہ معاشرہ زمان (Time) کو تاریخی ترتیب کے انداز میں تصور کرتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اگر قدیم یونان کے الیوسس (Eleusis) کے پجاریوں سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پرسی فونی (Persephone) کو پلوٹو (Pluto) نے دُنیائے زیریں میں قید کر رکھا تھا اور یہ کہ اُس کی ماں دیمیتر (Demeter) اپنی بیٹی کے کھو جانے پر ماتم کرتی پھری تھی..... تو شاید اس سوال پر وہ الجھن کا شکار ہو جاتے۔ وہ کیسے یقین کر سکتے تھے کہ پرسی فونی زمین پر لوٹ چکی تھی' جیسا کہ اسطورہ کہتی تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس متھوس میں منکشف کیا گیا زندگی کا بنیادی آہنگ حقیقتاً رونما ہو رہا تھا۔ کھیتوں میں ہل چلایا جاتا' مکئی کے بیجوں کو درست وقت پر زمین تلے دبایا جاتا اور آخر کار مکئی پیدا ہو جاتی۔ متھوس اور فصل کا مظہر دنیا کے بارے میں کسی بنیادی اور آفاقی شے کی نشاندہی کرتے تھے' بالکل اسی طرح جس طرح انگریزی لفظ Boat اور فرانسیسی لفظ Bateau ایک ہی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں' جو کہ ان دونوں اصطلاحوں سے آزاد اور عرضی (Extrinsic) ہے۔ سیفری یہودیوں نے بھی شاید ایسا ہی جواب وضع کیا تھا۔ جلاوطنی ہستی کا ایک بنیادی قانون تھی۔ آپ کسی طرف بھی دیکھتے' آپ کو یہودی جڑوں سے اکھڑے اجنبی نظر آتے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے لوگ جو یہودی النسل نہیں تھے (Gentile)' انہوں نے کھونے کا اور مایوسی کا تجربہ کیا نیز اس احساس کا کہ وہ اس دنیا میں اجنبی ہیں .....جیسا کہ آفاقی اساطیر پہلے انسانوں کے اولین جنت سے نکالے جانے کے حوالے سے شہادت دیتی ہیں۔ لیوریا کی تخلیق کی پیچیدہ کہانی نے اس کو ایک بالکل مختلف انداز سے ظاہر اور واضح کیا۔ شخینا کی جلاوطنی اور بے وطن لوگوں کے طور پر ان کی اپنی زندگیاں دو الگ الگ حقیقتیں نہیں بلکہ ایک ہی تھیں۔ زِم زَم (Zim Zum) نے واضح کیا کہ جلاوطنی تو ہستی کی عین بنیاد میں نقش ہے۔

لیوریا کوئی ادیب نہیں تھا اور اس کی زندگی میں بہت کم لوگ اس کی تعلیمات سے آگاہ تھے۔ تاہم اس کے شاگردوں نے آئندہ نسلوں کے لیے اس کی تعلیمات کو قلمبند کیا جبکہ دوسروں نے انہیں یورپ میں پھیلایا۔ 1650ء لیوریائی قبالہ ایک عوامی تحریک بن چکا تھا' اس زمانے کے یہودیوں میں ایسی عمومی قبولیت حاصل کرنے والا واحد الٰہیاتی نظام۔ ایسا اس وجہ سے نہیں تھا کہ اسے عقلی یا سائنسی طور پر ثابت کیا جا سکتا تھا' حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ خاص طور پر پیدائش (Genesis) سے متضاد تھا۔ تاہم صحیفے کا لفظی مطالعہ' جیسا کہ ہم دیکھیں گے' ایک جدید معاملہ ہے' جو کہ اساطیری شعور پر عقلی شعور کے غلبے سے ابھرا ہے۔ جدید عہد سے پہلے یہودی' عیسائی اور مسلمان اپنے اپنے مقدس متون کی انتہائی استعاراتی' علامتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور باطنی تعبیریں کرتے تھے۔ چونکہ خدا کا کلام لامحدود تھا' اس لیے اس سے متنوع مفاہیم اخذ کیے جا سکتے تھے۔ اسی لیے بائبل کے سادہ معنوں سے لیوریا کے انحراف کو یہودیوں نے غلط تصور نہیں کیا' جیسا کہ بہت سے جدید مذہبی لوگ کرتے۔ اس کی اسطورہ انہیں اس لیے مسلمہ لگتی تھی کیونکہ وہ ان کی زندگیوں کی توضیح اور انہیں معنویت عطا کرتی تھی۔ وجود پذیر ہوتی ہوئی جدید دنیا سے نکالے گئے الگ تھلگ افراد کی حیثیت سے یہودیوں کا تجربہ ہستی کے انتہائی بنیادی قوانین سے موافقت رکھتا تھا۔ تخلیق کی ہر شے عین ابتدا ہی سے اپنے مقام سے ہٹائی گئی تھی' الوہی روشنی مادے میں پھنسی ہوئی تھی' اور خیر' زندگی کی ہر جگہ موجود حقیقت سے' یعنی شر سے نبرد آزما ہونے پر مجبور تھا۔ مزید یہ کہ یہودی دھتکارے ہوئے اور کم ذات نہیں تھے بلکہ نجات کے عمل کے مرکزی کردار تھے۔ انہیں یقین تھا کہ توریت کے احکامات' موسیٰؑ کے قانون پر عمل اور سیفیڈ میں وضع کی گئیں خصوصی رسومات ادا کرنے سے ان کی آفاقی جلاوطنی ختم ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہودی شخینا کو خداوند سے ''دوبارہ ملنے'' (Tikkun) میں' یہودیوں کی ارض موعودہ کی طرف واپسی میں اور باقی دنیا کو اس کی درست حالت میں بحال ہونے میں مدد دے سکتے تھے۔

یہ اسطورہ یہودیوں کے لیے اہمیت کی حامل چلی آ رہی ہے۔ ہولوکاسٹ (Holocaust)* کے المیے کے بعد کچھ لوگوں نے سمجھایا کہ وہ خدا کو صرف ابتلاً' زم زم (Zim Zum) کی کمزور الوہیت' جو کہ تخلیق کے قابو میں نہیں ہے' کی حیثیت سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ آج بھی جدید اور بنیاد پرست یہودی تحریکیں مادے میں پھنسی ہوئی الوہی روشنی اور تکون (Tikkun) کے احیائی عمل سے فیضان حاصل کرتی ہیں۔ ہر نئی اسطورہ کی طرح لیوریائی قبالہ ایک انکشاف تھی' جس نے یہودیوں کو دکھایا کہ ان کی زندگیاں بنیادی طور پر کیا ہیں اور ان کی کیا معنویت ہے۔ اسطورہ اپنی ہی صداقت تک محدود اور بعض عمیق سطحوں پر بدیہی تھی۔ نہ تو وہ عقلی ظاہر کی جا سکتی تھی اور نہ کی گئی۔ آج ہم لیوریائی اسطورہ کو ایک علامت یا استعارہ قرار دے سکتے ہیں مگر یہ بھی اس کا جواز دینا ہی ہوگا۔ دراصل یونانی میں لفظ "Symbol" (علامت) کا مطلب تھا' دو چیزوں کو اس طرح باہم ملانا کہ وہ الگ الگ نہ ہو سکیں۔ جب مغربی لوگوں نے کسی رسم یا نقش کو ''صرف ایک علامت'' کہنا شروع کیا تھا' تو جدید شعور' جو ہمیشہ اس قسم کی علیحدگیوں پر زور دیتا ہے' رونما ہو گیا تھا۔

* ہٹلر کے احکامات کے تحت یہودیوں کے قتل عام کو ہولوکاسٹ کہتے ہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایتی مذہب میں اسطورہ تقریبات اور مراقباتی ریاضتوں کے ذریعے پرستش کرنے والوں کی دنیاوی زندگیوں میں ابدی حقیقت کو لانے والی نئی رسوم سے الگ نہیں ہوتی تھی۔ اپنی علامتیت (Symbolism) کے باوجود لیوریائی قبالہ یہودی تجربے کے لیے اتنی اہم نہیں ہوئی تھی کیونکہ اسے ایسی رسوم کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا تھا جو جلاوطنوں میں الوہی معنویت کا شعور پیدا کرتیں۔ سیفیڈ میں قبالائیوں نے لیوریا کی الٰہیات کی تشکیل نو کے لیے خصوصی رسومات وضع کیں۔ انہوں نے شخینا سے ہم آہنگی کے لیے شب بیداریوں کا اہتمام کیا۔ وہ شخینا کو ایک عورت تصور کرتے تھے جو اپنے الوہی سرچشمے سے دوبارہ ملنے کی شدید آرزو لیے دنیا میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ یہودی آدھی رات کو جاگتے اور ننگے پیروں' روتے اور منہ پر خاک ملتے تھے۔ ان رسوماتی اعمال سے ان کے اپنے رنج وغم کا اظہار ہو جاتا اور وہ انہیں الوہی موجودگی کے غم جھیلنے کے تجربے سے بھی مماثلت دیتے تھے۔ وہ ساری ساری رات جاگتے رہتے اور عاشقوں کی طرح خدا کو یاد کرتے رہتے اور اس درد کی وجہ سے گریہ و زاری کرتے جو ویسے تو اکثر انسانی آزردگیوں میں نہاں ہوتا ہے مگر جو کہ جلاوطنی کی ابتلا میں مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ تکون (Tikkun) کے اعمال کے طور پر فاقے کیے جاتے' کوڑے جھیلے جاتے' برف میں لیٹا جاتا تھا۔ قبالائی دیہاتوں میں دور دور تک نکل جاتے' شخینا کی طرح بھٹکتے پھرتے اور اس طرح خود اپنی بے گھری کے احساس کا اظہار کرتے۔ یہودی قانون تاکید کرتا تھا کہ عبادت (Prayer) صرف اس وقت ہی اپنی پوری قوت اور معنویت کے ساتھ کی جاسکتی ہے جب کم از کم دس مرد اکٹھے ہوں' تاہم سیفیڈ میں یہودیوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ تنہا عبادت کریں اور دنیا میں اپنی تنہائی اور کمزوری کے حقیقی احساس کا تجربہ مکمل طور پر کریں۔ تنہا عبادت ایک یہودی اور باقی معاشرے میں فاصلہ پیدا کرتی تھی' اسے ایک مختلف نوع کا تجربہ کرنے کے لیے تیار کرتی تھی اور یہودیوں کی ہستی کو مستقل طور پر معرض خطر میں ڈالے رکھنے والی دنیا میں ان کی انتہائی خطرناک تنہائی کو از سر نو محسوس کرنے میں مدد دیتی تھی۔

تاہم لیوریا اس بات پر مصر تھا کہ لطف اندوزی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ قبالائیوں کو ایک منظم طریقے کے تحت اپنے غم کے وسیلے سے عمل کرنا ہوگا تاوقتیکہ وہ خوشی حاصل نہ کر لیں۔ نصف شب والی رسوم صبح سویرے شخینا اور آئن سوف کے آخری اتصال کے لیے' نتیجتاً انسانیت کی الوہیت سے علیحدگی کے خاتمے کے لیے مراقبے پر انجام کو پہنچتی تھیں۔ مراقبے کے حوالے سے قبالائیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ یہ تصور کریں کہ ان کا ہر عضو الوہی ہستی کا ارضی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معبد ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب تلقین کرتے ہیں کہ جب تک روحانیت عملی رحمدلی میں رونما نہیں ہوتی ہے' وہ بے کار ہے اور لیوریائی قبالہ بھی اسی بصیرت کو پیش کرتا تھا۔ دوسروں کو نقصان پہنچانے والی غلطیوں کا سخت کفارہ ادا کرنا پڑتا تھا: جنسی استحصال پر' بہتان طرازی پر' اپنے رفقاء کی تحقیر پر اور والدین کی نافرمانی پر۔

آخر میں قبالائیوں کو ایسی صوفیانہ ریاضتوں کا درس دیا گیا' جو دنیا کے بیشتر عقیدوں میں بھی وضع کی گئی ہیں۔ یہ ریاضتیں عامل کو سائیکی کے عمیق گوشوں تک رسائی پانے اور وجدانی بصیرت حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ سیفیڈ میں مراقبے کو خدا کے نام لکھے گئے خطوط کو تفصیل اور مہارت سے دوبارہ تحریر کرنے پر مرکوز کیا گیا۔ یہ ''ارتکاز'' (Kawwanot) قبالائی کو خود اپنے اندر الوہی ہستی کے سراغ سے آگاہ کرواتا۔ ممتاز قبالائیوں کا عقیدہ تھا کہ وہ نئی مقدس تخلیق کرنے کا اہل بن جائے گا اور لیوریا کی طرح اب تک غیر معلوم مذہبی سچ کو روشنی میں لائے گا۔ یہ کوانوٹ (Kawwanot) یقیناً قبالائیوں کے لیے عظیم مسرت لے کر آئے۔ لیوریا کے ایک شاگرد ہیم وائٹل (1620ء-1542ء) نے کہا کیف و سرور کے عالم میں وہ فخر و ناز اور رعب و جلال سے کپکپاتا ہے۔ قبالائی خواب دیکھتے اور وجد آفرین ماورائیت کا تجربہ کرتے' جو کہ سفاک اور اجنبی دکھائی دینے والی دنیا کو تبدیل کر دیتے تھے۔

عقلیت پسندانہ فکر عملی میدان میں حیران کن کامیابی حاصل کر چکا ہے لیکن یہ ہمارے رنج و الم میں کمی نہیں کر سکتا۔ سپینی المیے کے بعد قبالائیوں نے جانا کہ الاندلس کے یہودیوں میں مقبول رہنے والے فلسفے کے عقلی نظام ان کے کرب کا مداوا نہیں کر سکتے۔ زندگی معنویت سے خالی دکھائی دیتی تھی اور انسان اپنی معنویت سے عاری زندگیوں میں مایوسی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جلاوطن یہودی اپنی زندگی کو قابل برداشت بنانے کے لیے مقدس اور تصوف کی طرف مائل ہو گئے جنہوں نے ان کو اپنے کرب' نقصان اور خواہش کے لاشعوری سرچشموں سے رابطہ استوار کرنے کے قابل بنایا اور ان کی زندگیوں میں ایک ایسا وژن شامل کر دیا جو ان کے لیے آسودگی اور راحت لایا۔

تاہم یہ امر قابل غور ہے کہ اگنیٹیئس آف لویولا کے برعکس لیوریا اور اس کے شاگردوں نے یہودیوں کی سیاسی نجات کے لیے کوئی عملی منصوبے تیار نہیں کیے۔ قبالائی ارض اسرائیل میں آباد ہو چکے تھے تاہم وہ صیہونی (Zionist) نہیں تھے۔ لیوریا نے یہودیوں کو یہ تاکید نہیں کی کہ وہ جلاوطنی ترک کر کے ارض مقدس کی طرف ہجرت کر جائیں۔ اس نے اپنی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اساطیر یا اپنے صوفیانہ وژن کو ایک ایسی آئیڈیالوجی تخلیق کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا جو کہ عمل کا تفصیلی خاکہ (Blueprint) ہو۔ یہ متھوس کا کام بھی نہیں تھا۔ ایسی ہر عملی منصوبہ بندی اور سیاسی سرگرمی لوگوس ــــ عقلیت پسندانہ' ہمہ گیر فکر کا میدان تھی۔ لیوریا جانتا تھا کہ صوفی کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری یہودیوں کو وجودی اور روحانی مایوسی سے بچانا ہے۔ جب ان اساطیر کا اطلاق بعد میں سیاست کی عملی زندگی پر کیا گیا تو نتائج تباہ کن نکلے' جیسا کہ ہم آگے چل کر اسی باب میں بیان کریں گے۔

مذہبی پرستش کے نظام' عبادت اور رسوم کے بغیر اساطیر اور نظریوں میں کوئی معنویت نہیں ہوتی۔ اسطورہ کو قبالائیوں کے لیے قابل رسائی بنانے والی خصوصی تقریبات اور رسومات کے بغیر لیوریا کی تخلیق کی کہانی ایک لایعنی قصہ ہی رہتی۔ صرف کسی عباداتی تناظر کی وجہ سے ہی کوئی مذہبی عقیدہ بامعنی بن جاتا تھا۔ جب لوگ اس قسم کی روحانی سرگرمی سے محروم ہو جائیں تو وہ اپنا عقیدہ گنوا بیٹھتے ہیں۔ ان یہودیوں کے ساتھ یہی واقع ہوا تھا' جنہوں نے عیسائیت قبول کرنے اور جزیرہ نمائے آئبیریا میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایسا کچھ بہت سے جدید لوگوں کے ساتھ بھی ہو چکا ہے' جو نہ تو مراقبہ کرتے ہیں' نہ رسوم ادا کرتے ہیں یا جو کسی تقریباتی عبادت میں حصہ نہیں لیتے اور پھر محسوس کرتے ہیں کہ مذہب کی اساطیر ان کے لیے تو کوئی معنویت نہیں رکھتیں۔ بہت سے کنورس (Conversos) کیتھولک ازم سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونے کے اہل تھے۔ دراصل جوآن ڈی والڈیز (1500-41ء) اور جوآن لوئیس ویوز (1540ء-1492ء) جیسے مصلحین رد اصلاح (Counter Reformation) کے اہم رہنما بن گئے اور یوں انہوں نے ابتدائی جدید کلچر کے لیے اس طرح نمایاں خدمات انجام دیں' جس طرح کارل مارکس' سگمنڈ فرائڈ' ایمائیل ڈرخائیم' البرٹ آئن سٹائن اور لڈوگ وٹگنسٹائن جیسے سیکولر یہودیوں نے مرکزی دھارے کے معاشرے میں شامل ہونے کے بعد جدیدیت پر گہرا اثر ڈالا۔

یہودی عورتوں کی اولین ترجمان:

ان بااثر کنورسوں میں سے ایک سب سے زیادہ اہم شخصیت ٹیریسا آف ایویلا (82-1515ء) تھی' جو کہ جان آف کراس کی مرشد اور معلم اور ڈاکٹر آف چرچ قرار دی جانے والی پہلی عورت تھی۔ وہ سپین میں روحانیت کی اصلاح کی رائد (Pioneer) تھی نیز اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حوالے سے بالخصوص متفکر تھی کہ عورتوں کو مذہبی معاملات میں درست بنیاد فراہم کی جائے کیونکہ اس زمانے میں عورتوں کو اچھی تعلیم نہیں دی جاتی تھی اور نالائق روحانی رہنما ان سے غیر صحت مندانہ صوفیانہ ریاضتیں کرواتے تھے۔ اس نے تلقین کی کہ ہسٹیریائی مدہوشی' تصورات اور وجد کا تقدس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تصوف تو انتہائی مہارت' منظم ارتکاز' ایک متوازن شخصیت اور ایک خوشگوار' ہوش مندانہ مزاج کا متقاضی ہوتا تھا اور اسے معمول کی زندگی کے ساتھ منضبط اور چوکس انداز میں مربوط کر دیتا ہے۔ جان آف کراس کے مانند ٹیریسا ایک تجدید کرنے والی اور ایک جینیئس صوفیہ تھی تاہم اگر وہ یہودی ہی رہتی تو اسے ایسا موقع دستیاب نہ ہوا ہوتا کیونکہ صرف مردوں ہی کو قبالہ پر عمل کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی روحانیت یہودی ہی رہی۔ اپنی کتاب The Interior Castle میں وہ لکھتی ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے روح اپنے سفر کے دوران سات آسمانی ایوانوں سے گذرتی ہے۔ یہ ترتیب پہلی سے بارہویں صدی عیسوی کے دوران یہودی دنیا میں فروغ پانے والے ''تصوفِ تخت'' (Throne Mysticism) سے نمایاں مشابہت رکھتی ہے۔ ٹیریسا ایک راسخ العقیدہ اور مخلص کیتھولک تھی تاہم وہ ایک یہودن کی طرح عبادت (Prayer) کرتی تھی اور اپنی ننوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تلقین کرتی تھی۔

آلام کا سمندر:

ٹیریسا کی مثال میں' یہودیت اور عیسائیت سود مند انداز میں ضم ہو سکے تاہم دوسرے کنورسوں نے دونوں کے مابین نزاع کا مشاہدہ کیا۔ اس کی ایک مثال پہلا محتسب اعلیٰ ٹامس ڈی ٹارکیمیڈا (98-1420ء) تھا۔ اس نے جس جوش وخروش کے ساتھ سپین میں بچی کھچی یہودیت کو مٹا دینے کی کوشش کی' ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی خود اپنے دل سے پرانے عقیدے کو جڑ سے اکھاڑنے کی لاشعوری کوشش ہو۔ بیشتر میرانوؤں (Maranos) نے دباؤ کے تحت عیسائیت قبول کر لی اور ایسا لگتا ہے کہ بہت سے لوگ نئے مذہب میں پوری طرح کبھی شامل نہیں ہوئے۔ اس پر حیرت اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ بپتسمہ پانے کے بعد مذہبی احتساب کا ادارہ ان پر کڑی نگاہ رکھتا تھا اور انہیں معمولی معمولی الزامات کے تحت گرفتار ہو جانے کے خوف میں جینا پڑتا تھا۔ جمعے کو موم بتیاں جلانے اور صدقہ مچھلی کھانے سے انکار کرنے کا مطلب قید' تشدد یا کم سے کم صورت میں جائیداد کی قرقی ہوتا تھا۔ نتیجتاً کچھ لوگ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب ہی سے بیگانہ ہو گئے۔ وہ اپنی زندگیوں کو مصیبتوں کی آماجگاہ بنا دینے والے کیتھولک ازم کو پوری طرح قبول نہیں کر سکے جبکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہودیت ماضی کی ایک غیر حقیقی یاد بن گئی۔ 1492ء کی عظیم بیدخلی کے بعد سپین میں کوئی باعمل یہودی نہیں بچا تھا اور اگرچہ میرانو اپنے عقیدے پر خفیہ طور پر عمل کرنا چاہتے تھے مگر ان کے پاس یہودی قانون یا رسوماتی عمل سیکھنے کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ سیکولرازم' دہریت (Atheism) اور مذہب بیزاری کے باقی یورپ میں عام ہو جانے سے مدتوں پہلے جزیرہ نمائے آئبیریا کے میرانو یہودیوں میں ہم ان جوہری طور پر جدید رجحانات کو دیکھ سکتے ہیں۔

اسرائیلی عالم یرمیاہو یوول کے بقول کنورسوں کے لیے پورے مذہب کے حوالے سے متشکک ہونا بہت عام سی بات تھی۔ حتیٰ کہ 1492ء کی عظیم بیدخلی سے پہلے ایک عظیم سپینی خاندان کے افراد پیڈرو اور فرینڈو ڈی لاکیبلر یا جیسے کچھ کنورسوں نے سیاست' فن (آرٹ) اور ادب میں گہری دلچسپی لی مگر بہرحال مذہب میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ پیڈرو' جو کھلم کھلا کہتا تھا کہ وہ ایک جعلی عیسائی ہے' اس کا دعویٰ تھا کہ عیسائیت نے اسے مقدس قوانین اور ضوابط کے حوالے سے فکرمند ہوئے بغیر آزادی سے جینے کا موقع دیا ہے۔ 1492ء سے تھوڑا عرصہ پہلے ہی ایک شخص الورو ڈی مونٹلبن کو اس جرم میں مذہبی عدالت میں پیش کیا گیا کہ اس نے لینٹ * کے دوران پنیر اور گوشت کھایا ہے۔ اس نے نہ صرف عیسائی روزہ بلکہ یہودی قانون بھی توڑا تھا' جس کے تحت گوشت اور دودھ سے بنی ہوئی اشیاء کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ واضح بات ہے کہ وہ دونوں عقیدوں سے وابستگی محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس موقعے پر الورو جرمانہ ادا کر کے بچ گیا۔ یقینی طور پر وہ کیتھولک ازم پر گرمجوشی سے عمل پیرا نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مذہبی احتساب کے ادارے نے اس کے والدین کو اس الزام کے تحت قتل کروا دیا تھا کہ وہ خفیہ طور پر یہودیت پر عمل پیرا تھے' ان کی لاشوں کو قبروں سے نکال لیا گیا' ان کی ہڈیاں نذر آتش کر دی گئیں اور ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ الورو یہودیت کے ساتھ معمولی سا تعلق رکھنے سے بھی لاچار ہو گیا تو وہ ایک مذہبی جہنم میں رہنے پر مجبور ہو گیا۔ ستر برس کی عمر میں مذہبی عدالت نے اسے اس جرم میں قید کر دیا کہ وہ حیات بعدالموت کے نظریے کو ارادتاً اور بار بار جھٹلاتا ہے۔ ''مجھے یہیں خوشحال ہونے دو'' اس نے ایک سے زیادہ مواقع پر کہا ''کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس طرف کیا ہے''۔

* لینٹ (Lent): عیسائیت میں ایسٹر سے قبل چالیس دنوں کا عرصہ' جس میں روزے رکھے جاتے ہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الورا کو مجرم ٹھہرائے جانے سے اس کا داماد فرینڈ وڈی روجس (1541ء-1465ء) جو کہ المیہ رومانی ڈرامے La Celestina کا مصنف تھا' مشتبہ قرار پایا۔ چنانچہ اس نے ظاہری طور پر عیسائیت کو اپنا لیا لیکن پہلی مرتبہ 1499ء میں شائع ہونے والی کتاب La Celestina میں ہم تعیش آمیز زندہ دلی کے نیچے کمزور سا سیکولرازم پاتے ہیں۔ اس میں خدا کہیں نہیں ہے' محبت ہی اعلیٰ ترین قدر ہے' بلکہ جب محبت مرتی ہے تو دنیا ایک خرابہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ڈرامے کے اختتام پر پلیبر یو اپنی بیٹی کی خودکشی پر گریہ وزاری کرتا ہے' جو اکیلی اس کی زندگی کو معنویت دیتی تھی۔ ''اے دنیا' اے دنیا'' وہ کہتا ہے' ''جب میں نوجوان تھا تو میرا خیال تھا کہ تجھے اور تیرے کاموں کو کوئی نظام چلا رہا ہے۔'' مگر اب

> ''ایسا لگتا ہے کہ تو خطاؤں کا گورکھ دھندا ہے' ایک دہشت ناک صحرا' وحشی درندوں کا بھٹ' ایک کھیل' جس میں انسان دائروں میں گھومتا رہتا ہے..... ایک سنگلاخ میدان' سانپوں سے بھری چراگاہ' ایک پربہار مگر بے ثمر باغ' تفکرات اور پریشانیوں کی بہار' آنسوؤں کا دریا' آلام کا سمندر' ایک اکارت امید''۔

پرانے عقیدے پر عمل نہ کرنے پر مجبور' نئے عقیدے کی مذہبی عدالت کی سفاکی سے بیگانگی کا شکار ہو کر روجس ایک ایسی ناامیدی و مایوسی میں گھر چکا تھا جو نہ تو کوئی معنویت پا سکتی تھی' نہ نظم اور نہ کوئی حتمی قدر۔

جابرانہ جدیدیت کا نتیجہ:

فرڈیننڈ اور ازابیل جو آخری کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے وہ یہ تھا کہ یہودیوں کو متشکک بے عقیدہ بنایا جائے۔ تاہم اپنی ساری کہانی میں ہم جانیں گے کہ جس قسم کا جبر واستبداد وہ کر رہے تھے' وہ الٹ نتائج پیدا کرتا ہے۔ لوگوں کو ان کی مرضی کے برخلاف مروجہ نظریے کی قبولیت پر مجبور کرنا ایسی سرگرمیوں اور نظریات کو جنم دیتا ہے' جو کہ خود جبر کرنے والوں کے لیے انتہائی ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔ فرڈیننڈ اور ازابیل جارح قسم کے جدیدیت پھیلانے والے تھے' جو کہ تمام منحرفین کو دبا دینا چاہتے تھے' مگر ان کی سختیاں ایک خفیہ زیرزمین یہودی تنظیم کی تشکیل اور یورپ میں سیکولرازم اور دہریت کے پہلے اعلانات کا پیش خیمہ بنیں۔ بعدازاں کچھ عیسائی اس قسم کے مذہبی جبر واستبداد سے اتنے متنفر ہو گئے کہ وہ بھی تمام مذاہب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر یقین گنوا بیٹھے۔ تاہم سیکولرازم بھی اتنا ہی سفاک نکلا اور بیسویں صدی کے دوران ترقی کے نام پر سیکولرازم کا اطلاق عسکری بنیاد پرستی کے ابھار کا ایک اہم عامل ہے' جو کہ بعض اوقات متعلقہ حکومت کے لیے بھی ہلاکت انگیز ثابت ہوا ہے۔

میرانو یہودی: انوکھے نظریات کے پرچارک:

1492ء میں عیسائی ہونے سے انکار کرنے والے 80000 یہودیوں کو پرتگال کے شاہ جوآلو دوم نے پناہ دی۔ انہی یہودیوں اور ان کی اولادوں میں ہم دہریت کی سب سے زیادہ واضح اور ڈرامائی مثالیں پاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہودی اپنے عقیدے کو باقی رکھنے کے بارے میں ناامیدی کے ساتھ خواہش کرتے تھے' گو کہ ایسا کرنا یا تو دشوار یا ناممکن پاتے تھے کیونکہ وہ کسی جامع عباداتی نظام کے حامل نہیں تھے۔ 1492ء میں پرتگال فرار ہو جانے والے یہودی سپینی کنورسوں سے زیادہ سخت جان تھے: انہوں نے اپنا عقیدہ چھوڑنے کی بجائے جلاوطنی قبول کر لی۔ جب 1495ء میں مینوئل اول بادشاہ بنا تو اس کے ساس سسر فرڈیننڈ اور ازابیل نے اسے مجبور کیا کہ وہ اپنے ملک میں آباد یہودیوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرے لیکن اس نے مفاہمت کی روش اپناتے ہوئے انہیں ایک نسل کے لیے احتساب سے رعایت دلوا دی۔ ان پرتگالی میرانوؤں کے پاس ایک زیرزمین تنظیم بنانے کے لیے پچاس برس کی مہلت تھی' جس میں ایک راسخ العقیدہ اقلیت نے خفیہ طور سے یہودیت پر عمل کرنا جاری رکھا اور دوسروں کو واپس پرانے عقیدے کی طرف لانے کی کوشش کی۔

تاہم وہ یہودیت پذیر (Judaizing) میرانو باقی یہودی دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے کیتھولک تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور ان کے تخیلات عیسائی علامتوں اور نظریوں سے معمور تھے۔ وہ اکثر و بیشتر عیسائی اصطلاحوں میں یہودیت کے بارے میں سوچتے اور بات کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ان کا عقیدہ تھا کہ انہیں عیسیٰؑ کی بجائے موسیٰؑ کا قانون ''محفوظ'' کر چکا ہے جبکہ یہ تصور یہودیت میں کوئی معنویت نہیں رکھتا تھا۔ وہ یہودی قانون کو فراموش کر چکے تھے اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا ان کا یہودیت کا فہم گھٹتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو یہودیت کے حوالے سے ان کا واحد وسیلۂ معلومات سامیت دشمن عیسائیوں کی تحریریں ہوتی تھیں۔ اس طرح وہ جس عقیدے پر عمل پیرا تھے' وہ نہ سچی یہودیت تھی اور نہ سچی عیسائیت۔ ان کا مسئلہ آج کی ترقی پذیر دنیا کے لوگوں جیسا نہیں تھا۔ آج کے لوگ تو مغربی کلچر کا محض سطحی فہم ہی رکھتے ہیں مگر ان کے روایتی طرز زندگی کو جدیدیت نے اس انداز سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متاثر کیا ہے کہ پرانے طرز زندگی کے مطابق جینے سے قاصر ہیں۔ پرتگال کے میرانو یہودیوں نے بھی اس سے ملتی جلتی بیگانگی کا تجربہ کیا۔ انہیں ایک ایسے جدید کلچر کو قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تھا' جو کہ ان کی داخلی ذات سے ہم آہنگ نہیں تھا۔

سولہویں صدی کے اختتام پر کچھ یہودیوں کو جزیرہ نمائے آئبیریا سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ کچھ یہودی پہلے ہی سپینی نوآبادیوں اور جنوبی فرانس میں آباد ہو چکے تھے' لیکن وہاں انہیں اب بھی اپنے عقیدے پر عمل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ تاہم سترہویں صدی کے دوران یہودیت پذیر میرانو وینس' ہیمبرگ اور ___ بعدازاں ___ لندن جیسے شہروں میں آباد ہو گئے' جہاں وہ یہودیت کی طرف کھلم کھلا واپس آ سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ احتساب سے فرار ہونے والے آئبیریائی پناہ گزین ایمسٹرڈیم میں آباد ہو گئے' جو کہ ان کا نیا یروشلم بن گیا۔ ہالینڈ (The Netherlands) یورپ میں سب سے زیادہ روادار ملک تھا۔ وہ ایک ری پبلک تھا' ایک ترقی پذیر تجارتی سلطنت کا حامل تھا' جو سپین سے اپنی آزادی کی جدوجہد کے دوران آئبیریائی اقدار سے متضاد ایک لبرل تشخص تخلیق کر چکا تھا۔ یہودی 1657ء میں ری پبلک کے مکمل شہری بن گئے۔ یہاں وہ یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح گھیٹوؤں (Ghettoes)* میں نہیں رہتے تھے۔ ولندیزیوں نے یہودیوں کی تجارتی مہارت کی قدر کی اور یہودی غیر یہودیوں سے آزادانہ میل جول رکھتے ہوئے نمایاں کاروباری بن گئے۔ وہ ایک شاندار معاشرتی زندگی' ایک عمدہ تعلیمی نظام اور ایک فروغ پذیر طباعتی صنعت کے حامل تھے۔

بلاشبہ بہت سے یہودی ایمسٹرڈیم کے معاشرتی اور معاشی مواقع کی وجہ سے وہاں آئے تھے تاہم کافی تعداد یہودیت پر پوری طرح عمل کرنے کی مشتاق تھی۔ لیکن ایسا کرنا سہل نہیں تھا۔ آئبیریا سے آنے والے ''نئے یہودیوں'' کو عقیدے کی تعلیم دوبارہ حاصل کرنا پڑی کیونکہ وہ اس سے زیادہ تر لاعلم ہی تھے۔ ربیوں کی یہ مبارزت طلب ذمہ داری تھی کہ ان کی حقیقی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے روایت پر مفاہمت کیے بغیر انہیں رعائتیں دیتے ہوئے ان کی یہودیت کی طرف واپسی میں رہنمائی دیں۔ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ بیشتر یہودی اس مرحلے سے خوش اسلوبی کے ساتھ گزر گئے گو کہ ابتدا میں تھوڑا بہت تناؤ پیدا ہوا تاہم انہوں نے اپنے آباؤاجداد کے عقیدے کی طرف واپسی میں مسرت محسوس کی۔

---

* جلاوطنی کے زمانوں میں یہودی جہاں کہیں بھی آباد ہوا کرتے تھے' ایک مخصوص محصور علاقے میں رہتے تھے' جہاں دوسرے عقائد کے لوگ نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسے علاقوں کو گھیٹو (Ghetto) کہا جاتا تھا۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک اہم مثال اوروبیو ڈی کیسٹرو کی تھی۔ وہ مابعد الطبیعیات کا ڈاکٹر اور پروفیسر تھا' سپین میں رہ چکا تھا اور وہاں خفیہ طور پر برسوں یہودیت پر عمل کرتا رہا تھا۔ احتسابی ادارے نے اسے گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا تھا' پھر وہ دوبارہ عیسائی بنایا گیا اور یوں وہ دل سے عیسائی ہوئے بغیر تولوس میں طب کی تدریس کرتا رہا۔ آخرکار وہ اس زندگی سے تنگ آ گیا اور 1650ء کے عشرے میں ایمسٹرڈیم پہنچ گیا۔ وہاں وہ یہودیت کا ایک زبردست مبلغ اور دوسرے واپس آنے والے میرانوؤں کا اتالیق بن گیا۔

تاہم اوروبیو ایک پورے طبقے کی ترجمانی کرتا تھا' جو کہ روایتی یہودیت کے قوانین اور روایات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے۔ وہ انہیں احمقانہ اور بوجھل تصور کرتے تھے۔ وہ آئبیریا میں جدید سائنس مثلاً منطق' ریاضی' طبیعیات اور طب کا مطالعہ کر چکے تھے' جیسا کہ خود اوروبیو جدید سائنسی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ لیکن اوروبیو نے ان کے حوالے سے لکھا: ''ان میں جھوٹی شان' غرور اور تکبر بہت زیادہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تمام علوم مکمل طور پر حاصل کر لیے ہیں۔''

> وہ یہ سوچتے تھے کہ اگر انہوں نے مقدس قانون کے تعلیم یافتہ افراد سے تحصیل علم پر رضامندی ظاہر کی تو ان کا عالمانہ رتبہ گھٹ جائے گا اور مقدس قانون کو جاننے والے تو عظیم سائنس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس سے اختلاف کریں گے۔

یہودی جو کہ کئی عشروں سے مذہبی علیحدگی کے عالم میں جی رہے تھے' اپنی عقلی قوتوں پر انحصار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی عباداتی نظام تھا' نہ اجتماعی مذہبی زندگی اور نہ ہی توریت کے ''مقدس قوانین'' کی رسوماتی اطاعت کا کوئی تجربہ۔ جب بالآخر وہ پہلے پہل ایمسٹرڈیم پہنچے تو وہاں انہوں نے اپنے آپ کو ایک مکمل طور پر فعال کمیونٹی میں پایا' فطری بات ہے کہ وہ تو چکرا سے گئے تھے۔ کسی خارجی فرد کو توریت کی پہلی پانچ کتابوں کے 613 احکامات آمرانہ اور مبہم دکھائی دیتے تھے۔ کچھ احکامات تو متروک ہو چکے تھے کیونکہ ان کا تعلق ارض مقدس پر کاشت کاری یا ''معبد'' میں عبادت کرنے سے تھا اور وہ جلاوطنوں کے لیے ناقابل عمل تھے۔ دیگر احکامات' مثلاً کھانے کے سخت ضوابط اور پاکیزگی کے قوانین' تو لازماً ظالمانہ لگتے تھے اور مہذب پرتگالی میرانوؤں کے لیے تو لایعنی تھے کیونکہ وہ عقلی انداز میں سوچنے کے عادی تھے اور ربیوں کی توضیحات کو قبول کرنا دشوار پاتے تھے۔ ابتدائی عیسوی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدیوں میں ترتیب دیا جانے والا مرموز زبانی قانون حلاقہ (Halakhah) تو بہت ہی زیادہ غیر عقلی اور آمرانہ لگتا تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں تو بائبلی احکامات بھی شامل نہیں تھے۔

تاہم توریت اپنی ہی متھوس کی حامل تھی۔ لیوریائی قبالہ کی طرح وہ جلاوطنی کا مداوا تھی۔ جب بنی اسرائیل کو چھٹی صدی قبل از مسیح میں بابل جلاوطن کر دیا گیا' ان کے معبد کو تباہ کر ڈالا گیا اور ان کی مذہبی زندگی برباد ہو گئی تو توریت کا متن ایک نیا ''معبد'' بن گیا' جس کے ذریعے جلاوطن لوگ الوہی موجودگی کا احساس پاتے تھے۔ دنیا کو پاکیزہ اور غیر پاکیزہ' مقدس اور غیر مقدس اشیاء میں تقسیم کرنے کا عمل ایک بکھری ہوئی دنیا کو تخیلاتی طور پر دوبارہ منظم کرنا تھا۔ یہودیوں نے جلاوطنی میں جانا کہ توریت کے مطالعے نے انہیں عمیق مذہبی تجربے سے ہم کنار کیا ہے۔ یہودی جدید لوگوں کی طرح متن کو صرف جانکاری نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے گہرے مطالعے نے' اور اس پر بحث مباحثے نے انہیں الوہی ہستی کے جلوؤں سے فیض یاب کروایا۔ توریت خدا کا کلام تھی' اس میں جذب ہو کر' خدا کا موسیٰ" سے خود مخاطب ہو کر دیئے گئے کلام کو یاد کر کے اور بآواز بلند پڑھ کر وہ الوہی ہستی کو اپنی ہستیوں کے اندر لا رہے تھے اور ایک مقدس اقلیم میں داخل ہو رہے تھے۔ توریت ایک علامت بن چکی تھی' جہاں انہوں نے شخینا کو پایا۔ احکامات (Commandments) پر عمل نے ان کی زندگیوں کی چھوٹی چھوٹی جزئیات میں الوہی ہدایت کو سمو دیا۔ وہ سبت کے دن کھانے' نہانے دھونے' عبادت کرنے یا فقط اپنے خاندانوں کے ساتھ آرام کرنے میں ان احکامات کی پابندی کرتے تھے۔

میرانو جس چیز کو اپنی زندگیوں کی اساس بنا چکے تھے' اس کی عقلی تفہیم فوری طور پر ممکن نہیں تھی۔ اس قسم کا اساطیری اور مسلکی عمل اجنبی اور انجانا تھا۔ اوروبیو نے شکایت کی کہ کچھ نئے یہودی ''ناقابل بیان دہرے'' بن چکے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ ہمارے بیسویں صدی کے شعور کے مطابق وہ لوگ دہرے نہیں تھے کیونکہ وہ ایک مادرائی خدا پر یقین رکھتے تھے' تاہم وہ بائبل والا خدا نہیں تھا۔ میرانوؤں نے ایک مکمل طور پر عقلیت پسندانہ عقیدہ تشکیل دے لیا تھا' بالکل ویسے ہی جیسے کہ روشن خیال فلسفیوں نے ڈی ازم (Deism) * کو وضع کیا تھا۔ یہ خدا تمام موجودات کا اولین سبب (First Cause) تھا' جس کے وجود کو ارسطو نے منطقی انداز میں ثابت کیا تھا۔ وہ خدا ہمیشہ عقلی انداز میں عمل کرتا تھا۔ وہ انسانی تاریخ میں غیر یقینی انداز میں مداخلت نہیں کرتا تھا' فطرت کے قوانین کو انوکھے معجزوں کے ذریعے تبدیل نہیں کرتا تھا۔ اسے کسی خصوصی ضابطۂ قوانین کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی' کیونکہ فطرت کے قوانین ہی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر شخص کے لیے کافی تھے۔ انسانی عقل فطری طور پر اس قسم کے خدا کے بارے میں سوچنے پر مائل تھی اور درحقیقت ماضی میں یہودی اور مسلمان فلسفی اس سے کافی ملتے جلتے خدا کا تصور پیش کر چکے تھے۔ تاہم اسے کبھی عمومی طور پر مانا نہیں گیا تھا۔ وہ مذہبی اعتبار سے سودمند تھا بھی نہیں' کیونکہ یہ امر بھی یقینی نہیں تھا کہ اولین سبب کو انسان کی موجودگی کا علم بھی تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ کاملیت کے فقدان کی وجہ سے وہ کسی شے پر بھی غور نہیں کر سکتا تھا۔ اس نوع کا خدا انسانی درد یا رنج و الم پر کہنے کو کچھ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے لیے انسان کو اساطیری اور رسوماتی روحانیت کی ضرورت ہوتی ہے' جو کہ میرانوؤں کے لیے آشنا نہیں تھی۔

ایمسٹرڈیم میں یہودیت کی طرف لوٹنے والے میرانو حلاقہ روحانیت کو سمجھنے کے کسی نہ کسی حد تک اہل تھے۔ تاہم بعضوں کے لیے تبدیلی ناممکن ہوگئی تھی۔ ان میں سے ایک سب سے زیادہ المناک مثال یورائیل ڈاکوسٹا کی تھی' جو ایک کنورسو خاندان میں پیدا ہوا تھا اور اسے یسوعیوں (Jesuits) نے تعلیم دی تھی' تاہم آگے چل کر اس نے جانا کہ عیسائیت تو جابرانہ اور سفاکانہ ہے نیز انجیل سے کوئی ربط نہ رکھنے والے انسان ساختہ قوانین اور نظریوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکوسٹا یہودی صحیفوں کی طرف پلٹا اور اس نے اپنے لیے یہودیت کا ایک انتہائی مثالی عقلیت پسندانہ تصور وضع کر لیا۔ جب وہ سترہویں صدی کے اوائل میں ایمسٹرڈیم پہنچا تو اسے یہ جان کر بہت شدید دھچکا لگا' یا اس کا دعویٰ یہی ہے' کہ معاصر یہودیت بھی کیتھولک ازم کی طرح انسان ساختہ ہی ہے۔

حالیہ علماء نے ڈاکوسٹا کے خیالات پر سوال اٹھائے ہیں اور اس امر پر بحث و تمحیص کی ہے کہ تقریباً یقینی طور پر وہ حلاقائی یہودیت کے کسی روپ سے پہلے آگاہ ہوا ہوگا' اور وہ بھی جزوی طور پر۔ ان کا کہنا ہے کہ اسے شاید ادراک نہیں تھا کہ معمول کی یہودی حیات پر حلاقہ کے کتنے گہرے اثرات تھے۔ تاہم ڈاکوسٹا کے ایمسٹرڈیم میں یہودیت کو سمجھنے میں مکمل نااہلی پر کوئی شبہ نہیں کیا جا رہا۔ اس نے یہودیوں کے اخروی حیات کے نظریے اور یہودی قانون پر تنقید کرنے والی ایک کتاب لکھی' یہ اعلان کرتے ہوئے کہ وہ صرف انسانی عقل اور فطرت کے قوانین پر ایمان رکھتا ہے۔ ربیوں نے ڈاکوسٹا کو ذات باہر قرار دے دیا اور اس نے بڑی بے چارگی کے ساتھ تنہا زندگی بسر کی۔ بالآخر وہ ٹوٹ گیا اور تائب ہوگیا اور یوں اسے

* اٹھارہویں صدی میں عیسائی دنیا میں "فطری مذہب" کی تحریک چلی' جو کہ خدا پر ایمان رکھنے کو تو درست تسلیم کرتی تھی لیکن عیسائیت میں رواج پا جانے والے توہمات کو رد کرتی تھی۔ اس تحریک نے وحی کو بھی مسترد کر دیا تھا۔ (مترجم)

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برادری میں دوبارہ شامل کر لیا گیا۔ تاہم ڈاکوسٹا نے حقیقتاً اپنے خیالات تبدیل نہیں کیے تھے۔ اس نے ان رسوم کے مطابق زندگی بسر کرنے کو ناممکن پایا' جو کہ اسے عقلی اعتبار سے لایعنی محسوس ہوتی تھیں اور اسے بعد میں بھی دو مرتبہ ذات باہر کیا گیا۔ آخرکار 1640ء میں ٹوٹ کر' بکھر کر' مایوس ہو کر اس نے سر میں گولی مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔

ڈاکوسٹا کے المیے نے ظاہر کر دیا کہ یورپ میں مذہبی زندگی کا کوئی سیکولر متبادل اس وقت تک موجود نہیں تھا۔ آپ کسی دوسرے عقیدے کو تو اپنا سکتے تھے لیکن جب تک آپ ایک غیر معمولی انسان نہ ہوتے (ڈاکوسٹا غیر معمولی نہیں تھا)' اس وقت تک آپ کسی مذہبی برادری سے باہر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ جن برسوں میں ڈاکوسٹا ذات باہر تھا' اس دوران وہ بالکل اکیلا رہتا تھا' یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کا دھتکارا ہوا اور گلیوں میں بچے اس پر آوازے کستے تھے۔

اس کے مساوی قابل ذکر' لیکن کم دلدوز مثال جوآن ڈاپارڈو کی تھی' جو 1655ء میں ایمسٹرڈیم پہنچا اور ضرور ڈاکوسٹا کی بدنصیبی پر غور کرتا ہوگا۔ وہ پرتگال میں بیس برس تک زیرزمین یہودی تنظیم کا باوفا رکن رہا تھا' تاہم 1645ء کے آغاز میں وہ ڈی ازم کے میرانو روپ سے آگاہ ہوا۔ پارڈو کوئی ذہین یا منضبط مفکر نہیں تھا بلکہ اس کا تجربہ ہم پر یہ امر واضح کرتا ہے کہ صرف عقل پر بھروسہ کرتے ہوئے یہودیت جیسے کسی اعترافی مذہب پر کاربند رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ ایک عباداتی زندگی' ایک مسلک اور ایک اساطیر کے بغیر پارڈو یہی نتیجہ اخذ کر سکتا تھا کہ ''خدا'' تو بس فطرت کے قوانین ہی کے مماثل ہے۔ اس کے لیے تو ''یہودیت'' کا مطلب رفاقت تھا' کیونکہ اس نے اپنی زندگی کو معنویت دینے والے ایک منظم گروہ میں گہری قربت کا تجربہ ہی کیا تھا۔ اس کے اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ ایمسٹرڈیم پہنچا اور ربیوں کا نشانۂ تنقید بن گیا تو اس پر بھی وہ یہودی برادری کے اندر ہی رہنے کا خواہش مند تھا۔ ڈاکوسٹا کے مانند پارڈو نے بھی برسوں اپنی پسند کے مطابق عبادت کرنے اور سوچنے کے حق کو برقرار رکھا۔ وہ ''یہودیت'' کا ایک اپنا ہی تصور رکھتا تھا اور جب اس کا اصل یہودیت سے ٹکراؤ ہوا تو وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ پارڈو نے اپنے اعتراضات کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ یہودی ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ خدا نے صرف انہیں کو منتخب کیا؟ یہ خدا کیا ہے؟ کیا خدا کو سفاکانہ اور غیر عقلی قوانین کا ایک مجموعہ دینے والی شخصیت کے طور پر سوچنے کی بجائے اولین سبب کی حیثیت سے سوچنا زیادہ منطقی نہیں؟ پارڈو مجسم ندامت بن کر رہ گیا۔ ربی آئبیریا سے آنے والے نئے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہودیوں کو دوبارہ تعلیم دینے کی کوشش کر رہے تھے (جن میں اکثر لوگ پارڈو جیسے خیالات رکھتے تھے) اور ربی اس کے ڈی ازم کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ 14 رفروری 1657ء کو اسے ذات باہر کر دیا گیا۔ تاہم اس نے برادری کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

یہ دو مکمل طور پر متضاد نظریات کا ٹکراؤ تھا۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے پارڈو اور ربی دونوں ہی درست تھے۔ پارڈو روایتی یہودیت کا کوئی شعور نہیں رکھتا تھا' وہ ذہن کے اساطیری سانچے کھو چکا تھا نیز اسے مسلک اور رسوم کے ذریعے عقیدے کی عمیق تر معنویت تک رسائی پانے کا کبھی موقع میسر نہیں آیا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ اپنی عقل اور بصیرت پر بھروسہ کیا تھا اور اب وہ انہیں ترک کرنے سے قاصر تھا۔ تاہم ربی بھی اپنی جگہ درست تھے۔ پارڈو کا ڈی ازم ان کے علم میں آنے والے یہودیت کے کسی روپ سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ دراصل پارڈو ''سیکولر یہودی'' بننا چاہتا تھا مگر سترہویں صدی میں ایسا کوئی زمرہ وجود نہیں رکھتا تھا اور نہ تو پارڈو اور نہ ہی ربی اس قابل تھے کہ اسے واضح طور پر وضع کر سکیں۔ وہ ایک جدید اور مکمل طور پر عقلیت پسندانہ تصور جہاں (ورلڈ ویو) اور عباداتی نظام و اسطورہ کی تشکیل دی ہوئی ذہنیت کے مابین تصادم کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

جیسا کہ اکثر ہوتا ہے' دونوں فریقوں نے بہت اچھا طرز عمل نہیں اپنایا۔ پارڈو ایک متکبر انسان تھا اور وہ ربیوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ ایک موقع پر تو اس نے سینا گوگ میں تلوار لہرا کر ربیوں پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ربیوں نے بھی مہذبانہ طرز عمل نہیں اختیار کیا۔ انہوں نے پارڈو کے پیچھے ایک جاسوس لگا رکھا تھا جو انہیں باقاعدگی سے اطلاعات دیتا تھا کہ پارڈو کے خیالات ہنوز ریڈیکل ہیں۔ ذات باہر کر دیئے جانے کے بعد اس کو یقین ہو گیا کہ تمام مذاہب مہمل ہیں اور فقط عقل کو ہی سچ کا واحد حکم ہونا چاہیے۔ کسی کو علم نہیں کہ پارڈو کا انجام کیا ہوا۔ اسے برادری سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا اور اس نے انٹیورپ میں پناہ لے لی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے کیتھولک چرچ سے بھی صلح کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ایسا ہی تھا تو یہ ایک مایوسانہ اقدام تھا جو ایک مرتبہ پھر عیاں کر دیتا ہے کہ سترہویں صدی میں ایک عام انسان کے لیے کسی مذہب کی حدود سے باہر زندہ رہنا کس طرح ناممکن تھا۔

پارڈو اور ڈاکوسٹا دونوں ہی جدید روح کے پیشرو تھے۔ ان کی کہانیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اعترافی مذہب کی متھوس عبادت اور رسوم کی ان روحانی ریاضتوں کے بغیر کھوکھلی ہوتی ہے' جو کہ ذہن کے زیادہ وجدانی حصوں کو بیدار کرتی ہیں۔ تنہا عقل صرف ایک کمزور سے ڈی ازم کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدا کر سکتی ہے' جس کو جلد ہی ترک کر دیا جاتا ہے کیونکہ جب ہم رنج والم سے دوچار ہوتے ہیں یا کسی مشکل میں ہوتے ہیں تو یہ ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ پارڈو اور ڈاکوسٹا اس لیے اپنا عقیدہ گنوا بیٹھے تھے کیونکہ انہیں اس پر عمل کرنے کے مواقع دستیاب نہیں تھے لیکن ایمسٹرڈیم کے ایک اور میرانو یہودی نے واضح کیا تھا کہ عقل پر عمل اس قدر جاذب اور ولولہ انگیز بن سکتا ہے کہ اسطورہ کی حاجت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا مراقبے کا واحد مرکز بن جاتی ہے اور خدا کی بجائے انسان ہر شے کا معیار بن جاتا ہے۔ عقل پر عمل کسی غیر معمولی ذہانت کے حامل مرد یا عورت کو ایک طرح کے صوفیانہ جلوے کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ امر بھی جدید تجربے کا حصہ بن چکا ہے۔

پہلا سیکولر یہودی فلسفی:

جس زمانے میں ربیوں نے پارڈو کو ذات باہر کیا تھا' ٹھیک اسی زمانے میں انہوں نے باروخ سپائنوزا' جس کی عمر صرف 23 برس تھی' کے خلاف بھی مقدمے کا آغاز کیا۔ پارڈو کے برعکس سپائنوزا ایمسٹرڈیم ہی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے والدین میں پرتگال میں یہودیت پذیر میرانوؤں کی حیثیت سے رہتے تھے اور جب ایمسٹرڈیم پہنچے تو انہوں نے آرتھوڈوکس یہودیت کو باقاعدہ اختیار کر لیا تھا۔ اسی لیے سپائنوزا کو کبھی سزا نہیں دی گئی۔ وہ ہمیشہ لبرل ایمسٹرڈیم میں رہا تھا اور غیر یہودی دنیا کی دانش ورانہ زندگی تک رسائی رکھتا تھا اور اسے اپنے عقیدے پر بغیر کسی مداخلت کے عمل کرنے کا موقع دستیاب تھا۔ اس نے شہرۂ آفاق کیٹر توریت سکول (Keter Torah School) میں روایتی تعلیم حاصل کی تھی' تاہم وہ جدید ریاضی' فلکیات اور طبیعیات بھی پڑھ چکا تھا۔ یہ طے تھا کہ سپائنوزا کاروباری زندگی اپنائے گا اور وہ راسخ العقیدہ لگتا تھا لیکن 1655ء میں' پارڈو کی ایمسٹرڈیم میں آمد کے تھوڑا عرصہ بعد' اس نے سینا گوگ میں جا کر عبادت کرنا ترک کر دیا اور تشکیک کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے جانا تھا کہ انجیلی متن میں تضادات موجود ہیں' جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ الوہی نہیں بلکہ انسانی ہے۔ اس نے وحی کے امکان کو مسترد کر دیا اور دلیل دی کہ ''خدا'' تو بس فطرت کی کلیت کا نام ہے۔ آخر کار 27 رجولائی 1656ء کو ربیوں نے سپائنوزا کو ذات باہر کرنے کی سزا کا اعلان کر دیا' جبکہ پارڈو کے برعکس سپائنوزا نے برادری میں رہنے کی درخواست نہیں کی۔ وہ تو نکالے جانے پر خوش تھا اور مستحکم مذہب کی رسائی سے باہر کامیاب زندگی گزارنے والا یورپ کا پہلا انسان بن گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پارڈو یا ڈاکوسٹا کے مقابلے میں سپائنوزا کے لیے غیر یہودی دنیا میں جینا زیادہ آسان تھا۔ وہ ایک نابغہ (Genius) اور اپنے مؤقف کو واضح طور پر بیان کرنے کا اہل تھا نیز ایک حقیقتاً آزاد انسان ہونے کی حیثیت سے ناگزیر تنہائی میں حوصلہ برقرار رکھ سکتا تھا۔ ہالینڈ اس کی جنم بھومی تھا اور وہاں اس کے طاقتور سرپرست موجود تھے' جو اسے معقول الاؤنس دیتے تھے' تاکہ اسے پستی اور غربت میں نہ جینا پڑے۔ اکثر کہا جاتا ہے سپائنوزا روزی کمانے کے لیے عدسے بنایا کرتا تھا' یہ بات بالکل غلط ہے' ایسا وہ صرف بصریات میں دلچسپی کی وجہ سے کیا کرتا تھا۔ اس نے تو اپنے زمانے کے کچھ ممتاز سائنس دانوں' فلسفیوں اور سیاست دانوں سے دوستیاں استوار کی ہوئی تھیں۔ اس پر بھی وہ ایک الگ تھلگ شخصیت ہی رہا۔ یہودی اور غیر یہودی اس کی لامذہبی کو صدمہ انگیز اور بدحواس کر دینے والا پاتے تھے۔

تاہم سپائنوزا کی دہریت میں بھی روحانیت تھی' کیونکہ وہ دنیا ہی کو الوہی مانتا تھا۔ اس کے تصور کے مطابق خدا دنیاوی حقیقت کے اندر موجود تھا' جس نے سپائنوزا کو رعب و دبدبے اور تحیر سے معمور کر دیا۔ وہ فلسفیانہ مطالعے اور فکر کو عبادت کی ایک صورت سمجھتا تھا' جیسا کہ اس نے اپنی کتاب (1661ء) Short Treatise on God میں توضیح کی تھی کہ خدا کوئی ایسی شے نہیں جسے جانا جائے بلکہ وہ ہماری فکر کا اصول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم حاصل کرنے سے جو مسرت ہم نے پائی وہ خدا کی دانشورانہ محبت تھی۔ سپائنوزا اس امر پر یقین رکھتا تھا کہ ایک سچا فلسفی وجدانی علم' بصیرت کی روشنی حاصل کرتا ہے' جو اس کی حاصل کردہ ساری منطقی معلومات کو مٹا دیتے ہیں اور جو ایک ایسی واردات (Experience) ہوتے ہیں' جسے سپائنوزا خدا یقین کرتا تھا۔ وہ اس واردات کو ''سعادت'' (Beatitude) کہتا تھا: اس کیفیت میں فلسفی کو ادراک ہوتا ہے کہ وہ خدا سے لاینفک ہے۔ یہ ایک صوفیانہ فلسفہ تھا' جسے جان آف دی کراس اور ٹیریسا آف ایولا کی وضع کردہ روحانیت کا ایک عقلیت پسندانہ روپ سمجھا جا سکتا تھا' تاہم سپائنوزا اس نوع کی مذہبی بصیرت کا روادار نہیں تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک ماورائی خدا کی آرزو انسانوں کو خود اپنی فطرت سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ بعد میں آنے والے فلسفیوں نے سعادت کے کیف کے لیے سپائنوزا کی جستجو کو پیچیدہ پایا اور انہوں نے اس کے تصور خدا کو بھی مسترد کر دیا۔ اس کے باوجود سپائنوزا اس دنیا پر دھیان جمانے اور مافوق الفطرت کو رد کرنے کی وجہ سے یورپ کا اولین سیکولر فلسفی بن گیا۔

بیشتر جدید لوگوں کے مانند سپائنوزا تمام رسمی مذاہب کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کو ذات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باہر کیے جانے کے واقعے کو مدنظر رکھ کر دیکھیں تو اس کی مذہب کو ناپسند کرنے کی روش مشکل ہی سے حیرت انگیز لگتی ہے۔ اس نے ان مذاہب کو ''ضعیف الاعتقادی اور تعصبات کا آمیزہ'' اور ''لایعنی اسرار کا طومار'' قرار دے کر رد کر دیا۔ اس نے اپنے آپ کو انجیلی متن میں مستغرق کرنے کے ذریعے نہیں بلکہ عقل کے آزادانہ استعمال سے کیف و سرور حاصل کیا اور نتیجتاً اس نے انجیل کا جائزہ سراسر معروضی انداز میں لیا۔ سپائنوزا نے باصرار کہا کہ انجیل کا مطالعہ اس کو الوہی تصور کرتے ہوئے نہیں بلکہ کسی بھی دوسرے متن کی طرح کیا جانا چاہیے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے انجیل کے تاریخی پس منظر' ادبی محاسن اور مصنفین کے مسئلے پر غور کرتے ہوئے اس کا مطالعہ سائنسی انداز میں کیا۔ اس نے اپنے سیاسی نظریات اخذ کرنے کے لیے بھی انجیل کو استعمال کیا۔ سپائنوزا یورپ کے ان اولین افراد میں سے ایک تھا جنھوں نے ایک سیکولر جمہوری ریاست کے نظریے کو فروغ دیا' جو کہ مغربی جدیدیت کا ایک امتیازی نشان بن گیا۔ اس نے دلیل دی کہ جب مذہبی پیشواؤں نے اسرائیل کے بادشاہوں سے زیادہ قوت حاصل کر لی تو ریاست کے قوانین تعزیری اور امتناعی ہو گئے۔ بنیادی طور پر سلطنت اسرائیل مذہبی (تھوکریٹک) ہی رہی تھی تاہم سپائنوزا کی رائے میں چونکہ خدا اور عوام ایک ہی ہیں' اس لیے عوام کی آواز سب سے برتر ہے۔ جب مذہبی پیشواؤں نے اقتدار پر قبضہ جما لیا تو خدا کی آواز مزید نہ سنی جا سکی۔ تاہم سپائنوزا عوام پسند (Populist) نہیں تھا۔ بیشتر ماقبل جدید فلسفیوں کی طرح وہ بھی ایک اشرافی (Elitist) تھا' جس کو یقین تھا کہ عام لوگ عقلیت پسندانہ فکر کو سمجھنے کے اہل نہیں تھے۔ انہیں تھوڑی سی بصیرت عطا کرنے کے لیے مذہب کی کسی صورت کی حاجت ہوتی ہے' تاہم اس مذہب کو لازماً اصلاح شدہ اور کسی نام نہاد الوہی قانون کی بجائے انصاف' اخوت اور آزادی کے فطری اصولوں پر استوار ہونا چاہیے۔

بلاشبہ سپائنوزا جدید روح کے پیشروؤں میں سے ایک تھا اور بعدازاں وہ سیکولر یہودیوں کا ہیرو بن گیا' جنھوں نے مذہب کی چھتر چھایا سے اس کے خروج کو بہت سراہا۔ تاہم سپائنوزا کی زندگی میں کوئی یہودی اس کا پیروکار نہیں بنا' حالانکہ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے یہودی بنیادی تبدیلی کے لیے آمادہ تھے۔ عین اسی زمانے میں کہ جب سپائنوزا اپنی سیکولر عقلیت پسندی کو تشکیل دے رہا تھا' ایک ایسے مسیحا پرست ہیجان نے یہودی دنیا کو گھیرا ہوا تھا جو کہ عقل (Reason) کو فروغ دے رہا تھا' وہ جدید دور کی ان ہزاروں تحریکوں میں سے ایک تھا' جنھوں نے لوگوں کو مقدس ماضی سے الگ ہونے اور ایک مکمل طور پر نئی شے تک پہنچنے کا ایک مذہبی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راستہ مہیا کیا۔ ہم اپنی کہانی میں اسے اکثر و بیشتر پائیں گے۔ چند ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں' جو کہ جدیدیت کے سیکولر فلسفے پیش کرنے والی دانشور اشرافیہ کو سمجھنے کے اہل ہوتے ہیں' جبکہ بیشتر لوگ مذہبی ذرائع سے نئی دنیا کی طرف جاتے ہیں' جو کہ ماضی سے ایک تسلی بخش تسلسل فراہم کرتے ہیں اور جدید لوگوں کو ایک اساطیری سانچے میں مستحکم کرتے ہیں۔

گیٹو یہودیوں کی الگ دنیا:

ایسا لگتا ہے کہ سترہویں صدی کے وسط میں بہت سے یہودی نقطۂ انقطاع پر پہنچ چکے تھے۔ یورپ کے دیگر یہودیوں کو ایمسٹرڈیم کی سیرانو کمیونٹی کی سی آزادی نصیب نہیں تھی' اور سپائنوزا کی نئی ریڈیکل علیحدگی صرف اس لیے ممکن ہوئی تھی کہ اسے غیر یہودیوں سے ملنے جلنے اور نئی سائنسوں کا مطالعہ کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ عیسائی دنیا میں ہر جگہ یہودیوں کو مرکزی دھارے والے معاشرے سے الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ سولہویں صدی تک کسی یہودی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ یہودیوں کے مخصوص علاقے سے باہر آباد ہو' جسے ''گیٹو'' (Ghetto) کہا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی ناگزیر طور پر داخلیت پسندانہ زندگی گزارتے تھے۔ اس علیحدگی نے سامیت دشمن تعصب کو بڑھا دیا اور فطری طور پر یہودیوں نے متعصب غیر یہودی دنیا کو تلخی اور بدگمانی سے جواب دیا۔ گیٹو ایک بالکل الگ دنیا بن گیا۔ یہودیوں کے اپنے سکول' اپنے سماجی اور خیراتی ادارے' اپنے حمام' قبرستان اور مذبح ہوتے تھے۔ گیٹو خودمختار ہوا کرتے تھے۔ کہیلا (Kehilla) یعنی منتخب ربیوں اور بزرگوں کی اجتماعی حکومت (Communal Government) نے یہودی قانون کے مطابق اپنی عدالتیں قائم کی ہوئی تھیں۔ نتیجتاً گیٹو ریاست کے اندر ریاست اور اپنے اندر ہی ایک دنیا بن گیا' جبکہ یہودی بیرونی غیر یہودی معاشرے سے کم ربط رکھتے تھے ــــ بلکہ اکثر تو اس کے خواہش مند بھی نہیں تھے۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ سترہویں صدی کے وسط تک بہت سے یہودی ان پابندیوں کے خلاف آواز اٹھانے لگے تھے۔ عمومی طور پر گیٹو غیر صحت بخش' غلیظ علاقے میں واقع ہوتے تھے۔ وہ ایک اونچی دیوار میں محصور ہوتے تھے' جس کا مطلب یہ نکلا کہ وہ گنجان آباد ہوتے تھے اور توسیع کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ روم یا ویانا کے وسیع تر گیٹوؤں میں بھی باغ بنانے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ رہائشی جگہ میں اضافے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ وہ موجودہ عمارتوں پر نئی منزلیں تعمیر کر لیں۔ ان عمارتوں کی بنیادیں اکثر کمزور ہوتی تھیں' جس کی وجہ سے ہر شے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منہدم ہو جایا کرتی تھی۔ وہاں آتش زنی اور بیماریاں پھیلنے کا مستقل خطرہ رہتا تھا۔ یہودیوں کو دوسروں سے مختلف لباس پہننے پر مجبور کیا جاتا تھا' وہ معاشی پابندیوں سے دوچار ہوتے تھے اور ان کے لیے پھیری لگانے اور محنت مزدوری کرنے کے علاوہ اور کوئی پیشہ نہیں تھا۔ انہیں بڑے کاروبار کرنے کی اجازت نہیں تھی چنانچہ یہودیوں کی اکثریت کا گذارا خیرات پر ہوتا تھا۔ دھوپ سے محرومی اور فطرت سے ربط نہ ہونے کی وجہ سے یہودی جسمانی اعتبار سے شکستہ ہوتے تھے۔ ذہنی اعتبار سے بھی وہ محدود ہوتے اور یورپ کی سائنسوں اور فنون سے بھی دور تھے۔ ان کے اپنے سکول اچھے تو تھے تاہم پندرہویں صدی کے بعد' جب عیسائی دنیا میں تعلیمی نصاب زیادہ لبرل ہو گیا تھا' یہودی صرف توریت اور تالمود ہی پڑھتے تھے۔ فقط اپنے صحیفوں اور ثقافتی روایات میں محو ہونے کی وجہ سے یہودیوں میں بال کی کھال نکالنے اور جزئیات پر توجہ مرکوز کرنے کا رجحان فروغ پا گیا۔

اسلامی دنیا میں یہودیوں کا مقام:

اسلامی دنیا میں یہودیوں کو اس انداز سے محدود نہیں رکھا گیا تھا۔ بلکہ انہیں عیسائیوں کی طرح ''ذمیوں'' کا درجہ حاصل تھا' جس سے انہیں شہری اور عسکری تحفظ مل گیا تھا' بشرطیکہ وہ اسلامی ریاست کی حاکمیت اور قوانین کا احترام کرتے رہیں۔ مسلمانوں نے یہودیوں پر ظلم وستم نہیں ڈھائے' اسلامی دنیا میں سامیت دشمنی کی کوئی روایت نہیں تھی اور اگرچہ ذمی دوسرے درجے کے شہری ہوتے تھے تاہم انہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی' وہ اپنے معاملات اپنے قوانین کے مطابق طے کر سکتے تھے اور مرکزی دھارے کے کلچر اور تجارت میں شمولیت کے لیے یورپ کے یہودیوں سے کہیں زیادہ آزاد تھے۔

تاہم واقعات نے ظاہر کیا کہ اسلامی دنیا میں آباد یہودیوں میں بے چینی فروغ پا رہی تھی اور وہ زیادہ آزادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ وہ 1492ء سے یورپ میں ہونے والی یکے بعد دیگرے تباہیوں کی خبریں سن رہے تھے اور 1648ء میں انہیں پولینڈ میں ہونے والے مظالم کی خبروں نے دہشت زدہ کر کے رکھ دیا۔ یہودی تاریخ میں بیسویں صدی تک ان مظالم سے زیادہ ظلم وستم کی کوئی مثال نہیں تھی۔

کوزاکوں کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام:

پولینڈ' اب یوکرین کہلانے والے' علاقے پر قابض ہوا تھا' جہاں کسانوں نے اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دفاع کے لیے گھڑ سوار دستے بنا لیے تھے۔ یہ ''کوزاک'' پولینڈ والوں اور یہودیوں سے نفرت کرتے تھے' جو کہ درمیانی آدمیوں (Middlemen) کی حیثیت سے پولش نوابوں کی زمینوں کا انتظام سنبھالتے تھے۔ 1648ء میں کوزاکوں کے رہنما بورس چملنسکی نے بغاوت کر دی جس کے دوران پولش اور یہودی کمیونٹیوں کو یکساں طور پر حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جب آخر کار 1667ء میں جنگ ختم ہوئی تو' تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ' ایک لاکھ یہودیوں کو قتل کیا جا چکا تھا اور یہودیوں کی تین سو کمیونٹیاں برباد کر دی گئی تھیں۔ ممکن ہے کہ اعداد و شمار بیان کرنے میں مبالغہ کیا گیا ہو تاہم خطوط اور پناہ گزینوں کی کہانیوں سے دنیا کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے یہودی دہشت زدہ ہو گئے۔ پناہ گزینوں نے وسیع پیمانے پر قتل عام کی کہانیاں سنائیں' جن کے دوران یہودیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے اجتماعی قبروں کے بارے میں بتایا' جن میں یہودی عورتوں اور بچوں کو زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہودیوں کو رائفلیں دے کر ایک دوسرے پر گولیاں چلانے کا حکم دیا جاتا تھا۔ بہت سے یہودیوں کو یقین تھا کہ یہ مسیحا کی آمد سے پہلے کا فتنہ و فساد ہے اور وہ مایوسی کے عالم میں مسیحا کے جلد دوبارہ جی اٹھنے کی کوشش میں لیوریائی قبالہ کی رسوم اور توبہ کرانے والے اصولوں کی طرف مائل ہو گئے۔

یہودی مسیحا کا ظہور:

جب چملنسکی قتل و غارت کی خبریں سمرنا' جو آج ترکی میں ہے' پہنچیں تو ایک نوجوان یہودی نے' جو کہ شہر کے باہر سیر اور مراقبہ کر رہا تھا' ایک افلاکی صدا سنی' جو اسے بتا رہی تھی کہ وہ ''اسرائیل کو بچانے والا'' مسیحا ہے۔ شبتائی زیوی ایک نوجوان عالم اور ایک قبالائی تھا (گو کہ اس مرحلے پر لیوریائی قبالائی نہیں تھا)' اور اس کے کچھ پیروکار بھی تھے' جنہیں وہ اپنی بصیرتوں سے آگاہ کرتا تھا۔ وہ ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا مگر جب وہ تقریباً بیس سال کا ہوا تو اس میں وہ علامات ابھرنا شروع ہو گئیں جنہیں آج ہم مریضانہ ڈپریشن کہتے ہیں۔ وہ کئی کئی دنوں تک خلوت گزیں رہتا' ایک تاریک کمرے میں مراقبہ کرتا' تاہم ڈپریشن کے ان مرحلوں کے بعد ''روشنی'' کے اضطرابی مرحلے آتے' جن کے دوران وہ بے چین رہتا' اسے نیند نہ آتی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ اعلیٰ تر قوتوں سے منسلک ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو توریت کے احکامات کی خلاف ورزی پر مجبور پاتا' مثال کے طور پر خدا کے نام کھلم کھلا ادا کرنا یا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غیر کوشر* غذا کھانا۔ وہ وضاحت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ ''انوکھے اعمال'' کیوں کرتا ہے' تاہم وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ خدا نے کسی وجہ سے اسے ایسا کرنے پر راغب کیا تھا۔ بعدازاں وہ اس امر کا قائل ہو گیا کہ یہ خلاف قانون اعمال نجات دلانے والے تھے: خدا ''جلد ہی تمام دنیاؤں کی اصلاح کے لیے اسے نیا قانون اور نئے احکامات دے گا''۔ قانون کی یہ خلاف ورزیاں ''مقدس گناہ'' تھیں۔

لیوریائی قبالائی ایسے ہی اعمال کو تکون (Tikkun) کہتے تھے۔ ایسا یقینی ہے کہ وہ یہودی زندگی کی رسمی مذہبی پابندیوں کے خلاف ایک لاشعوری بغاوت کے عکاس تھے اور کسی مکمل طور پر نئی چیز کی ایک الجھی ہوئی خواہش کا اظہار۔

آخر کار سمرنا کے یہودی شبتائی کے رویے سے تنگ آ گئے اور اسے 1650ء میں شہر سے نکل جانا پڑا۔ پھر اس نے ایک پندرہ سالہ دور کا آغاز کیا جسے اس نے بعد میں اپنے ''تاریک برس'' قرار دیا۔ ان برسوں کے دوران وہ عثمانی سلطنت میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھرتا رہا۔ اس نے کسی کو بھی اپنے مسیحانہ رتبے کے بارے میں نہیں بتایا اور شاید خصوصی ذمہ داری کا تصور ہی فراموش کر دیا۔ 1665ء تک وہ خود کو اپنے آسیبوں سے آزاد کروانے کی سعی کرتا رہا اور ایک ربی بن گیا۔ اس نے غزہ میں رہنے والے ایک نوجوان قبالائی کے بارے میں سنا' جو شفا دینے والے کی حیثیت سے مشہور تھا۔ وہ اس کو ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ ربی ناتھن نے پہلے ہی شبتائی کے بارے میں سن رکھا تھا' شاید اس وقت جب وہ دونوں یروشلم میں' ایک دوسرے سے ناواقف' رہتے تھے۔ شبتائی کے ''انوکھے اعمال'' کے حوالے سے کوئی شے ضرور ناتھن کے تخیل میں بس گئی تھی کیونکہ اپنے ملاقاتی کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے ناتھن کو اس کے بارے میں الہام ہوا۔ وہ تازہ تازہ لیوریائی قبالہ میں شامل ہوا تھا اور خود کو مقفل کر کے' روزہ رکھتے ہوئے' روتے ہوئے اور زبور کی تلاوت کرتے ہوئے پیورم (Purim) سے ذرا پہلے خلوت گزینی اختیار کر چکا تھا۔ اس شب بیداری کے دوران اس نے تصور میں شبتائی کو دیکھا اور اپنی ہی بلند آواز میں پیشگوئی سنی: ''یوں کہا خدا نے! دیکھو تمہارا نجات دہندہ آ رہا ہے۔ شبتائی زیوی اس کا نام ہے۔ وہ چلائے گا' ہاں وہ گرجے گا' وہ میرے

* یہودی بھی مذبوحہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں' جبکہ غیر مذبوحہ جانوروں کو کھانا ان پر ممنوع ہے۔ وہ مذبوحہ جانور کو ''کوشر'' کہتے ہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دشمنوں پر غالب ہوگا''۔ جب شبتائی حقیقتاً اس کے دروازے پر پہنچا تو ناتھن نے اسے اپنے تصور کی معجزانہ تصدیق سمجھا۔

آخر یہ کیسے ہوا کہ ناتھن جیسے ذہین مفکر نے اس اداس اور پریشان حال انسان کو اپنا نجات دہندہ تصور کر لیا؟ لیوریائی قبالہ کی رو سے مسیحا کی روح زم زم (Zim Zum) کے عمل سے تخلیق ہونے والی بے خدا اقلیم میں پھنسی ہوئی ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے مسیحا ''دوسرے رخ'' ("Other Side") کی شیطانی قوتوں سے نبرد آزمائی پر مجبور کیا گیا تھا' تاہم اب ناتھن کا ایمان تھا کہ قبالائیوں کے توبہ تائب والے نظاموں کی بدولت وہ شیطانی قوتیں مسیحا پر سے اپنی گرفت کھونا شروع ہو گئی تھیں۔ وقفے وقفے سے اس کی روح آزاد ہو جاتی تھی اور وہ مسیحائی عہد کا نیا قانون رائج کرتا تھا۔ لیکن فتح ہنوز ادھوری تھی اور وقفے وقفے سے مسیحا ایک بار پھر تاریکی کا شکار ہو جاتا تھا۔ یہ سب باتیں شبتائی کی شخصیت اور تجربے سے کامل مطابقت رکھتی تھیں۔ جب وہ پہنچا تو ناتھن نے اسے بتایا کہ خاتمہ نزدیک ہے۔ جلد ہی وہ شیطانی قوتوں پر مکمل طور پر فتح حاصل کر لے گا اور وہ یہودیوں کو نجات دلائے گا۔ قدیم قانون منسوخ ہو جائے گا اور وہ اعمال جو ممنوعہ اور گناہ قرار پائے ہوئے ہیں' مقدس ہو جائیں گے۔

اول اول تو شبتائی کو ناتھن کی فنتاسی (Fantasy) سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا تاہم نوجوان ربی کی فصاحت نے بتدریج اسے قائل کر لیا اور کم از کم اس کو اپنے انوکھے رویوں کی کچھ توضیح میسر ہو گئی۔ 28 مئی 1665ء کو شبتائی نے باقاعدہ اعلان کیا کہ وہ مسیحا ہے اور ناتھن نے فوری طور پر مصر' الیپو اور سمرنا خط ارسال کر دیئے کہ نجات دہندہ جلد ہی عثمانی سلطان کو شکست دے گا' یہودیوں کی جلاوطنی کو ختم کرے گا اور انہیں واپس ارض مقدس لے جائے گا۔ تمام غیر یہودی قومیں اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیں گی۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور 1666ء تک مسیحا نہ ہیجان یورپ' عثمانی سلطنت اور ایران کی تقریباً ہر کمیونٹی میں سرایت کر گیا تھا۔ پرلے درجے کے احمقانہ مناظر رونما ہوئے۔ یہودیوں نے فلسطین کی طرف سفر کی تیاریاں کرتے ہوئے اپنی املاک فروخت کرنا شروع کر دیں اور کاروبار جمود کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے سنا کہ مسیحا نے روزہ داری کے روایتی ایام میں سے روزہ داری کے ایک یوم کو ختم کر دیا ہے' یہ خبر سن کر یہودیوں نے جلوس نکالے اور گلیوں میں رقص کیا۔ ناتھن نے احکامات جاری کیے کہ جلد اختتام (End) کو ممکن بنانے کے لیے یہودیوں کو سیفیڈ کی توبہ تائب والی رسوم ادا کرنی چاہئیں اور یورپ' مصر' ایران' بلقان' اٹلی' ایمسٹرڈیم' پولینڈ اور فرانس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں رہنے والے یہودیوں نے روزے رکھنا' شب بیداریاں کرنا' ٹھنڈے یخ پانی میں بیٹھنا' کانٹوں پر لیٹنا اور غریبوں کو خیرات دینا شروع کر دیا۔ یہ ابتدائے جدیدیت کی بہت سی عظیم بیداریوں (Great Awakenings) میں سے ایک تھی کہ جب لوگوں نے کسی بہت بڑی تبدیلی کو جبلی طور پر محسوس کیا۔ بہت کم لوگ شبتائی کے بارے میں جانتے تھے اور ناتھن کے پیچیدہ قبالائی وژن سے بھی بہت تھوڑے لوگ پوری طرح واقف تھے۔ ان کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ مسیحا آ چکا ہے اور آخری امید پوری ہو گئی ہے۔ ان وجد آفریں مہینوں میں یہودیوں نے اس قدر امید اور قوت کا تجربہ کیا کہ گیٹو کی درشت اور محدود دنیا پگھلتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ انہوں نے ایک بالکل مختلف شے کا مزہ چکھ لیا تھا اور بہت سوں کو یقین تھا کہ زندگی دوبارہ کبھی پہلے جیسی نہیں ہو گی۔ وہ نئے امکانات کی جھلکیاں دیکھ رہے تھے' جو ایسا لگتا تھا کہ تقریباً ان کی گرفت میں ہیں۔ چونکہ وہ آزادی محسوس کر رہے تھے اس لیے بہت سے یہودی یہ ماننے لگے تھے کہ پرانی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اختتام کو پہنچ چکی ہے۔

ایسے یہودی جو شبتائی یا ناتھن کے براہ راست اثر میں آ گئے تھے انہوں نے ظاہر کیا کہ وہ توریت کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہیں' حالانکہ وہ بھی اس امر سے آگاہ تھے کہ اس کا مطلب مذہبی زندگی کا خاتمہ ہو گا۔ جب شبتائی نے مسیحا کا شاہانہ لبادہ پہنے ایک سینا گوگ کا دورہ کیا اور ایک روزہ ختم کر دیا' خدا کا ممنوعہ نام ادا کیا' غیر کوشر گوشت کھایا' عورتوں کو سینا گوگ کے اندر صحیفے کو پڑھنے کی اجازت دی تو لوگ خوشی سے جھوم اٹھے۔ تاہم ہر شخص اس پر یقین نہیں رکھتا تھا' ہر کمیونٹی میں ایسے ربی نیز عام آدمی تھے جو ان اقدامات کو غلط تصور کرتے تھے۔ تاہم امیر' غریب ہر طبقے کے لوگوں نے شبتائی کو تسلیم کر لیا تھا اور الوہی قانون کے خلاف اس کے اقدامات کو خوشدلی سے قبول کر لیا تھا۔ اس قانون نے یہودیوں کا کبھی تحفظ نہیں کیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ تحفظ دینے سے قاصر ہے' اس کے ہوتے ہوئے بھی یہودیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا' وہ ہنوز جلد وطنی کاٹ رہے تھے۔ ایسے حالات میں لوگ نئی آزادی کے لیے تیار تھے۔

تاہم یہ سب کچھ بہت خطرناک تھا۔ لیوریائی قبالہ ایک اسطورہ تھی۔ اس کو عملی سیاسی پروگرام میں اس انداز سے ڈھالنے کے لیے وضع نہیں کیا گیا تھا بلکہ اسے تو روح کی داخلی زندگی کو فروزاں کرنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ متھوس اور لوگوس لازم و ملزوم تو تھے مگر اپنی اپنی جگہ بالکل مختلف تھے اور مختلف کرداروں کے حامل تھے۔ سیاست عقل اور منطق کے دائرۂ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کار میں آتی تھی۔ اسطورہ اسے معنویت تو فراہم کرتی تھی مگر اس کی تعبیر اس انداز سے نہیں کی جاسکتی تھی جیسے ناتھن نے آئزک لیوریا کے اساطیری وژن کی تعبیر کر لی تھی۔ ہوسکتا ہے یہودی اپنے آپ کو طاقتور' آزاد اور اپنی تقدیر کا مالک محسوس کرتے ہوں لیکن ان کے حالات تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب بھی کمزور اور بے بس و لاچار تھے اور اپنے حکمرانوں کی خوشنودی کے محتاج تھے۔ تاریکی کی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما مسیحا کا لیوریائی تصور شر کے خلاف آفاقی جدوجہد کی ایک طاقتور علامت تو تھا لیکن اگر اس تصور کو ایک حقیقی اور جذباتی اعتبار سے غیر مستحکم انسان میں مجسم کرنے کی کوشش کی جاتی تو نتائج تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔

یہودی مسیحا کا قبول اسلام:

اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔ فروری 1666ء میں شبتائی ناتھن کی دعاؤں کے زیر سایہ سلطان سے نبرد آزما ہونے کے لیے روانہ ہوگیا۔ سلطان اس وحشیانہ یہودی ولولے سے آگاہ ہو چکا تھا اور اسے بغاوت کا احتمال تھا۔ چنانچہ جب شبتائی نے گیلی پولی کے نزدیک پڑاؤ ڈالا تو اسے گرفتار کر کے استنبول لے جا کر سلطان کے حضور پیش کیا گیا۔ شبتائی نے اسلام قبول کر لیا' جس سے ساری دنیا کے یہودی دہل کر رہ گئے۔ ان کے خیال کے مطابق مسیحا مرتد ہوگیا تھا۔

اس معاملے کو یہیں انجام پذیر ہو جانا چاہیے تھا۔ یہودیوں کی اکثریت شبتائی سے نفرت کرنے لگی اور شرم و ندامت کے عالم میں اپنی معمول کی زندگی اور توریت کی کامل پیروی کی طرف لوٹ گئے۔ تاہم تھوڑی تعداد میں ایسے یہودی بھی تھے جو آزادی کے خواب کو ترک نہیں کر سکے۔ وہ یہ یقین کرنے سے قاصر تھے کہ گزرے ہوئے عرصے میں انہوں نے آزادی کا جو مزہ چکھا تھا' وہ سراب تھا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ ایک مرتد مسیحا کو بھی قبول کرنے پر آمادہ تھے' بالکل ابتدائی دور کے عیسائیوں کی طرح' جنہوں نے عیسیٰؑ کی پیروی جاری رکھی تھی۔

شدید ڈپریشن کے ایک مرحلے کے بعد ناتھن نے اپنی الٰہیات کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالا۔ اس نے اپنے شاگردوں کے سامنے توضیح کی کہ نجات کا عمل شروع ہوگیا تھا لیکن ایک رکاوٹ سامنے آگئی۔ یہ حتمی ''مقدس گناہ'' تھا' تکون (Tikkun) کا آخری عمل۔ شبتائی کے پیروکاروں نے' جو کہ اب بھی شبتائی کو مسیحا مانتے تھے' اس صورتحال پر مختلف انداز سے ردعمل ظاہر کیا۔ ناتھن کی الٰہیات ایمسٹرڈیم میں بہت مقبول تھی۔ ان کے خیال کے مطابق مسیحا اب ایک میرانو بن چکا تھا اور دلی طور پر اسلام قبول کرنے کے باوجود خفیہ طور پر یہودیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تعلیمات پر ہی کاربند تھا۔ ایسے میرانو جو طویل عرصہ سے توریت سے مطمئن نہیں تھے' وہ نجات کی تکمیل پر اس کے مٹ جانے کے منتظر تھے۔ دیگر یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ انہیں مسیحا کے مکمل طور پر نجات دلوانے تک توریت کی تعلیمات پر عمل کرتے رہنا چاہیے اور جب مسیحا آئے گا تو پرانے قانون سے بالکل مختلف نیا قانون رائج کرے گا۔ شبتائی کے پیروکاروں پر مشتمل یہودیوں کی ایک اقلیت اس سے بھی آگے چلی گئی۔ وہ عارضی طور پر بھی خود کو پرانے قانون کی طرف نہیں لائے' ان کا عقیدہ تھا کہ یہودیوں کو شر کی اقلیم میں اپنے مسیحا کی پیروی لازماً کرنی چاہیے اور مرتد ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے مرکزی دھارے والے عقیدوں کو قبول کر لیا۔۔۔ یورپ میں عیسائیت کو اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کو۔۔۔ اور اپنے گھروں کی خلوت میں یہودی ہی رہے۔ ان انقلابیوں (Radicals) نے ایک جدید یہودی حل بھی پیش کیا یعنی یہودیوں کو چاہیے کہ وہ غیر یہودی کلچر میں گھل مل جائیں لیکن خفیہ طور پر اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کریں۔

شبتائی کے پیروکاروں کا خیال تھا کہ شبتائی اپنی دہری زندگی شدید کرب کے عالم میں گزار رہا ہے' تاہم ظاہری طور پر وہ ایک مسلمان کے روپ میں بہت مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ شبتائی اسلام کے مقدس قانون' شریعت' کا مطالعہ کرتے ہوئے اور سلطان کے روحانی مشیر کو یہودیت کی تعلیم دیتے ہوئے اپنے دن گزار رہا تھا۔ اسے لوگوں سے ملنے جلنے کی اجازت تھی' اور وہ ساری دنیا سے آنے والے یہودی مندوبین سے ملاقاتیں اور نشستیں کرتا تھا۔ وہ اس کی عظیم مذہبیت کی تعریفیں کرتے تھے۔ شبتائی کو اکثر اپنے گھر کے اندر توریت ہاتھوں میں لیے حمدیں گاتے ہوئے دیکھا گیا۔ لوگ اس کے اخلاص پر حیرت کرتے تھے اور لوگوں کے محسوسات میں ہمدردانہ انداز سے شمولیت پا لینے کی اس کی حیران کن اہلیت پر متحیر تھے۔ شبتائی کے حلقے میں مروج تصورات ناتھن کے حلقے میں مروج تصورات سے بالکل مختلف تھے اور غیر یہودیوں کے حوالے سے بہت زیادہ مثبت تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ شبتائی تمام عقیدوں کو درست مانتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو یہودیت اور اسلام کے مابین ایک پل ماننے کے ساتھ ساتھ عیسائیت اور عیسیٰؑ سے بھی مسحور تھا۔ اس کے مہمان بتاتے تھے کہ کبھی وہ ایک مسلمان کا سا رویہ اختیار کرتا ہے اور کبھی ایک ربی کی طرح کا رویہ اپنا لیتا ہے۔ عثمانیوں نے اسے یہودی تہوار منانے کی اجازت دی ہوئی تھی اور شبتائی اکثر ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں توریت تھامے دیکھا جاتا تھا۔ شبتائی سینا گوگوں میں جا کر یہودیوں کو قائل کرتا کہ وہ مسلمان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو جائیں کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ ارض مقدس کی طرف واپس جا سکیں گے۔ 1669ء میں لکھے گئے ایک خط میں شبتائی نے اس بات کو سختی کے ساتھ رد کیا کہ اس نے دباؤ اور جبر کے تحت اسلام قبول کیا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ مذہب اسلام ''عین حق'' ہے اور اسے مسیحا کی حیثیت سے یہودیوں کے ساتھ ساتھ غیر یہودیوں کی طرف بھی بھیجا گیا ہے۔

17 ستمبر 1676ء کو شبتائی کی موت سے اس کے پیروکاروں کو شدید صدمہ ہوا کیونکہ اس کی موت سے نجات کی تمام امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ تاہم اس فرقے نے خفیہ طور پر اپنا وجود برقرار رکھا اور یہ ظاہر کر دیا کہ مسیحا نہ ابھار کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ اس نے یہودی تجربے (Experience) کی بنیادوں کو چھو لیا تھا۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ مذہبی تحریک ایک ایسا پل بن گئی جس نے ان کے لیے بعد ازاں عقلیت پسندانہ جدیدیت کو اپنانے کے مشکل مرحلے سے گزرنا آسان بنا دیا۔ توریت کو ترک کر دینے پر بہت سے یہودیوں کی آمادگی اور ایک نئے قانون کا خواب دیکھنے والے شبتائی کے پیروکاروں کے برقرار رہنے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ تبدیلی اور اصلاح پر سوچنے کے لیے تیار تھے۔ شبتائی اور شبتائیت پر جامع کتاب لکھنے والا گرشم شولم کا کہنا ہے کہ شبتائی کے ان خفیہ پیروکاروں میں سے بہت سے لوگ یہودی روشن خیالی یا اصلاحی تحریک کے رائدین (Pioneers) بنے۔ اس نے انیسویں صدی کے دوران مشرقی یورپ میں روشن خیالی کے نظریات پھیلانے والے پراگ کے رہائشی جوزف ویہٹے کی نشاندہی کی ہے' جو کبھی شبتائی کا پیروکار رہ چکا تھا۔ ہنگری میں اصلاح کی تحریک کو متعارف کروانے والا ایرون کو ون بھی نوجوانی میں شبتائی کا پیروکار تھا۔ شولم کا یہ نظریہ متنازعہ بن چکا ہے اور اسے کسی بھی طرح قطعی ثابت نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ بات عمومی طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ شبتائیت (Shabbateanism) نے ربیوں کی روایتی مقتدرہ کی بیخ کنی میں اہم کردار ادا کیا اور اس نے یہودیوں کو اس تبدیلی کے بارے میں سوچنے کے قابل بنایا' جو ناممکن دکھائی دیتی تھی۔

دونمیہ: بظاہر مسلمان اور خفیہ طور پر یہودی:

شبتائی کی موت کے بعد دو انقلابی شبتائیتی (Shabbatean) تحریکوں نے بے شمار یہودیوں کو غالب عقیدے کی قبولیت پر تیار کیا۔ 1683ء میں عثمانی ترکی میں دوسو کے لگ بھگ یہودی خاندانوں نے اسلام قبول کیا۔ اس دونمیہ (Donmeh) یعنی نومسلم فرقے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے خفیہ سیناگوگ ہوتے تھے تاہم وہ مساجد میں بھی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اپنے عروج کے زمانے میں اس فرقے کے پیروکاروں کی تعداد ایک لاکھ پندرہ ہزار ہوگئی تھی۔ تاہم انیسویں صدی کے شروع میں اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن افراد نے جدید سیکولر تعلیم حاصل کر لی وہ کسی مذہب کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئے۔ کچھ نوجوان دونمیہ (Donmeh) 1908ء میں برپا ہونے والی سیکولر ''نوجوان ترکوں'' (The Yuong Turks) کی بغاوت میں پیش پیش تھے۔

جنسی آزادی کو فروغ دینے والا خفیہ یہودی فرقہ:

ایسی دوسری تحریک زیادہ شرانگیز تھی اور اس نے منفیت کا اظہار کیا جو کہ اسطورہ کو سیاسی عمل میں ڈھالنے کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ جیکب فرینک (1726-91ء) اس وقت شیتائیت میں شامل ہوا تھا' جب وہ بلقان کی سیاحت کر رہا تھا۔ جب وہ اپنے ملک پولینڈ واپس آیا تو اس نے ایک خفیہ فرقہ تشکیل دیا' جو ظاہری طور پر تو یہودی قانون کے مطابق عمل کرتا تھا لیکن خفیہ طور پر ممنوعہ جنسی سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ جب 1756ء میں اسے یہودی برادری سے خارج کر دیا گیا تو وہ اپنے پیروکاروں سمیت پہلے مسلمان ہو گیا (ترکی کے سفر کے دوران) اور بعد میں کیتھولک عیسائی۔

فرینک نے توریت کی تعلیمات کو نہ صرف رد کر دیا تھا بلکہ اخلاق باختگی کو اپنا لیا تھا۔ اس کے خیال میں توریت پرانی ہی نہیں بلکہ خطرناک اور ناکارہ ہو چکی تھی۔ اس کی سوچ کے مطابق احکامات (Commandments) موت کے قوانین تھے اور ان کو لازماً رد کر دیا جانا چاہیے تھا۔ گناہ اور بے حیائی نجات اور خدا کو پانے کا واحد راستہ تھے۔ فرینک تعمیر کرنے کے لیے نہیں بلکہ ''صرف تباہی و بربادی اور تخریب کے لیے'' آیا تھا۔ اس کے پیروکار تمام مذہبی قوانین کے خلاف جنگ میں مصروف تھے: ''میں تم سب کو کہتا ہوں کو جو بھی جنگجو ہو گا وہ لامذہب ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی قوت کے ذریعے آزادی تک رسائی پائے گا'' آج کے اکثر سیکولر لوگوں کی طرح فرینک بھی تمام مذاہب کو نقصان دہ تصور کرتا تھا۔ جوں جوں تحریک ترقی کرتی گئی فرینک کے پیروکار ماضی کو یکسر تبدیل کر دینے اور دنیا کو بچانے والے عظیم انقلاب کا خواب دیکھتے ہوئے سیاست کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے انقلاب فرانس (The French Revolution) کو اپنے وژن کی سچائی کی علامت تصور کیا اور یہ کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدا نے ان کی طرف سے مداخلت کی تھی۔

یہودی: تشکیک پسندی' دہریت اور منفیت پرستی کے پیشرو:

یہودی جدید عہد کے بہت سے رجحانات کے پیشرو ہیں۔ یورپ کے جارحانہ انداز میں جدید ہوتے ہوئے معاشرے نے انہیں اذیت و کرب سے دوچار کیا تھا' جس کی وجہ سے وہ سیکولرازم' تشکیک پسندی' دہریت' عقلیت پسندی' منفیت پسندی' تکثیریت اور عقیدے کو ایک نجی معاملے سمجھنے کی طرف مائل ہوئے۔ بیشتر یہودیوں کے لیے تو مغرب میں تشکیل پاتی ہوئی نئی دنیا کا راستہ مذہب سے ہو کر جاتا تھا تاہم یہ مذہب عقیدے کی اس قسم سے بہت مختلف تھا' جس سے ہم بیسویں صدی میں مانوس رہے ہیں۔ وہ مذہب اساطیر پر زیادہ انحصار کرتا تھا' صحیفوں کو لفظی طور پر ہی نہیں پڑھتا تھا اور نئے حلوں کو قبول کرنے پر پوری طرح تیار تھا' جن میں سے کچھ ان کی کسی نئی شے کی تلاش میں صدمہ انگیز محسوس ہوتے تھے۔ ماقبل جدید معاشرے میں مذہب کے کردار کو سمجھنے کے لیے ہمیں مسلم دنیا پر توجہ دینا ہوگی' جو کہ اس جدید عہد کے آغاز میں تبدیلیوں سے دوچار تھی اور روحانیت کی ایسی مختلف صورتیں وضع کر رہی تھی جو جدید عہد میں مسلمانوں پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

اسلامی بنیاد پرستی کا تاریخی پس منظر

(1492ء-1700ء)

اسلام ایک عالمی طاقت:

1492ء میں یہودی مغرب میں آہستہ آہستہ وجود پذیر ہونے والے نئے نظام کے اولین متاثرین تھے۔ اس انتہائی اہم سال کے دوسرے متاثرین سپین کے مسلمان تھے' جنہوں نے یورپ میں اپنا آخری مضبوط مرکز گنوا دیا تھا۔ تاہم اسلام کسی بھی اعتبار سے چلا ہوا کارتوس نہیں تھا۔ سولہویں صدی کے دوران وہ ایک عالمی طاقت (Global Power) تھا۔ اگرچہ سنگ شہشاہوں (1260ء-960ء) نے چین کو اسلامی دنیا سے کہیں زیادہ معاشرتی رفعتوں تک پہنچا دیا تھا اور اطالوی نشاۃ ثانیہ نے ایک ایسے ثقافتی انقلاب کا آغاز کیا' جس نے بالآخر مغرب کو ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کے قابل بنا دیا' تاہم مسلمان ان چیلنجوں کا آسانی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل اور سیاسی و معاشی حوالے سے عروج پر تھے۔ مسلمان دنیا کی آبادی کا صرف ایک تہائی تھے لیکن وہ اس وقت پورے مشرق وسطیٰ' ایشیا اور افریقہ میں اس قدر وسعت میں اور تزویراتی حوالے سے اہم مقامات پر حکمراں تھے کہ عالمی تاریخ میں اسلامی دنیا کو ایک کائنات اصغر کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک ولولہ انگیز اور تنوع آمیز تھا۔

تین ہمعصر عظیم اسلامی سلطنتیں:

سولہویں صدی کی ابتدا میں تین نئی اسلامی سلطنتوں کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں یعنی ایشیائے کوچک' اناطولیہ' عراق' شام اور شمالی افریقہ میں عثمانی سلطنت' ایران میں صفوی سلطنت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ہندوستان میں مغل سلطنت۔ ہر سلطنت اسلامی روحانیت کے مختلف پہلو کی ترجمانی کرتی تھی۔ مغل سلطنت فلسفہ کے نام سے معروف اعتدال پسندانہ' آفاقیت پسندانہ فلسفیانہ عقلیت پسندی کی ترجمانی کرتی تھی' صفوی شاہوں نے اب تک ایک اشرافی اقلیت کا عقیدہ چلی آ رہی شیعیت کو اپنی ریاست کا مذہب قرار دیا تھا اور عثمانی ترکوں نے' جو کہ سنی اسلام پر سختی سے کاربند تھے' مسلمانوں کے مقدس قانون شریعت کی بنیاد پر ایک نظام حکومت تشکیل دیا تھا۔

وہ تین سلطنتیں ایک نیا سفر تھیں۔ وہ تینوں ہی سلطنتیں اولین جدید ادارے تھیں' جن کا انتظام باقاعدہ انداز میں اور بیوروکریٹک اور عقلیت پسندانہ کاملیت کے ساتھ چلایا جاتا تھا۔ اپنے اولین برسوں میں عثمانی ریاست یورپ کے کسی بھی ملک سے بہت زیادہ طاقتور اور فعال تھی۔ سلیمان عالیشان (66-1520ء) کی حکمرانی میں وہ اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ سلیمان یونان' بلقانی ریاستوں اور ہنگری کو فتح کرتا ہوا عثمانی سلطنت کو مغرب کی طرف وسعت دیتا گیا اور اس کی پیشرفت 1529ء میں ویانا کو فتح کرنے میں ناکامی سے ہی رک سکی۔ صفوی ایران میں شاہوں نے شاہراہیں اور کارواں سرائیں تعمیر کروائیں' معیشت کو استحکام عطا کیا اور بین الاقوامی تجارت میں ملک کو صف اول میں جگہ دلوا دی۔ تینوں سلطنتوں میں اطالوی نشاۃ ثانیہ کی ہمسر ثقافتی ترقی ہوئی۔ سولہویں صدی عثمانی معماری' صفوی مصوری اور تاج محل کا عظیم دور تھی۔

اور اس کے باوجود کہ وہ سب جدید ہوتے ہوئے معاشرے تھے' تاہم وہ انقلابی تبدیلی نہیں لا پائے۔ وہ اٹھارہویں صدی کے دوران مغربی ثقافت کی امتیازی خصوصیت بن جانے والے انقلابی رجحان کو قبول نہیں کر سکے۔ اس کے برعکس تینوں سلطنتوں نے امریکی عالم مارشل جی۔ ایس۔ ہوگسن کے بقول ''روایت پسند روح'' کا اظہار کیا' جو کہ یورپ سمیت تمام ماقبل جدید معاشروں کا امتیازی وصف تھی۔ یہ سلطنتیں قدامت پسند روح کا آخری عظیم سیاسی اظہار تھیں اور چونکہ وہ جدید دور کے آغاز کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاستیں تھیں اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ قدامت پسند روح کا عروج تھیں۔ آج قدامت پسند معاشرہ مشکل میں ہے یا تو اس پر جدید مغربی مزاج موثر طور پر غلبہ پا چکا ہے یا وہ قدامت پسند سے جدید روح تک کے دشوار عبوری مرحلے سے گزر رہا ہے۔ بنیاد پرستی اسی کربناک تبدیلی کا ردعمل ہے۔ چنانچہ ان مسلمان سلطنتوں میں اس قدامت پسند روح کے عروج کا تجزیہ کرنا اہمیت کا حامل ہوگا تاکہ ہم اس کی قوت اور اثرات نیز اس کی محدودیتوں کو سمجھ سکیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدامت پسند معاشرے کی خصوصیات:

انیسویں صدی تک مغرب نے سرمایہ کاری اور تیکنیکی ترقی کے ذریعے تہذیب کی ایک مکمل طور پر نئی صورت متعارف کروا دی۔ اس سے پہلے تمام کلچر معاشی اعتبار سے اضافی زرعی پیداوار پر انحصار کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ کسی زرعی معاشرے کی توسیع اور کامیابی کی ایک حد ہوتی تھی' کیونکہ وہ اپنے وسائل کو استعمال کرنے اور ذمہ داریاں نبھانے میں آخرکار ناکام ہو جاتا تھا۔ سرمایہ کاری کے لیے سرمایہ محدود مقدار میں ہوتا تھا۔ ہر وہ اختراع جس کے لیے زرکثیر کی ضرورت ہوتی اسے عمومی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا' کیونکہ لوگوں کے پاس اتنے وسائل نہیں ہوتے تھے کہ وہ ہر شے کو تبدیل کریں' اپنے عملے کو دوبارہ تربیت دلوائیں اور کام کا نئے سرے سے آغاز کر سکیں۔ ہمارے کلچر سے پہلے کوئی کلچر مسلسل اختراع و ایجاد کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا' جسے آج مغرب میں ہم یقینی سمجھتے ہیں۔ آج ہم اپنے والدین کی نسل کے مقابلے میں زیادہ علم حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں اور پراعتماد ہیں کہ ہمارے معاشرے ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ہمیشہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں گے۔ ہم مستقبل اساس (Future-Oriented) ہیں۔ ہماری حکومتوں اور اداروں کو مستقبل پر نگاہ رکھنا ہوتی ہے اور آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہونے والے مفصل منصوبے تیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ امر واضح ہے کہ ہمارا معاشرہ مستقل اور منضبط عقلیت پسندانہ سوچ کا حامل ہے۔ یہ لوگوں کی اولاد ہے' جو کہ ہمارے علم میں اضافہ کرتے اور ہماری اہلیتوں کو توسیع دیتے اور ماحول کو قابو میں لاتے ہوئے ہمیشہ آگے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ تاہم ایک جدید معیشت کے بغیر عقلیت پسندانہ فکر اس انتہائی ایجاد پسند معاشرے کو تخلیق نہیں کر سکتی تھی۔ مغربی معاشروں کے لیے نئی ایجادات کو ممکن بنانے کی خاطر بنیادی ڈھانچے (انفراسٹرکچر) کو تبدیل کرتے رہنا ناممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مستقل سرمایہ کاری کے ذریعے ہم اپنے بنیادی وسائل میں اضافہ کر سکتے ہیں تاکہ وہ ہماری ٹیکنالوجیکل ترقی کے ہمقدم رہیں۔ تاہم ایسا کسی زرعی معاشرے میں ممکن نہیں تھا' جہاں لوگ پہلے سے حاصل شدہ چیزوں پر ہی اپنی توانائیاں صرف کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا ماقبل جدید معاشرے کا ''قدامت پسندانہ'' جھکاؤ کسی بنیادی بودے پن سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس قسم کے کلچر کی محدودیتوں کی عکاسی کرتا تھا۔ مثال کے طور پر تعلیم فرسودہ مضامین پر مشتمل ہوتی تھی اور نئے پن کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی تھی۔ طلباء کو انقلابی حد تک نئے تصورات کو وضع کرنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی' کیونکہ معاشرہ عمومی طور پر انہیں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایسے تصورات معاشرتی اعتبار سے انتشار انگیز اور کمیونٹی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ ایک قدامت پسند معاشرے میں معاشرتی استحکام اور نظم (Order) کو اظہار کی آزادی سے زیادہ اہم تصور کیا جاتا تھا۔

جدید معاشروں کی طرح مستقبل کی طرف دیکھنے کی بجائے ماقبل جدید معاشرے فیضان کے لیے ماضی کا رخ کرتے تھے۔ مستقل ترقی کی توقع کرنے کی بجائے سوچا جاتا تھا کہ اگلی نسلیں زوال پذیر ہو سکتی ہیں۔ کارناموں کی نئی رفعتوں تک رسائی پانے کی بجائے یہ یقین کیا جاتا تھا کہ معاشرے اولین کاملیت سے زوال پذیر ہو چکے ہیں۔ اس مفروضہ سنہرے دور کو حکومتوں اور افراد کے لیے ایک مثال تصور کیا جاتا تھا۔ تہذیب کو موروثی طور پر غیر یقینی سمجھا جاتا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ کوئی معاشرہ بآسانی درندگی پر اتر سکتا تھا' جیسا کہ پانچویں صدی میں رومن سلطنت کے منہدم ہونے کے بعد مغربی یورپ درندگی پر اتر آیا تھا۔ جدید دور کے اوائل میں اسلامی دنیا کے حافظے سے تیرہویں صدی کی تاتاری یورش کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ بڑے پیمانے پر قتل و غارت' تاتاری لشکر کی آمد سے پہلے ہزاروں افراد کا اپنے گھر بار چھوڑ کر فرار ہونا اور عظیم اسلامی شہروں کی پے در پے تباہی و بربادی کی دہشت انگیز یادیں ہنوز تازہ تھیں۔ لائبریریاں اور تعلیمی ادارے بھی تباہ کر دیئے گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی صدیوں کی عرق ریزی سے حاصل کیا گیا علم بھی برباد ہو گیا تھا۔ اب مسلمان سنبھل چکے تھے۔ صوفیاء ایک روحانی احیا عمل میں لا چکے تھے جو لیوریائی قبالہ ہی کے مانند صحت بخش ثابت ہوا تھا اور تینوں نئی سلطنتیں اس صحت یابی کی علامت تھیں۔ عثمانی اور صفوی خاندان تاتاری عہد میں ہونے والی وسیع جلاوطنی کی یادگار تھے' دونوں ہی عسکری ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے' ان کا سربراہ جنگجو ہوتا تھا اور وہ اکثر کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے وابستہ تھے' جو کہ مذکورہ تباہی اور بربادی کے بعد ابھرے تھے۔ ان سلطنتوں اور ان کی ثقافتوں کی طاقت اور حسن اسلامی اقدار کا دوبارہ اثبات اور اسلامی تاریخ کے دوبارہ پستی سے نکل آنے کا فخریہ اعلامیہ تھے۔

تاہم اس قسم کے المیے کے بعد ماقبل جدید معاشرے کی قدامت پسندی زیادہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ لوگ عظمت رفتہ کو کرب کے ساتھ یاد کرتے رہتے اور کسی نئی شے کی جستجو نہیں کرتے تھے۔ مثال کے طور پر سنی اسلام میں' جو کہ عثمانی سلطنت کا سرکاری مذہب تھا' متفقہ طور پر کہا جاتا تھا کہ ''اجتہاد کے دروازے'' بند ہو چکے ہیں۔ اب تک تو مسلمان فقہا کو اجازت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی کہ وہ الٰہیات اور قانون کے حوالے سے پیدا ہونے والے ایسے سوالوں کو حل کرنے کے لیے کہ جن کا حل نہ تو قرآن اور نہ مستحکم روایت پیش کرتی ہو' اپنی بصیرت کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں۔ تاہم اوائلی جدید عہد تک' ایک تقریباً مکمل طور پر تباہ شدہ روایت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں سنی مسلمانوں کا عقیدہ تھا کہ مزید کسی آزاد فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام جوابات موجود ہیں' شریعت معاشرے کے لیے ایک بنا بنایا خاکہ ہے' اور اجتہاد کی نہ تو ضرورت ہے' نہ یہ مناسب ہے۔ اس کی بجائے مسلمانوں کو لازماً ''تقلید'' کرنی چاہیے۔ انہیں نئے حل تلاش کرنے کی بجائے مستحکم قانونی کتابوں میں موجود فیصلوں کو قبول کر لینا چاہیے۔ اوائلی جدید عہد کے دوران سنی اسلامی دنیا میں ''بدعت'' (Innovation) کو اتنا ہی انتشار انگیز اور خطرناک سمجھا جاتا تھا جتنا کہ عیسائی مغرب میں مذہبی معاملات میں غیر مروجہ رائے (Heresy) کو۔

جدید عہد کی ترقی پذیر اور انقلابی روح کے خلاف کسی رجحان کا تصور کرنا دشوار ہو گا۔ ہماری تعقلاتی قوتوں پر ارادی پابندی لگانے کا تصور اب نفرت انگیز ہے۔ جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کہ جدید کلچر صرف اسی صورت میں پروان چڑھا کہ جب لوگوں نے اس قسم کی پابندیوں کو توڑنا شروع کیا۔ اگر مغربی جدیدیت لوگوس کی پیداوار ہے تو یہ دیکھنا آسان ہے کہ ماقبل جدید دنیا کی قدامت پسند روح کے لیے متھوس کتنی موافق تھی۔ اساطیری سوچ مستقبل کی طرف نہیں بلکہ ماضی کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ مقدس شروعات کی طرف' کسی اولین واقعے کی جانب یا انسانی زندگی کی بنیادوں کی سمت توجہ مبذول کرتی ہے۔ اسطورہ کسی نئی شے پر توجہ دینے کی بجائے مستقل شے پر دھیان دیتی ہے۔ یہ ہمیں ''خبریں'' مہیا نہیں کرتی ہے بلکہ وہی بتاتی ہے کہ جو ہمیشہ رہا ہے۔ ہر اہم شے پہلے ہی حاصل کی اور سوچی جا چکی ہے۔ ہم اپنے پرکھوں کے اقوال پر جیتے ہیں خصوصاً مقدس متنوں میں' جو کہ ہمیں ہر وہ بات بتاتے ہیں جسے جاننے کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے۔ روایت پسند عہد کی روحانیت ایسی ہوتی تھی۔ متھ' رسوماتی اعمال اور اساطیری بیانئے نہ صرف فرد کو معنویت کا ایک ایسا احساس عطا کرتے تھے جو کہ اس کی عمیق ترین لاشعوری ہستی سے ہم آہنگ ہوتا تھا بلکہ اس رجحان کو بھی تقویت دیتے تھے جو کہ زرعی معیشت اور اس کی محدودیتوں کی بقا کے لیے انتہائی لازمی ہوتا تھا۔ جیسا کہ شبتائی زیوی کی مثال سے واضح طور پر عیاں ہو گیا کہ اسطورہ عملی تبدیلی برپا کرنے کے لیے کارآمد نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا ذہنی سانچہ وضع کرتی ہے جو اشیاء کو جوں کا توں قبول کر لیتا ہے۔ ایسا اس معاشرے میں انتہائی ضروری ہوتا تھا جو بے روک ٹوک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایجاد و اختراع کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔

جس طرح تبدیلی کو ایک روایت کا درجہ دینے والے مغربی معاشرے میں جینے والے لوگوں کے لیے اساطیر کے کردار کو مکمل طور پر سراہنا مشکل' بلکہ ناممکن ہے' اسی طرح قدامت پسندانہ روحانیت کے ڈھالے ہوئے لوگوں کے لیے جدید کلچر کی مستقبل بین حرکیت کو قبول کرنا انتہائی مشکل' بلکہ شاید ناممکن ہے۔ اسی طرح کسی جدیدیت پسند (Modernist) کے لیے ہنوز روایتی اساطیری اقدار کے تحت پروان چڑھنے والے لوگوں کو سمجھنا بھی نہایت دشوار ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ آج اسلامی دنیا میں کچھ مسلمان دو امور کے حوالے سے بہت متفکر ہیں۔ اول' وہ مذہب کو سیاست سے' چرچ کو ریاست سے الگ کر دینے والے مغربی معاشرے کے سیکولرازم سے نفرت کرتے ہیں۔ دوم' اکثر مسلمان اپنے معاشروں کو شریعت کے مطابق چلتا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ امر جدید روح کے ڈھالے ہوئے لوگوں کو گہری الجھن میں ڈال دیتا ہے' جو بوجوہ خوفزدہ ہوتے ہیں کہ مذہبی انتظامیہ اس ترقی کو روک دے گی' جسے وہ ایک صحت مند معاشرے کے لیے بنیادی طور پر ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ چرچ اور ریاست کی علیحدگی کو ایک آزادی بخش عمل مانتے ہیں اور ''اجتہاد کے دروازے'' بند کرنے والے کسی مذہبی احتسابی ادارے کے خیال سے بھی ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک الوہی قانون کا تصور بھی جدیدیت کے نظریے سے قطعی طور پر متضاد ہے۔ جدید سیکولر لوگ کسی مافوق الانسان (Superhuman) ہستی کی طرف سے انسانیت پر نافذ کیے گئے کسی تبدیل نہ ہونے والے قانون کو بھی بے کشش تصور کر سکتے ہیں۔ وہ قانون کو مقدس کی بجائے لوگوس کی پیداوار تصور کرتے ہیں۔ یہ عقلیت پسندانہ اور عملیت پسندانہ ہوتا ہے اور اسے وقتاً فوقتاً حالات کے مطابق ضرور تبدیل ہونا چاہیے۔ چنانچہ ان کلیدی معاملات پر جدیدیت پسندوں اور مسلمان بنیاد پرستوں کے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔

عثمانی سلطنت:

تاہم اپنے عروج پر شرعی ریاست کا تصور انتہائی طمانیت بخش تھا۔ یہ عثمانی سلطنت کا کارنامہ تھا' جس نے اسلامی قانون کے ساتھ اپنی وفاداری سے جواز حاصل کیا تھا۔ سلطان کو شریعت کا محافظ ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ اگرچہ سلطان اور متعدد صوبوں کے گورنر اپنے اپنے ''دیوان'' میں عدل ارزانی کرتے تھے تاہم شرعی عدالتوں کے قاضیوں کو حقیقی عادل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Judges) تصور کیا جاتا تھا (عثمانیوں نے پہلی مرتبہ باقاعدہ طور پر شرعی عدالتیں قائم کی تھیں)۔ عثمانی سلطنت میں قاضی' ان کے مشیر مفتی اور مدرسوں میں فقہ کی تعلیم دینے والے علماء سب کے سب ریاستی ملازمین ہوتے تھے۔ وہ حکومت میں اتنی ہی بنیادی اہمیت رکھتے تھے جتنا کہ فوج اور انتظامیہ۔ عرب صوبوں کے باشندوں نے ترکوں کی حکمرانی اس لیے قبول کر لی تھی کیونکہ سلطان علماء کے وسیلے سے حکومت کرتا تھا۔ یوں علماء سلطان اور اس کی رعایا' استنبول اور دور دراز واقع صوبوں کے مابین ایک اہم ربط بن گئے تھے۔ وہ لوگوں کے مسائل سے سلطان کو آگاہ کرتے اور انہیں اختیار تھا کہ اگر سلطان اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرے تو وہ اسے راہ راست پر آنے کی ہدایت کریں۔ چنانچہ علماء محسوس کر سکتے تھے کہ عثمانی سلطنت ان کی سلطنت ہے اور سلطان مذہبی پیشواؤں کی عائد کردہ پابندیوں کو تسلیم کر لیتے تھے کیونکہ یہ شراکت ان کے اقتدار کو تقویت دیتی تھی۔ شریعت نے ریاست کے روزمرہ کے معاملات میں اس سے پہلے کبھی اتنا نمایاں کردار ادا نہیں کیا تھا' جتنا کہ عثمانی سلطنت میں' نیز سولہویں صدی کے دوران عثمانیوں کی کامیابی نے واضح کر دیا کہ اسلامی قانون سے ان کی وفاداری نے دراصل انہیں سیدھے راستے پر گامزن کر دیا تھا۔ وہ ہستی کے بنیادی قوانین سے ہم آہنگ ہو گئے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ تمام قدامت پسند معاشرے ماضی کے سنہرے دور کی طرف دیکھتے تھے اور عثمانی سلطنت کے سنی مسلمان رسول خدا حضرت محمد ﷺ (632ء-570ء) اور خلفائے راشدین کے دور کی طرف دیکھتے تھے۔ انہوں نے معاشرے کا انتظام اسلامی قانون کے مطابق چلایا تھا۔ اس زمانے میں مذہب اور ریاست الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کمیونٹی کے سیاسی سربراہ بھی تھے۔ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب قرآن' جسے آپؐ ساتویں صدی کے ابتدائی برسوں میں عربوں کی طرف لائے تھے' تلقین کرتا ہے کہ مسلمانوں کی اولین ذمہ داری ایک منصفانہ اور مساویانہ معاشرہ تخلیق کرنا ہے' جہاں غریبوں اور بیکسوں کے ساتھ عزت و احترام والا برتاؤ کیا جائے۔ اس کے لیے تمام محاذوں پر جہاد کی ضرورت تھی: روحانی' سیاسی' معاشرتی' ذاتی' عسکری اور معاشی محاذوں پر (ہم مغرب کے لوگ لفظ ''جہاد'' کا ترجمہ ''مقدس جنگ'' کرتے ہیں' جبکہ اس کا ترجمہ ''کوشش'' یا ''جدوجہد'' کیا جانا چاہیے)۔ مسلمان اپنی مکمل زندگی کو ایک نظام کے تحت لا کر خدا کے پسندیدہ انسان بن جاتے اور شخصی ارتکاز اور معاشرتی اتحاد حاصل کرتے' جو کہ خدا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے نزدیک ہونے کے مترادف تھا۔ زندگی کا کوئی بھی گوشہ اس مذہبی ''کوشش'' سے باہر نہیں تھا اور اگر ایسا کیا جاتا تو اسے توحید کے اصول کی خلاف ورزی قرار دیا جاتا تھا' جو کہ اسلام کا اساسی عقیدہ ہے۔ توحید کا انکار خود اللہ کا انکار قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا ایک پکے مسلمان کے لیے سیاست وہی حیثیت رکھتی تھی جو عیسائیوں کے لیے عشائے ربانی رکھتا ہے۔ سیاست ایک ایسی سرگرمی ہے جس کو لازماً تقدس مآب بنانا چاہیے تھا تاکہ یہ اللہ تک پہنچنے کا ایک وسیلہ بن جائے۔

اسلام ایک عملی مذہب:

عیسائیوں نے اپنے مذہبی عقائد پر زیادہ زور دیا جبکہ اسلام عقیدے کے ساتھ ساتھ عمل کو بھی مساوی اہمیت دیتا ہے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان پر ایمان لانا اور عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ان پانچ بنیادی ارکان میں سب سے پہلا رکن ہے توحید الٰہی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ کے آخری رسول ہونے کا اقرار کرنا۔ اسلام کا دوسرا بنیادی رکن ہے دن میں پانچ مرتبہ صلوٰۃ قائم کرنا۔ اسلام کا تیسرا رکن ہے زکوٰۃ ادا کرنا تاکہ اسلامی برادری میں دولت کی تقسیم منصفانہ رہے۔ اسلام کا چوتھا بنیادی رکن ہے رمضان کے مہینے میں روزے رکھنا تاکہ غریبوں کی بھوک اور دکھ تکلیف یاد رہے۔ اسلام کا پانچواں بنیادی رکن حج ہے' جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔ امت کا سیاسی استحکام زکوٰۃ اور رمضان میں بھی واضح طور پر مرکزی اہمیت رکھتا ہے تاہم اسے حج میں بھی پوری قوت کے ساتھ مدنظر رکھا گیا ہے۔ حج اسلام کا ایک اجتماعی عمل ہے' جس کے دوران ہر فرد یکساں سفید لباس (احرام) پہنتا ہے' جس سے امت کے اتحاد کا اظہار ہوتا ہے اور امیر و غریب کا فرق مٹ جاتا ہے۔

حج: مسلمان مرد و زن کا وجودی سقوط:

حج مکہ میں کعبہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ کعبہ بہت قدیم ہے اور یہ آغاز ہی سے اللہ سے موسوم ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی قدیم رسم کو جاری رکھا تھا لیکن اس میں سے مشرکانہ اعمال کو خارج کر کے اس کی توحیدی شان کو اجاگر کیا تھا اور اس وقت سے آج تک حج مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کا بھرپور احساس عطا کر رہا ہے۔ کعبہ کی ساخت پر ماہر نفسیات سی۔ جی۔ ژونگ (1961ء-1875ء) کا ''جیومیٹریکل پیٹرن'' کا نظریہ صادق آتا تھا۔ پلوٹارک' اووڈ اور ڈائیونیسیس جیسے کلاسیکی مصنفین نے عبادت گاہوں کو گول یا چوکور بیان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا تھا' جو کہ ان کے خیال کے مطابق کائنات کے بنیادی ڈھانچے کی عکاسی کرتی تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق کوئی عبادت گاہ کائنات کو انتشار سے نکال لانے اور اسے ایک حقیقت کا روپ دینے کی ترجمانی کرتی ہے۔ ژونگ کا خیال تھا کہ جیومیٹریکل ہیئت کائناتی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر حقیقت کی اساس ایک دائرے میں ایک مربع تھا۔

ہر مسلمان مرد عورت اپنی پوری ہستی کے وجودی سقوط (Existential Surrender) کے ذریعے ہی برادری کے اندر ایک مصدقہ انسان (Authentic Human Being) کی حیثیت سے جی سکتا ہے۔

حج آج بھی کسی مسلمان کے لیے ایک اعلیٰ ترین مذہبی تجربہ ہے۔ یہ مسلمان کی توجہ اس حقیقت کی طرف دلاتا ہے جو اتنی بنیادی ہے کہ اس سے ماورا جانا ناممکن ہے۔ یہ مسلمانوں کو صرف سطحی نہیں بلکہ انتہائی عمیق سقوط میں مدد دیتا ہے۔ اسلامی برادری کا ہر عقلیت پسندانہ عمل ــــ سیاسی' معاشی' تجارتی یا معاشرتی ــــ اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ انسان کا ہر عمل اللہ کی رضا کے تابع ہے۔ کعبہ مسلمانوں کے عقلیت پسندانہ اعمال کو معنویت اور تناظر عطا کرتا ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ انسانیت کے لیے کوئی نیا سچ نہیں لا رہا ہے بلکہ یہ کہ وہ تو حیات انسانی کے جوہری قوانین ہی کو عیاں کر رہا ہے۔ یہ تو پہلے سے معروف سچائیوں کو ''یاد دلانے والا'' ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا کہ وہ اولین مذہب ہی کو اس کے حقیقی روپ میں انسانیت کے لیے لائے ہیں۔ اللہ نے حضرت آدمؑ ' جنہیں قرآن اللہ کا پہلا پیغمبر قرار دیتا ہے' کے زمانے سے کرۂ ارض کے تمام باشندوں پر پیغمبر نازل کیے' جو انہیں بتاتے تھے کہ انہیں کس طرح زندگی گزارنی چاہیے۔ جانوروں' مچھلیوں یا پودوں کے برعکس' جو کہ کائناتی نظام کی جبلی اطاعت کرتے ہیں' انسان آزاد ارادے کے حامل ہیں اور وہ نافرمانی کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ جب انہوں نے کمزوروں پر جبر کرنے اور دولت کی منصفانہ تقسیم نہ کرنے والے استبدادی معاشرے تخلیق کر کے ہستی کے بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کی تو ان کی تہذیبیں فنا ہو گئیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ ماضی کے تمام عظیم پیغمبروں ــــ حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ ــــ نے اللہ کا ایک ہی پیغام اپنی امتوں کو پہنچایا۔ اب اللہ نے عربوں کو بھی اسی الوہی پیغام سے سرفراز فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ وہ معاشرتی انصاف اور مساوات قائم کریں تاکہ وہ ہستی کے بنیادی قوانین سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ جب مسلمان اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ نعمتوں سے نوازے جاتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ کے قانون کی خلاف ورزی کو غیر فطری تصور کیا جاتا ہے' یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی مچھلی خشکی پر رہنے کی کوشش کرے۔

عثمانیوں کی حیرت انگیز فتوحات کی وجہ:

سولہویں صدی میں عثمانیوں کی حیرت انگیز فتوحات کو ان کی رعایا نے بنیادی اسلامی اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ تصور کیا۔ ان کا معاشرہ اسی وجہ سے تو تحیر انگیز انداز میں کامیاب رہا تھا۔ عثمانی نظام حکومت میں شریعت کو دی گئی بے نظیر اہمیت کو قدامت پسند روح کے تناظر میں بھی دیکھا گیا۔ اوائل جدید عہد میں مسلمانوں نے الوہی قانون کی پابندی کو اپنی آزادی پر قدغن محسوس نہیں کیا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح وہ رضائے الٰہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسلامی قانون رسول کریمؐ کے وصال کے بعد صدیوں کے دوران تشکیل پذیر ہوا تھا۔ رسول کریمؐ کے وصال فرمانے کے ایک صدی بعد ہی مسلمان ہمالیہ سے لے کر پیرینیز تک پھیلی ہوئی ایک وسیع سلطنت پر حکومت کر رہے تھے' جسے ہر معاشرے کی طرح' ایک پیچیدہ قانونی نظام کی ضرورت تھی۔ بالآخر اسلامی قانون کے چار مکاتب فکر وجود پذیر ہوئے' سب کے سب یکسانیت رکھتے تھے اور مساوی طور قابل اطلاق تھے۔ قانون کی اساس قرآن اور اسوۂ حسنۂ رسولؐ تھا۔ قانونی مکاتب فکر نے اسوۂ رسولؐ ہی کو پیش کیا تھا' تاکہ ساری دنیا کے مسلمان اپنے رسولؐ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زندگی کا ہر عمل انجام دیں۔ انہیں امید تھی کہ اسوۂ رسولؐ پر عمل کر کے ہی اللہ کی اطاعت ممکن ہے۔ مسلمان حقیقی روایت پسند انداز میں ماضی کی ایک اکملیت کی توثیق کر رہے تھے۔ رسول کریمؐ کی زندگی اور شخصیت مسلمانوں کے لیے ایک مثال تھی۔ ان کی سنت پر عمل کرنے سے معاشرہ حقیقی معنوں میں اسلامی ہو گیا۔ تیرہویں صدی میں تاتاری یورش کے وقت تک شریعت پوری اسلامی دنیا میں راسخ ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ خلفاء اور علماء نے لوگوں پر جبر کیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ان کی زندگیوں کو معنویت عطا کی تھی۔ تاہم ایسا بھی نہیں تھا کہ مسلمان ساتویں صدی کے طرز زندگی کے زندانی بنے ہوئے ہوں۔ اس کی بجائے عثمانی ریاست سولہویں صدی کے اوائل میں دنیا کی سب سے زیادہ جدید ریاست تھی۔ عثمانیوں نے اپنے زمانے کے اعتبار سے ایک نئے طرز کی انتہائی فعال بیوروکریسی تشکیل دی تھی اور ولولہ انگیز دانش ورانہ زندگی کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ عثمانیوں نے دوسرے کلچروں کو خوش آمدید کہا۔ وہ مغرب کی بحری سائنس اور دریافت کنندگان کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دریافتوں سے حقیقتاً بہت خوش تھے نیز بارود اور آتشیں ہتھیاروں جیسی مغربی فوجی ایجادات کو حاصل کرنے کے مشتاق تھے۔ یہ طے کرنا علماء کی ذمہ داری تھی کہ ان ایجادات و اختراعات کو مسلمان قانون سے کس طرح ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ فقہ کا مطالعہ محض قدیم متون پر غور وفکر تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ ایک مبارزت طلب جہت کا بھی حامل تھا اور اس زمانے میں اسلام اور مغرب کے مابین کوئی حقیقی تضاد موجود نہیں تھا۔ یورپ خود قدامت پسند روح کے زیر اثر تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے انسان دوست اپنے کلچر کے سرچشموں کی طرف واپسی اختیار کر کے اسے تازہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ عام فانی انسانوں کے لیے مذہب کو مکمل طور پر رد کر دینا واقعتاً ناممکن ہوتا ہے۔ یورپی لوگ اپنی ایجادات کے باوجود اٹھارہویں صدی تک قدامت پسند نظام کے تحت رہے۔ مسلمانوں نے یورپ کو اس وقت اجنبی سمجھنا شروع کیا جب مغربی جدیدیت نے مستقبل اساس عقلیت پسندی (Future-Oriented Rationalim) کو ماضی کی طرف دیکھنے والے اساطیری طرز زندگی کی جگہ رائج کر دیا۔

ابن تیمیہؒ: ایک انقلابی مصلح:

اس کے علاوہ یہ سوچنا غلط ہوگا کہ قدامت پسند معاشرہ مکمل طور پر جمود کا شکار ہوتا ہے۔ پوری اسلامی تاریخ کے دوران اصلاح اور تجدید کی تحریکیں موجود رہی تھیں' جو کہ اکثر اوقات بالکل انقلابی ہوا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر دمشق کے ایک مصلح (ریفارمر) احمد ابن تیمیہؒ (1328ء-1263ء) نے ''اجتہاد کے دروازے بند'' ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا زمانہ تاتاری یورش کے دوران اور اس کے بعد کا زمانہ ہے' کہ جب مسلمان صدمے سے سنبھلنے اور اپنے معاشرے کو دوبارہ تخلیق کرنے کی مایوسانہ کوشش کر رہے تھے۔ اصلاحی تحریکیں عموماً ثقافتی تبدیلی کے دور میں یا بہت بڑی سیاسی بربادی کی صورت میں رونما ہوتی ہیں۔ ایسے زمانوں میں پرانے حل تسلی بخش نہیں رہتے اور سٹیٹس کو (Status Quo) کو چیلنج کرنے کے لیے مصلحین اپنی عقلی قوتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ ان یکسر تبدیل شدہ حالات میں مسلمانوں کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شریعت کو اپنے وقت کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ انقلابی تو تھے لیکن ان کے پروگرام نے ایک جوہری طور پر قدامت پسندانہ صورت اپنا لی۔ ابن تیمیہؒ کا عقیدہ تھا کہ اس بحران سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو لازماً قرآن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سنت کی طرف لوٹنا ہوگا۔ وہ بعد میں ہونے والے الٰہیاتی اضافوں کو مٹانا اور بنیادوں کی طرف لوٹنا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ حقیقی اسلام کی طرف واپسی کی خواہش میں مقدس تصور کیے جانے والے عہد وسطیٰ کے فلسفے اور فقہ کو ترک کرنا چاہتے تھے۔ مروجہ رسوم و رواج پر ان کے اس حملے نے حکومت کو مشتعل کر دیا اور ابن تیمیہؒ نے اپنے آخری ایام زنداں میں گزارے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات دل شکنی کی وجہ سے ہوئی کیونکہ ان کے پہریدار انہیں لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ تاہم عام لوگ ان سے محبت کرتے تھے۔ ان کی قانونی اصلاحات لبرل اور انقلابی تھیں اور لوگ دیکھ سکتے تھے کہ وہ دل سے ان کا فائدہ چاہتے تھے۔ ان کا جنازہ ان کی عوامی مقبولیت کا اظہار تھا۔ اسلامی تاریخ میں ان جیسے بہت سے مصلحین گزرے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ہمارے زمانے کے بعض مسلمان بنیاد پرست اسی تجدید اور اصلاح کی روایت کے تحت کام کر رہے ہیں۔

باطنی تحریکیں:

بعض مسلمانوں نے باطنی تحریکوں کے ذریعے نئے مذہبی تصورات اور اعمال کو اپنایا۔ ان باطنی تحریکوں کو عام لوگوں سے خفیہ رکھا جاتا تھا کیونکہ باطنیوں کا خیال تھا کہ وہ انہیں درست طور پر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تاہم وہ عقیدے کے اس اپنے روپ اور اکثریت کے عقیدے میں کوئی تضاد نہیں پاتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی تحریکیں قرآن کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں اور انہیں نئی معنویت دیتی ہیں۔ باطنی اسلام کی تین بڑی صورتیں تصوف، عقلیت پسندانہ فلسفہ (Falsafah) اور شیعیت۔ مؤخرالذکر پر ہم اسی باب میں آگے چل کر تفصیل سے بحث کریں گے۔ خواہ اسلام کی یہ باطنی صورتیں اختراعی لگتی تھیں، خواہ وہ مرکزی دھارے کی شریعت سے انقلابی انداز میں انحراف کرتی محسوس ہوتی تھیں، لیکن باطنی اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ وہ اصل سرچشموں کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ قرآنی تعلیمات پر یونانی فلسفے (Philosophy) کے اصولوں کا اطلاق کرنے کی کوشش کرنے والے فلسفہ (Falsafah) کی تحریک چلانے والے لازمان سچ کے اولین آفاقی عقیدے کی طرف واپسی چاہتے تھے، جسے وہ مختلف تاریخی مذاہب سے مقدم مانتے تھے۔ صوفیوں کا عقیدہ تھا کہ ان کی صوفیانہ ریاضتوں سے حقیقت اعلیٰ تک رسائی ممکن ہے۔ شیعوں کا دعویٰ تھا کہ قرآن میں جس سماجی انصاف کا حکم دیا گیا تھا صرف وہی اس کے پاسدار ہیں جبکہ بدعنوان مسلمان حکمرانوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ ہمارے مفہوم میں کوئی باطنی بھی ''اوریجنل'' (Original) نہیں ہونا چاہتا تھا' وہ سب قدامت پسندانہ انداز سے بنیادوں کی طرف واپسی میں اوریجنل تھے۔ ان کے خیال میں صرف اسی طریقے سے انسانی تکمیل اور آسودگی ممکن ہو سکتی تھی۔

مصر میں علماء کے عروج کا تاریخی جائزہ:

ہم زیرِنظر کتاب میں جن دو مسلمان ملکوں کا تفصیلی تجزیہ کریں گے' ان میں سے ایک مصر ہے' جو 1517ء میں اس وقت عثمانی سلطنت کا حصہ بنا جب سلطان سلیم اول نے اپنی شام کی مہم کے دوران اس کو فتح کر لیا۔ چنانچہ مصر میں شریعت غالب رہی۔ قاہرہ میں واقع عظیم یونیورسٹی الازہر سنی دنیا میں فقہ کی تعلیم کا سب سے زیادہ اہم مرکز بن گئی تاہم مصر عثمانی حکومت کی صدیوں کے دوران استنبول کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا اور نسبتاً غیر نمایاں ہو گیا۔ جدید عہد کے اوائل کے حوالے سے ہم اس ملک کے بارے میں بہت تھوڑا جانتے ہیں۔ 1250ء سے اس علاقے پر مملوکوں کی حکومت تھی' جو پہلے جنگجو غلام ہوا کرتے تھے۔ ینی چری جو عسکری حوالے سے عثمانی سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی تھے' وہ بھی غلام تھے۔ مملوکوں کے عروج کے زمانے میں مصر اور شام میں ایک زندگی سے بھرپور معاشرہ وجود پذیر ہو چکا تھا اور مصر اسلامی دنیا کا ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک بن گیا تھا۔ تاہم مملوک سلطنت بھی زرعی تہذیب کی خلقی محدودیتوں کا نشانہ بنی اور پندرہویں صدی کے اواخر تک زوال کا شکار ہو گئی۔ تاہم مملوک مصر میں مکمل طور پر مغلوب نہیں ہوئے تھے۔ عثمانی سلطان سلیم اول نے الیپو کے مملوک گورنر خیربے کے ساتھ اتحاد قائم کر کے مصر کو فتح کیا تھا۔ اس سودے بازی (Deal) کے نتیجے میں خیربے کو عثمانی فوجوں کی واپسی پر وائسرائے مقرر کیا گیا۔

ابتدا میں عثمانیوں نے مملوکوں کی دو بغاوتوں کو ناکام بنا دیا۔ تاہم سولہویں صدی کے اواخر تک عثمانیوں کے وسائل ختم ہونا شروع ہو گئے۔ شدید افراطِ زر کی وجہ سے انتظامیہ میں زوال آ گیا اور رفتہ رفتہ کئی بغاوتوں کے بعد مملوک کماندار مصر کے حقیقی حکمرانوں کی حیثیت سے دوبارہ نمایاں ہو گئے' گو کہ سرکاری اعتبار سے وہ استنبول کے ماتحت ہی رہے۔ ان کے کمانداروں نے ایک ایسی اعلیٰ مہارت والے فوجی افسروں کو تیار کیا' جنھوں نے عثمانی فوج میں موجود مملوک فوجیوں کی ترک گورنر کے خلاف بغاوت کی قیادت کی اور اس کی جگہ ایک مملوک کو گورنر بنا دیا۔ سلطان نے نئے گورنر کو منظوری دے دی اور یوں ملک دوبارہ مملوکوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے زیر حکومت آ گیا' سوائے ایک استثنیٰ کے' جب سترہویں صدی کے اواخر میں مختصر عرصے کے لیے ینی چری اقتدار پر قابض ہو گئے تھے۔ تاہم مملوک حکمران غیر مستحکم تھے۔ وہ دو گروہوں میں منقسم تھے اور طرفین کی تباہی کا موجب ایک تنازعہ موجود تھا۔ اس بحرانی دور کے دوران مصری عوام کو سب سے زیادہ نقصان ہوا۔ بغاوتوں اور گروہی تشدد کے دوران ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جاتیں' ان کے گھر چھین لیے جاتے اور بھاری ٹیکس نافذ کر دیئے جاتے تھے۔ انہیں اپنے حکمرانوں سے' خواہ وہ ترک ہوں یا مملوک' کوئی لگاؤ نہیں تھا' کیونکہ وہ غیر ملکی تھے اور انہیں ان کی باہمی لڑائیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ عوام علماء کی طرف راغب ہونے لگے' جو کہ مصری تھے' شریعت کے مقدس نظام کے ترجمان تھے اور مصری عوام کے حقیقی رہنما بن گئے تھے۔ جب اٹھارہویں صدی کے دوران مملوکوں کا باہمی تنازعہ شدید ترین ہو گیا تو انہوں نے عوام سے اپنے اقتدار کو تسلیم کروانے کے لیے علماء کی حمایت کو ضروری پایا۔

علماء مصری معاشرے کے اساتذہ' سکالر اور دانشور تھے۔ ہر شہر میں ایک سے لے کر سات مدرسے ہوتے تھے' جو ملک کو اس کے اساتذہ فراہم کرتے تھے۔ دانشورانہ معیارات بہت اعلیٰ نہیں تھے۔ جب سلطان سلیم اول نے مصر کو فتح کیا تو وہ انتہائی قیمتی مسودات کے ساتھ ساتھ ممتاز علماء کو بھی اپنے ساتھ استنبول لے گیا۔ مصر عثمانی سلطنت کا ایک پسماندہ صوبہ بن گیا۔ عثمانیوں نے عرب سکالروں کی سرپرستی نہیں کی' مصریوں کا بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں تھا اور اس طرح مملوک سلطنت میں ترقی پانے والا فلسفہ' فلکیات' طب اور سائنس زوال کا شکار ہو گئے۔

تاہم چونکہ علماء حکمرانوں اور عوام کے درمیان ابلاغ کا اہم ذریعہ تھے' اس لیے وہ انتہائی طاقتور ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے کاشتکار طبقے فلاحین (Fellahin) سے تعلق رکھتے تھے' اس لیے دیہاتی علاقوں میں ان کا اثر بہت زیادہ تھا۔ وہ مدرسوں پر مشتمل تعلیمی نظام پر مکمل گرفت رکھتے تھے۔ اسی طرح چونکہ شرعی عدالتیں انصاف فراہم کرنے والے بڑے ادارے تھے اس لیے علماء کو قانونی نظام پر بھی اجارہ داری حاصل تھی۔ مزید برآں انہیں دیوان میں اہم سیاسی مناصب بھی حاصل تھے۔ اس کے علاوہ شریعت کے سرپرستوں کی حیثیت سے وہ حکومت کی کسی اصولی مخالفت میں رہنما کا کردار ادا کرنے پر قادر تھے۔ الازہر کا عظیم مدرسہ بازار سے متصل تھا اور علماء کے تاجروں کے ساتھ خاندانی روابط استوار ہو چکے تھے۔ اگر وہ حکومتی پالیسی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے تو الازہر کے کسی مینارے پر نقارہ بجانے سے بازار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بند ہو جاتا اور ہجوم گلیوں میں امڈ آتا۔ مثال کے طور پر 1794ء میں الازہر کے ریکٹر شیخ الشرقوی نے ایک نئے ٹیکس کے خلاف ایک ہجوم کی قیادت کی یہ ٹیکس ان کے بقول جابرانہ اور غیر اسلامی تھا۔ تین دن بعد حکمرانوں نے مجبور ہو کر ٹیکس نافذ نہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ تاہم علماء کی قیادت میں حکومت کو ختم کر دینے والی کسی بغاوت کا حقیقی خطرہ موجود نہیں تھا۔ بے عموماً ان کی جائیدادیں ضبط کر کے انہیں قابو میں رکھتے تھے اور عوام کے ہجوم مملوک فوج سے ٹکرا نہیں سکتے تھے۔ اس کے باوجود علماء کی ممتاز حیثیت نے مصری معاشرے کو ایک مذہبی خصوصیت عطا کر دی تھی۔ صرف اسلام مصری لوگوں کو حقیقی تحفظ فراہم کرتا تھا۔

عثمانی سلطنت کا زوال:

اٹھارہویں صدی کے اواخر تک مشرق وسطیٰ میں تحفظ و سلامتی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ عثمانی ریاست اب سنگین انتشار کا شکار ہونے لگی تھی۔ سولہویں صدی میں اس کی حکومت کی اعلیٰ ترین فعالیت اب نااہلی میں بدل چکی تھی' بالخصوص سلطنت کے مرکز سے بہت دور واقع علاقوں میں۔ مغرب نے حیرت انگیز انداز میں قوت حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور عثمانی بھانپ چکے تھے کہ وہ یورپی طاقتوں سے مزید برابری کی سطح پر مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مغرب کے چیلنج کا جواب دینا اس لیے دشوار نہیں تھا کہ وہ سیاسی کمزوری کے زمانے میں رونما ہوا تھا' بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں جس قسم کا معاشرہ تخلیق کیا جا رہا تھا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں موجود نہیں تھی۔ سلطانوں نے حالات کے مطابق ڈھلنے کی کوشش کی مگر ان کے اقدامات سطحی تھے۔ مثال کے طور پر سلطان سلیم سوم (عہد حکمرانی 1807ء-1789ء) نے مغربی خطرے کو خالصتاً عسکری تناظر میں دیکھا۔ 1780ء کی دہائی میں فوج کو یورپی خطوط پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی تاہم جب سلطان سلیم سوم 1789ء میں تخت نشین ہوا تو اس نے بے شمار فوجی سکول قائم کیے' جن میں فرانسیسی اساتذہ تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ ان فوجی سکولوں میں طلباء کو یورپی زبانیں اور ریاضی' جہازرانی' جغرافیہ اور تاریخ پر لکھی گئیں مغربی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ لیکن چند ایک فوجی تیکنیکوں کو سیکھنے سے اور جدید سائنسوں کو کسی حد تک جاننے سے مغربی خطرے کو روکا نہیں جا سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپیوں نے تو ایک مکمل طور پر نیا طرز زندگی اور طرز فکر تخلیق کر لیا تھا۔ یورپ والوں کا مقابلہ انہیں کے میدان میں کرنے کے لیے عثمانیوں کو ایک عقلیت پسندانہ کلچر وضع کرنے' معاشرے کے اسلامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈھانچے کو منہدم کرنے اور ماضی سے تمام مقدس رابطے منقطع کرنے کی ضرورت تھی۔ تقریباً تین سو برسوں سے یورپ والوں سے رابطہ رکھنے والی اشرافیہ کے کچھ افراد کے لیے یہ تبدیلی ممکن تھی لیکن قدامت پسندانہ نظام کو ذہن اور دل میں بسائے ہوئے عام لوگوں کو اس قسم کی انقلابی تبدیلی کی ضرورت کو سمجھنے اور قبول کرنے پر کس طرح راضی کیا جاتا؟

سلطنت کے دور دراز واقع علاقوں میں عثمانیوں کا زوال بہت واضح تھا' لوگوں نے ہمیشہ کی طرح اس تبدیلی اور بے چینی کا جواب مذہبی حوالوں سے دیا۔ جزیرہ نمائے عرب میں محمد ابن عبدالوہاب (92-1703ء) استنبول سے الگ ہو کر وسطی عرب اور خلیج فارس کے علاقے میں اپنی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبدالوہاب ایک خالصتاً اسلامی ریفارمر تھا۔ اس نے قرآن اور سنت کی روشنی میں اور وسطی عہد کی فقہ' تصوف اور فلسفے کو سختی سے رد کرتے ہوئے اس بحران کا سامنا کیا۔ اس کا خیال تھا کہ عثمانی سلطانوں نے حقیقی اسلام سے انحراف کیا ہے اس لیے وہ مرتد ہیں' مسلمانوں کو ان کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے اور وہ موت کے مستحق ہیں۔ ان کی شرعی ریاست غیر مصدقہ ہے۔ عبدالوہاب نے خالص عقیدے کا ایک علاقہ قائم کرنے کی کوشش کی' جس کی بنیاد اس نے ساتویں صدی کی اولین اسلامی برادری کو بنایا۔ وہ ایک جارحانہ تحریک تھی' جس نے لوگوں سے اپنے آپ کو زبردستی تسلیم کروایا۔ بیسویں صدی کے دوران بعض بنیاد پرست اسلام پسند (Islamist) مصلحین نے ان تشددانہ اور رد کرنے والی تیکنیکوں میں سے کچھ کو استعمال کیا' یہ عہد زیادہ بڑی تبدیلی اور بے چینی کا تھا۔

مراکشی صوفی مصلح احمد ابن ادریس:

مراکشی صوفی مصلح احمد ابن ادریس (1836ء-1780ء) ایک بالکل مختلف سوچ کے حامل تھے۔ ان کے پیروکار آج بھی موجود ہیں۔ انہوں نے عثمانی سلطنت کے دور دراز کے صوبوں میں رونما ہونے والے انتشار کا یہ حل تجویز کیا کہ لوگوں کو تعلیم دی جائے اور انہیں بہتر مسلمان بنایا جائے۔ انہوں نے شمالی افریقہ اور یمن میں سفر کرتے ہوئے مختلف علاقوں کے لوگوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم دی کہ نماز کیسے ادا کرنی چاہیے اور انہیں غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہونے پر شرم دلائی۔ یہ ایک عوامی سطح کی تحریک تھی ابن ادریس نے وہابی طریقوں کو نہیں اپنایا۔ ان کے خیال کے مطابق جبر کی بجائے تعلیم مسائل کا حل ہے۔ لوگوں کو مذہب کے نام پر قتل کر دینا صریحاً غلط ہے۔ دیگر مصلحین نے بھی انہیں خطوط پر کام کیا۔ الجیریا میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احمد التگرانی (وفات 1815ء)' مدینہ میں محمد ابن عبدالکریم صمیم (وفات 1775ء) اور لیبیا میں محمد ابن علی السنوسی (وفات 1832ء) علماء کو نظرانداز کرتے ہوئے عقیدے کو براہ راست عوام تک لے کر گئے۔ یہ ایک عوام پسند (Populist) تحریک تھی۔ انہوں نے مذہبی ایسٹیبلشمنٹ پر تنقید کی' جسے وہ اشرافی (Elitist) تصور کرتے تھے۔ انہوں نے عبدالوہاب کے برعکس مذہبی عقائد کو خالص بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ان کا خیال تھا کہ پیچیدہ فقہ کے مقابلے میں لوگوں کو بنیادی عقائد اور رسوم کی طرف لے جا کر انہیں اخلاقیات کے دائرے میں زندگی گزارنے کا قائل کر کے معاشرے کے عوارض کا زیادہ موثر علاج ممکن تھا۔

نئے صوفیاء:

صوفیا صدیوں سے اپنے پیروکاروں کو تلقین کرتے آئے ہیں کہ وہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق زندگی بسر کریں۔ وہ یہ بھی تاکید کرتے آئے ہیں کہ خدا تک جانے والا راستہ تخلیقی اور صوفیانہ تخیل سے ہو کر جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں یہ مصلحین' جنہیں سکالر ''نئے صوفیا'' (Neo-Sufis) کہتے ہیں' ایک قدم مزید آگے چلے گئے۔ انہوں نے لوگوں کو اپنی بصیرتوں پر مکمل طور پر انحصار کرنے کا درس دیا اور کہا کہ انہیں علماء وفضلاء پر انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ ابن ادریس تو یہاں تک چلے گئے کہ انہوں نے رسول کریمؐ کے علاوہ ہر مسلمان درویش اور صوفی کو رد کر دیا' خواہ وہ کتنے ہی عالی مرتبت تھے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں کو نئی باتیں سیکھنے اور تسلیم و رضا کی عادات ترک کرنے کی حوصلہ افزائی دی تھی۔ صوفیانہ جستجو کی منزل خدا سے اتصال نہیں تھا بلکہ رسول کریمؐ کی شخصیت سے عمیق ہم آہنگی اختیار کرنا تھی۔ یہ ابتدائی قسم کے جدید رجحانات تھے وہ اگرچہ نئے صوفیاء اب بھی رسول کریمؐ کی نخستمثالی شخصیت کی طرف ہی مائل تھے تاہم ایک مابعدالطبیعیاتی کی بجائے انسانیاتی عقیدہ وضع کرتے دکھائی دیتے تھے اور وہ پرانے کے ساتھ ساتھ نئی اور اختراعی باتوں کو بھی اپنانے کے لیے اپنے پیروکاروں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ ابن ادریس کا مغرب کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا' نہ ان کی تحریروں میں کبھی یورپ کا ذکر آیا' اور انہوں نے مغربی تصورات کی کوئی آگاہی یا ان میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم سنی اسلام کے اساطیری نظریے ان کے یورپی روشن خیالی کے کچھ اصولوں کو اپنانے کا پیش خیمہ بنے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایران میں علماء کے عروج کا تاریخی جائزہ:

ایران کا بھی یہی معاملہ تھا' جس کی اس زمانے کی تاریخ مصر کے مقابلے میں زیادہ بہتر انداز سے محفوظ ہے۔ جب سولہویں صدی کے اوائل میں صفویوں نے ایران کو فتح کیا تو انہوں نے شیعیت کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس وقت تک شیعیت ایک دانشورانہ اور صوفیانہ باطنی تحریک رہی تھی اور شیعہ اصولی بنیادوں پر سیاسی زندگی میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ایران میں چند اہم شیعی مراکز ہمیشہ موجود رہے تھے تاہم بیشتر شیعہ عجمی (Persians) نہیں' عرب تھے۔ چنانچہ ایران میں صفوی تجربہ ایک حیران کن اختراع تھا۔ سنیوں اور شیعوں کے مابین کوئی عقائدی تنازعہ موجود نہیں تھا' فرق بنیادی طور پر احساس کا تھا۔ سنی اسلامی تاریخ کے حوالے سے بنیادی طور پر امید پرست تھے جبکہ شیعوں کا وژن زیادہ المیہ تھا: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانوادے کا سانحہ خیر وشر' عدل و جبر کی کائناتی کشمکش کی علامت بن گیا تھا' جس میں شر کا ہاتھ ہمیشہ اوپر دکھائی دیتا تھا۔ جہاں سنی رسول کریمؐ کی زندگی کو ایک مثالی حیثیت دے چکے تھے' وہاں شیعوں نے آپؐ کے خانوادے کو مثالی حیثیت دی۔ اس شیعی عقیدہ کو سمجھنے کے لیے' جس کے بغیر ہم 79-1978ء کے انقلابِ ایران جیسے واقعات کو نہیں سمجھ سکتے' ہمیں شیعیت کے ارتقا کا مختصر جائزہ ضرور لینا ہوگا۔

جب حضرت محمدؐ نے 632ء میں وصال فرمایا تو آپؐ نے اپنی جانشینی کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا اور آپؐ کے دوست حضرت ابوبکرؓ کو امت کی اکثریت نے خلیفہ منتخب کر لیا۔ تاہم بعض لوگوں کو یقین تھا کہ حضرت محمدؐ اپنے قریب ترین مرد رشتہ دار حضرت علیؓ ابن طالب کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے' جو کہ آپؐ کے زیر ولایت' چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ تاہم حضرت علیؓ کو 656ء میں چوتھا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ لیکن شیعہ ان سے پہلے والے تین خلفاء کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتے اور حضرت علیؓ کو ''پہلا امام'' کہتے ہیں۔* حضرت علیؓ کی دینداری کسی سوال سے ماورا ہے اور انہوں نے اپنے افسروں کو عادلانہ حکومت کی اہمیت کے حوالے سے متاثر کن خطوط تحریر کئے۔ انہیں 661ء میں ایک مسلمان انتہا پسند (Extremist) نے المناک انداز میں شہید کر دیا۔ سنی اور شیعہ دونوں نے یکساں طور پر اس سانحے کا غم منایا۔ ان کے بعد حضرت

* فاضل مصنفہ نے امام کا ترجمہ بریکٹ میں (Leader) درج کیا ہے' تاہم اردو داں قارئین کے لیے لیڈر سے زیادہ جامع لفظ امام ہے' سو ہم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاویہؓ خلیفہ بنے اور انہوں نے دمشق میں خلافت بنوامیہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت علیؓ کے بڑے بیٹے حضرت حسنؓ جنہیں شیعہ دوسرا امام کہتے ہیں' سیاست سے دستبردار ہو گئے۔ ان کی وفات 669ء میں مدینہ میں ہوئی۔ تاہم 680ء میں' جب خلیفہ حضرت معاویہؓ فوت ہوئے تو عراق کے شہر کوفہ کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے دوسرے بیٹے حضرت حسینؓ کی پرزور حمایت کی۔ حضرت حسینؓ مکہ میں رہتے تھے۔ حالات و واقعات سنگین ہوتے گئے اور آخرکار آپؓ نے یزید کے خلاف مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ آپؓ اپنے رفقاء اور بیویوں اور بچوں کی ایک مختصر سی جمعیت سمیت کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ خانوادۂ رسولؐ کو جبر کے خلاف گامزن دیکھ کر امت اسلام پر زیادہ مصدقہ عمل کرنے کی طرف لوٹ آئے گی۔ لیکن عاشورہ کے مقدس دن' محرم کی دس تاریخ کو' اموی فوجیوں نے حضرت حسینؓ کی اس مختصر سی فوج کو کوفہ کے باہر کربلا کے میدان میں روک لیا اور ان سب کو شہید کر دیا گیا۔ حضرت حسینؓ سب سے آخر میں شہید ہوئے۔

سانحۂ کربلا:

کربلا کا المیہ ہر شیعہ کی شخصی زندگی کا ایک لازمان (Timeless) واقعہ بن گیا۔ یزید جبر اور ناانصافی کی علامت بن گیا۔ دسویں صدی تک شیعہ ہر سال یوم عاشورہ پر حضرت حسینؓ کی شہادت کا غم مناتے تھے' وہ روتے' اپنے جسموں کو پیٹتے اور مسلم سیاسی زندگی کی بدعنوانی کے حوالے سے اپنی لافانی مخالفت کا اعلان کرتے تھے۔ شعرا حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کے لیے مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ اس طرح شیعوں نے کربلا کو مرکز بنا کر احتجاج کا مسلک تشکیل دیا۔ سماجی انصاف کی تڑپ شیعہ وژن کی اساس ہے۔ جب شیعہ عاشورۂ محرم کی رسوم ادا کرتے ہوئے جلوس نکالتے ہیں تو وہ حضرت حسینؓ کی پیروی اور جبر کے خلاف جدوجہد میں جان تک قربان کرنے کے اپنے عزم کا اعلان کرتے ہیں۔

اس مسلک کو تشکیل پذیر ہونے میں کچھ وقت لگا۔ سانحۂ کربلا کے بعد کے ابتدائی برسوں میں حضرت حسینؓ کے بیٹے حضرت علیؓ جو اس سانحے میں شہید ہونے سے بچ گئے تھے اور ان کے بیٹے محمدؒ (جنہیں بالترتیب چوتھا اور پانچواں امام تسلیم کیا جاتا ہے) مدینہ میں مقیم رہے اور انہوں نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ تاہم اسی دوران میں اموی حکمرانی سے غیر مطمئن کچھ لوگوں کے لیے پہلے امام حضرت علیؓ انصاف اور نیکی کی علامت بن گئے تھے۔ جب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عباسیوں نے بالآخر 750ء میں اموی خلافت کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور اپنی خلافت قائم کی (1260ء-750ء) تو پہلے پہل انہوں نے شیعان علیؓ سے اپنے تعلق کا اعلان کیا۔ یہ وہ شیعہ تھے جنہیں بیشتر مسلمان ''غلو'' کے ماننے والے تصور کرتے ہیں۔ عراق میں مسلمانوں کا تعلق ایک پرانی اور زیادہ پیچیدہ مذہبی دنیا سے قائم ہو چکا تھا اور بعض مسلمان عیسائی' یہودی یا زرتشتی اساطیر سے متاثر ہوئے تھے۔ بعض شیعہ حلقوں میں حضرت علیؓ کو حضرت عیسیٰؑ کی طرح خدا کی تجسیم مانا جانے لگا۔ شیعہ باغیوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے امام شہید نہیں ہوئے بلکہ غیب میں چلے گئے ہیں۔ وہ ایک روز واپس آئیں گے اور فتح کے لیے اپنے پیروکاروں کی قیادت کریں گے۔ دوسروں کو روح مقدس کے تصور نے مسحور کر لیا' جو ایک انسان میں ظہور فرما ہوتی ہے اور اسے الوہی دانش عطا کرتی ہے۔ یہ سب اساطیر ایک بہتر صورت میں' شیعوں کے باطنی وژن کے لیے اہمیت اختیار کر گئیں۔

سانحۂ کربلا شیعوں کے مذہبی وژن میں مرکزیت اختیار کر گیا۔ اس نے انسانی ہستی کے قلب میں برپا خیر و شر کی لامختتم مگر دکھائی نہ دینے والی کشمکش کی طرف ان کی توجہ مبذول کروائی۔ سانحۂ کربلا کی یاد میں منائی جانے والی رسوم نے حضرت حسینؓ کو اپنے زمانے کے مخصوص حالات و واقعات سے نکال کر انہیں ایک زندہ موجودگی دے دی' آپؓ ایک عمیق صداقت کی علامت بن گئے۔ تاہم شیعیت کے تصورات کا اطلاق حقیقی زندگی میں عملی طور پر نہیں ہو سکتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ جب عباسیوں جیسے شیعی حکمرانوں نے اقتدار حاصل کر لیا تو سیاسی زندگی کی درشت حقیقتوں نے انہیں باور کرا دیا کہ وہ ان اعلیٰ مثالیوں (Ideals) کے مطابق حکومت نہیں کر سکتے۔ عباسی خلفاء دنیاوی اصطلاح میں نہایت کامیاب تھے مگر جب ایک مرتبہ انہوں نے اقتدار حاصل کر لیا تو انہوں نے جلد ہی اپنی شیعہ انقلابیت ترک کر دی اور عمومی سنی بن گئے۔ ان کی حکومت امویوں سے زیادہ منصفانہ دکھائی نہیں دیتی لیکن سچے شیعوں کے لیے بغاوت کرنا لایعنی تھا کیونکہ کسی بھی انقلاب کو سفاکی کے ساتھ دبا دیا جاتا۔ دراصل سانحۂ کربلا سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جابر حکمران کی مخالفت کی ہر کوشش کا مقدر ناکامی سے دوچار ہونا ہے' اس سے قطع نظر کہ وہ کس قدر دین دارانہ اور عدل کے لیے کس قدر پرجوش ہے۔

چھٹے شیعی امام حضرت جعفر الصادقؒ (وفات 765ء) نے اس حقیقت کا ادراک کیا اور مسلح جدوجہد کو باقاعدہ طور پر ترک کر دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اگرچہ رسول کریمؐ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولاد ہونے کی حیثیت سے صرف وہ امت کے جائز لیڈر (امام) ہیں تاہم ان کا حقیقی کردار کسی بے ثمر تنازعے میں ملوث ہونا نہیں بلکہ شیعوں کو صحیفۂ خداوندی کی باطنی تعلیم دینا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہر امام اپنی نسل کا روحانی قائد ہوتا ہے۔ ہر امام اپنے پیشرو کا مقرر کردہ ہوتا ہے' جو اسے الوہی سچ کا خفیہ علم منتقل کرتا ہے۔ چنانچہ امام ایک منزہ عن الخطا روحانی ہدایت کرنے والا اور کامل منصف ہوتا ہے۔ اس طرح شیعہ سیاست سے دور ہو کر ایک صوفیانہ فرقہ بن گئے' جو ایسی مراقباتی تیکنیکیں استعمال کرتا ہے جن کے ذریعے قرآن کے ہر ہر لفظ کے پس پردہ موجود باطنی حکمت کو دریافت کیا جاتا ہے۔ یہ فکر عوام کے لیے نہیں تھی کیونکہ وہ اس کی غلط تعبیر کر سکتے تھے' پس شیعہ اپنے روحانی اور سیاسی تصورات کو اپنے تک ہی رکھتے تھے۔ حضرت جعفر الصادقؒ کا وضع کردہ نظریۂ امامت ایک تخیلاتی وژن تھا' جو صحیفۂ خداوندی اور تاریخ کے لفظی اور واقعی (Factual) معنی سے ماورا الغیب کی مستقل' اولین حقیقت کو دیکھتا تھا۔ جہاں کوئی غیر شیعہ صرف ایک انسان کو دیکھ سکتا تھا' وہاں شیعہ جعفر الصادقؒ میں الوہیت کا سراغ پا سکتے تھے۔

امامت روزمرہ زندگی کی خراب اور المناک صورتحال میں خدا کی رضا کو عملی جامہ پہنانے کی انتہائی دشواری کی بھی عکاسی کرتی تھی۔ جعفر الصادقؒ نے عقیدے کو شخصی اقلیم تک محدود کرتے ہوئے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا۔ انہوں نے مذہب کی حفاظت کے لیے اور ایک ایسی دنیا میں اس کو باقی رہنے کے قابل بنانے کے لیے ایسا کیا تھا' جو کہ اس کے لیے معاندانہ دکھائی دیتی تھی۔ یہ سیکولرائزیشن کی پالیسی ایک عمیق روحانی محرک سے پیدا ہوئی تھی۔ شیعہ جانتے تھے کہ مذہب اور سیاست کو ملانا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ایک صدی بعد یہ خطرہ المناک انداز میں سامنے آ گیا۔ 836ء میں عباسیوں نے اپنا دارالخلافہ سامرہ میں منتقل کر لیا' جو بغداد کے جنوب میں ساٹھ میل دور واقع تھا۔ اس زمانے تک عباسیوں کی قوت انتشار کا شکار ہو چکی تھی اور اگرچہ خلیفہ پوری اسلامی دنیا کا نام کا حکمران تو تھا لیکن سلطنت کے دور دراز علاقوں میں امیروں اور قبائلی سرداروں نے حقیقی اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ خلیفوں نے محسوس کیا کہ ایسے پریشان کن زمانے میں' اولاد رسولؐ یعنی اماموں کو آزاد نہیں رہنے دیا جائے اور 848ء میں خلیفہ المتوکل نے دسویں امام علی الہادیؒ کو مدینہ سے سامرا بلوا بھیجا' جہاں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ اور ان کے بیٹے' گیارہویں امام حسن العسکری صرف ایک وکیل (نمائندے) کے ذریعے شیعوں سے رابطہ رکھ سکتے تھے' جو عباسی حکام کی توجہ سے بچنے کے لیے بغداد کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک تجارتی علاقے میں کاروبار کیا کرتا تھا۔

874ء میں گیارہویں امام وفات پا گئے۔ شاید انہیں خلیفہ کے ایما پر زہر دے دیا گیا تھا۔ انہیں اس طرح سے الگ تھلگ رکھا گیا تھا کہ شیعہ ان کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔ سوال کھڑے ہو گئے کہ کیا ان کا بیٹا تھا؟ اگر نہیں تو جانشینی کا کیا بنے گا؟ کیا سلسلۂ امامت ختم ہو جائے گا اور اگر ایسا ہے تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیعہ صوفیانہ رہنمائی سے محروم ہو گئے؟ یہ قیاس عام ہو گیا تاہم انتہائی معروف نظریہ یہی کہتا تھا کہ دراصل حضرت حسن العسکری کا ایک بیٹا تھا ــــ ابوالقاسم محمدؑ جو بارہویں امام تھے لیکن وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے غیبت میں چلے گئے تھے۔ یہ ایک پرکشش حل تھا' کیونکہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا۔ آخری دو امام واقعتاً ناقابل رسائی تھے۔ اب امام غائب نے اپنے وکیل عثمان العمری کے وسیلے سے لوگوں کے ساتھ رابطہ جاری رکھا' جو روحانی ہدایت دیتا' زکوٰۃ اکٹھی کرتا' صحیفۂ خداوندی کی تعبیر کرتا اور قانونی فیصلے کرتا تھا لیکن اس حل کی زندگی کا عرصہ مختصر تھا۔ شیعہ مضطرب ہونے لگے کہ کیا بارہویں امام زندہ بھی ہیں؟ 934ء میں اس وقت کا وکیل علی ابن محمد السامری شیعوں کے لیے امام غائب کا ایک پیغام لایا کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ خدا نے انہیں معجزانہ طور پر چھپا لیا تھا۔ وہ قیامت سے کچھ عرصہ پہلے کسی روز واپس آئیں گے اور انصاف کی حکمرانی قائم کریں گے۔ وہ اب بھی شیعوں کے منزہ عن الخطا رہنما تھے اور امت کے واحد جائز حکمران۔ لیکن وہ اب اپنے ماننے والوں سے وکیلوں کے ذریعے یا براہ راست رابطہ نہیں رکھیں گے۔ شیعوں کو ان کی جلد واپسی کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ وہ انہیں دوبارہ صرف ''ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اور اس وقت دیکھیں گے جب زمین جبر و استبداد سے بھر جائے گی''۔

امام غائب کے تصور کو عقلی طور پر واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اسے صرف تصوف کے تناظر میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اس کو لوگوں کی حیثیت سے سمجھنا چاہیں تو بہت سے سوال ابھریں گے۔ امام دنیا میں کس جگہ چلے گئے؟ کیا وہ جگہ زمین پر ہی تھی یا کسی وسطی اقلیم میں؟ ممکنہ طور پر وہ کس قسم کی زندگی کے حامل ہو سکتے تھے؟ کیا ان کی عمر بڑھ رہی تھی؟ اگر انہیں دیکھا اور سنا نہیں جا سکتا تھا تو وہ اپنے ماننے والوں کی رہنمائی کیسے کر سکتے تھے؟ ایک ایسا شیعہ جو عقل کو نظرانداز کرنے اور ذہن کی وجدانی قوتوں کو زیادہ اہمیت دینے والے باطنی نظام کا پیروکار ہو' وہ ایسے سوالات کو احمقانہ تصور کرے گا۔ شیعہ اپنے صحیفوں اور عقائد کی لفظی تعبیر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کرتے تھے۔ اب ان کی ساری روحانیت الغیب کی ایک علامتی جستجو تھی' جو کہ ''ظاہر'' کے واقعات کے تغیر کے پس پردہ موجودہ ہوتا ہے۔ شیعہ ایک غیر مرئی خدا کی عبادت کرتے تھے' قرآن میں پوشیدہ معانی تلاش کرتے تھے' انصاف کے لیے لڑی جانے والی ایک لامختتم جنگ میں حصہ لیتے تھے' ایک امام غائب کی شدید آرزو کرتے تھے اور اسلام کے ایک ایسے روپ کو ترویج دیتے تھے جسے دنیا سے خفیہ رکھنا ہوتا تھا۔ امام غائب معمول کی تاریخ سے الگ ہو جانے کے بعد زمان اور مکان (Time and Space) کی حدود سے آزاد ہو گئے تھے اور استعادی طور پر وہ مدینہ یا سامرا میں خود اپنے اور دوسرے اماموں کے زندگی گزارنے کے زمانے کی نسبت شیعوں کی زندگیوں میں زیادہ نمایاں ہو گئے۔ وہ اس دنیا میں موجود تو ہیں مگر اس دنیا کے نہیں ہیں۔ الوہی حکمت انسانیت سے الگ نہیں کی جا سکتی ہے (کیونکہ ہم انسانی تناظر سے خدا سمیت ہر شے کا صرف تصور کر سکتے ہیں) بلکہ ہمیں عام مرد و زن کی بصیرتوں سے ماورا لے جاتی ہے۔ غیبت کے نظریے کو عقل کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا۔ تاہم اس نے انسانیت کے مذہبی تجربے میں ایک صداقت کا اظہار ضرور کیا۔

ہر باطنی روحانیت کی طرح شیعیت آج تک صرف ایک اشرافیہ کے لیے ہی تھی۔ دانشورانہ حوالے سے مہم جو مسلمان ہی اس کی طرف مائل ہوتے تھے' جن میں صوفیانہ استغراق کی صلاحیت ہوتی ہے اور انہیں اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ تاہم شیعہ دوسرے مسلمانوں سے مختلف سیاسی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ جہاں سنی روحانیت کی رسومات اور اصول سنی مسلمانوں کو زندگی کو جوں کا توں قبول کرنے میں مدد دیتے تھے' وہاں شیعہ تصوف ایک الوہی عدم اطمینان کو ظاہر کرتا تھا۔ غیبت کے نظریے کے اعلان کے تھوڑے عرصے بعد پروان چڑھنے والی ابتدائی روایات دسویں صدی عیسوی کے دوران شیعوں کی فرسٹریشن اور بے بسی کو منکشف کرتی ہیں۔ اسے ''شیعوں کی صدی'' کہا گیا ہے کیونکہ اسلامی سلطنت کے مختلف علاقوں میں بھرپور قوت کے مالک مقامی کماندار شیعہ تھے' تاہم اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑا۔ اکثریت کے لیے تو زندگی قرآن کی تعلیمات کے تناظر میں نامنصفانہ اور غیر مساویانہ تھی۔ دراصل تمام امام ان حکمرانوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے' جنہیں شیعہ بدعنوان تصور کرتے تھے: روایت یہ کہتی تھی کہ حضرت حسینؓ کے بعد ہر امام کو اموی اور عباسی خلفاء نے زہر دلوا دیا تھا۔ شیعوں نے ایک زیادہ منصفانہ اور فیض رساں معاشرتی نظام کی آرزو میں قیامت سے پہلے امام غائب کے ظہور کے نظریے کو مرکزی حیثیت دی۔ جب وہ قیامت سے پہلے آئیں گے تو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شر کی قوتوں سے جنگ کریں گے اور انصاف اور امن کے ایک سنہرے دور کا آغاز کریں گے۔ تاہم اختتام کی اس تڑپ کا یہ مطلب نہیں کہ شیعوں نے قدامت پسندانہ نظریے کو ترک کر دیا تھا اور مستقبل اساس ہو گئے تھے۔ وہ اس امر کی' کہ اشیاء کو کیسا ہونا چاہیے' اتنی بھرپور آگہی رکھتے تھے کہ انہوں نے عمومی سیاسی زندگی کو ناقابل برداشت پایا۔ امام غائب دنیا میں کسی نئی چیز کو نہیں لائیں گے بلکہ وہ تو انسانی معاملات کی ہستی کی بنیادی اصولوں سے آخری مطابقت کے لیے انسانی تاریخ کو درست کریں گے۔ اسی طرح امام کا ''ظہور'' گہرے معنوں میں ایک ایسی شے کو نمایاں کرے گا جو پہلے ہی سے ساتھ ساتھ تھی کیونکہ امام غائب تو شیعوں کی زندگی میں ایک مستقل موجودگی ہیں۔ وہ تاریک اور جابرانہ دنیا میں خدا کے نور کی ترجمانی کرتے ہیں اور امید کا واحد سرچشمہ ہیں۔

غیبت کے نظریے نے شیعی تاریخ کی اس دیومالائیت (Mythologization) کو مکمل کر دیا جس کا آغاز تب ہوا تھا' جب چھٹے امام نے سیاسی عمل کو ترک اور مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا تھا۔ اسطورہ (Myth) عملیت پسندانہ سیاسی عمل کے لیے خاکہ مہیا نہیں کرتی بلکہ ایمان والوں کو اپنے معاشرے کا تجزیہ کرنے اور اپنی داخلی زندگیوں کو سنوارنے کا طریقہ مہیا کرتی ہے۔ غیبت کی اسطورہ نے شیعیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر سیاسی بنا دیا۔ شیعہ عارضی حکمرانوں کی مخالفت کر کے خطرے مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ ایک ایسے عادل سیاسی قائد' جو دنیا میں جی نہیں سکے بلکہ انہیں غیب میں جانا پڑا یعنی امام کا تصور شیعوں کی ان کے اپنے معاشرے سے بیگانگی کو ظاہر کرتا تھا۔ اس نئے نکتۂ نظر سے ہر حکومت کو ناجائز قرار دینا پڑتا تھا کیونکہ اس نے امام غائب کے حق کو غصب کر لیا تھا۔ چنانچہ زمینی حکمرانوں سے کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی گو کہ شیعہ بقا کے لیے ہر مقتدر کے ساتھ تعاون ضرور کرتے تھے۔ وہ ''ایک طویل مدت کے بعد'' صرف آخری زمانے میں واپس آ سکنے والے انصاف کی شدید آرزو کرتے ہوئے ایک روحانی زندگی گذارتے۔ وہ صرف شیعہ علما کی اتھارٹی کو تسلیم کرتے' جنہوں نے امام کے سابقہ ''وکیلوں'' کی جگہ لے لی تھی۔ علما اپنے علم' اپنی روحانیت اور الوہی قانون میں اپنی مہارت کی وجہ سے امام غائب کے نائب اور ترجمان بن گئے۔ لیکن چونکہ تمام حکومتیں ناجائز تھیں' اس لیے وہ کوئی سیاسی عہدہ قبول نہ کرتے تھے۔

اس طرح شیعوں نے سیاست کو مکمل طور پر سیکولر بنا دیا' جسے بنیادی اسلامی اصول ''توحید'' کی خلاف ورزی تصور کیا جا سکتا تھا۔ توحید کے اصول کے تحت ریاست اور مذہب کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایسی علیحدگی ممنوع تھی۔ تاہم یہ سیکولرائزیشن ایک مذہبی بصیرت سے پیدا ہوئی تھی۔ امامت کا نظریہ مذہب اور سیاست کے بنیادی تضاد کا عکاس تھا۔ سیاسی زندگی لوگوس کی اقلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ آگے کو دیکھنے والی' عملیت پسند' مصالحت کرنے کی اہل اور معاشرے کو عقلی بنیادوں پر منظم کرنے والی ہوتی ہے۔ اسے مذہب کے مطلق مطالبوں کو زندگی کی تلخ معروضی حقیقتوں سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے۔ ماقبل جدید زرعی معاشرے کی بنیاد ایک بنیادی نابرابری پر تھی یعنی اس کا انحصار کسانوں کی محنت پر تھا' جو تہذیب کے ثمرات سے فیض یاب نہیں ہو سکتے تھے۔ محوری دور (200ء قبل از مسیح تا 700ء) کے عظیم مذاہب اسی مخمصے سے دوچار اور اس کو حل کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ جہاں کہیں وسائل غیر اطمینان بخش تھے اور جہاں ٹیکنالوجی اور ذرائع مواصلات کے فقدان نے حکمرانی کو مشکل بنا دیا تھا' وہاں سیاست زیادہ سفاک اور جارحانہ انداز میں عملی ہو گئی تھی۔ چنانچہ کسی حکومت کے لیے اسلامی مثالیے کے مطابق چلنا یا الوہی دانش کی تجسیم امام کے وجود کو برداشت کرنا انتہائی مشکل تھا' جو اس کی خامیوں کو عیاں کر کے رکھ دیتے۔ مذہبی رہنما سنگین غلط کاریوں پر فہمائش' تنقید اور احتجاج کر سکتے تھے تاہم المیہ یہ تھا کہ مقدس لوگوں کو یا تو الگ تھلگ یا قید میں رہنا تھا' جیسا کہ خلفاء نے اماموں کو سامرہ کے عسکری قلعے میں نظر بند رکھا تھا۔

حالانکہ شیعیت ایک اساطیری عقیدہ بن چکی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ غیر عقلی تھی۔ درحقیقت شیعیت اسلام کا ایک زیادہ عقلیت پسندانہ اور دانشورانہ روپ بن گئی تھی۔ شیعوں نے جانا تھا کہ وہ ان سنی الٰہیات دانوں سے مطابقت رکھتے تھے' جنہیں معتزلہ کہا جاتا تھا اور جنہوں نے قرآنی عقائد کو عقلی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ معتزلہ بھی شیعوں کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ ایک تضاد سا ہے کہ غیبت کے لاعقلی (A-Rational) نظریے نے شیعہ علماء کو دنیا کے عملیت پسندانہ معاملات میں سنی علماء سے زیادہ اپنی عقلی قوتوں کو استعمال کرنے کی آزادی دے دی تھی۔ چونکہ امام غائب مزید دستیاب نہیں تھے' اس لیے انہیں اپنی دانش ورانہ قوتوں پر بھروسہ کرنا پڑا۔ چنانچہ شیعوں میں "اجتہاد کے دروازے" کبھی بند قرار نہیں دیے گئے' جیسا کہ سنیوں نے قرار دے دیئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جب شیعوں کے امام غائب ہوئے تو پہلے پہل انہوں نے خود کو ذہنی طور پر بند ھا ہوا سا محسوس کیا تھا' تاہم تیرہویں صدی تک ایک نہ ایک ممتاز اور عالم فاضل شیعہ مذہبی پیشوا کو مجتہد کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم شیعی عقلیت پسندی ہماری مغرب کی موجودہ سیکولر عقلیت پسند سے مختلف تھی۔ شیعہ مفکر اکثر و بیشتر نقاد ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر گیارہویں صدی کے سکالر محمد المفید اور محمد الطوسی کہتے تھے کہ مذہبی پیشواؤں کو صرف روایات کا حوالہ ہی نہیں دینا چاہیے بلکہ انہیں عقل اور منطق کو استعمال کرنا چاہیے حالانکہ جو عقلی دلائل انہوں نے پیش کیے وہ کسی جدید متشکک کو قائل نہیں کر سکتے۔ مثلاً طوسی نے امامت کے نظریے کو ان بنیادوں پر ''ثابت'' کیا کہ خدا اچھا ہے اور وہ ہماری نجات چاہتا ہے' اس لیے یہ مان لینا عقلی طور پر موزوں ہے کہ وہ ہمیں ایک منزہ عن الخطا راہنما ضرور مہیا کرے گا۔ لوگ سماجی انصاف کے لیے کام کر سکتے تھے تاہم جب طوسی نے غیبت کا جواز ڈھونڈنے کی کوشش کی تو ناکام ہو گیا۔ تاہم یہ نظریہ شیعوں کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں تھا۔ عقل اور وحی ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ فقط ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی تھیں۔ ہم جدید مغرب میں اساطیر اور تصوف کو سچ کے سرچشمے کی حیثیت سے رد کر چکے ہیں اور صرف عقل پر اعتماد کرتے ہیں' طوسی جیسا کوئی مفکر دونوں کو درست اور ضروری سمجھتا۔ وہ واضح کرتا کہ اس کے صوفیانہ مراقبے کے دوران کامل محسوس ہونے والے نظریات بھی اسلامی تناظر میں معقول ہیں۔ مراقباتی تیکنیکیں ایسی بصیرتیں مہیا کرتیں جو ان کی اپنی حدود میں سچ ہوتیں' تاہم انہیں منطقی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا' لوگوں کی پیداوار کسی ریاضیاتی مساوات کی طرح۔

صفوی دورِ حکومت اور علماء:

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں پندرہویں صدی کے اختتام تک بیشتر شیعہ عرب ہوتے تھے اور وہ بالخصوص عراق میں مضبوط تھے اور وہاں بھی خاص طور پر دو مقدس شہروں نجف اور کربلا میں' جو بالترتیب حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ سے موسوم تھے۔ بیشتر ایرانی سنی تھے' تاہم ایرانی شہر قم ہمیشہ ایک شیعی مرکز رہا تھا اور رے' کاشان اور خراسان میں اچھی خاصی تعداد میں شیعہ رہتے تھے۔ پس ایرانیوں نے صفویہ صوفی سلسلے کے سربراہ انیس سالہ شاہ اسمٰعیل کی آمد پر اس کو خوش آمدید کہا۔ اس نے 1501ء میں تبریز کو فتح کیا تھا' جبکہ باقی ایران کو اگلے عشرے میں زیرنگیں لے آیا اور شیعیت کو صفوی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ اسمٰعیل کا دعویٰ تھا کہ وہ ساتویں امام کی اولاد ہے اور اس کا عقیدہ تھا کہ اس طرح اسے وہ جواز حاصل ہو گیا ہے جو کسی بھی دوسرے مسلمان حکمران کو حاصل نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم یہ واضح طور پر شیعی روایت سے انقطاع تھا۔ بیشتر شیعہ' جو ''بارہ امامی'' کہلاتے تھے (اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بارہ اماموں کو مانتے تھے)' ان کا عقیدہ تھا امام غائب کی غیر موجودگی میں کوئی حکومت جائز نہیں ہوسکتی۔ تب پھر ایک ''ریاستی شیعیت'' کیسے ہوسکتی تھی؟ اسمٰعیل نے' جو بارہ امامی روایت کے بارے میں بہت کم جانتا تھا' اس بات کی پروا نہیں کی۔ منگولوں کی یورش کے زمانے میں تشکیل پانے والا صفوی سلسلہ' جو ایک صوفیانہ برادری تھی' بنیادی طور پر تو صوفی سلسلہ تھا لیکن اس نے پرانے شیعوں کے ''غلو'' کے بعض تصورات کو اپنا لیا تھا۔ اسمٰعیل کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ الوہی ہستی ہیں اور شیعی مسیح بہت جلد آئے گا اور سنہرے دور کا آغاز کرے گا۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو بتایا کہ وہ امام غائب ہے اور غیب سے نکل آیا ہے۔ صفوی سلسلہ عوامی اور انقلابی گروہ تھا' جو کہ شیعی باطنیت کے وضعدارانہ حلقوں سے بہت دور تھا۔ اسمٰعیل ایک شیعی ریاست قائم کرنے میں کسی تذبذب کا شکار نہیں تھا اور اس نے سنی اکثریت کے ساتھ مہذبانہ بقائے باہمی کی کوشش کرنے کی بجائے سنیوں کی شدید مخالفت کی' حالانکہ جعفر الصادقؒ کے زمانے سے شیعہ سنیوں کے ساتھ بقائے باہمی کے اصول کے تحت رہتے آئے تھے۔ عثمانی اور صفوی سلطنتوں میں ایک نئی فرقہ وارانہ عدم رواداری ابھری تھی جو تقریباً اسی زمانے میں ترقی پذیر یورپ میں کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے مابین رونما ہونے والی باہمی منافرت سے مماثلت رکھتی تھی۔ حالیہ صدیوں میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان امن رہا تھا۔ تاہم سولہویں صدی کے اوائل میں عثمانیوں نے اپنی سلطنت میں شیعوں پر جبر کیا اور جب ایران میں اسمٰعیل ابھرا تو اس نے بھی عثمانیوں ہی کی طرح سنیوں پر جبر و ستم کیا۔

تاہم صفویوں کو یہ جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ مسیحانہ غلو کا نظریہ جس طرح حکومت کی مخالفت کے دوران ان کے لیے فائدہ مند رہا تھا' اب حکومت میں آجانے کے بعد ان کے لیے مزید موزوں نہیں رہا۔ شاہ عباس اول (1629ء-1588ء) غلو کے پرانے نظریے کو مٹانے کا عزم کیے ہوئے تھا' اس نے انتظامیہ میں سے اس نظریے کے حامل افراد کو ہٹا دیا اور بارہ امامی شیعیت کو فروغ دینے کے لیے عرب علماء کو بلوایا۔ اس نے دارالحکومت اصفہان اور حلہ میں ان کے لیے مدارس تعمیر کروائے' ان کے لیے املاک وقف کیں اور انہیں فیاضانہ تحائف سے نوازا۔ ابتدائی دنوں میں ایسی سرپرستی ضروری تھی کیونکہ وہ علماء دوسرے ملکوں سے آئے تھے اور مکمل طور پر شاہوں کے دست نگر تھے۔ تاہم اس سے شیعوں کی فطرت ناگزیر طور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر تبدیل ہوگئی۔ شیعہ علماء ہمیشہ اقلیت میں ہی رہے تھے۔ ان کے کبھی اپنے مدارس نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ ایک دوسرے کے گھروں میں ہی مطالعہ اور مباحثہ کیا کرتے تھے۔ اب شیعہ علما انتظامیہ میں ڈھل رہے تھے۔ اصفہان شیعیت کا سرکاری علمی مرکز بن گیا۔ شیعہ اس سے پہلے ہمیشہ حکومت سے الگ رہے تھے مگر اب علماء نے حکومت کے مذہبی فرائض کے ساتھ ساتھ قانونی اور تعلیمی نظام بھی سنبھال لیے تھے۔ انتظامی بیوروکریسی ایرانی سنیوں پر مشتمل تھی' اس لیے انہیں سیکولر ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ایران کی حکومت میں سیکولر اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم عمل میں آ گئی تھی۔

تاہم علماء صفوی ریاست سے محتاط رہے' انہوں نے سرکاری عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور رعایا ہی رہنے کو ترجیح دی۔ اس لیے ان کی حیثیت عثمانی علماء سے بالکل مختلف تھی لیکن زیادہ طاقتور۔ شاہوں کی فیاضی اور سرپرستی نے علماء کو مالی حوالے سے آزادی عطا کر دی تھی۔ جہاں عثمانی اپنے علماء کو ان کی مراعات چھین لینے سے ڈرا کر یا ان کی املاک ضبط کر کے ہمیشہ اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے وہاں شیعہ علماء کو اس انداز سے مطیع نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ جب ایرانیوں میں شیعیت پھیلی تو علماء کو اس حقیقت کا بھی فائدہ پہنچا کہ امام غائب کے مصدقہ ترجمان شاہ نہیں بلکہ وہ ہیں۔ تاہم اولین صفوی اس قدر طاقتور تھے کہ علماء کو قابو رکھ سکیں اور مذہبی پیشوائیت اس وقت تک مضبوط نہیں ہوئی تھی جب اٹھارہویں صدی تک تمام ایرانی شیعہ نہیں ہو گئے۔

لیکن اقتدار تو بدعنوان بنا دیتا ہے۔ جب صفوی سلطنت میں علماء طاقتور ہو گئے تو وہ زیادہ آمریت پسند اور حد تو یہ ہے کہ متعصب ہو گئے۔ شیعیت کے بعض زیادہ پرکشش اوصاف دب کر رہ گئے۔ اس نئے سخت گیر موقف کے بنیادگزار محمد باقر مجلسی (وفات 1700ء) تھے' جو ہر زمانے کے علماء میں سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر عالم تھے۔ شیعہ صدیوں سے صحیفۂ خداوندی کی ایک اختراعی تفہیم کی حوصلہ افزائی کرتے آئے تھے۔ تاہم باقر مجلسی صوفیانہ روحانیت اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں کے خلاف تھے' جو پرانی باطنی شیعیت میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ایران میں باقی ماندہ صوفیوں کو سزائیں دلوانا شروع کر دیا اور فلسفہ (Falsafah) کے نام سے مشہور عقلیت پسندی اور اصفہان کی صوفیانہ فلاسفی (Philosophy) کی تعلیمات کو دبانے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے تصوف اور فلسفہ دونوں کے حوالے سے عمیق بے اعتمادی کو جنم دیا جو آج بھی ایرانیوں میں موجود ہے۔ شیعہ علماء قرآن پر غور و فکر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے فقہ پر زور دینے لگے۔

باقر مجلسی نے شہادت حسینؓ کے حوالے سے نکالے جانے والے جلوسوں کو بھی نئے معانی پہنائے۔ خصوصی مجلسوں میں عراقی شیعہ واعظ کاشفی (وفات: 1504ء) کی لکھی گئی کربلا کی انتہائی جذباتی کہانی ''روداد الشہادت'' پڑھی جاتی' جبکہ لوگ بلند آواز سے گریہ و زاری کرتے۔ یہ رسومات ہمیشہ جبر کے خلاف تادم مرگ جنگ کا اظہار کرتی ہوئیں ایک انقلابی امکان کی حامل رہی تھیں۔ تاہم اب حضرت حسینؓ کو ایک مثال کے طور پر دیکھنے کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے باقر مجلسی اور ان کے رفقاء نے لوگوں کو درس دیا کہ وہ امام کو ایک سرپرست کے طور پر دیکھیں اور اگر انہوں نے آپؓ کی شہادت پر ماتم کر کے ان کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا تو وہ انہیں جنت میں بھجوائیں گے۔ اب یہ رسوم لوگوں کو طاقتور کی حمایت کرتے ہوئے اور صرف اپنے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے سٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے مخصوص ہو گئیں۔ یہ پرانے شیعی مثالئے کا زور ختم کرنا اور تحقیر تھی نیز یہ نظرئے میں تحریف بھی تھی۔ یہ مسلک عوام کو ہستی کے بنیادی قوانین اور آہنگ سے ہم آہنگی اختیار کرنے میں مدد دینے کی بجائے انہیں صرف مطیع و فرمانبردار رکھتا تھا۔ یہ ایک ایسی پیشرفت تھی جس نے ایک بالکل مختلف انداز سے ظاہر کیا تھا کہ سیاسی طاقت مذہب کے لیے کس طرح تباہ کن ہو سکتی تھی۔

باقر مجلسی کا بڑا نشانہ ستم اصفہان میں تشکیل پانے والا صوفیانہ فلسفے کا مکتب فکر تھا۔ اسے میر دیمد (وفات: 1631ء) اور ان کے شاگرد ملا صدرا (وفات: 1640ء) نے قائم کیا تھا۔ ملا صدرا ایک ایسے مفکر تھے جنہوں نے ایرانیوں کی آئندہ نسلوں پر گہرے اثرات ڈالے۔ میر دیمد اور ملا صدرا بعض علماء کی انتہا پسندی اور کٹر پن کے سخت مخالف تھے۔ وہ اسے شیعیت سے اور دراصل مذہب سے مکمل انحراف تصور کرتے تھے۔ پرانے زمانوں میں' جب شیعہ صحیفۂ خداوندی میں نہاں معانی کی جستجو کرتے تھے تب انہوں نے پوری طرح سے تسلیم کیا تھا کہ الوہی سچ لامحدود ہوتا ہے' تازہ بصیرتیں ہمیشہ ممکن ہوتی ہیں اور قرآن کی واحد تعبیر ہی کافی نہیں ہے۔ میر دیمد اور ملا صدرا کے نزدیک سچا علم کبھی بھی دانش ورانہ تصدیق کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی مذہبی اتھارٹی' خواہ وہ کتنی ہی ممتاز کیوں نہ ہو' سچ پر اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

انہوں نے اس قدامت پسند سوچ کا بھی واضح طور پر اظہار کیا کہ کامل انسانی حیات کے لیے اساطیر اور عقل دونوں ہی جوہری حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بغیر نامکمل ہیں۔ میر دیمد الٰہیات داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فطری سائنس داں بھی تھے۔ ملاصدرا نے صوفیانہ وجدان کی بصیرتوں کی تحقیر کرنے پر علماء اور عقلیت پسندانہ فکر کی اہمیت گھٹانے پر صوفیا پر تنقید کی۔ ان کے خیال میں سچے فلسفی کو ارسطو کی طرح عقلیت پسند ہونا پڑتا ہے لیکن پھر سچ کی وجد آفریں تخیلاتی تفہیم کے لیے خود اپنے سے ماورا جانا پڑتا ہے۔ دونوں مفکرین نے لاشعور کے کردار پر زور دیا جسے انہوں نے ایک ایسے منطقے کے طور پر بیان کیا جو شعوری ادراک اور دانشورانہ تجرید کی اقالیم کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ قبل ازیں صوفی فلسفی اس نفسیاتی منطقے کو عالم المثال کا نام دے چکے تھے یعنی خالص تمثالوں کی دنیا۔ یہ وژن کی اقلیم ہے جو تحت الشعور سے جنم لیتی ہے اور خوابوں اور تنویمی متخیلہ میں ذہن کی شعوری سطح پر ابھرتی ہے تاہم صوفیوں کے وجدانی اصولوں اور ریاضتوں کے ذریعے بھی اس تک رسائی پائی جا سکتی ہے۔ میر دیمد اور ملاصدرا نے باصرار کہا کہ یہ تصورات (Visions) محض داخلی فنتاسیاں (Fantasies) ہی نہیں بلکہ معروضی حقیقت ہوتے ہیں' گو کہ ان کا منطقی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں ''تخیل'' اور اسی لیے غیر حقیقی قرار دینے کی بجائے (جیسا کہ جدید عقلیت پسند قرار دیتے ہیں) ہمیں اپنی ہستی کی اس جہت سے ضرور آشنا ہونا چاہئے۔ یہ ہمارے رویوں اور ادراکات پر گہرا اثر رکھتی ہے۔ ہمارے خواب ''حقیقی'' ہوتے ہیں' یہ وہ کچھ بتاتے ہیں' جو کچھ کہ تخیلاتی ہے' ہم اپنے خوابوں میں جس کا تجربہ کرتے ہیں۔ اساطیر تخیلات کے لاشعوری تجربے کو منظم کرنے کی ایک کوشش تھی' جس نے انسان کو اپنی ہستی کے بنیادی گوشوں سے ربط استوار کرنے کے قابل بنایا۔ عہد حاضر میں لوگ ذہن لاشعور (Unconscious Mind) کی کارکردگی کی ویسی ہی بصیرت تحلیل نفسی (Psychoanalysis) سے حاصل کرتے ہیں۔ اصفہان کے صوفیانہ مکتب فکر نے' جس کے بنیاد گزار میر دیمد اور ملاصدرا تھے' اس بات پر زور دیا کہ سچ وہ نہیں ہے جس کا ادراک منطقی' غیر شخصی اور قانونی طور پر کیا جائے بلکہ یہ ایک داخلی جہت کا حامل ہوتا ہے جسے ہمارے شعور کو نہیں کاٹنا ہے۔

اس فکر نے ناگزیر طور پر بعض نئے سخت گیر شیعہ علماء سے ان کا ٹکراؤ کروا دیا' جنہوں نے ملاصدرا کو اصفہان سے نکلوا دیا۔ وہ دس برس تک قم کے نزدیک ایک چھوٹی سی بستی میں قیام پذیر رہنے پر مجبور ہو گئے۔ علیحدگی کے اس عرصے کے دوران انہوں نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ صوفیانہ فلسفے سے ان کی وابستگی کے باوجود ان کی مذہبی فکر ہنوز ذہنی ہی ہے۔ فقہ یا خارجی الٰہیات کا مطالعہ ہمیں صرف مذہب کے بارے میں معلومات مہیا کر سکتا ہے' یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخصی قلب ماہیئت اور روشنی پیدا نہیں کر سکتی جو کہ مذہبی جستجو کی حتمی منزل ہے۔ ایسا تبھی ہو سکا تھا جب انہوں نے ارتکاز کی صوفیانہ تیکنیکوں پر عمل کیا تھا اور اپنے اندر عالم المثال میں اتنا گہرا اتر گئے تھے کہ ان کا دل ''جلنے لگا'' اور ''الوہی روشنی مجھ پر پڑنے لگی.....اور میں ان اسرار کو پانے کے قابل ہو گیا جنہیں میں پیشتر ازیں نہیں سمجھا تھا''، انہوں نے بعد ازاں اپنی کتاب ''الاسفار الاربعہ'' میں توضیح کی تھی۔

صدرا کے صوفیانہ تجربے نے انہیں قائل کر لیا کہ انسان اس دنیا میں کاملیت (Perfection) حاصل کر سکتا ہے۔ تاہم قدامت پسند تصور سے سچائی کے ساتھ جس کاملیت کا نظریہ انہوں نے پیش کیا وہ کسی نئی اور اعلیٰ تر حالت کی طرف ارتقا نہیں تھا بلکہ حضرت ابراہیمؑ اور دیگر پیغمبروں کے اور یکجل خالص وژن کی طرف واپسی تھی۔ یہ خدا کی طرف' تمام ہستی کے سرچشمے کی طرف واپسی تھی۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا صوفی کو اس دنیا کو لازماً ترک کر دینا چاہیے۔ ''الاسفار الاربعہ'' میں انہوں نے ایک کرشماتی سیاسی قائد کے صوفیانہ سفر کو بیان کیا ہے۔ اول' اسے انسان سے خدا کی طرف لازماً سفر کرنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ خدا کی ہر ہر صفت پر غور کرتے ہوئے الوہی فضا میں سفر کرتا ہے تاوقتیکہ وہ ان سے ناقابل فسخ وحدت کے وجدانی شعور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح خدا کے چہرے کو تکتے ہوئے اس کی قلب ماہیئت ہو جاتی ہے اور اسے توحید کے حقیقی معانی کا نیا ادراک ہوتا ہے اور ایک نئی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے تیسرے سفر میں وہ قائد واپس نوع انسان کی طرف آتا ہے اور پاتا ہے کہ اب وہ دنیا کو بالکل مختلف طور پر دیکھ رہا ہے۔ اس کا چوتھا اور آخری سفر اس دنیا میں خدا کے کلام کی تبلیغ اور الوہی قانون کے اطلاق کے نئے طریقوں کی دریافت اور معاشرے کو خدا کی رضا کے مطابق ازسرنو تشکیل دینے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا وژن تھا جو معاشرے کی کاملیت کو روحانی ارتقا سے مربوط کرتا تھا۔ عدل اور مساوات کا قیام روحانی اور مذہبی عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ ملاصدرا کے وژن نے مادی عالم میں معاشرے کی قلب ماہیئت کو صوفیانہ اور اساطیری تناظر سے' جو کہ اسے معنویت عطا کرتا ہے' ناقابل انقطاع تصور کرتے ہوئے عقلیت پسندانہ کوشش کو جوہری طور پر اہم قرار دے کر سیاست اور روحانیت کو ملا دیا' جو کہ بارہ امامی شیعیت میں الگ الگ قرار دی جا چکی تھیں۔ یوں ملاصدرا نے شیعی قیادت کا ایک نیا نمونہ (Model) پیش کیا' جس نے ہمارے زمانے میں ایرانی سیاست پر گہرا اثر مرتب کیا۔

ملاصدرا کے وژن کے مطابق روحانی سیاسی قائد الوہی بصیرت کا حامل ہو گا لیکن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں پر اپنی مذہبی آراء اور اعمال کو تھوپ سکتا ہے۔ ملاصدرا کے خیال میں اگر وہ ایسا کرے گا تو مذہبی سچ کے جوہر کو رد کر دے گا۔ ملاصدرا علماء کی بڑھتی ہوئی طاقت کے شدید مخالف تھے اور سترہویں صدی میں ایران میں فروغ پاتے ہوئے ایک بالکل نئے تصور کے حوالے سے بالخصوص متفکر تھے۔ بیشتر علماء اب اس ایقان کے حامل تھے کہ زیادہ تر مسلمان عقیدے کے بنیادی اصولوں کی تعبیر خود کرنے کے اہل نہیں تھے۔ چونکہ علماء امام غائب کے واحد ترجمان تھے اس لیے عام لوگوں کو ایک مجتہد کا انتخاب لازماً کرنا ہوگا' جو کہ اجتہاد کرنے پر قادر ہوگا اور انہیں اس کی قانونی ہدایات کے مطابق اپنے رویوں کو ڈھالنا چاہیے۔ ملاصدرا کو ''اصولیوں'' کے ان دعوؤں سے صدمہ پہنچا تھا۔ ان کے خیال میں ہر وہ مذہب جس کی بنیاد ''تقلید'' پر ہو خلقی طور پر ''آلودہ'' ہوتا ہے۔ تمام شیعہ پیغمبروں اور اماموں کی ''اخبار'' کو سمجھنے کے اہل ہیں اور خود ہی نماز اور رسوم سے اخذ کردہ روحانی بصیرت اور عقل کی اساس پر حل تلاش کر سکتے ہیں۔

جیسے جیسے سترہویں صدی آگے بڑھی اصولیوں اور ان کے مخالفین کے مابین تنازع شدید تر ہوتا چلا گیا۔ صفویوں کا اقتدار زوال کا شکار ہونا شروع ہو گیا تھا اور معاشرہ انتشار کی زد میں آ گیا۔ لوگ علماء کو نظم (Order) بحال کرنے والی واحد اتھارٹی کے طور پر دیکھتے تھے لیکن ان کی اتھارٹی کے حوالے سے ان کے اندر آپس میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس مرحلے پر بیشتر ایرانیوں نے ''اصولیوں'' کی مخالفت کی اور ''اخباریوں'' کی پیروی کی' جو کہ ماضی کی روایت پر بھروسہ کرتے تھے۔ اخباریوں نے اجتہاد کی مذمت کی اور قرآن وسنت کی ایک لفظی تعبیر کو فروغ دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ تمام قانونی فیصلے قرآن' رسول کریمؐ یا اماموں کے صریح بیانات کی بنیاد پر کیے جانے چاہئیں۔ جن معاملات میں کوئی فیضانی قانون موجود نہ ہو' ان میں مسلمان فیصلہ کرنے والوں کو اپنی عقل پر بالکل انحصار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ایسے معاملات سیکولر عدالتوں کو بھیج دینے چاہئیں۔ اصولی زیادہ لچک دار سوچ کے خواہاں تھے۔ فیصلہ کنندگان درست فیصلے کرنے کے لیے اپنی استدلالی قوتوں کو اسلامی روایت کے تحت تشکیل دیئے گئے قانونی اصولوں کی بنیاد پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ''اخباری'' ماضی میں اس قدر غلطاں ہیں کہ اسلامی فقہ نئے چیلنجوں سے نمٹنے کی اہل نہیں رہی۔ ان کا استدلال تھا کہ امام غائب کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ کنندہ حرف آخر نہیں ہے اور کسی نظیر کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دراصل ان کا کہنا تھا کہ مومنوں کو ماضی کی کسی قابل احترام اتھارٹی کی بجائے ہمیشہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندہ مجتہد کے فیصلوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ دونوں فریق ایک معاشرتی اور سیاسی عدم استحکام کے زمانے میں قدامت پسند روح کے ساتھ سچے رہنے کی کوشش کر رہے تھے اور دونوں ہی اصولی طور پر الوہی قانون سے مربوط تھے۔ نہ اصولیوں نے اور نہ ہی اخباریوں نے دانشورانہ تصدیق پر زور دیا' ایسا صرف مذہبی عمل یا رویے کے معاملے میں تھا کہ مومنوں کو یا تو صحیفۂ خداوندی کے لفظی احکام یا مجتہد کے فیصلوں کو ماننا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود دونوں فریق کوئی شے کھو چکے تھے۔ اخباریوں نے قانون کی صورت میں ظاہر ہونے والے اولین الوہی امر کو ماضی کی تاریخی روایت سے خلط ملط کر دیا تھا۔ وہ ظاہر پرست (Literalist) بن چکے تھے اور جوہری طور پر قدیم شیعیت کے علامتی مذہب سے دور ہو چکے تھے۔ ان کے وژن میں تو عقیدہ حتمی ہدایت ناموں کا ایک سلسلہ بن چکا تھا۔ اصولیوں کو انسانی عقل پر زیادہ اعتماد تھا' جو ہنوز ان کے مذہب کی مقدس سے وابستہ تھی۔ لیکن مومنوں سے اپنے ہی فیصلے کی توثیق کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے ملا صدرا کے فرد کی مقدس آزادی کے ایقان کو کھو دیا تھا۔

سترہویں صدی تک ایک قانونی مقتدرہ (Authority) کا قیام انتہائی ضروری ہو چکا تھا' جو کہ ریاست کی کمزوری کی تلافی کر سکے۔ تجارت برباد ہو چکی تھی' جس سے معاشی عدم تحفظ پیدا ہوا اور آخری شاہوں کی نااہلی نے ان کی ریاست کو صید زبوں بنا دیا۔ جب 1722ء میں افغان قبیلوں نے اصفہان پر حملہ کیا تو شہر نے رسوا کن انداز میں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ایران انتشار کے دور میں داخل ہو گیا اور ایک وقت تو ایسا آیا کہ وہ ایک الگ اکائی کے طور پر وجود کھو بیٹھا۔ شمال سے روسیوں نے چڑھائی کر دی' مغرب سے عثمانیوں نے یورش کر دی اور افغانوں نے جنوب اور مشرق میں اپنا قبضہ مضبوط کر لیا۔ تاہم طہماسپ دوم نے' جو سلطان حسین شاہ کا تیسرا بیٹا تھا' اصفہان کو محاصرے سے نکال لیا اور افشار قبیلے کے سردار نادر خان کی مدد سے حملہ آوروں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ 1736ء میں نادر خان نے طہماسپ کو بے دخل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔ اس نے ملک پر سفاکی کے ساتھ مگر مؤثر انداز سے حکومت کی تاوقتیکہ 1748ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ پھر ایک تاریک' شورشوں سے بھرا ہوا فترۂ حکومت شروع ہوا۔ ترکمان قاچار قبیلے کے آقا محمد خان نے اقتدار پر قبضہ کیا اور 1794ء میں اپنی حکومت کو مستحکم کر لیا۔ یہ قاچار خاندان بیسویں صدی کے اوائل تک حکمران رہا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان بحرانی برسوں میں دو اہم مذہبی پیشرفتیں ہوئیں۔ نادر خان نے ایران میں سنت کو دوبارہ مستحکم کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ممتاز علماء نے اصفہان چھوڑ دیا اور عثمانی سلطنت کے علاقے عراق میں نجف اور کربلا کے مقدس شہروں میں پناہ گزیں ہو گئے۔ پہلے تو یہ ایک ناکامی لگتی تھی تاہم بعد میں یہ علماء کے لیے ایک فائدہ ثابت ہوئی۔ کربلا اور نجف میں بھی انہیں عظیم تر خودمختاری حاصل ہوئی۔ وہ سیاسی اعتبار سے شاہوں کی پہنچ سے باہر تھے اور مالی اعتبار سے آزاد تھے اور رفتہ رفتہ وہ دربار کے لیے چیلنج بنتے ہوئے ایک متبادل حکومت بن گئے۔ اس عہد کی دوسری اہم تبدیلی اصولیوں کی فتح تھی' جو ایک حد تک ممتاز سکالر وحید بہبہانی کے متشددانہ طریقوں سے حاصل ہوئی تھی' جس نے اجتہاد کے کردار کو نہایت صراحت کے ساتھ متعین کیا تھا اور فیصلہ کنندگان کے لیے اس کا استعمال ضروری بنا دیا تھا۔ جو شیعہ اصولیوں کے مؤقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا اسے کافر قرار دے دیا جاتا اور مخالفت کو بے رحمی کے ساتھ کچل دیا جاتا تھا۔ کربلا اور نجف میں لڑائی ہوئی جس میں کچھ اخباری ہلاک ہو گئے۔ اصفہان کے صوفیانہ فلسفے پر بھی پابندی لگا دی گئی اور تصوف کو اتنی سفاکی کے ساتھ کچلا گیا کہ وحید کا بیٹا علی جلا مشہور ہو گیا۔ تاہم' جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' مذہبی معاملات میں جبر عمومی طور پر نقصان کا باعث بنتا ہے۔ تصوف زیرزمین چلا گیا اور ایسے منحرفین اور دانش وروں کے تصورات کی صورت گری کرتا رہا' جو سٹیٹس کو (Status Quo) سے جنگ کر رہے تھے۔ وحید کی فتح ایرانی علماء کے لیے ایک سیاسی کامیابی تھی۔ اصولی مؤقف فترۂ حکومت کے شورش زدہ برسوں کے دوران عوام میں مقبول تھا کیونکہ اس نے انہیں ایک ایسی کرشماتی اتھارٹی کا سرچشمہ مہیا کر دیا تھا جس نے کسی حد تک نظم کو بحال کر دیا۔ مجتہد سیاسی خلا میں قدم رکھنے کے اہل تھے اور انہوں نے عوام میں اپنی قوت کبھی نہیں کھوئی تھی۔ لیکن وحید نے استبدادی ذرائع سے جو فتح حاصل کی تھی' وہ مذہبی اعتبار سے شکست تھی کیونکہ وہ اماموں کے رویے اور مثالیوں سے بہت دور ہو گئی تھی۔

جدید مغرب کی اسلامی دنیا پر اولین یورش:

اٹھارہویں صدی کے اختتام تک عثمانی اور ایرانی سلطنتیں بحران کا شکار تھیں۔ وہ اپنے وسائل ختم کر بیٹھنے والی ایک زرعی تہذیب کے ناگزیر انجام سے دوچار ہو گئی تھیں۔ محوری دور سے قدامت پسند روح نے ایک ایسے معاشرے کی محدودیتوں کو ایک عمیق سطح پر قبول

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے میں مدد دی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قدامت پسند معاشرے جامد اور مرگ پسند تھے۔ بلکہ اس روحانیت نے تو اسلامی دنیا میں عظیم ثقافتی اور سیاسی کارناموں کے لیے فیضان (Inspiration) عطا کیا تھا۔ سترہویں صدی تک اسلام دنیا کی عظیم ترین قوت تھا۔ تاہم یہ سیاسی' دانش ورانہ اور فن کارانہ کاوشیں ایک اساطیری تناظر کے اندر کی گئیں جو کہ یورپ میں ارتقاپذیر نئے مغربی کلچر کی اقدار کے لیے اجنبی ہوتا۔ جدید یورپ کے بہت سے تصورات مسلمانوں کے لیے شناسا اور موافق تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کا عقیدہ ایسے رجحانات تشکیل دینے کی حوصلہ افزائی کرتا تھا جو ان رجحانات سے مماثلت رکھتے تھے جنہیں جدید مغرب نے فروغ دیا: معاشرتی انصاف' مساوات' فرد کی آزادی' انسان اساس روحانیت' ایک سیکولر نظام سیاست' ایک شخصی عقیدہ اور عقلیت پسندانہ فکر کا فروغ۔ تاہم نئے یورپ کی دیگر خصوصیات اپنانا قدامت پسندی کے تحت پروان چڑھنے والے لوگوں کے لیے دشوار تھا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک مغرب دانش ورانہ اعتبار سے مسلمانوں سے آگے نکل چکا تھا اور چونکہ اس زمانے میں مسلمان سلطنتیں بھی سیاسی حوالے سے کمزور تھیں' اس لیے وہ یورپی ریاستوں کا آسان شکار بن گئے' جو کہ اس وقت اپنی عالمی اجارہ داری کے لیے پرتول رہی تھیں۔ برطانویوں نے پہلے ہی ہندوستان میں اپنے آپ کو مستحکم کرلیا تھا اور فرانس اپنی سلطنت تشکیل دینے کا عزم کیے ہوئے تھا۔ 19 مئی 1798ء کو نپولین 38000 فوجیوں اور 400 بحری جہازوں کے ساتھ تولون سے مشرق وسطیٰ روانہ ہوا تاکہ مشرق میں برطانوی قوت کو چیلنج کیا جائے۔ فرانسیسی بحری بیڑے نے یکم جولائی کو بحیرۂ روم پار کیا اور نپولین نے 4300 فوجیوں کو اسکندریہ اتارا' جنہوں نے اگلے دن صبح ہونے کے تھوڑی دیر بعد شہر کو فتح کرلیا۔ اس طرح اسے مصر میں ایک مرکز (Base) حاصل ہوگیا۔ نپولین اپنے ساتھ بہت سے علماء (سکالرز)' جدید یورپی ادب کی لائبریری' ایک سائنسی لیبارٹری اور عربی ٹائپ کے ساتھ ایک چھاپہ خانہ (پرنٹنگ پریس) لایا تھا۔ مغرب کا نیا سائنسی' سیکولر کلچر اسلامی دنیا پر یورش کرچکا تھا اور وہ دوبارہ کبھی پہلے جیسی نہیں ہونا تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

عیسائی بنیاد پرستی کا تاریخی پس منظر

(1492ء۔1700ء)

جدیدیت کا آغاز:

عین اس وقت جب یہودی سپین سے جلاوطنی کے المناک نتائج سے نبرد آزما تھے اور مسلمان اپنی تین عظیم سلطنتیں قائم کر رہے تھے' مغرب کے عیسائی ایک ایسے سفر کا آغاز کر رہے تھے' جس نے انہیں پرانی دنیا کے ایقان اور تقدس سے بہت دور لے جانا تھا۔ وہ ایک ولولہ انگیز دور تھا' مگر پریشان کن بھی۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران بلیک ڈیتھ (Black Death) * نے عیسائی دنیا کی ایک تہائی آبادی کو ہلاک کر دیا تھا اور یورپ کے ملک انگلینڈ اور فرانس کے مابین سو سالہ جنگ (Hundred Years War) اور طرفین کی تباہی کا موجب اطالوی جنگوں جیسے بحرانوں سے تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ یورپیوں نے 1453ء میں عیسائی بازنطین پر عثمانی فتح کا صدمہ بھی سہا تھا۔ پوپ کے ''ایوگنن کجروی'' (Avignon Captivity) کے سکینڈل اور ''افتراقِ عظیم'' (Great Schism) ..... جب تین پونٹف (Pontiff) سینٹ پیٹر کی جانشینی کے دعویدار تھے..... کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے چرچ پر اعتقاد کھو دیا۔ لوگ خوفزدہ تھے اور انہیں ادراک ہو رہا تھا کہ وہ اب پرانے انداز سے مذہبی نہیں رہ سکتے ہیں۔ تاہم یہی زمانہ روشن خیالی اور خودمختاری کا بھی دور تھا۔ آئبیریائی دریافت کنندگان (Iberian Explorer) نئی دنیا کو دریافت کر چکے تھے' فلکیات داں آسمانوں کے راز افشاء کر رہے تھے اور یورپیوں کی تیکنیکی ترقی انہیں اپنے ماحول پر ایسی گرفت عطا کر رہی تھی

* طاعون کی ہولناک وبا۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو پہلے کبھی کسی کو حاصل نہیں رہی تھی۔ جہاں قدامت پسند روح مردوزن کو احتیاط سے متعین کردہ حدود کے اندر ہی جینے کا درس دیتی تھی' وہاں مغربی عیسائی دنیا کے نئے کلچر نے ظاہر کیا کہ معلوم دنیا (Known World) کی حدود سے پرے جانا بھی ممکن ہے۔ اس سے پرانا اساطیری مذہب ناممکن ہوکر رہ گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ مغربی جدیدیت عقیدے کے لیے خلقی طور پر معاند ہے۔

تاہم مغربی معاشرے کی قلب ماہیئت (Transformation) کے ابتدائی مراحل میں معاملہ ایسا نہیں تھا۔ تبدیلی کی دہلیز پر بہت سے دریافت کنندگان' سائنس دانوں اور مفکروں کا ایقان تھا کہ وہ مذہب کو مٹا دینے کی بجائے مذہبی ہونے کے نئے طریقے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم اس باب میں ان کی کچھ عقدہ کشائیوں (Solutions) کا تجزیہ کریں گے اور ان کے عمیق نتائج پر غور کریں گے۔ تاہم یہ بات واضح ہونا بہت اہم ہے کہ جو انسان جدید روح (Moder Spirit) کے ترجمان بن گئے تھے' انہوں نے اسے خود تخلیق نہیں کیا تھا۔ سولہویں صدی تک یورپ میں' اور بعدازاں اس کی امریکی نوآبادیوں میں' ایک پیچیدہ عمل جاری تھا جو لوگوں کے سوچنے اور دنیا کا تجربہ کرنے کے طریقے کو تبدیل کررہا تھا۔ تبدیلی آہستہ آہستہ رونما ہوتی تھی اور اکثر قابل قبول انداز میں۔ بیک وقت کئی شعبوں میں ایسی ایجادات واختراعات ہوئیں' جن میں سے کوئی بھی اس زمانے میں فیصلہ کن نہیں لگتی تھی' تاہم ان کے مجموعی اثرات نتیجہ خیز تھے۔ یہ سب دریافتیں ایک عملیت پسندانہ' سائنسی روح کو تشکیل دے رہی تھیں جو آہستہ آہستہ پرانے قدامت پسندانہ اساطیری مذہب کی جڑیں کھوکھلی کررہی تھی اور لوگوں کو خدا' مذہب' ریاست' فرد اور معاشرے کے حوالے سے نئے تصورات قبول کرنے پر آمادہ کررہی تھیں۔ یورپ اور امریکی نوآبادیات کو مختلف سیاسی انتظامات کے ذریعے تبدیلیوں کو قابل قبول بنانے کی ضرورت درپیش تھی۔ کسی بھی دوررس معاشرتی تبدیلی کے دور کی طرح وہ عہد بھی تشدد آمیز تھا۔ تباہ کن جنگیں اور انقلابات' متشددانہ بغاوتیں' دیہاتی علاقوں کی بربادی اور ہولناک مذہبی فسادات رونما ہوئے۔ تین سو برس کے دوران یورپیوں اور امریکیوں کو اپنے معاشرے کو جدید بنانے کے لیے سفاکانہ طریقے استعمال کرنا پڑے۔ خونریزی ہوئی' عذاب وسزا کا سلسلہ چلا' بڑے پیمانے پر قتل وغارت ہوا' استحصال کیا گیا اور لوگوں کو غلام بنایا گیا۔ ہم آج ترقی یافتہ دنیا کے جدیدیت پذیری کے اذیت ناک عمل سے گزرنے والے ملکوں میں ایسی ہی خونیں کارروائیوں کا مشاہدہ کررہے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایجادات اور ان کے اثرات:

زراعت میں جدیدیت اس سارے عمل کا ایک چھوٹا سا تجربہ تھا' تاہم بڑھتی ہوئی پیداواریت اور زیادہ صحت مند مویشیوں نے ہر کسی کی زندگی پر اثر ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ بھی زیادہ خصوصی ترقیاں ہوئیں۔ لوگوں نے زیادہ کارآمد آلات بنانا شروع کیے: قطب نما' دوربین' محدب عدسے نئی دنیاؤں کو منکشف کر رہے تھے اور بہتر نقشے' چارٹ اور بحری جہاز رانی کی تیکنیکیں عطا کر رہے تھے۔ سترہویں صدی کے مائیکروسکوپسٹ (Microscopist) انٹون وان لیون ہک نے پہلی مرتبہ بیکٹیریا' سپرمیٹوزوآ اور دوسری خوردبینی مخلوقات کا مشاہدہ کیا اور اس کے مشاہدوں نے تخلیق کے نئے عملوں کا راستہ دکھایا۔ اس کا صرف یہ عملیت پسندانہ اثر ہی نہیں ہوا کہ بیماریوں کا خاتمہ کر دیا گیا بلکہ اس نے حیات اور موت سے وابستہ بہت سے اساطیری تصورات کی بنیادوں کو بھی تباہ کر دیا۔ طب ارتقا پانے لگی گو کہ طریقۂ علاج انیسویں صدی تک خامیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سترہویں صدی کے دوران پہلی مرتبہ نکاسی' آب کے حوالے سے تشویش میں اضافہ ہوا اور بہت سی بیماریوں کو پہلی مرتبہ درست طور پر تشخیص کیا گیا۔ ارضی سائنسیں ترقی پانا شروع ہوئیں نیز زلزلوں اور آتش فشاں پہاڑوں جیسے مظاہر (Phenomena) کے حوالے سے بحث و مباحثہ شروع ہوا' جس نے ان کے بارے میں موجود اساطیری خوف مٹا دیئے۔ مکینیکل آلات کو بہتر بنایا گیا۔ گھڑیاں زیادہ اعتبار کے قابل ہونے لگیں اور یہ پیشرفت وقت کی سیکولرائزیشن کا پیش خیمہ بنی۔ ریاضیاتی اور شماریاتی تیکنیکوں کے اطلاق نے لوگوں کو مستقبل کا ایک مکمل طور پر نیا شعور عطا کیا: 1650ء اور 1660ء کے عشروں میں لفظ ''امکان'' (Probable) کے معانی بدلنا شروع ہوئے۔ اس کا معنی قدامت پسندانہ عہد کی طرح ''مسلمات کا سند یافتہ'' ہونے کی بجائے ''تمام شواہد کے تناظر میں غالباً ہونے والا'' طے پا گیا۔ آئندہ کی دنیا کے حوالے سے اس آزادانہ رجحان اور اعتماد نے نئے سائنسی ثبوت اور بیوروکریٹک عملیت پسندی کو جنم دیا۔ برطانوی شماریات داں (Statisticians) ولیم پیٹری اور جان گرانٹ نے زندگی کی امکانیت میں خاص طور پر دلچسپی لی اور اٹھارہویں صدی کے اوائل تک یورپ کے لوگوں نے اپنی زندگیوں کا بیمہ کروانا شروع کر دیا۔ یہ سب پیشرفتیں قدامت پسندانہ نظام کے لیے تباہ کن امکانات کی حامل تھیں۔

ان میں سے کوئی پیش رفت بھی اپنے آپ میں فیصلہ کن نہیں لگتی تھی تاہم مجموعی طور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر ان کے اثرات انقلابی نوعیت کے تھے۔ 1600ء تک یورپ میں ایجادات اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہی تھیں کہ ترقی کا عمل پسپا ہونے والا نہیں محسوس ہوتا تھا۔ ایک شعبے میں ہونے والی ایجاد دوسرے شعبوں میں انکشافات کا باعث بنتی۔ اس عمل کو نہ رکنے والا تحرک حاصل ہو گیا تھا۔ دنیا کو بنیادی اور تبدیل نہ ہونے والے قوانین کے تحت چلنے والی تصور کرنے کی بجائے یورپی اس حقیقت سے آگاہ ہو رہے تھے کہ وہ فطرت کو جان سکتے ہیں اور اس کو تسخیر کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے ماحول پر ہمیشہ سے زیادہ گرفت رکھتے تھے اور اپنی مادی خواہشات کو آسودہ کر سکتے تھے۔ تاہم جیسے جیسے لوگ اپنی زندگیوں کی اس عقلیت پسندی کے عادی ہوتے گئے لوگوس حاوی ہوتا گیا اور اسطورہ اعتبار گنواتی چلی گئی۔ لوگوں کو مستقبل کے حوالے سے زیادہ تیقن محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ خوفناک نتائج سے بے نیاز ہو کر تبدیلی عمل میں لا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر امیر لوگ' اُس توقع پر کہ ایجادات کا عمل جاری رہے گا اور تجارت ترقی پاتی رہے گی' اپنے سرمائے کو منظم طور پر خرچ کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس سرمایہ دارانہ معیشت نے مغرب کو زراعت اساس پرانے معاشروں کی محدودیتوں سے چھٹکارا پا کر اپنے وسائل کو لامحدود بنانے کی اہلیت عطا کی۔ معاشرے کو عقلیت پسندانہ اور تیکنیکی سانچے میں ڈھالنے کا نتیجہ انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب کی صورت میں سامنے آیا۔ مغربی لامحدود ترقی کے حوالے سے اس قدر پراعتماد تھے کہ وہ فیضان کے لیے اب ماضی کی طرف مزید نہیں دیکھتے تھے بلکہ زندگی کو مستقبل میں حاصل ہونے والی عظیم ترین کامیابیوں کا ایک خوف سے بے نیاز سفر تصور کرتے تھے۔

جمہوریت' رواداری اور عالمگیر انسانی حقوق:

اس عمل میں معاشرتی تبدیلی بھی شامل تھی۔ جدیدیت پذیری کے عمل میں بالکل نچلی سطح پر لوگوں کی شراکت درکار تھی۔ چنانچہ عام لوگ پرنٹر' مشینسٹ اور فیکٹری ورکر بننے لگے اور انہوں نے بھی ایک حد تک کارکردگی کے جدید معیارات کو پا لیا۔ لوگوں کو تھوڑی بہت تعلیم کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہونے لگی۔ محنت کشوں کی بڑھتی ہوئی تعداد تعلیم یافتہ ہو گئی تھی اور جب ایک مرتبہ ایسا ہو گیا تو وہ اپنے معاشرے کے فیصلہ سازی کے عمل میں اپنے زیادہ حصے کا مطالبہ کرنے لگے۔ ایک زیادہ جمہوری حکومت بہت ضروری ہو گئی۔ اگر کوئی قوم اپنے تمام تر انسانی وسائل کو جدیدیت پذیری اور اپنی پیداواریت (Productivity) بڑھانے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے استعمال کرنا چاہتی تو اسے یہودیوں جیسے اب تک الگ تھلگ رکھے گئے گروپوں کو مرکزی دھارے کے کلچر میں شامل کرنا ضروری تھا۔ نیا تعلیم یافتہ محنت کش طبقہ پرانی اجارہ داریوں کی مزید محکومی نہیں کر سکتا تھا۔ جمہوریت' رواداری اور عالمگیر انسانی حقوق' جو مغربی سیکولر کلچر کی مقدس اقدار بن چکے تھے' جدیدیت پذیری کے اجزاء کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔ وہ مدبروں (Statsmen) اور سیاست دانوں (Political Scientists) کے خوابوں میں دیکھے گئے خوب صورت تصورات ہی نہیں تھے بلکہ جدید ریاست کی ضرورتوں سے پیدا ہوئے تھے۔ اوائلی جدید یورپ میں معاشرتی' سیاسی' معاشی اور دانش ورانہ تبدیلی ایک مربوط عمل کا حصہ تھی' ہر عنصر دوسرے پر انحصار کرتا تھا۔ جمہوریت کو کسی جدید معاشرے کو منظم کرنے کا ایک انتہائی کارگر اور پیداواری طریقہ پایا گیا اور ترقی کے عمل میں پیچھے رہ جانے والی مشرقی یورپی ریاستیں اس کا واضح ثبوت بن گئیں' جنہوں نے بعض گروپوں کو مرکزی دھارے سے باہر رکھنے کے لیے ہولناک اقدامات کیے تھے۔

چنانچہ یہ ایک مسحور کر دینے والا زمانہ تھا تاہم ایک صدمہ انگیز سیاسی تبدیلی بھی' جسے لوگوں نے مذہبی طور پر قبول کرنے کی کوشش کی۔ عقیدے کی وسطی عہد کی صورتیں مزید راحت آفریں نہیں رہی تھیں' کیونکہ وہ ان تبدیل شدہ حالات میں واضح طور پر مؤثر نہیں رہی تھیں۔ مذہب کو بھی زیادہ فعال اور جدید ہونا پڑا' جیسا کہ سولہویں صدی میں کیتھولک ریفارمیشن (Reformation) میں ہوا۔ تاہم ابتدائی جدید عہد کی اصلاح پسندانہ تحریکوں نے یہ عیاں کر دیا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ سولہویں صدی میں جدیدیت پذیری کا عمل خوب فروغ پا رہا تھا' یورپی ہنوز قدامت پسند روح سے جڑے ہوئے تھے۔ عظیم مسلمان مصلحین کی طرح پروٹسٹنٹ اصلاح پسند بھی تبدیلی کے عہد میں ماضی کی طرف واپسی کے ذریعے ایک نیا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مارٹن لوتھر (1556ء-1483ء)' جان کیلون (64-1509ء) اور ہلڈرچ زونگلی (1531ء-1484ء) نے عیسائی روایت کے سرچشموں کی طرف ہی دیکھا۔ جہاں ابن تیمیہؒ نے قرآن و سنت کے خالص اسلام کی طرف واپسی کے لیے وسطی عہد کی الٰہیات اور فقہ کو رد کیا وہاں لوتھر نے بھی اسی طرح عہد وسطیٰ کے مکتبی الٰہیات دانوں پر تنقید کی اور بائبل اور بانیانِ چرچ کی خالص عیسائیت کی طرف واپسی اختیار کی۔ چنانچہ قدامت پسند مسلمان مصلحین کی طرح پروٹسٹنٹ اصلاح پسند انقلابی بھی تھے اور ری ایکشنری (Reactionist) بھی۔ وہ ظہور میں آنے والی نئی دنیا سے جڑے ہوئے نہیں تھے' بلکہ اب بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی جڑیں ماضی میں ہی تھیں۔

جدیدیت: بے بسی اور فنا کے خوف کی خالق:

تاہم وہ بھی اپنے عہد ہی کی پیداوار تھے اور وہ تبدیلی کا عہد تھا۔ زیرِنظر کتاب میں ہم دیکھیں گے کہ جدیدیت پذیری کا عمل اضطراب و اندیشگی (Anxiety) کو پیدا کرسکتا ہے۔ جونہی ان کی دنیا تبدیل ہوتی ہے' لوگ اپنے آپ کو بے اساس اور کھویا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس کیفیت میں وہ اس جہت کو نہیں دیکھ پاتے جس طرف ان کا معاشرہ جارہا ہوتا ہے بلکہ وہ اس آہستہ رو قلبِ ماہیئت کا تجربہ غیر مربوط طریقوں سے کرتے ہیں۔ جب ان کی زندگیوں کو نظام اور اہمیت عطا کرنے والی پرانی اساطیر تبدیلی کے عمل میں شکستگی سے دوچار ہوتی ہے تو انہیں اپنے تشخص کے زیاں اور ایک مفلوج کر دینے والی مایوسی کا تجربہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے سب سے زیادہ عمومی احساسات میں بے بسی اور فنا کا خوف شامل ہوتے ہیں' جو انتہائی حالات میں تشدد کے ذریعے اپنا اظہار کرتے ہیں۔ ہم لوتھر میں اس امر کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ اپنی ابتدائی زندگی میں وہ اذیت ناک مایوسیوں کا شکار تھا۔ وسطی عہد کے عقیدے کی کوئی رسم اور ریاضت اُسے بقول خود اس Tristitia الم سے نجات نہیں دلا سکی' جس نے اُسے موت کے خوف میں مبتلا کر دیا تھا' جسے وہ کامل فنا تصور کرتا تھا۔ جب اس تاریک دہشت نے اس پر غلبہ پایا تو وہ بائبل کی حمد نمبر 90 کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہوگیا' جو انسانی زندگی کے فنا ہو جانے کا بیان کرتی ہے اور انسان کی تصویر کشی خدا کے غصے کا شکار کی حیثیت سے کرتی ہے۔ اپنی ساری عملی زندگی میں لوتھر موت کو خدا کے قہر و غضب کا اظہار تصور کرتا رہا۔ اس کی الٰہیات انسان کو اپنی نجات سے یکسر قاصر اور خدا کی رحمت کا مکمل طور پر محتاج پیش کرتی ہے۔ انسان صرف اپنی بے بسی کا ادراک کر کے محفوظ رہ سکتا ہے۔ لوتھر نے اپنی مایوسی سے فرار پانے کے لیے خود پر عمل کا جنون طاری کرلیا' اس نے عزم کرلیا کہ دنیا میں جس قدر عمل خیر وہ کرسکتا ہے ضرور کرے گا' لیکن وہ نفرت کی آگ سے بھی جھلس رہا تھا۔ الٰہیاتی مخالفوں کے علاوہ پوپ' ترکوں' یہودیوں' عورتوں اور باغی کسانوں کے خلاف لوتھر کا غصہ ہمارے عہد کی دیگر اصلاحی تحریکوں کی خصوصیت ہے' جو نئی دنیا کی اذیت کے ساتھ جدوجہد کرتی تھیں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنہوں نے ایک ایسا مذہب بھی وضع کرلیا تھا جس میں خدا کی محبت اور دوسرے انسانوں سے نفرت ساتھ ساتھ موجود تھیں۔

زونگلی اور کیلون نے بھی انہیں نئے جنم کا احساس عطا کرنے والے ایک نئے مذہبی وژن کو وضع کرنے سے پہلے مکمل طور پر ناطاقتی کا تجربہ کیا تھا۔ وہ بھی اس امر کے قائل تھے کہ وہ خود اپنی نجات کے اہل نہیں اور یہ کہ انسانی ہستی کے مسائل کے روبرو وہ بالکل بے بس ہیں۔ دونوں نے خدا کی مطلق حاکمیت پر زور دیا' جیسا کہ جدید بنیاد پرست کرتے ہیں۔ لوتھر کی طرح کیلون اور زونگلی نے ایک نئی مذہبی دنیا تخلیق کی اور انقلابی انداز میں قلبِ ماہیت سے دوچار دنیا میں اپنے مذہب کو کارگر بنانے کے لیے بعض اوقات انتہاپسندانہ اقدامات اور تشدد سے بھی کام لیا۔

اپنے عہد ہی کے انسان ہونے کی حیثیت سے' یہ اصلاح پسند بھی وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے عکاس تھے۔ انہوں نے رومن کیتھولک چرچ کو چھوڑ کر آزادی کے ابتدائی اعلامیوں کی صورت گری کی جنہوں نے مغربی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ نیا نظام مکمل خودمختاری اور آزادی کا طلب گار ہوتا ہے اور تبدیل شدہ دنیا میں پروٹسٹنٹ اصلاح پسند عیسائیوں سے اس چیز کے طلب گار تھے کہ انہیں چرچ کے کنٹرول سے آزاد رہ کر اپنی مرضی سے بائبل کا مطالعہ اور تعبیر کرنی چاہیے۔ (تاہم وہ تینوں اپنی تعلیمات سے اختلاف کرنے والوں سے سخت نفرت کرتے تھے: لوتھر کا عقیدہ تھا کہ ''بدعتی'' کتابوں کو جلا دیا جانا چاہیے جبکہ کیلون اور زونگلی تو منحرفین کو قتل کرنے پر تیار رہتے تھے۔) ان تینوں نے اس امر کو واضح کردیا کہ اس عقلیت پسندانہ عہد میں مذہب کی پرانی علامتی تفہیم ناکارہ ہونا شروع ہوچکی ہے۔ قدامت پسندانہ روحانیت میں' ایک علامت الوہی حقیقت کی ترجمان ہوتی تھی اور مردوزن ارضی اشیاء میں تقدیس کا تجربہ کرتے تھے' اس طرح علامت اور تقدیس لاینفک ہوتے تھے۔ عہدِ وسطیٰ کے عیسائی اولیاء (Saints) کے تبرکات میں الوہیت کا تجربہ کرچکے تھے اور یوکرسٹی (Eucharistic) روٹی اور شراب کو صوفیانہ طور پر عیسیٰؑ کے مساوی تصور کرچکے تھے۔ اب اصلاح پسندوں نے اعلان کیا کہ تبرکات بت ہیں اور Eucarist ''محض'' ایک علامت ہے اور ماس (Mass) ایک سادہ سی یادگار ہے۔ انہوں نے مذہب کی اساطیر کے حوالے سے بولنا شروع کردیا تھا اور لوگوں نے جس آمادگی کے ساتھ اصلاح پسندوں کی پیروی کی اس نے ظاہر کردیا کہ یورپ کے اکثر عیسائی اساطیری شعور سے بھی دستبردار ہونے لگے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوتھر کے نظریات:

یورپ میں زندگی دھیرے دھیرے سیکولر ہو رہی تھی اور پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک بھی' اپنی مذہبی شدت پسندی کے باوجود' سیکولر تھی۔ قدامت پسندوں کی طرح اصلاح پسند بھی اولین سرچشمے یعنی بائبل کی طرف واپسی کا دعویٰ کرتے تھے تاہم وہ صحیفۂ خداوندی کو جدید انداز سے پڑھ رہے تھے۔ اصلاح یافتہ (Reformed) عیسائی کو صرف اپنی بائبل پر بھروسہ کرتے ہوئے خدا کے سامنے تنہا کھڑا ہونا تھا لیکن پرنٹنگ کی ایجاد سے قبل اور اس عہد کے انہیں تعلیم یافتہ بنانے سے پہلے' جس نے اسے بائبل پڑھنے کے قابل بنا دیا' ایسا ممکن نہیں تھا کہ ہر عیسائی کے پاس اس کی اپنی بائبل ہوتی۔ رفتہ رفتہ لوگ بائبل کو لفظی طور پر پڑھنے لگے جیسا کہ جدیدیت پذیر پروٹسٹنٹ اسے بھی دوسری کتابوں کی طرح پڑھنا سیکھ رہے تھے۔ خاموش' تنہا مطالعے نے عیسائیوں کو تعبیر کے روایتی طریقوں اور مذہبی ماہروں کی سرپرستی سے نجات پانے میں مدد دی۔ انفرادی عقیدے پر تاکید نے سچ کو موضوعی بنانے میں بھی مدد دی..... جدید مغربی ذہنیت کی ایک خصوصیت۔ تاہم لوتھر نے جہاں عقیدے کی اہمیت پر زور دیا وہاں اس نے عقل کو سختی سے مسترد کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ عقل کو مذہب کی دشمن تصور کرتا ہے۔ ہم کیلون کی تحریروں میں تو نہیں البتہ لوتھر کی تحریروں میں دیکھ سکتے ہیں کہ عقل اور اساطیر کا لازم و ملزوم ہونے کا قدیم تصور مٹ رہا تھا۔ لوتھر اپنے عموی جھگڑالو انداز میں ارسطو کا ذکر نفرت کے ساتھ کرتا تھا اور ایراسمس (Erasmus) سے ناراضی کا اظہار کرتا تھا' جسے وہ عقل کا مجسمہ تصور کرتا تھا اور عقل کے بارے میں اس کا ایقان تھا کہ وہ صرف دہریت کی طرف لے جا سکتی ہے۔ عقل کو مذہب کے دائرے سے خارج کر کے لوتھر ان یورپیوں میں سے ایک بن گیا' جنہوں نے اسے سیکولر بنایا تھا۔

چونکہ لوتھر کے لیے خدا سراسر پراسرار اور پوشیدہ تھا' اس لیے دنیا الوہی ہستی سے خالی تھی۔ لوتھر کا Deus Absconditus نہ تو انسانی اداروں میں پایا جا سکتا تھا اور نہ ہی طبیعی حقیقت میں۔ وسطی عہد کے عیسائیوں نے خدا کا تجربہ چرچ میں کیا تھا' جس کو اب لوتھر نے خلافِ عیسیٰؑ (Anti Christ) قرار دے دیا تھا۔ نہ ہی اس نے کائنات کے تحیر انگیز نظام پر غور و فکر کر کے خدا کا علم حاصل کرنے کی اجازت دی' جیسا کہ مکتبی الٰہیات دانوں نے (جو لوتھر کے اشتعال کا نشانہ تھے) کیا تھا۔ لوتھر کی تحریروں میں خدا طبیعی دنیا سے پسپا ہونا شروع ہو چکا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا' جو کہ اب بہر حال کوئی مذہبی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لوتھر نے سیاست کو بھی سیکولر بنا دیا۔ اس کے خیال میں چونکہ مادّی حقیقت روحانی حقیقت سے یکسر مختلف تھی اس لیے چرچ اور ریاست کو ایک دوسرے کے دائرۂ کار کا احترام کرتے ہوئے لازماً آزادی کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ لوتھر کے جذباتی مذہبی وژن نے اسے چرچ اور ریاست کی علیحدگی کی وکالت کرنے والے اولین یورپیوں میں سے ایک بنا دیا۔ ایک مرتبہ پھر سیاست کی سیکولرائزیشن مذہبی ہونے کے ایک نئے طریقے کے طور پر شروع ہوئی۔

کیلون کے نظریات:

لوتھر نے مذہب اور سیاست کو اس نفرت و کراہت کی وجہ سے علیحدہ کیا تھا' جو رومن کیتھولک چرچ کے جابرانہ ہتھکنڈوں سے پیدا ہوئی تھی۔ رومن کیتھولک چرچ نے اپنے قوانین اور آرتھوڈوکسی کو لاگو کرنے کے لیے ریاست کو استعمال کیا تھا۔ کیلون لوتھر کے بے خدا دنیا والے وژن کو نہیں مانتا تھا۔ زونگلی کی طرح اس کا عقیدہ تھا کہ عیسائیوں کو کسی خانقاہ تک محدود ہونے کی بجائے سیاسی اور معاشرتی زندگی میں حصہ لینا چاہیے۔ کیلون نے ابھرتی ہوئی سرمایہ دارانہ اخلاقیاتِ محنت (Work Ethics) کا بپتسمہ کرنے میں اس طرح مدد دی کہ اس نے محنت کو مقدس بلاوا قرار دے دیا' وسطی عہد کے عیسائیوں کے برعکس جو کہ محنت کو کسی گناہ کی سزا قرار دیتے تھے۔ کیلون نے لوتھر کے اس تصور کو بھی قبول نہیں کیا کہ عالم فطرت تقدس سے محروم ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خدا کو اس کی تخلیق میں دیکھنا ممکن ہے نیز اس نے فلکیات' جغرافیہ اور حیاتیات کے مطالعے کا حکم دیا۔ ابتدائی جدید دور کے کیلونسٹوں (Calvinists) میں اچھے سائنس داں بھی تھے۔ کیلون سائنس اور صحیفۂ خداوندی میں کوئی تضاد نہیں پاتا تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ بائبل جغرافیہ اور کائناتیات (Cosmology) کے بارے میں لفظی معلومات نہیں دے رہی تھی بلکہ سچ کو ان اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کر رہی تھی جنہیں محدود انسان سمجھ سکتا تھا۔ بائبل کی زبان Balbative تھی یعنی ایک ایسے سچ کو ارادتاً سادہ بنانا جس کو کسی دوسرے طریقے سے بیان کرنا بہت پیچیدہ ہوتا۔

ابتدائی جدید دور کے سائنس داں:

ابتدائی جدید دور کے سائنس داں کیلون کے سے اعتماد کے حامل تھے اور اپنی تحقیق اور مباحثوں کو اساطیری مذہبی زاویۂ نظر سے بھی دیکھتے تھے۔ پولش فلکیات داں نکولاس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوپرنیکس کا یقین تھا کہ اس کی سائنس ''انسانی سے زیادہ الوہی'' تھی۔ تاہم اس کا ہیلیو سینٹرک Heliocentric کائنات کا نظریہ پرانے اساطیری تصورات پر ایک زوردار ضرب تھا۔ اس کا حیران کن مفروضہ اتنا انقلابی تھا کہ اس کے اپنے زمانے میں بہت ہی کم لوگوں نے اسے قبول کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے بلکہ وہ اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جب ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ ہم اجرام فلکی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو اس کا سادہ سا سبب یہ ہے کہ زمین مخالف سمت میں گردش کر رہی ہوتی ہے۔ کوپرنیکس کا نظریہ ادھورا ہی رہا تاہم جرمن طبیعیات داں جوہانیز کیپلر (1630ء۔ 1571ء) نے اس نظریے کی تائید میں ریاضیاتی شواہد فراہم کر دیئے جبکہ پیسا کے فلکیات داں گیلیلیو گیلیلی (1642ء۔ 1564ء) نے دوربین کے ذریعے سیاروں کا مشاہدہ کر کے کوپرنیکی (Copernican) مفروضے کی تجرباتی طور پر آزمائش کی۔ یہ دوربین اس نے خود بنائی تھی۔ جب گیلیلیو نے 1612ء میں اپنی تحقیق کو شائع کروایا تو سنسنی سی پھیل گئی۔ پورے یورپ میں لوگوں نے خود دوربینیں بنائیں اور آسمانوں (Heavens) کا مشاہدہ کرنے لگے۔

گیلیلیو کو مذہبی عدالت نے خاموش کروا دیا اور توبہ کرنے پر مجبور کیا' تاہم اس کے کسی حد تک جنگجویانہ مزاج نے بھی اس کی تذلیل میں ایک کردار ادا کیا تھا۔ مذہبی لوگوں نے ابتدائی جدید عہد میں جبلی طور پر سائنس کو رد نہیں کیا۔ جب کوپرنیکس نے اپنا مفروضہ پہلے پہل ویٹی کن میں پیش کیا تو پوپ نے اسے منظور کر لیا تھا اور کیلون کو اس نظریے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خود سائنس داں اپنی تحقیق کو جوہری طور پر مذہبی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ جب کیپلر نے ایسے راز افشا کیے جنہیں پہلے کبھی کسی انسان کو جاننے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا' تو اسے محسوس ہوا کہ اس پر ''الوہی ہیجان'' طاری ہو گیا تھا اور گیلیلیو کو یقین تھا کہ اس کی تحقیق الوہی رحمت کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنی سائنسی عقلیت پسندی کو مذہبی وژن سے ہم آہنگ دیکھ سکتے تھے' جیسے لوگوس اور متھوس لازم و ملزوم ہوتے تھے۔

اس کے باوجود کوپرنیکس نے ایک انقلاب کا آغاز کر دیا تھا اور انسانوں نے ویسے ہی طریقے سے نہ کبھی خود کو دیکھا تھا' نہ اپنے ادراک پر بھروسہ کرنا تھا۔ اب تک لوگ اپنے حواس کی شہادت پر بھروسہ کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ وہ ''غیر مرئی'' کو پانے کے لیے دنیا کے خارجی پہلوؤں کا مشاہدہ کر چکے تھے بلکہ اس اعتماد کے حامل رہے تھے کہ یہ خارجی شکلیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی حقیقت کی ترجمان ہیں۔ انہوں نے زندگی کے بنیادی قوانین کے اپنے تصور کے اظہار کے لیے جن اساطیر کو وضع کیا تھا' وہ حقیقت کا جزو تھیں۔ ایلیوسس (Eleusis) کے یونانی پجاری پرسی فونی کی کہانی کو فصل کے آہنگوں سے جوڑ سکتے تھے' جن کا کہ وہ خود مشاہدہ کر سکتے تھے۔ تاہم کوپرنیکس کے بعد شک کا ایک بیج بویا جا چکا تھا۔ یہ ثابت کیا جا چکا تھا کہ زمین' جو ٹھہری ہوئی لگتی تھی' دراصل بہت تیزی سے حرکت کر رہی ہے' سیارے صرف اس لیے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ لوگ اپنے تصور کو ان پر منطبق کر دیتے ہیں: جس کو معروضی (Objective) تصور کیا گیا تھا' حقیقتاً وہ تو موضوعی (Subjective) تھا۔ عقل اور اسطورہ مزید ہم آہنگ نہیں رہے۔ دراصل ایسا لگتا تھا کہ سائنس دانوں کے پیدا کردہ لوگوس نے عام انسانوں کے ادراک کی قدر گھٹا دی تھی اور انہیں فاضل ماہرین کا دست نگر بنا دیا تھا۔ جہاں اسطورہ یہ ظاہر کر چکی تھی کہ انسانی عمل زندگی کے جوہری معانی سے جڑا ہوا ہے' وہاں نئی سائنس نے انسان کو کائنات میں ایک محدود سی حیثیت میں دھکیل دیا تھا۔ اب انسان اشیاء کا مرکز نہیں بلکہ ایک غیر ممتاز سیارے پر کائنات میں گھوم رہا تھا۔ یہ ایک مایوس کن وژن تھا' جسے نئی کاسمولوجی کو پرانی کاسمولوجی کی طرح روحانی طور پر بامعنی بنانے کے لیے شاید ایک اسطورہ کی ضرورت تھی۔

نیوٹن: قدامت پسندانہ روح کا گرویدہ:

لیکن جدید سائنس تو اساطیر کو بے اعتبار کرنا شروع ہو چکی تھی۔ برطانوی سائنسدان سر آئزک نیوٹن (1727ء۔ 1624ء) نے تجربے اور استخراج کے استنباطی سائنسی طریقوں کے بھرپور استعمال سے اپنے پیشروؤں کی تحقیقات کا نچوڑ پیش کیا۔ نیوٹن نے کشش ثقل (G ravity) کو ایک کائناتی قوت کے طور پر پیش کیا' جس نے پوری کائنات (Cosmos) کو یکجا کر رکھا ہے اور اجرام فلکی کو ایک دوسرے سے ٹکرانے سے روکا ہوا ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ یہ نظام خدا' "The Great "Mechanick کے وجود کو ثابت کرتا ہے' کیونکہ کائنات کا پیچیدہ خاکہ (ڈیزائن) حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آ سکتا۔ ابتدائی جدید عہد کے دیگر سائنس دانوں کی طرح نیوٹن نے انسانوں کو دنیا کے بارے میں بالکل نئی اور یقینی معلومات عطا کیں۔ اسے یقین تھا کہ اس کا ''نظام'' معروضی حقیقت سے موافقت رکھتا ہے اور انسانی علم کو پہلے سے زیادہ آگے لے گیا ہے۔ تاہم لوگوس کی دنیا میں نیوٹن کے مکمل طور پر محو ہو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانے سے اس کے لیے ناممکن ہوگیا کہ سچ کی ایک صورت کے طور پر دوسرے انسانوں کی پیش کردہ ادراک کی زیادہ وجدانی صورتوں کی تحسین کرے۔ اس کی رائے میں اساطیر اور اسراریت (Mystery) فکر کے ابتدائی اور وحشیانہ طریقے تھے۔ اس نے تنک مزاجی سے لکھا: ''مذہب کے معاملات میں یہ انسان کے توہمات ہوتے ہیں جو اسرار کے شائق ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے جسے انسان کم جانتا ہے اسی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔''

نیوٹن کو اس خواہش نے تقریباً خبطی بنا دیا تھا کہ عیسائیت کو اس کے اساطیری عقائد سے پاک کردے۔ اُسے یہ یقین ہوگیا تھا کہ تثلیث کے غیر عقلی (A-Rational) اور تجسیم یسوع کے عقائد سازش' فریب اور جعلسازی کا نتیجہ ہیں۔ جہاں وہ اپنی عظیم کتاب (1687ء) Philosophiae Naturalis Principia پر کام کر رہا تھا' وہاں اُس نے ایک عجیب و غریب کتاب پر کام شروع کیا' جس کا عنوان تھا:

The Philosophical Origins Of Gentile Theology

اور اس کتاب میں اس نے لکھا کہ حضرت نوحؑ نے ایک ایسا مذہب پایا تھا جو توہمات اور اسرار سے خالی تھا اور جس میں صرف ایک خدا تھا' جسے عالم فطرت پر عقلی غور و فکر کے ذریعے جانا جا سکتا تھا۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے اس خالص عقیدے کو آلودہ کر دیا' چودھویں صدی میں بددیانت الٰہیات دانوں نے تجسیم یسوع اور تثلیث جیسے جعلی عقائد اس میں شامل کر دیئے۔ دراصل Book Of Revelation غارت گری کے منظر کے طور پر تثلیثیت (Trinitarianism)..... ''مغرب کے اس عجیب مذہب''، ''تین مساوی خداؤں کے مسلک'' ..... کی پیشگوئی کر چکی تھی۔ نیوٹن ہنوز ایک مذہبی آدمی تھا اور ایک عقلیت پسندانہ اولین مذہب کی اپنی جستجو میں' ایک اعتبار سے' قدامت پسندانہ روح کا گرویدہ تھا۔ تاہم وہ گزشتہ نسلوں کے سے انداز میں اپنے عقیدے کا اظہار نہیں کر سکا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا تھا کہ تثلیث کا عقیدہ تو چوتھی صدی عیسوی کے یونانی آرتھوڈوکس الٰہیات دانوں نے متھوس کے طور پر وضع کیا تھا' بالکل ویسے ہی جیسے بعدازاں یہودی قبالائیوں (Jewish Kabbalists) نے خلق کیا تھا۔ جیسا کہ گریگوری آف نیسا نے وضاحت کی تھی کہ باپ' بیٹے اور روح کے تین عقیدے معروضی حقائق نہیں تھے بلکہ صرف ایسی اصطلاحات تھے جن کو ہم استعمال کرتے ہیں۔'' اس طریقے کو بیان کرنے کے لیے کہ جس سے ''نام نہ دی جا سکنے والی اور بیان نہ کی جا سکنے والی'' الوہی فطرت (Ousia) خود کو ہمارے انسانی ذہنوں کی محدودیتوں میں ڈھالتی ہے۔ اسے عبادت'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مراقبے اور لٹرجی (Liturgy) کے مسلکی تناظر کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ لیکن نیوٹن' جو تثلیث کو صرف عقلی تناظر میں دیکھ سکتا تھا' اساطیر کے کردار کا فہم نہیں رکھتا تھا اور اسی لیے اس نے اس عقیدے کو رد کر دیا تھا۔ تثلیثی الٰہیات کے حوالے سے جس دشواری کا تجربہ آج بہت سے عیسائی کر رہے ہیں' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عقل کی حمایت میں نیوٹن والے تعصب کا شکار ہیں۔ نیوٹن کا موقف تو پوری طرح سمجھ میں آنے والا ہے۔ وہ مغرب کے ان اولین لوگوں میں سے ایک ہے جنھوں نے سائنسی عقلیت پسندی کے طریقے اور اصول مکمل طور پر تشکیل دیئے تھے۔ اس نے ایک اعلیٰ ترین کارنامہ انجام دیا تھا اور اس کا نتیجہ اتنا ہی خمار آگیں تھا جتنا کہ کسی مذہبی تجربے کا۔ وہ اپنے مطالعات کے دوران پکارا کرتا تھا: "O God, I think thy thoughts: After Thee!" اس کے پاس وجدانی صوفیانہ شعور کے لیے وقت نہیں تھا' جو واقعتاً اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہو سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس مغربی تجربے کی شدت اور خیرہ کن کامیابی کی وجہ سے عقل اور اسطورہ متضاد بن رہے تھے۔

فرانسس بیکن کے نظریات:

سترہویں صدی تک ترقی اتنی یقینی ہو چکی تھی کہ بہت سے یورپی پہلے ہی مکمل طور پر مستقبل اساس ہو گئے تھے۔ وہ اس حقیقت کو جان رہے تھے کہ اگر وہ سچ کو پانا چاہتے ہیں تو انہیں ماضی کو رد کرنا اور نئے سرے سے آغاز کرنا پڑے گا۔ یہ آگے کی طرف تحرک قدامت پسند روح کی بنیاد ماضی کی طرف واپسی سے مکمل طور پر متضاد تھا۔ نئی سائنس کو آگے دیکھنا تھا اور اس انداز سے ہی اس نے کام کیا۔ جب ایک مرتبہ کوپرنیکی نظریہ تسلی بخش انداز میں ثابت ہو گیا تو پرانے کائناتیاتی (Cosmological) نظام کو واپس لانا مزید ممکن نہیں رہا۔ بعدازاں خود نیوٹن کا نظام' گو طریقے نہیں' رد کر دیا گیا۔ یورپی سچ کا ایک نیا تصور تشکیل دے رہے تھے۔ سچ کبھی مطلق نہیں رہا تھا' کیونکہ نئی دریافتیں ہمیشہ پرانی کی جگہ لے سکتی تھیں۔ اس کا مظاہرہ معروضی طور پر کرنا ہوتا تھا اور اس کی اثر آفرینی کو عملی دنیا میں ماپا جاتا تھا۔ ابتدائی جدید سائنس کی کامیابی نے اسے ایک اتھارٹی عطا کر دی جو اساطیری سچ سے زیادہ مضبوط ہونا شروع ہو گئی۔

ایسا فرانسس بیکن (1626ء۔ 1561ء) کی کتاب (1605ء) The Advancement of Learning میں پہلے ہی واضح ہو چکا تھا۔ فرانسس بیکن انگلینڈ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے شاہ جیمز اول کا مشیر تھا۔ بیکن نے اس بات پر زور دیا کہ ہر سچ' حد تو یہ ہے کہ مذہب کے انتہائی مقدس عقائد بھی' تجربی سائنس کے بہت سخت تنقیدی طریقوں کا موضوع ہونے چاہئیں۔ اگر وہ ثابت شدہ حقائق اور ہمارے حواس کی شہادت سے متضاد ہوں تو انہیں رد کر دینا چاہیے۔ ماضی کی کسی عظیم بصیرت کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ انسانیت کے لیے نیا عظیم الشان مستقبل تخلیق کرنے کے ہمارے عمل میں رکاوٹ ڈالے۔ بیکن کو یقین تھا کہ سائنسی ایجادات انسانی ایذا و ابتلا کا خاتمہ کر دیں گی اور اس زمین ہی کو جنت بنا دیں گی۔ بیکن کی تحریروں میں ہم نئے عہد کا جوش اور ولولہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ اتنا پر اعتماد تھا کہ بائبل اور سائنس میں کوئی تصادم نہیں دیکھ پاتا تھا اور گیلیلیو کو سزا دیئے جانے سے برسوں پہلے اس نے سائنس دانوں کے لیے مکمل دانش ورانہ آزادی کا مطالبہ کیا تھا' جن کا کام نوع انسان کے لیے اتنی زیادہ اہمیت رکھتا تھا کہ اس میں سادہ ذہن والے مذہبی پیشواؤں کو رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔ The Advancement of Learning سائنسی عقلیت پسندی کی آزادی کا اعلامیہ تھی' جس نے اسطورہ سے نجات ڈھونڈی اور اعلان کیا کہ صرف وہی انسانوں کو سچ تک رسائی دلوا سکتی ہے۔

یہ ایک اہم ساعت تھی' کیونکہ یہیں سے جدید مغرب میں جانی جانے والی سائنس کی شروعات ہوئی تھی۔ اب تک تو سائنسی اور عقلی دریافتیں ہمیشہ جامع اساطیر کے دائرے میں ہی کی گئی تھیں' جو ان دریافتوں کی معنویت کو واضح کرتی تھی۔ غالب اسطورہ ہمیشہ ایسی تحقیقات کو قابو رکھتی تھی اور ان کے اطلاق پر قدغن لگا دیتی تھی۔ جیسا کہ قدامت پسند معاشرے کی محدودیتوں کا تقاضا ہوتا تھا۔ تاہم سترہویں صدی تک یورپی سائنس داں اپنے آپ کو ان پرانی پابندیوں سے آزاد کروانا شروع ہو چکے تھے۔ انہیں اب ان کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی کیونکہ جو عوامل زرعی معاشروں کو پسماندہ رکھتے تھے' ان پر بتدریج غلبہ پا لیا گیا تھا۔ بیکن کا اصرار تھا کہ صرف اور صرف سائنس سچ ہے۔ مسلمہ طور پر اس کا سائنس کا تصور ہمارے تصورِ سائنس سے بہت مختلف تھا۔ بیکن کے نزدیک سائنسی طریقہ حقائق (Facts) کو جمع کرنے پر مشتمل ہے' اس نے سائنسی تحقیق میں اندازہ کاری (Guess Work) اور مفروضے کی اہمیت کو نہیں مانا۔ تاہم بیکن کی متعین کردہ سچ کی تعریف بہت مؤثر رہی' خصوصاً انگریزی بولنے والے ملکوں میں۔ اس کا ایقان تھا کہ ہم فقط جن معلومات پر بھروسہ کر سکتے ہیں' وہ ہمارے پانچ حواس سے حاصل ہوتی ہیں' اس کے علاوہ باقی سب کچھ خالصتاً وہم ہے۔ فلسفہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مابعدالطبیعیات' الٰہیات' آرٹ' متخیلہ' تصوف اور اساطیر سب کے سب غیر متعلقہ اور توہم پرستانہ ہونے کی وجہ سے ناکارہ ہیں کیونکہ انہیں تجربی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اساطیری سوچ کی موت:

ایسے لوگ جو اس مکمل طور پر عقلیت پسندانہ طرز حیات کے قائل تھے مگر جو مذہبی بھی رہنا چاہتے تھے' انہیں خدا اور روحانیت کے بارے میں سوچنے کے نئے طریقے ڈھونڈنا پڑے۔ ہم اساطیری سوچ کی موت کا نظارہ فرانسیسی سائنس داں رینے ڈیکارٹ (1650ء۔1596ء) کے فلسفے میں کرتے ہیں' جو صرف Logoi یعنی عقلیت پسندانہ زبان میں بات کرنے پر قادر تھا۔ اس کا وژن منفرد تھا۔ ڈیکارٹ کے نزدیک کائنات حیات سے محروم ایک مشین ہے' طبیعی دنیا غیر ذی روح اور مردہ ہے۔ یہ ہمیں الوہی ہستی کے بارے میں کوئی معلومات نہیں دے سکتی۔ کائنات میں واحد زندہ شے انسانی ذہن ہے' جو صرف اپنے اندر یقینیت پا سکتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہم یہ بھی یقین نہیں کر سکتے کہ ہمارے اپنے شکوک اور سوچوں کے علاوہ کوئی شے وجود رکھتی ہے۔ ڈیکارٹ ایک پکا کیتھولک تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے وجود کے بارے میں مطمئن کرنا چاہتا تھا' تاہم اس نے اسطورہ اور مسلک کے اولین تخیلاتی ماضی کی طرف لوٹنے سے انکار کر دیا۔ نہ ہی وہ پیغمبروں کی بصیرتوں اور مقدس کتابوں پر اعتماد کر سکا۔ نئے عہد کا انسان ہونے کی حیثیت سے اس نے موصولہ تصورات کو قبول نہیں کیا۔ سائنس داں کو اپنا ذہن لازماً صاف سلیٹ بنا دینا چاہیے۔ سچ صرف وہ ہے جسے ریاضی کے ذریعے فراہم کیا جائے یا ایسے واضح اور قطعی قضیوں کے ذریعے: ''جو ہو گیا اسے کالعدم نہیں کیا جا سکتا'' جو کہ ناقابل تردید حد تک درست ہے۔ چونکہ واپسی کا راستہ بند تھا اس لیے ڈیکارٹ صرف آگے ہی جا سکتا تھا۔

ایک شام آتشدان کے قریب بیٹھے ہوئے ڈیکارٹ نے یہ مقولہ وضع کیا:

"Cogi To, Ergo Sum" یعنی ''چونکہ میں سوچتا ہوں' پس میں ہوں۔'' اس کا ایقان تھا کہ یہ مقولہ بدیہی ہے۔ جس ایک شے کے بارے میں وہ پر یقین ہو سکا' وہ تھی ہمارے ذہن کا شک کا تجربہ۔ لیکن اس سے انسانی ذہن کی محدودیت عیاں ہوئی' اور ''محدودیت'' کا تصور ہی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک ہم ''کاملیت'' کا پہلے ہی سے تصور نہ رکھتے ہوں۔

دنیا میں ہماری مؤثر کارکردگی کے لیے عقلیت پسندانہ فکر ناگزیر ہے۔ اگر اس کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رخ کسی عملیت پسندانہ ہدف کی طرف موڑ دیا جائے تو یہ اپنی معراج پر ہوتی ہے یا ڈیکارٹ کے مانند جب ہم کسی شے پر جتنا ممکن ہو معروضی طور پر غور کرنے کے لیے مادی اشیاء سے رخ پھیر لیتے ہیں۔ تاہم جب ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا ''کیوں'' وجود رکھتی ہے (اگر یہ وجود رکھتی ہے تو!) یا کیا زندگی معنویت رکھتی ہے' کیا عقل تھوڑی بہت ترقی کر سکتی ہے اور ہماری سوچ کا موضوع بذات خود ہمارے لیے اجنبی بن سکتا ہے۔ ڈیکارٹ آتش دان کے پاس بیٹھا' اپنی سرد' خالی دنیا میں' اپنی غیر یقینیت میں مقید اور ایک ''ثبوت'' کی مالا جپتے ہوئے' جو کہ ایک ذہنی چیستاں سے بھی کچھ سوا ہے' جدید انسانیت کے روحانی مخمصے کی تصویر پیش کرتا ہے۔

یوں' ایک ایسے زمانے میں' کہ جب سائنس اور آزاد عقلیت پسندی تیزی سے ترقی کر رہی تھیں' زندگی بے شمار لوگوں کے لیے لایعنی ہوتی جا رہی تھی' جنہیں انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ' اساطیر کے بغیر جینا پڑ رہا تھا۔ برطانوی فلسفی تھامس ہابز (1679ء-1588ء) کا عقیدہ تھا کہ خدا موجود تو ہے مگر صرف عملی مقاصد کے لیے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ وجود نہیں رکھتا۔ لوتھر کی طرح ہابز کو بھی یقین تھا کہ دنیا الوہی ہستی سے خالی ہے۔ ہابز کا عقیدہ تھا کہ خدا نے انسانیت کے آغاز پر اپنے آپ کو عیاں کیا تھا اور دوبارہ اس کے اختتام پر کرے گا۔ تاہم اس وقت ہمیں اس کے بغیر رہنا ہے' تاریکی میں انتظار کرتے ہوئے۔ فرانسیسی ریاضی داں ایک انتہائی مذہبی آدمی' بلیز پاسکل کے نزدیک لامتناہی کائنات کا خالی پن اور ''ابدی خاموشی'' جدید سائنس کے زیر اثر پیدا ہونے والے خالص خوف سے عیاں ہوئے ہیں:

> جب میں انسانوں کی اندھی اور خراب و خستہ حالت دیکھتا ہوں' جب میں پوری کائنات کو اس کی مُردگی (Deadness) میں دیکھتا ہوں اور کسی روشنی کے بغیر چھوڑ دیئے گئے انسان کو' گویا کائنات کے اس گوشے میں یہ جانے بغیر کھویا ہوا ہے کہ کس نے اسے یہاں بھیج دیا ہے' اسے کیا کرنا ہے' جب وہ مرے گا تو کیا ہوگا' کسی بھی شے کو جاننے میں نااہل' دیکھتا ہوں تو دہشت زدہ ہو جاتا ہوں' ایک ایسے انسان کی طرح جسے نیند میں کسی ویران جزیرے پر لا کر چھوڑ دیا جائے' جو بیدار ہو تو نکل بھاگنے کے کسی ذریعے سے محروم مکمل طور پر کھویا ہوا ہو۔ تب میں حیرت کرتا ہوں کہ ایسی خراب و خستہ حالت لوگوں کو مایوسی کی طرف کیوں نہیں دھکیلتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقل اور لوگوس جدید دنیا کے مرد و زن کی قسمت کو ان گنت عملی طریقوں سے بہتر بنا رہی تھی' تاہم وہ ان حتمی سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھیں جنہیں پوچھنے پر' ایسا لگتا ہے کہ انسان عین اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے اور جو اَب تک متھوس کے لیے ہی مخصوص رہے تھے۔ نتیجتاً' جیسا کہ پاسکل نے بیان کیا تھا' مایوسی اور بیگانگی جدید تجربے کا جزو رہی ہیں۔

تاہم ایسا ہر ایک کے لیے نہیں تھا۔ جان لاک (1704ء۔1632ء) جو اٹھارہویں صدی میں فلسفیانہ روشن خیالی کا آغاز کرنے والوں میں سے ایک تھا' پاسکل کی سی کسی وجودی اذیت کا شکار نہیں تھا۔ زندگی اور انسانی عقل پر اس کا عقیدہ متین اور پر اعتماد تھا۔ اسے خدا کے وجود کے بارے میں کوئی شک نہیں تھا' گو کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ ایک ایسا خدا' جو ہمارے حواس سے ماورا ہو' بیکن کے تجربی امتحان میں ناکام ہو جائے گا۔

عقل پر مکمل اعتبار و انحصار کرتے ہوئے لاک کا مذہب بعض یہودی میرانوؤں (Marranos) کے وضع کردہ ڈی ازم (Deism) سے مماثلت رکھتا تھا۔ وہ اس بات کا پوری طرح قائل تھا کہ عالم فطرت ایک خالق کا بھرپور ثبوت مہیا کرتا ہے اور یہ کہ اگر عقل کو آزادی کے ساتھ پنپنے کا موقع دیا جائے تو ہر شخص خود سچ کو جان لے گا۔ جھوٹے اور توہم پرستانہ تصورات دنیا میں صرف اس وجہ سے پھیلے تھے کہ پادریوں نے لوگوں سے اپنی آرتھوڈکسی قبول کروانے کے لیے مذہبی احتساب جیسے سفاکانہ اور جابرانہ ہتھکنڈے استعمال کیے تھے۔ چنانچہ سچے مذہب کے لیے ریاست کو ہر طرح کے عقائد کو لازماً برداشت کرنا چاہیے اور خود کو صرف عملی انتظام اور کمیونٹی کی حکومت تک ہی محدود رکھنا چاہیے۔ چرچ اور ریاست لازماً الگ الگ ہونے چاہئیں اور کسی کو بھی دوسرے کے کاموں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ یہ عقل کا دور تھا' اور لاک کا ایقان تھا کہ انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ مرد و زن آزاد ہوں گے اور اسی لیے سچ کو پانے کے اہل ہوں گے۔

اس سازگار وژن نے روشن خیالی اور جدید' سیکولر' روادار ریاست کے متاثر کن آئیڈیل کی بنیاد رکھی۔ فرانسیسی اور جرمن روشن خیال فلسفی بھی ڈی ازم کے عقلیت پسندانہ مذہب کو مانتے تھے اور پرانے اساطیری مذہب کو فرسودہ تصور کرتے تھے۔ چونکہ عقل سچ کی واحد کسوٹی تھی اس لیے پرانے عقیدے اس فطری مذہب کے طفلانہ روپ تھے اور انہیں رد کر دیا جانا چاہیے تھا۔ انقلابی برطانوی الٰہیات داں میتھیو ٹنڈل (1733ء۔1655ء) اور رومن کیتھولک سے ڈی اسٹ (Deist) ہو جانے والے آئرش جان ٹولینڈ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(1722ء-1670ء) نے کہا کہ عقیدے کو عقلیت پسندانہ ہونا پڑے گا۔ مقدس سچ تک پہنچنے کا واحد بااعتبار راستہ ہماری فطری عقل ہے اور عیسائیت کو پراسرار' مابعد الطبیعیاتی اور معجزانہ باتوں کو لازماً نکال دینا چاہیے۔ ہر انسان کے لیے کسی کی مدد کے بغیر اپنی عقلی قوتوں کے ذریعے سچ تک پہنچنا ممکن تھا۔ جیسا کہ نیوٹن واضح کر چکا تھا کہ طبیعی کائنات پر غور وفکر کرنے سے ایک خالق یا اولین سبب (The First Cause) کی ناقابل تردید شہادت میسر آتی ہے۔ ہرمن سیموئیل رائیمرس (1768ء-1694ء) نے کہا کہ عیسیٰؑ نے کبھی الوہی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور یہ کہ ان کی جدوجہد تو سراسر سیاسی تھی۔ عیسیٰؑ کا احترام ایک عظیم استاد' ایک ''غیر معمولی' سادہ' اعلیٰ ترین اور عملی مذہب'' کے بانی کے طور پر کیا جانا چاہیے۔

متھوس کی پرانی صداقتوں (Truths) کی تعبیر اب یوں کی جارہی تھی گویا وہ Logoi تھے۔ یہ ایک یکسر نئی پیشرفت تھی جو بالآخر مایوسی سے دوچار ہوئی۔

کیونکہ جس زمانے میں یہ الٰہیات داں' فلسفی اور مؤرخین عقل کی برتری کے اعلانات کررہے تھے' عین اسی زمانے میں جرمن عقلیت پسند امانوئیل کانٹ (1804ء-1724ء) نے اس سارے روشن خیالی کے پروجیکٹ پر کاری ضرب لگائی۔ ایک طرف تو کانٹ نے آزادی کا ایک اور اعلامیہ جاری کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ لوگوں میں اتنی جرأت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ استادوں' گرجا گھروں اور سندوں (Authorities) پر انحصار ختم کردیں اور اپنے بھروسے پر سچ کو تلاش کریں۔ اس نے لکھا کہ ''روشن خیالی انسان کی خوداختیار کردہ شاگردی سے خروج (Exodus) ہے۔ شاگردی انسان کی کسی اور کی رہنمائی کے بغیر اپنے فہم کو استعمال کرنے میں نااہلی ہوتی ہے۔'' لیکن دوسری طرف کانٹ نے اپنی کتاب The Critique Of Pure Reason میں لکھا کہ یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ ہم اپنے خیال کے مطابق فطرت میں جس نظم (Order) کو پاتے ہیں اس کا خارجی حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ یہ ''نظم'' تو بس خود ہمارے ذہنوں کا زائیدہ ہوتا ہے' حد تو یہ ہے کہ نیوٹن کے نام نہاد سائنسی قوانین ہمیں کائنات سے کہیں زیادہ انسانی نفسیات کے بارے میں بتاتے ہیں۔ جب ذہن اپنے باہر موجود طبیعی دنیا کی اطلاعات حواس کے ذریعے حاصل کرتا ہے تو وہ اس ڈیٹا کو سمجھنے کے لیے خود اپنی داخلی ساختوں کے مطابق دوبارہ ترتیب دیتا ہے۔ کانٹ کو ذہن کی اس استعداد پر مکمل اعتماد تھا کہ وہ ایک کارگر عقلیت پسندانہ وژن وضع کرسکتا ہے تاہم یہ دکھاتے ہوئے کہ انسان کا خود اپنی نفسیات سے فرار حقیقتاً ناممکن ہے' اس نے اس امر کو بھی واضح کردیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ مطلق سچ جیسی کوئی شے وجود نہیں رکھتی ہے۔ ہمارے تمام تصورات جوہری اعتبار سے موضوعی اور تعبیری ہوتے ہیں۔ جہاں ڈیکارٹ ذہن کو مردہ کائنات کا واحد مالک سمجھتا تھا' وہاں کانٹ نے انسانیت اور دنیا کے تعلق کو توڑ دیا اور ہمیں ہمارے ذہنوں کے اندر ہی محدود کر دیا۔ عین اس وقت جب وہ انسانیت کو شاگردی سے نجات دلا رہا تھا' اس نے اسے ایک نئے زندان میں مقید کر دیا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے' جدیدیت نے جو کچھ ایک ہاتھ سے دیا' اسے دوسرے ہاتھ سے لے لیا۔ جہاں عقل انسانوں کو روشن خیالی اور آزادی عطا کر رہی تھی' وہاں وہ انہیں اس دنیا سے' جسے وہ نہایت مؤثر انداز میں قابو کرنا سیکھ رہے تھے' اجنبی بھی بنا سکتی تھی۔

اگر کوئی مطلق سچ نہیں تھا تو پھر خدا کے بارے میں کیا رائے تھی؟ دیگر ڈی اسٹوں (Deists) کے برعکس کانٹ کا ایقان تھا کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا ناممکن ہے' کیونکہ وہ حواس کی رسائی سے باہر ہے' اسی لیے انسانی ذہن کے لیے بھی ناقابل رسائی ہے۔ مطلق کے روبرو تنہا عقل کچھ نہیں کر سکتی۔ کانٹ جو واحد تسلی دے سکتا تھا' وہ یہ تھی کہ خدا کے وجود کو جھٹلانا بھی ناممکن ہے۔ کانٹ بذات خود ایک دیندار انسان تھا اور اپنے تصورات کو مذہب سے معاند تصور نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے تصورات عقیدے کو عقل پرستی کے ناموزوں انحصار سے آزادی دلواتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب (1788ء) Critique Of Practical Reason کے آخر میں لکھا ہے کہ وہ ہر انسان کو ودیعت کیے گئے اخلاقی قانون کا مکمل طور پر قائل ہے' جو آسمانوں کی عظمت و شوکت کے مانند اسے رعب اور تحیر سے معمور کر دیتا ہے۔ تاہم وہ ڈی اسٹ خدا کے لیے جو واحد عقلیت پسندانہ بنیاد پا سکتا تھا' وہ ایک بالکل مبہم دلیل تھی کہ ایسے خدا (Deity) اور حیات بعد الممات کے امکان کے بغیر ہم اخلاقی طور پر مشکل ہی سے عمل کر سکتے ہیں۔ ایک ثبوت کے طور پر یہ دلیل انتہائی غیر تسلی بخش تھی۔ کانٹ کا خدا بس ایک پس فکری (After Thoughat) تھا' انسانی صورتحال سے منسلک۔ خلقی ادراک کے علاوہ اس امر کی کوئی حقیقی توجیہہ نہیں تھی کہ کسی عقلیت پسند کو ایمان کے لیے کیوں متفکر ہونا چاہیے۔ ایک ڈی اسٹ اور ایک عقلیت پسند انسان ہونے کے ناطے کانٹ کو ایسی کسی روایت یا عمل سے کوئی سروکار نہیں تھا جس کے ذریعے ماضی کے مردوزن عقل سے آزاد رہتے ہوئے خود ہی مقدس ہستی کا شعور حاصل کر سکتے تھے۔ کانٹ الوہی قانون کے تصور کا شدید مخالف تھا' جو اس کی نگاہوں میں انسانی خودمختاری کا سفاکانہ انکار تھا اور وہ تصوف' عبادت یا رسوم کو لایعنی سمجھتا تھا۔ مذہب اور الوہی ہستی کا کوئی تصور رسوم کے بغیر حقیر' غیر ضروری اور بودا ہوگا۔

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل وبراہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساحری کا عظیم جنون:

تاہم متناقض انداز میں مغرب میں سچ کی واحد کسوٹی کے طور پر عقل کے ابھرنے کے ساتھ ہی مذہبی غیر عقلیت پسندی نے بھی فروغ پایا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں یورپ کے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ملکوں اور حد تو یہ ہے کہ امریکی نوآبادیات تک میں رونما ہونے والے ساحری کے عظیم جنون (The Great Witch Craze) نے دکھا دیا کہ سائنسی عقلیت پسندی کا مسلک تاریک قوتوں کو ہمیشہ دبا نہیں سکتا۔ تصوف اور اساطیر مردوزن کو لاشعور کی دنیا سے معاملہ کرنا سکھا چکی تھیں۔ ممکن ہے ایسا حادثاتی طور پر نہ ہو کہ ایک ایسے زمانے میں کہ جب مذہبی عقیدہ اس قسم کی روحانیت کو ترک کرنا شروع ہو رہا تھا' تحت الشعور دیوانہ ہو کر بھاگ پڑا تھا۔ ساحری کے جنون کو اجتماعی فنتاسی کے طور پر بیان کیا گیا ہے' جس میں ساری عیسائی دنیا کے مردوزن اور مذہبی محتسب شریک تھے۔ لوگوں کا ایقان تھا کہ وہ شیطانوں کے ساتھ جنسی فعل کر چکے ہیں نیز شیطانی رسوم اور بدفعلیوں میں شرکت کرنے کے لیے رات کو فضا میں پرواز کر چکے ہیں۔ خیال کیا گیا کہ ماس (Mass) کی نقل اتارتے ہوئے جادوگرنیاں شیطان کی پوجا کرتی ہیں..... ایک اُلٹ حرکت' جو روایتی مذہب کے خلاف وسیع پیمانے پر لاشعوری بغاوت کی عکاسی کرتی ہے۔ خدا بہت دور' اجنبی اور مشکل محسوس ہونے لگا: شیطان کو انسانیت کے عفریتی روپ کے طور پر بیان کرتے ہوئے اس کی شخصیت کے توسط سے تحت الشعوری خوف اور خواہشات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ ساحری کے جرم میں ہزاروں مردوزن کو یا تو پھانسی پر لٹکا دیا گیا یا زندہ جلا دیا گیا۔ نئی سائنسی عقلیت پسندی' جو ذہن کی ان عمیق سطحوں سے ناآشنا تھی' اس ہسٹیریائی طوفان کو قابو کرنے میں بے بس تھی۔ ایک ہمہ گیر' خوف ناک اور تباہ کن بے عقلی (Un-Reason) بھی جدید تجربے کا حصہ رہی ہے۔

ایک خوفناک شگاف:

بحیرۂ اوقیانوس کی دونوں طرف مغرب کے لوگوں کے لیے وہ زمانہ بہت خوفناک تھا۔ اصلاح کی تحریک ایک خوفناک شگاف تھی' جس نے یورپ کو نفرت اور دشمنی سے معمور دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا۔ انگلینڈ میں پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں نے ایک دوسرے پر ظلم و ستم کیے۔ فرانس میں کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے درمیان خانہ جنگی ہوئی (63-1562ء)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جبکہ 1572ء میں ملک گیر سطح پر پروٹسٹنٹوں کا قتل عام کیا گیا۔ تیس سالہ جنگ (The Thirty years War, 1618-48ء) نے یورپ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ وہ بھرپور مذہبی جہت والی اقتدار کی کشمکش تھی' جس نے یکے بعد دیگرے قوموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور متحدہ یورپ کی ہر امید کو فنا کر دیا۔ سیاسی بے چینی اس پر مستزاد تھی۔ 1642ء میں انگلینڈ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا' جو شاہ چارلس اول کی سزائے موت (1649ء) اور پیوریٹن پارلیمنٹیرین اولیور کرامویل کے تحت ایک ری پبلک کے قیام کا نتیجہ تھی۔ جب 1660ء میں بادشاہت بحال ہوئی تو پارلیمنٹ نے اس کے اختیارات کو محدود کر دیا۔ مغرب میں زیادہ جمہوری ادارے اذیت ناک اور خونیں انداز میں ابھر رہے تھے۔ اس سے بھی کہیں زیادہ المناک 1789ء کا انقلاب فرانس (French Revolution) تھا۔ نپولین کے تحت نظم و ضبط بحال ہونے سے قبل فرانس میں دہشت کی حکمرانی اور فوجی آمریتیں قائم تھیں۔

جدید دنیا کے لیے انقلاب فرانس کا ورثہ Janus Faced تھا: اس نے مہربان روشن خیالی کے آزادی' مساوات اور اخوت کے آئیڈیلز کو فروغ دیا' تاہم اس نے ہولناک ریاستی دہشت گردی کی یادیں بھی چھوڑیں' جو کہ مساوی طور پر مؤثر تھی۔ امریکی نوآبادیات میں بھی سات سالہ جنگ (The Seven Years War, 1756-63) ہوئی' جس میں برطانیہ اور فرانس اپنے اپنے استعماری مقبوضات کے لیے آپس میں لڑے تھے۔ یہ جنگ امریکہ کے مشرقی ساحلوں پر ہولناک اموات کا باعث بنی۔ یہ جنگ آزادی کی جنگ (The War of Independence, 1775-83) اور جدید دنیا کی پہلی سیکولر ری پبلک کے قیام کا پیش خیمہ بنی۔ مغرب میں ایک زیادہ منصفانہ اور روادارانہ نظام وجود پذیر ہو رہا تھا' تاہم یہ تشدد سے معمور تقریباً دو صدیوں کے بعد حاصل ہوا تھا۔

بحران کے دوران:

بحران کے دوران لوگ مذہب کی طرف مائل ہو گئے تھے اور بعض لوگوں نے جانا کہ ان نئے حالات میں مذہب کی پرانی صورتیں مزید کارآمد نہیں رہیں۔ اینٹی نومین Antinomian تحریکوں نے' جو کہ بعد میں یہودیت میں رونما ہونے والی شبتائیتی (Shabbatean) تحریکوں سے مماثل تھیں' ماضی سے تعلق توڑنے اور بے ربطی کے ساتھ کسی نئی شے تک رسائی پانے کی کوشش کی۔ سترہویں صدی کے انگلینڈ میں' خانہ جنگی کے بعد' جیکب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہابٹملی اور لارنس کلارکسن (1615-17ء) نے ایک ابتدائی قسم کی دہریت (Atheism) کا پرچار کیا۔ ہابٹملی نے اپنی کتاب The Light And Dark Sides Of God (1650ء) میں لکھا کہ ایک الگ تھلگ' دوردراز خدا کو ماننا بت پرستی ہے' خدا عیسیٰؑ کے علاوہ بھی دوسرے انسانوں میں جلوہ گر ہوا ہے اور الوہیت ہر شے میں موجود ہے' حتیٰ کہ گناہ میں بھی۔ کلارکسن نے اپنی کتاب The Single Eye میں لکھا کہ گناہ تو محض انسان کی ایک فنتاسی ہے جبکہ شر خداوند ہی کا ایک مظہر ہے۔ ایک انقلابی بپٹسٹ ایبیزیئر کوپ (1619-72ء) نے جنسی امتناعات کو توڑ دیا اور انہیں کھلم کھلا غلط قرار دیا۔ اس کا ایقان تھا کہ جلد ہی عیسیٰؑ واپس آئیں گے اور اس موجودہ گلے سڑے اور منافقانہ نظام کو مٹا دیں گے۔ نیوانگلینڈ کی امریکی نوآبادیات میں بھی اینٹی نومین ازم (Antinomianism) موجود تھا۔ ایک عوامی مبلغ جان کاٹن (1585ء-1652ء) نے' جو 1635ء میں میساچوسٹس میں پہنچا' اس امر پر زور دیا کہ نیک کام فضول ہیں اور نیک زندگی بے فائدہ ہے: خدا ہمیں ان انسان ساختہ قوانین کے بغیر ہی بچا سکتا ہے۔ اس کی شاگردہ این ہچنسن (1590ء-1643ء) نے دعویٰ کیا کہ اسے خدا کی طرف سے پیغامات موصول ہوتے ہیں اور وہ اپنی بائبل پڑھنے یا نیک کام کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ شاید یہ باغی اپنے اس بالکل ابتدائی نوعیت کے احساس کا اظہار کر رہے تھے کہ اس نئی دنیا میں پرانی پابندیاں کارگر نہیں رہیں کہ جہاں زندگی بنیادی طور پر ہی تبدیل ہو رہی ہے۔ مستقل اختراع و ایجاد کے زمانے میں ایسا ہونا ناگزیر تھا کہ کوئی شخص مذہبی اور اخلاقی آزادی اور اختراع کے لیے بھی آواز بلند کرے۔

دوسرے لوگوں نے نئے عہد کے آدرشوں کو مذہبی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ انجمن احباب (Society Of Friends) کے بانی جارج فاکس (1624-91ء) نے ایک ایسی روشن خیالی کا پرچار کیا جو کہ اس سے مختلف نہیں تھی' جسے بعدازاں کانٹ نے بیان کیا تھا۔ اس نے درس دیا کہ اس کے کوئیکرز (Quakers) * کو اپنے قلب میں ہی ایک روشنی کا مشاہدہ کرنا چاہیے' اس نے انہیں کہا کہ وہ ''کسی دوسرے شخص کی رہنمائی کے بغیر اپنے فہم کو استعمال کریں''۔ اس کا ایقان تھا کہ اس سائنسی دور میں مذہب کو لازماً ''تجرباتی'' بننا ہوگا' جو کسی مقتدر ادارے کی بجائے ذاتی تجربے سے تصدیق یافتہ ہو۔ انجمن احباب (Society Of Friends) نے نئے سیاسی آدرش کی تائید کی یعنی تمام انسان مساوی ہیں۔ کوئیکروں کو اپنی

* جارج فاکس کی قائم کردہ ''انجمن احباب'' (Society of Friends) کے ارکان کو یہ نام دیا گیا تھا۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹوپیاں کسی کے لیے نہیں اتارنی چاہئیں۔ غیر تعلیم یافتہ مردوزن کو یونیورسٹی ڈگریوں کے حامل مذہبی پیشواؤں کا احترام نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے نظریات کو عام کرنا چاہیے۔ اسی طرح جان ویزلے (91-1703ء) نے روحانیت پر سائنسی طریق اور نظام کا اطلاق کرنے کی کوشش کی۔ اس کے میتھڈسٹ (Methodist) عبادت' بائبل کے مطالعے' روزہ رکھنے اور انسانی فلاح کے کام انجام دینے کے سخت طریقۂ کار پر عمل کرتے تھے۔ کانٹ کی طرح ویزلے نے عقیدے کی عقل سے نجات کا استقبال کیا اور اعلان کیا کہ مذہب کوئی ذہنی فلسفہ نہیں ہے بلکہ یہ تو قلب کی روشنی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ایک رحمت ہوسکتی ہے کہ حالیہ برسوں میں عیسائیت کے عقلیت پسندانہ اور تاریخی شواہد ''ناکام اور بوجھل'' ہو گئے ہیں۔ یہ رحمت مردوزن کو ''اپنے اندر جھانکنے اور اپنے دلوں کے اندر جگمگاتی ہوئی روشنی کو پانے'' پر مجبور کرتے ہوئے انہیں آزادی دلائے گی۔

امریکہ میں بنیاد پرستی:

عیسائی تقسیم ہو رہے تھے: کچھ لوگ ''فلسفوں'' کی پیروی کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے عقیدے کو اسراریت سے معریٰ اور عقلیت پسندانہ بنانے کی کوشش کی' دیگر لوگوں نے عقل کو سرے سے ہی مسترد کر دیا۔ یہ ایک پریشان کن پیش رفت تھی جو کہ بالخصوص امریکی نوآبادیات میں نمایاں تھی۔ اس تقسیم کا ایک دوررس اثر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انیسویں صدی کے اواخر میں بنیاد پرستی کا ارتقا تھا۔ نیو انگلینڈ کے پیورٹن لوگوں کو چھوڑ کر بیشتر نوآبادیاتی لوگ مذہب سے بے نیاز تھے۔ سترہویں صدی کے اختتام تک ایسا لگتا تھا کہ نوآبادیات تقریباً مکمل طور پر سیکولر ہو رہی ہوں۔ تاہم اٹھارہویں صدی کے اوائل میں پروٹسٹنٹوں نے دوبارہ زور پکڑا اور نئی دنیا میں عیسائی زندگی پرانی دنیا کے مقابلے میں زیادہ رسمی ہوگئی۔ حد تو یہ ہے کہ کوئیکر' بیپٹسٹ اور پریسبائٹیرین جیسے مختلف العقیدہ فرقوں نے بھی' جو سارے کے سارے مذہبی مقتدرہ کو رد کر چکے تھے اور اپنی سوچ کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تاکید کرتے تھے' فلاڈیلفیا میں اسمبلیاں قائم کیں' جو مقامی کمیونٹیوں پر کڑی نگاہ رکھتیں' مذہبی پیشوائیت کی نگرانی کرتیں' مبلغوں کی اصلاح کرتیں اور بدعت کو مٹاتی تھیں۔ یہ تینوں فرقے استبدادی مگر جدیدیت پذیر مرکزیت کے نتیجے میں پروان چڑھے تھے اور ان کے ارکان کی تعداد ڈرامائی انداز میں بڑھتی تھی۔ عین اسی زمانے میں میری لینڈ میں چرچ آف انگلینڈ قائم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا گیا اور نیویارک سٹی' بوسٹن اور چارلسٹن میں خوب صورت گرجا گھروں نے خطوطِ فلکی (Skylines) کو تبدیل کر دیا۔

تاہم جہاں عظیم تر نظم و ضبط کے لیے عمل جاری تھا' وہاں اس عقلیت پسندانہ پابندی کے خلاف ایک شدید اور عوامی سطح کا ردعمل بھی موجود تھا۔ قدامت پسندانہ مذہب نے ہمیشہ اساطیر اور عقل کو لازم و ملزوم تصور کیا تھا: ہر ایک دوسرے کے بغیر تہی تھا۔ مذہبی معاملات کا بھی ہمیشہ یہی معاملہ رہا تھا' جہاں عقل کو ایک اہم کردار ادا کرنے کی اکثر و بیشتر اجازت دی گئی تھی۔ تاہم نئی پروٹسٹنٹ تحریکوں میں سے کچھ میں (ایک پیشرفت' جس کا سرا پیچھے لوتھر سے ملتا تھا) عقل کو رد کرنے یا الگ تھلگ کرنے کا نیا رجحان غیر عقلیت پسندی کا پیش خیمہ بنا۔ کوئیکر نام نہاد عقلیت پسند ہوتے تھے کیونکہ ابتدائی زمانے میں وہ اپنے مذہبی نظریات کو بہت شدت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ایک مشاہدہ کرنے والے نے لکھا ہے کہ وہ اس قدر ''چیختے چلاتے' تھراتے اور گرجتے برستے تھے کہ کتے بھونکنے' مویشی بدحواس ہو کر بھاگنے اور سؤر چیخنے لگتے تھے''۔

پیورٹین اور انقلابی کیلونسٹ بھی' جن کا آغاز چرچ آف انگلینڈ کی ''پاپائیت'' کی مخالفت سے ہوا تھا' ایک انتہاپسندانہ اور ہنگامہ آفریں روحانیت کے حامل تھے۔ ان کی ''دوسری مرتبہ جنم'' والی رسومات بھی الم انگیز تھیں: بہت سے لوگوں نے خدا کی آغوش میں رحمت یاب ہو کر سمانے سے پہلے احساس خطا' خوف اور مفلوج کر دینے والے شک کا تجربہ کیا۔ ان کی اس تبدیلی نے انہیں بہت زیادہ توانائی عطا کی اور انہیں ابتدائی جدیدیت میں نمایاں کردار ادا کرنے کے قابل بنایا۔ وہ لوگ اچھے سرمایہ کار اور اکثر و بیشتر اچھے سائنس داں تھے۔ تاہم بعض اوقات رحمت کے اثرات مدھم پڑ جاتے اور پیورٹین شدید مایوسانہ کیفیات میں مبتلا ہو کر ایک پہلے جیسی حالت میں لوٹ جاتے اور بعض لوگوں نے تو خودکشی بھی کر لی۔

قدامت پسند مذہب عمومی طور پر اس انداز سے ہسٹیریائی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی رسومات لوگوں کو حقیقت سے ہم آہنگ کرواتی تھیں۔ بیکانیلیائی (Bacchanalian) مسلک اور مجنونانہ سرمستیاں یقیناً رونما ہوئیں تاہم ان میں اکثر نہیں بلکہ چند لوگ ہی ملوث تھے۔ تصوف عام لوگوں کی دسترس سے باہر نہیں تھا۔ اپنے عروج پر وہ فرد سے فرد کے تعلق کا عمل تھا' جس میں شاگرد کی احتیاط کے ساتھ نگرانی کی جاتی تھی کہ کہیں وہ غیر صحت مندانہ نفسیاتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیفیات میں مبتلا نہ ہو جائے۔ لاشعور میں اترنا ایک ایسا معاملہ تھا جس کے لیے بے انتہا مہارت' ذہانت اور نظم وضبط کی ضرورت ہوتی تھی۔ جب ماہرانہ رہنمائی میسر نہ ہوتی تو نتائج افسوسناک نکلتے تھے۔ وسطی عہد کے بعض اولیاء (Saints) کا ناکافی روحانی رہنمائی کی وجہ سے پیدا ہونے والا جنون آمیز اور نیوراتی (Neurotic) رویہ ذہن کی غیر منظم متبادل حالتوں کو جنم دینے کے خطرات کا عکاس تھا۔ ٹیریسیا آف ایولا اور جان آف کراس کی اصلاحات کا مقصد ایسی ہی خامیوں کو درست کرنا تھا۔ جب عوامی سطح پر صوفیانہ ریاضتیں کی جائیں تو وہ ہجوم کے ہسٹیریا' شبتائیتیوں (Shabbatarians) کی نفی پرستی اور پیورٹنوں کے ذہنی عدم توازن کو پیدا کرسکتی ہیں۔

امریکی مذہبی زندگی کی جذباتی انتہا پسندی:

اٹھارہویں صدی کے دوران جذباتی انتہاپسندی امریکی مذہبی زندگی کی ایک خصوصیت بن گئی تھی۔ یہ جذباتی انتہاپسندی پہلی عظیم بیداری (First Great Awakening) میں بالخصوص ظاہر ہوئی' جو 1734ء میں نارتھمپٹن' کنکٹیکٹ میں پھٹ پڑی تھی اور جس کی وقائع نگاری فاضل کیلونسٹ منسٹر جوناتھن ایڈورڈز (58-1703ء) نے کی تھی۔ ایڈورڈز توضیح کرتا ہے کہ بیداری (Awakening) سے پہلے نارتھمپٹن کے لوگ خصوصی طور پر مذہبی نہیں رہے تھے' تاہم 1734ء میں دو نوجوان اچانک ہلاک ہوگئے اور صدمہ (جس کو خود ایڈورڈز کی جذباتی تقریروں نے بڑھایا تھا) ایک جنون آمیز مذہبیت میں ڈھل گیا' جو کسی متعدی مرض کی طرح میساچوسٹس اور لانگ آئی لینڈ میں پھیل گیا۔ لوگوں نے کام کاج چھوڑ دیئے اور دن دن بھر بائبل پڑھنے لگے۔ چھ ماہ کے اندر اندر شہر کے تین سو افراد ''دوبارہ پیدا ہونے'' (Born Again) کی سی تبدیلی کے توڑ مروڑ کر رکھ دینے والے تجربے سے گزرے۔ وہ اذیت ناک اور تباہ کن نشیب وفراز سے گزرے تھے۔ بعض اوقات تو وہ اتنے شکستہ اور ''احساس خطا کے تحت ایک پاتال میں گرے ہوئے سے ہوتے تھے کہ وہ یہ تک سوچنے پر آمادہ ہوتے کہ وہ خدا کے رحم سے ماورا ہو چکے ہیں۔'' بعض اوقات وہ ''بیک وقت ہنسنے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے' ساتھ ساتھ دھاڑیں بھی مارنا شروع ہو جاتے تھے۔'' جب انگریز میتھڈسٹ مبلغ جارج وائٹ فیلڈ (70-1714ء) نے نوآبادیات کا دورہ کیا تو ایک اور لہر پیدا ہوئی۔ اس کے وعظوں کے دوران لوگ روتے' چلاتے اور غش کھا جاتے۔ گرجا گھر' خود کو محفوظ تصور کرنے والے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کی چیخوں اور خود کو دھتکارا ہوا تصور کرنے والے لوگوں کی آہ و زاری سے لرزنے لگے۔ ایسا نہیں تھا کہ صرف غیر تعلیم یافتہ اور سیدھے سادے لوگ ہی اس کا شکار تھے۔ وائٹ فیلڈ کو ہارورڈ اور ییل (Yale) میں بھی وجد آمیزی کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا تھا۔ اس کے دورے کا اختتام 1740ء میں ایک عوامی جلوس کے ساتھ ہوا' جس میں اس نے تیس ہزار لوگوں کو بوسٹن کامن (Boston Common) میں تبلیغ کی۔

ایڈورڈز نے اپنی ''بیداری'' والی کتاب میں اس قسم کی جذبات پرستی (Emotionalism) کے خطرات کو بیان کیا۔ جب نارتھمپٹن میں یہ احیاء ٹھنڈا ہوگیا تو ایک شخص اس قدر مایوس ہوا کہ خودکشی پر آمادہ ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس وجد آفریں مسرت کے زیاں کا مطلب صرف یہ تھا کہ جہنم اس کا مقدر ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی ''ہجوم کے ہجوم..... ایسا لگتا تھا کہ انہیں مشورہ دیا گیا ہے' ان کو تاکید کی گئی ہے' گویا کسی شخص نے انہیں کہا ہے کہ ''اپنے گلے کاٹ ڈالو' ابھی ایک اچھا موقع ہے۔ فی الفور' بس اسی وقت!'' دو آدمی ''عجیب و غریب ولولہ انگیز تصورات'' کے زیر اثر پاگل ہوگئے۔ ایڈورڈز نے یہ بات زور دے کر کہی کہ بیشتر لوگ ''بیداری'' سے پہلے کی نسبت زیادہ پرسکون اور متین ہوگئے تھے' تاہم اس کا معذرت خواہانہ انداز ظاہر کرتا ہے کہ یہ تصور کرنا کس قدر خوفناک ہوسکتا تھا کہ مذہب ایک قلبی معاملہ ہے۔ جب عقیدے کو غیر عقلی مان لیا جائے اور اس سے مربوط بہترین قدامت پسندانہ روحانیت کو ترک کر دیا جائے تو لوگ ہر طرح کے توہمات کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کسی مسلک کی رسوم پوری احتیاط کے ساتھ اس طرح تشکیل دی جاتیں کہ وہ ایک صدمے سے گزرنے کا پیش خیمہ تو بنتیں تاہم اس کے بعد لوگ زیادہ صحت مند ہوجاتے تھے۔ یہ امر لیوریائی قبالہ کی رسوم میں واضح ہوا تھا' جن کے تحت لوگوں کو اپنے رنج و غم کے اظہار کی تو اجازت ہوتی تھی لیکن اختتام ہنسی خوشی کرنا ہوتا تھا۔ بالکل اسی طرح حضرت حسینؓ کے احترام میں نکالے جانے والے جلوسوں میں شیعوں کو اپنا اضطراب اور غصہ نکالنے کا ایک راستہ مل جاتا تھا' لیکن ایک رسوماتی شکل میں: وہ عمومی طور پر اس کے بعد غصے سے دیوانے نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ امیر اور طاقتور لوگوں کے خلاف اپنے اشتعال کا اظہار کرتے تھے۔ تاہم نارتھمپٹن کے لوگوں کی مدد کرنے کو ایسی کوئی رسوم نہیں تھیں۔ ہر شے بے ساختہ اور غیر منظم تھی۔ لوگوں کو اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت تھی۔ بعض لوگوں کے لیے یہ چیز ہلاکت انگیز ثابت ہوئی۔

اس کے باوجود ایڈورڈز کو یقین تھا کہ ''بیداری'' خدا کا کام تھی۔ اس نے عیاں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دیا تھا کہ امریکہ میں ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے اور وہ باقی دنیا پر بھی محیط ہو جائے گا۔ ایڈورڈز کو یہ بھی یقین تھا کہ اس قسم کے احیاء کے ذریعے عیسائی کرۂ ارض پر خدا کی بادشاہی قائم کریں گے' معاشرہ سچ اور خدا کے انصاف کا عکاس ہو جائے گا۔ ''بیداری'' میں سیاسی اعتبار سے کوئی انقلابیت نہیں تھی۔ ایڈورڈز اور وائٹ فیلڈ نے اپنے سامعین کو برطانوی حکمرانی کے خلاف بغاوت کرنے' جمہوری حکومت کے لیے مہم چلانے یا دولت کی منصفانہ تقسیم کا مطالبہ کرنے کی تلقین نہیں کی تاہم اس تجربے نے انقلاب امریکہ (American Revolution) کے لیے راستہ ہموار کرنے میں مدد ضرور دی۔ اس وجد آفریں تجربے نے ان لوگوں کو جو کہ ڈی اسٹ (Deist) روشن خیالی کے آدرشوں کو قبول کرنے سے یکسر قاصر تھے' آزادی کی ایک مسعود کیفیت کی یاد میں محو چھوڑا۔ لفظ ''آزادی'' کو اس تبدیلی کی مسرت کو بیان کرنے کے لیے کثرت سے استعمال کیا گیا نیز معمول کی زندگی کے رنج والم سے چھٹکارے کے اظہار کے لیے۔ وائٹ فیلڈ اور ایڈورڈز ہر دو نے اپنے پیروکاروں کو ہلاشیری دی کہ وہ اپنے وجد آفریں عقیدے کو اشرافیہ کے عقیدے سے برتر سمجھیں' کیونکہ اشرافیہ دوبارہ پیدا ہونے کے تجربے سے نہیں گزری تھی اور اس کی عقلیت پسندی کی وجہ سے اسے جنونی تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے بہت سے لوگ' جنہیں احیاء سے مذہبی پیشواؤں کی متکبرانہ دوری یاد تھی' وہ ادارہ جاتی اتھارٹی سے بے اعتمادی کا شکار ہو گئے' جو کہ امریکی کیلونسٹوں کے عیسائی تجربے کا جزو بن گئی۔ ''بیداری'' امریکی تاریخ کی پہلی عوامی تحریک تھی۔ اس نے لوگوں کو بھونچال سا برپا کر دینے والے واقعات میں شرکت کا وجد آفریں تجربہ فراہم کیا' ان کا ایقان تھا کہ یہ واقعات تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیں گے۔

تاہم ''بیداری'' نے کیلونسٹوں میں تقسیم بھی پیدا کر دی۔ ''اولڈ لائٹس'' کے نام سے مشہور ہو جانے والے بوسٹن کے منسٹروں جوناتھن مے ہیو (66-1720ء) اور چارلس چانسی (87-1705ء) جیسے لوگوں کو' جن کا ایقان تھا کہ عیسائیت کو ایک عقلیت پسندانہ اور روشن خیال عقیدہ ہونا چاہیے' احیاء کے ہسٹیریا سے سخت صدمہ پہنچا اور وہ احیاء کے دانش مخالف تعصب سے بدگمانی و بے اعتمادی کا شکار ہو گئے۔ ''اولڈ لائٹس'' کی کثیر تعداد کا تعلق معاشرے کے خوشحال طبقوں سے تھا' جبکہ نچلے طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ''نیو لائٹ گرجا گھروں'' کے جذباتی مذہب کی طرف مائل تھے۔ 1740ء کے عشرے کے دوران تقریباً دو سو نئے فرقوں نے پرانے فرقوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے الگ چرچ قائم کر لیے۔ پریسبائیٹرین نیو لائٹس 1741ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پریسبائٹیرین سنوڈ (Synod) سے الگ ہو گئے اور انہوں نے منسٹروں کی تربیت کے لیے اپنے کالج کھولے جن میں پرنسٹن نیوجرسی کا Nassau Hall قابل ذکر ہے۔ بعدازاں یہ تقسیم ختم تو ہوگئی لیکن اس دوران نیولائٹس ایک الگ ادارہ جاتی تشخص کے حامل ہو گئے تھے جو کہ بعد میں انیسویں صدی کے اواخر میں بنیاد پرستانہ تحریک کے ظہور میں آنے کے دوران اہم ثابت ہوا۔

نفرت کا مذہب' اشتعال کی الٰہیات:

''بیداری'' نے ہر شخص کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا اور اس کے بعد' حد تو یہ ہے کہ اولڈ لائٹس بھی جاریہ واقعات کو بھی الہامی اہمیت دینے پر آمادہ تھے۔ جب نومبر 1755ء میں دنیا کے مختلف حصوں میں بیک وقت زلزلے برپا ہوئے تو جوناتھن ے ہیو کو یقین ہوگیا کہ ''عظیم انقلاب رونما ہونے ہی والے ہیں۔'' اس نے ''دنیا کی سیاسی اور مذہبی حالت میں غیر معمولی تبدیلی'' کی پیشگوئی کی۔ ے ہیو نے سات سالہ جنگ کے دوران امریکہ اور کینیڈا میں اپنی نوآبادیاتی مقبوضات کے لیے ہونے والی برطانیہ اور فرانس کی استعماری جدوجہد کو جبلی طور پر مذہبی رنگ دے دیا۔ اس کا ایقان تھا کہ اس سے عیسیٰؑ دشمن' آخری زمانوں کا جھوٹا مدعی یعنی پوپ کمزور ہوگا اور عیسیٰؑ دوسری مرتبہ جلد آ جائیں گے۔ نیولائٹس نے بھی سات سالہ جنگ کے دوران امریکہ کو بدی کی قوتوں کے خلاف ایک کائناتی جنگ میں صف اول میں لڑنے والا تصور کیا۔ ایسا اسی زمانے میں ہوا تھا کہ یوم پوپ (5 نومبر) ایک سالانہ تعطیل قرار پایا اور اس دن مشتعل ہجوم پوپ کے پتلے نذر آتش کیا کرتے تھے۔ وہ زمانہ دہشت انگیز اور تشدد سے بھرا ہوا تھا۔ امریکی اپنے اوپر نازل ہونے والے المیوں کی توضیح کے لیے اب بھی قدیم اساطیر کی طرف دیکھتے تھے۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ انہیں متوقع تبدیلی کا بھی احساس تھا اور انہوں نے فرانس اور رومن کیتھولک چرچ کو امریکہ کے خیر پر مبنی نظام معاشرت و سیاست کے شدید دشمن اور شیطان تصور کرتے ہوئے نفرت کا ایک مذہب تشکیل دیا۔ جب انہوں نے ایسی الہامی فنتاسیوں کو پروان چڑھایا تو ایسا لگتا ہے وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ پاپائیت کی بربادی سے پہلے نجات' آزادی اور عدل و امن کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس نئی دنیا کو وجود میں لانے کے لیے خون کی ہولی کھیلنا ضروری ہے۔ ہم مشاہدہ کریں گے کہ جدیدیت کے طلوع سے پیدا ہونے والے ردعمل میں اشتعال کی الٰہیات وضع کی جاتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکی محسوس کر سکتے تھے کہ تبدیلی رونما ہونے ہی والی ہے' تاہم وہ پرانی دنیا ہی سے جڑے رہے۔ سات سالہ جنگ کے معاشی اثرات کے تحت برطانوی حکومت نے امریکی نوآبادیات پر نئے ٹیکس عائد کر دیئے۔ اس اقدام نے اس انقلابی بحران کو ابھارا جو 1775ء کی امریکہ کی جنگِ آزادی پر منتج ہوا۔ اس طویل جدوجہد کے دوران ہی امریکیوں نے ماضی سے انقلابی انقطاع کے اس اذیت دہ عمل کو شروع کیا' جو جدید نظام میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے نفرت کے مذہب نے اس پیشرفت میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔

اعلانِ آزادی:

انقلابی لیڈر ..... مثلاً جارج واشنگٹن' جان اور سیموئیل ایڈمز' تھامس جیفرسن اور بنجامن فرینکلن ..... انقلاب کو ایک سیکولر واقعہ تصور کرتے تھے۔ وہ عقلیت پسند لوگ تھے' جان لاک' سکاٹش کامن سینس فلسفے یا انقلابی وہگ (Whig) نظریے کے جدید آدرشوں سے فیضان یافتہ روشن خیال افراد تھے۔ وہ ڈی اسٹ (Deists) تھے اور آرتھوڈوکس عیسائیوں کے مذہبی تصورات سے اختلاف رکھتے تھے۔ انہوں نے انقلاب کی طرف دھیرے دھیرے' رُکتے رکتے حرکت کرتے ہوئے ایک استعماری طاقت کے خلاف ایک باوقار عملیت پسندانہ جدوجہد کی۔ یقیناً انہوں نے اپنے آپ کو عیسیٰؑ کے دشمنوں سے کائناتی جنگ لڑنے والے جنگجو نہیں سمجھا۔ برطانیہ سے ناگزیر علیحدگی عملی اور دنیاوی مقاصد تک محدود تھی: ''متحدہ نوآبادیات آزاد ریاستیں ہونے کا حق رکھتی ہیں اور انہیں یہ حق ملنا چاہیے۔'' جیفرسن نے جان ایڈمز اور فرینکلن کے ساتھ مل کر جو ''اعلانِ آزادی'' تحریر کیا تھا اور جسے 4/جولائی 1776ء کو نوآبادیاتی کانگرس (Colonial Congress) نے منظور کیا تھا' وہ لاک کے بیان کردہ بدیہی انسانی حقوق کے مثالیے کی بنیاد پر لکھی گئی ایک روشن خیالی سے معمور دستاویز تھی۔ ان حقوق کا تعین یوں کیا گیا تھا: ''زندگی' آزادی اور مسرت کے حصول کے حقوق۔'' اعلان آزادی میں ڈی اسٹ خدائے فطرت (God Of Nature) کے نام پر آزادی' خودمختاری اور مساوات کے جدید آدرشوں کو پیش کیا گیا تھا۔ تاہم سیاسی اعتبار سے اعلانِ آزادی انقلابی نہیں تھا۔ اس میں معاشرے کی دولت کو دوبارہ تقسیم کرنے یا کسی مذہبی نظام عدل و امن کو قیام کرنے کی پوٹو پیائی باتیں نہیں کی گئی تھیں۔ وہ تو ایک دوررس اور دیرپا لائحۂ عمل کی صورت گری کرنے والی عملی' اور عقلیت پسندانہ دستاویز تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکہ اور ایران کے انقلاب میں مماثلت:

تاہم امریکی ری پبلک کے بانی (Founding Fathers) اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے تصورات مثالی نہیں تھے۔ امریکیوں کی اکثریت کیلونسٹ تھی اور وہ اس عقلیت پسندانہ نظام کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ دراصل وہ تو ڈی ازم (Deism) کو ایک شیطانی نظریہ تصور کرتے تھے۔ ابتدا میں تو نوآبادیاتی عوام کی اکثریت بالکل اپنے لیڈروں ہی کی طرح برطانیہ سے الگ ہونے سے ہچکچاتی تھی۔ انقلابی جدوجہد میں سب شریک بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی تیس ہزار افراد نے برطانیہ کی جانب سے جنگ لڑی اور جنگ کے بعد 80000 سے 100000 کے لگ بھگ لوگ کینیڈا' ویسٹ انڈیز یا برطانیہ کی طرف نقل مکانی کر گئے۔ جن لوگوں نے آزادی کے لیے جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا انہیں بانیوں کے سیکولر تصورات کے ساتھ ساتھ پرانی اسطورہ اور عیسائیت کے نظام عدل و امن کے خوابوں نے بھی تحریک دی تھی۔ درحقیقت مذہب کو سیاست سے الگ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ امریکہ سے وسیع حد تک مختلف امیدیں رکھنے والے نوآبادیاتی عوام کو برطانیہ کی استعماری طاقت کے خلاف جنگ آزمائی کے قابل بنانے کے لیے سیکولر اور مذہبی نظریات کا تخلیقی امتزاج کیا گیا۔ ہم ایران کے اسلامی انقلاب (79-1978ء) میں بھی' جو کہ ایک استعماری طاقت کے خلاف ایک اعلانِ آزادی تھا' سیکولر اور مذہبی آئیڈیلزم کا ایسا ہی امتزاج مشاہدہ کریں گے۔

انقلابی جدوجہد کے پہلے دس برسوں کے دوران لوگ ماضی سے ایک ریڈیکل انقطاع پر راضی نہیں تھے۔ برطانیہ کے ساتھ تعلقات میں سختی بعید از خیال محسوس ہوتی تھی۔ بہت سوں کو اب بھی امید تھی کہ برطانوی حکومت اپنی پالیسیوں کو تبدیل کرے گی۔ کوئی شخص بھی مستقبل کی طرف پرجوش ہو کر نہیں بڑھ رہا تھا اور ایک نئے عالمی نظام (New World Order) کے خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ بیشتر امریکی اب بھی بحران کا مقابلہ جبلی طور پر پرانے ماقبل جدید انداز ہی سے کر رہے تھے: وہ اپنی حالت کو مستحکم بنانے کے لیے مثالی ماضی کی طرف دیکھتے تھے۔ انقلابی رہنماؤں اور زیادہ سیکولر ریڈیکل وِگ نظریہ اپنانے والوں نے 1066ء میں نارمنوں (Normans) کی یورش کے خلاف سیکسنوں (Sexons) کی جدوجہد یا برطانوی خانہ جنگی کے دوران پیورٹن پارلیمنٹیرینوں (Parliamentarians) کی حالیہ جدوجہد سے فیضان پایا تھا۔ کیلونسٹوں نے اولڈ انگلینڈ میں جابرانہ اینگلیکن (Anglican) حکومت کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاف پیورٹنوں (Puritans) کی جدوجہد کی یادیں تازہ کرتے ہوئے نیو انگلینڈ میں اپنے سنہرے دور کو دوبارہ لانے کی کوشش کی۔ وہ امریکی ویرانے میں ایک خدائی معاشرہ تخلیق کرتے ہوئے نئی دنیا میں جبر و استبداد سے آزادی کے متلاشی تھے۔ اس دور (73-1763ء) کے وعظوں اور انقلابی تقریروں میں ماضی کے قیمتی حاصلات کو محفوظ کرنے کی خواہش پر زور دیا گیا تھا۔ نوآبادیاتی لوگ اپنے ورثے کو پرانی قدامت پسندانہ روح کے مطابق محفوظ کرنے کی سعی کر رہے تھے۔ ماضی کو خوشگوار اور مستقبل کو امکاناً خوفناک بنا کر پیش کیا گیا۔ انقلابی رہنماؤں نے اعلان کیا کہ وہ تو روایت سے انقلابی انقطاع کے نتیجے میں ناگزیر طور پر رونما ہونے والے المیے کو ٹالنے کے لیے اقدامات کر رہے ہیں۔ انہوں نے بائبل کی زبان استعمال کرتے ہوئے برطانوی پالیسی کے نتائج سے ڈرایا۔

تاہم اس روش میں تبدیل آئی۔ جب برطانوی اپنی متنازعہ استعماری پالیسیوں پر اڑے رہے تو نوآبادیات کے لوگوں نے اپنی کشتیاں جلا دیں۔ بوسٹن ٹی پارٹی (1773ء) نیز لیکسنگٹن اور کنکارڈ کی جنگوں (1775ء) کے بعد واپسی کا کوئی امکان نہیں رہا۔ اعلانِ آزادی نے پرانے نظام سے انقطاع اور ایک عدیم النظیر مستقبل کی طرف بڑھنے کے ایک نئے اور جرأتمندانہ عزم کا اظہار کیا۔ اس اعتبار سے اعلانِ آزادی ایک جدید دستاویز تھی، جس نے یورپ کے سائنسی انقلاب کی خصوصیات دانشورانہ آزادی اور مستحکم عقائد و روایات پر حملے کو سیاسی اصطلاحات میں پیش کیا تھا۔ تاہم نوآبادیات کے لوگوں کی اکثریت جان لاک سے زیادہ عیسائی پیشگوئی کی اساطیر سے متاثر تھی۔ وہ اس جدید سیاسی خودمختاری تک ایک اساطیری وسیلے سے رسائی کے حاجت مند تھے، جس سے کہ وہ مانوس تھے، جس میں ان کے بنیادی عقائد کی بازگشت تھی اور جنہوں نے ان کو اس دشوار تبدیلی کے لیے نفسیاتی مضبوطی پانے کا اہل بنایا۔ جیسے کہ ہم اکثر دیکھیں گے کہ مذہب اکثر و بیشتر لوگوں کو جدیدیت کے اذیت دہ عمل سے گزرنے کے ذرائع مہیا کرتا ہے۔

یوں اہم چرچوں (Churches) نے (حتیٰ کہ اینگلیکنوں نے بھی) سام ایڈمز جیسے عوامی لیڈروں کی انقلابی تقریروں کو عیسائی رنگ دیا۔ جب وہ حکومت کے لیے راستی اور ذمہ داری کی بات کرتے تو اس سے سام کی برطانوی اہل کاروں کی بدعنوانی پر آتشیں تنقید کو تقویت ملتی۔ عظیم بیداری (Great Awakening) نے نیولائٹ کیلونسٹوں کو ایسٹیبلشمنٹ سے محتاط بنایا اور کسی بڑی تبدیلی پر اثرانداز ہونے کی ان کی اہلیت پر اعتماد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عطا کیا تھا۔ جب انقلابی رہنما ''آزادی'' کی بات کرتے تو وہ ایک ایسی اصطلاح استعمال کرتے تھے' جو پہلے ہی مذہبی معانی سے مملوتھی۔ یہ اصطلاح خداوند کی بادشاہت جیسے تصورات سے مربوط تھی' جس میں سب جبر واستبداد ختم ہوجانا تھا نیز یہ اصطلاح منتخب افراد کی اسطورہ سے جڑی ہوئی تھی' جنہوں نے دنیا کی تبدیلی کے لیے خداوند کے آلۂ کار بننا تھا۔ ییل یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ ٹموتھی ڈوائٹ (1817ء۔ 1752ء) نے بڑے جوش کے ساتھ انقلاب کو ''امانوئیل کی سلطنت'' کا نقیب قرار دیا اور کہا کہ امریکہ ''وہ نئی' خاص الخاص بادشاہت بن رہا ہے' جو اعلیٰ ترین اولیاء (Saints) کو عطا کی جائے گی۔'' 1775ء میں کنکٹیکٹ کے مبلغ ایسنز یر بالڈون نے باصرار کہا کہ جنگ کی تباہی و بربادی سے خدا کے نئی دنیا کے منصوبوں کا نفاذ تیز تر ہوجائے گا۔ عیسیٰؑ امریکہ میں اپنی عظیم الشان بادشاہت قائم کریں گے: آزادی' مذہب اور علم یورپ سے نکل کر مغرب کی طرف بحیرۂ اوقیانوس کے پار پہنچ چکے ہیں۔ موجودہ بحران اس بدعنوان نظام کے آخری دنوں کا راستہ ہموار کررہا ہے۔ فلاڈیلفیا کے کوتوال (Provost) ولیم سمتھ کے نزدیک نوآبادیات ''آزادی' فنون اور آسمانی علم کے لیے خداوند کا منتخبہ مرکز'' تھیں۔

تاہم اگر مذہبی پیشوا سیاست کو مذہبی رنگ دے رہے تھے تو سیکولر رہنماؤں نے بھی عیسائی یوٹوپین ازم (Utopianism) کو استعمال کیا۔ جان ایڈمز نے امریکہ کے قیام کو پوری انسانیت کو روشنی عطا کرنے کے خدائی منصوبے کے طور پر پیش کیا۔ تھامس پین کو یقین تھا کہ ''ہم دنیا پر دوبارہ چھا جانے کی قوت کے حامل ہوگئے ہیں۔ حضرت نوحؑ کے وقت سے آج تک کبھی ایسی صورتحال پیدا نہیں ہوئی ہے۔ نئی دنیا جنم لینے ہی والی ہے''۔ رہنماؤں کی عقلی عملیت پسندی بذاتِ خود لوگوں کو انجانے مستقبل کے خوف بھرے سفر پر گامزن کرنے کے لیے تسلی بخش نہیں تھی۔ عیسائیت کے جوش اور ولولے' تصورات اور اساطیر نے انقلابی جدوجہد کو معنویت بخشی اور سیکولرسٹوں کے ساتھ ساتھ کیلونسٹوں کو روایت سے انقطاع کرنے میں یکساں مدد دی۔

سات سالہ جنگ کے دوران ابھرنے والی نفرت کی الٰہیات نے بھی اسی طرح عمل کیا۔ جس طرح ایرانیوں نے اسلامی انقلاب کے دوران امریکہ کو ''شیطانِ بزرگ'' (The Great Satan) قرار دیا تھا' بالکل اسی طرح انقلابی بحران کے دوران برطانوی اہل کاروں کو شیطان کے چیلے قرار دیا گیا۔ بدنام زمانہ سٹیمپ ایکٹ کی منظوری (1765ء)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد حب وطن کی نظموں اور گیتوں میں اس ایکٹ کے پیش کرنے والوں' لارڈ بیوٹ' گرینوائل اور نارتھ کو شیطان کے کارندوں کے طور پر پیش کیا گیا' جو امریکیوں کو شیطان کی ابدی سلطنت میں لے جانے کی سازش کر رہے تھے۔ سٹیمپ کو ''درندے کا امتیازی نشان'' قرار دیا گیا' جو کہ کتاب الہام کے مطابق آخری زمانے میں دھتکارے ہوئے پر نقش ہوگا۔ تمام نوآبادیات میں نکلنے والے سیاسی جلوسوں میں شیطان کی تصویروں کے ساتھ برطانوی وزیروں کے پتلے اٹھائے اور ''اشجار آزادی'' (Liberty Trees) پر لٹکائے جاتے تھے۔ 1774ء میں بادشاہ جارج سوم نے سات سالہ جنگ کے دوران انگلستان کے فتح کیے ہوئے کینیڈین علاقے میں فرانسیسی کیتھولکوں کو مذہبی آزادی دی تو اسے عیسیٰؑ کا دشمن قرار دے دیا گیا۔ اب اس کی تصویر بھی پاپائی اینٹی کرائسٹ اور شیطان کی تصویروں کے ساتھ اشجارِ آزادی پر لٹکائی جانے لگی۔ حد تو یہ ہے کہ نوآبادیات کے تعلیم یافتہ افراد بھی اس موہوم کائناتی سازش کے خوف کا شکار ہوگئے۔ ہارورڈ اور ییل یونیورسٹیوں کے صدور (Presidents) کو یقین تھا کہ نوآبادیات کے لوگ شیطانی قوتوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور وہ ''ظالمانہ قوت کے سب سے زیادہ حمایتی مذہب'' رومن کیتھولک ازم کی متوقع شکست کی امید کرتے تھے۔ آزادی کی جنگ پاپائی اینٹی کرائسٹ کی بربادی کے لیے خداوند کے منصوبے کا جزو بن چکی تھی' جو کہ یقیناً امریکہ میں خداوند کی عادلانہ و منصفانہ بادشاہت کا پیش خیمہ بننا تھی۔ ہمہ گیر سازش کا یہ مریضانہ تصور نیز ایک عام سے سیاسی تنازعے کو خیر و شر کی قوتوں کے مابین ایک کائناتی جنگ کے طور پر دیکھنے کا رجحان بدقسمتی سے اکثر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب لوگ کسی انقلابی جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس شیطانی اساطیر نے نوآبادیات کے لوگوں کو پرانی دنیا سے الگ ہونے میں مدد دی' جس کے لیے وہ ابھی تک ایک بچی کھچی انوکھی چاہت سی محسوس کرتے تھے۔ انگلینڈ کو شیطان قرار دینے سے وہ ایک ''غیر'' (Other) میں' امریکہ کے قطبی مخالف (Polar Opposite) میں تبدیل ہوگیا اور یوں نوآبادیات کے لوگ اپنے لیے ایک امتیازی تشخص وضع کرنے کے اور نئے نظام کو تشکیل دینے کے قابل ہوگئے۔

اسی طرح مذہب نے پہلی جدید سیکولر ری پبلک کی تخلیق میں ایک بنیادی کردار ادا کیا۔ تاہم جب نئی نئی آزاد ہونے والی ریاستوں نے اپنے آئین بنائے تو ان میں خدا کا ذکر برائے نام کیا گیا۔ 1786ء میں تھامس جیفرسن نے ورجینیا میں اینگلیکن چرچ کو توڑ دیا۔ اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مسودۂ قانون (Bill) میں کہا گیا تھا کہ عقیدے کے معاملے میں زور زبردستی سے کام لینا ''گناہ اور جابرانہ عمل'' ہے' اور یہ کہ اگر لوگوں کو اپنی سوچ پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے تو سچ غالب آ جائے گا' اور یہ کہ مذہب اور سیاست کے درمیان ایک ''علیحدگی کی دیوار'' (Wall Of Seperation) ہونی چاہیے۔ ورجینیا کے بپٹسٹوں' میتھڈسٹوں اور پریسبائیٹرین نے اس مسودۂ قانون کی تائید کی کیونکہ وہ ریاست میں چرچ آف انگلینڈ کی مراعاتی حیثیت سے آزردہ تھے۔ بعد میں دوسری ریاستوں نے ورجینیا کی پیروی کی اور اپنے اپنے چرچوں کو توڑ دیا' میساچوسٹس نے سب سے آخر میں 1833ء میں یہ اقدام کیا۔

1887ء میں' جب فلاڈیلفیا کنونشن میں وفاقی آئین بنایا گیا تو خدا کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا اور بل آف رائٹس (1789ء---Bill Of Rights)' وفاقی آئین کی پہلی ترمیم میں مذہب کو باقاعدہ طور پر ریاست سے الگ کر دیا گیا: ''کانگرس مذہب کے قیام کے لیے نیز اس پر آزادی کے ساتھ عمل کرنے پر قدغن لگانے کے لیے کوئی قانون نہیں بنائے گی۔'' اس کے بعد سے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں عقیدہ نجی اور رضا کارانہ معاملہ بن گیا۔ یہ ایک انقلابی قدم تھا اور اسے عہدِ خرد (Age Of Reason) کے ایک عظیم کارنامے کی حیثیت سے تحریم دی جاتی ہے۔ اس کے پس پشت کارفرما سوچ دراصل روشن خیالی کے روادارانہ فلسفے سے فیضان یافتہ تھی' تاہم بانی (Founding Fathers) دیگر عملیت پسندانہ خیالات سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ وہ اس امر سے آگاہ تھے کہ وفاقی آئین ریاستوں کے اتحاد کو محفوظ رکھنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے تاہم وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ اگر وفاقی حکومت نے کسی ایک پروٹسٹنٹ فرقے کو اپنایا اور اسے ریاستہائے متحدہ امریکہ کا سرکاری مذہب قرار دے دیا تو آئین منظور نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر کانگریگیشنلسٹ (Congregationalist) میساچوسٹس اینگلیکن چرچ کو قائم کرنے والے کسی آئین کو منظوری نہیں دے گا۔ یہی وجہ تھی کہ آئین کے آرٹیکل VI' سیکشن 3 میں وفاقی حکومت کے کسی عہدے کے لیے مذہبی امتحان کو ختم کر دیا گیا تھا۔ مذہب کو خارج کرنے اور سیاست کو سیکولر بنانے والے بانیوں کے فیصلے میں آئیڈیلزم نہاں تھا' تاہم نئی قوم کسی ایک فرقے کے حوالے سے اپنا تشخص قائم کر کے اپنی رعایا کی وفاداری کو برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ جدید ریاست اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ وہ روادار اور سیکولر ہو۔

تاہم اس کے بالکل برعکس' انیسویں صدی کے وسط تک نیا سیکولر ریاست ہائے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متحدہ امریکہ ایک جذباتی عیسائی ملک بن گیا تھا۔ 1780ء کی دہائی اور 1790ء کی دہائی میں تمام چرچوں (Churches) کو فروغ ملا۔ اور انہوں نے بانیوں کے روشن خیالی والے نظریے کو رد کرنا شروع کر دیا۔ اب انہوں نے امریکی آزادی کو عیسائی رنگ دینا شروع کر دیا: انہوں نے کہا کہ نئی ری پبلک خدا کا عطیہ ہے۔ انقلابی جنگ دوزخ کے خلاف جنت کی جنگ تھی۔ صرف قدیم اسرائیل نے اپنی تاریخ میں خدا کی براہِ راست مداخلت کا تجربہ کیا تھا۔ ٹموتھی ڈوائٹ نے اپنے طلباء کو تاکید کی کہ خدا کا ذکر آئین میں تو نہیں کیا گیا' تاہم ''تم اپنے ملک کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ خدا نے تم پر مصر میں اسرائیل کے لوگوں پر کی گئی رحمت سے کم رحمت نہیں کی ہے۔'' مذہبی پیشواؤں نے اعتماد کے ساتھ پیشگوئی کی کہ امریکی لوگ زیادہ دیندار ہو جائیں گے۔ انہوں نے توسیع پاتی ہوئی سرحدوں کو متوقع بادشاہت کی ایک علامت تصور کیا۔ جمہوریت لوگوں کو زیادہ خود مختار بنا چکی ہے لہٰذا اگر نئی ریاستیں عوامی اقتدار کے خلقی خطرات سے بچنا چاہتی ہیں تو انہیں زیادہ مذہبی ہونا چاہیے۔ امریکی عوام کو اپنے سیاسی رہنماؤں کے لادینی ڈی ازم (Deism) سے بچنا چاہیے۔ مذہبی پیشوا ڈی ازم کو نومولود قوم کی تمام ناگزیر ناکامیوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے اسے ایک نیا شیطانی دشمن بنا کر پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ڈی ازم دہریت اور مادیت پرستی کو فروغ دے گا' یہ عیسیٰؑ کی بجائے فطرت اور عقل کی پوجا کرتا ہے۔ ''باویرین الومینیٹی'' (Bavarian Illuminati) کہلانے والے ایک صوفیانہ گروہ کے حوالے سے سازش والا مریضانہ خوف پھیلایا گیا کہ یہ لوگ دہریئے ہیں اور امریکہ میں عیسائیت کو نیست و نابود کرنے کی سازش کر رہے ہیں۔ جب 1800ء میں تھامس جیفرسن صدارت کے لیے انتخاب میں حصہ لے رہا تھا تو ڈی ازم کے خلاف دوسری لہر اٹھی' جس نے بے خدا انقلاب فرانس کے دہریئے "Jacobins" اور جیفرسن میں ناطہ جوڑنے کی کوشش کی۔

امریکہ میں مذہب اور روشن خیالی میں کشمکش:

نئی ریاستوں کا اتحاد نازک تھا۔ پروٹسٹنٹ اور سیکولر امریکی نئی قوم سے بہت مختلف امیدیں باندھ رہے تھے۔ دونوں ہی مساوی طور پر بے مراد ثابت ہوئے۔ امریکی اب بھی آئین کی عزت اور بانیوں (Founding Fathers) کا احترام کرتے تھے' تاہم وہ امریکہ کو ''خدا کی اپنی قوم'' بھی قرار دیتے تھے' جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بعض پروٹسٹنٹ ''سیکولر انسان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوستی'' (Humanism) کو تقریباً شیطان جتنا ہی دشمن تصور کرتے رہے۔ انقلاب کے بعد قوم میں ایک تلخ تقسیم رونما ہوگئی اور امریکی اپنے کلچر کے تعین پر داخلی کشمکش میں پھنس گئے۔ اس کے نتیجے میں انیسویں صدی میں انہوں نے ''دوسرا انقلاب'' برپا کیا۔ زبردست دشواری اور جرأت کے ساتھ امریکیوں نے ماضی کو مٹا دیا تھا' انہوں نے ایک نیا آئین بنالیا تھا اور ایک نئی قوم کو جنم دے چکے تھے۔ تاہم اس میں تناؤ' کھنچاؤ اور پیراڈاکس مضمر تھا۔ ابھی لوگوں نے مجموعی طور پر فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کن شرائط پر جدید دنیا میں داخل ہوں اور کم مراعات یافتہ نوآبادیاتی لوگ روشن خیال اشرافیہ کی ثقافتی اجارہ داری کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ برطانویوں کو نیچا دکھانے کے بعد عام امریکیوں کو ابھی تک یہ طے کرنا تھا کہ انقلاب کا مفہوم ان کے لیے کیا ہے۔ کیا وہ بانیوں کی سرد' مہذبانہ اور شائستہ عقلیت پسندی اپنائیں یا وہ زیادہ درشت اور زیادہ عوامی پروٹسٹنٹ تشخص کو اپنائیں؟

بانیوں اور مذہبی پیشواؤں نے ایک جدید سیکولر ری پبلک کی تخلیق میں تو تعاون کیا تھا مگر وہ دونوں ہی کئی اہم حوالوں سے پرانی قدامت پسند دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ طبقۂ زعماء اور اشرافیہ میں سے تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ روشن خیال سیاسی مدبروں کی حیثیت سے یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ قوم کی رہنمائی کریں۔ انہوں نے نیچے سے آنے والی کسی تبدیلی کے امکان کا تصور نہیں کیا۔ وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ تاریخی تبدیلیاں عظیم شخصیات کے زیر اثر آتی ہیں۔ انہوں نے ابھی تک اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا تھا کہ کسی معاشرے کو اکثر و بیشتر غیر شخصی عمل ہی ترقی دیتے ہیں۔ ماحولیاتی' معاشی اور معاشرتی قوتیں استبدادی رہنماؤں کے منصوبوں کو ناکام بنا سکتی ہیں۔ 1780ء اور 1790ء کے عشروں کے دوران جمہوریت کی نوعیت کے حوالے سے بہت بحث مباحثہ ہوا۔ عوام کو کتنے اختیارات ہونے چاہئیں؟ امریکہ کے دوسرے صدر جان ایڈمز عام لوگوں کو اقتدار میں لانے اور امیروں کو مفلس بنا دینے والے کسی بھی نظام سیاست کے بارے میں شبہے کا شکار رہتے تھے۔ تاہم زیادہ انقلابی جیفرسن کے پیروکاروں نے پوچھا کہ کیا اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگ اکثریت کی طرف سے بات کر سکتے ہیں؟ انہوں نے ایڈمز کی حکومت کے ''جبر و استبداد'' کے خلاف احتجاج کیا اور کہا کہ عوام کی آواز پر ضرور کان دھرنے چاہئیں۔ انقلاب کی کامیابی نے بہت سے امریکیوں کو طاقتور ہونے کا احساس عطا کیا تھا۔ اس نے ان پر عیاں کر دیا تھا کہ مستحکم مقتدرہ خطا پذیر ہوتی ہے اور کسی طور بھی ناقابل شکست نہیں ہوتی۔ جن کو بوتل میں بند نہیں کیا جا سکا۔ جیفرسن کے

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیروکاروں کو یقین تھا کہ عام انسانوں کو بھی اس آزادی اور خودمختاری کا حامل ہونا چاہیے' جس کا ذکر فلسفیوں نے کیا ہے۔ نئے اخباروں میں ڈاکٹروں' وکیلوں' مذہبی پیشواؤں اور دوسرے سپیشلسٹوں کو مذاق کا نشانہ بنایا گیا۔ کسی شخص کو بھی ان نام نہاد ''ماہرین'' پر کامل اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ قانون' طب اور مذہب کو عقل سلیم کا معاملہ اور ہر شخص کی پہنچ میں ہونا چاہیے۔

یہ احساس بالخصوص سرحدی علاقوں میں عام تھا' جہاں لوگ محسوس کرتے تھے کہ وفاقی حکومت نے ان کی اہانت کی ہے۔ 1790ء تک 40 فیصد امریکی اس علاقے میں آباد تھے' جسے صرف تیس برس پہلے سفید فام نوآبادیات کاروں نے بسایا تھا۔ سرحدی لوگ حکمران اشرافیہ سے آزردہ تھے' جو ان کی مشکلات میں تو ان کا ساتھ نہیں دیتی تھی مگر برطانویوں ہی کی طرح سختی سے ٹیکس وصول کرتی تھی اور مشرقی ساحلوں کی اعلیٰ تہذیب اور سہولتوں کو چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کیے بغیر ان علاقوں میں سرمایہ کاری کے لیے زمین خرید چکی تھی۔ وہ ''دوسری عظیم بیداری'' (Great Awakening Second) کے نام سے مشہور احیاء کی دوسری لہر کو پیدا کرنے والے نئی قسم کے مبلغوں کی باتوں پر توجہ دینے لگے۔ یہ سیاسی طور پر پہلی کی نسبت زیادہ انقلابی تھی۔ ان پیغامبروں کو نہ صرف روحوں کو بچانے سے غرض تھی بلکہ انہوں نے معاشرے اور مذہب کو ایک ایسے انداز سے تشکیل دینے کے لیے کام کیا' جو کہ بانیوں کی وضع کردہ ہر شے سے بہت مختلف تھا۔

نئے احیاء کنندگان (Revivalists) جوناتھن ایڈورڈز اور جارج وائٹ فیلڈ کی طرح پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے' جنہوں نے ییل اور آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ انہیں علماء وفضلاء سے نفرت تھی اور وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ہر شخص کو الٰہیاتی ماہروں کی رہنمائی کے بغیر بائبل کی تشریح وتعبیر کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ پیغامبر کوئی مہذب لوگ نہیں تھے۔ وہ تبلیغ کرتے ہوئے دیسی بولی بولتے تھے' جیسی کہ عام لوگ سمجھ سکیں' وہ اکثر اوقات پست مذاق کے ساتھ ساتھ غیر مہذبانہ اشارے بھی کرتے تھے۔ ان کی عبادات شائستہ اور مہذبانہ نہیں بلکہ شور شرابے سے معمور اور انتہائی جذباتی ہوتی تھیں۔ وہ عیسائیت کو عوامی انداز میں دوبارہ ڈھال رہے تھے' جو کہ دورِ خرد (Age Of Reason) کے مہذبانہ نظام سے بہت مختلف تھا۔ وہ مشعل بردار جلوس اور عوامی ریلیاں (Rallies) نکالتے اور شہروں کے باہر بڑے بڑے خیمے نصب کر دیتے تاکہ احیاء کسی وسیع وعریض خیمہ گاہ کی وضع قطع اپنا لے۔ نئی قسم کے مذہبی گیت لوگوں پر وجد طاری کر دیتے' وہ روتے' شدت سے جھومتے اور خوشی سے چلاتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔

اپنے مذہب کو عقلی بنانے کی بجائے' وہ لوگ تخیلات' خوابوں' اشاروں' شعبدوں پر زور دیتے تھے..... وہ سب چیزیں جنہیں روشن خیال سائنس دانوں اور فلسفیوں نے مسترد کر دیا تھا۔ تاہم انہوں نے بھی جیفرسن کے پیروکاروں کی طرح ماضی کو دانش کا مخزن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا' جیسا کہ قدامت پسند تسلیم کرتے تھے۔ وہ جدید تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو روایات کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خداوند کے بیٹوں کی حیثیت سے آزادی کے حامل ہیں اور وہ اپنی عقل سلیم سے صحیفے کے سادہ حقائق پر غور کر کے سچ کو خود پا سکتے ہیں۔ ان نئے مبلغوں نے اشرافیہ' ایسٹیبلشمنٹ اور مذہبی پیشوائیت کو برا بھلا کہا۔ انہوں نے عہد نامہ جدید کے مساویانہ رجحانات پر زور دیا' جس میں کہا گیا ہے کہ عیسائی سلطنت میں پہلا آخری ہونا چاہیے اور آخری پہلا۔ خدا نے یہ بصیرتیں غریبوں اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں پر نازل کی تھیں؛ عیسیٰؑ اور ان کے حواری کسی کالج ڈگری کے حامل نہیں تھے۔

مذہب اور سیاست واحد وژن کا جزو تھے۔ لوریز وڈاؤ اپنے لہراتے ہوئے بالوں اور وحشیانہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دور جدید کے جان دی بپٹسٹ جیسا لگتا تھا۔ وہ کسی طوفان کو خدا کا براہ راست عمل تصور کرتا اور اپنی بصیرتوں کے لیے تصورات اور خوابوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ موسم میں کوئی تبدیلی' زمانے کے اختتام کا ''اشارہ'' ہو سکتی تھی' وہ مستقبل کی پیشگوئی کرنے کا دعویدار تھا۔ مختصر یہ کہ وہ جدیدیت کی نئی دنیا کا تضاد (Anti Thesis) تھا۔ تاہم وہ اپنے وعظ کا آغاز جیفرسن یا تھامس پین کے کسی قول سے کرتا اور ایک سچے جدیدیت پسند کی طرح وہ لوگوں کو تاکید کرتا کہ توہمات اور جہالت کی زنجیر توڑ دیں' فاضل ایسٹیبلشمنٹ کی مقتدرہ کو مسترد کر دیں اور خود غور و فکر کریں۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکہ میں مذہب اور سیاست ایک ہی سکّے کے دو رُخ تھے اور ایک دوسرے میں باآسانی مل سکتے تھے' آئین خواہ کچھ بھی کہتا رہے۔ یوں ایلیاس سمتھ نے جیفرسن کی صدارتی مہم کے دوران پہلی مرتبہ اس وقت سیاسی تبدیلی کا تجربہ کیا' جب وہ ایک انقلابی مساوات پسند بن گیا۔ تاہم پھر اس نے ایک نیا اور زیادہ جمہوری چرچ قائم کر دیا۔ اسی طرح جیمز او کلے انقلاب میں لڑ چکا تھا اور انگریزوں کا قیدی رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر سیاسی رہا تھا' ایک زیادہ مساویانہ چرچ کا مطالبہ کرتا تھا اور اس نے مرکزی دھارے کی عیسائیت سے الگ ہو کر اپنا فرقہ ''ری پبلک میتھڈسٹ'' قائم کر لیا۔ جب بارٹن سٹون نے پریسبائٹیریز سے قطع تعلق کیا تو اس نے اپنی علیحدگی کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اعلان آزادی'' قرار دیا۔ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ الیگزینڈر کیمبل (1866ء-1788ء) نے جب امریکہ کو نقل مکانی کی تو سکاٹش پریسبائیٹرین ازم کو چھوڑ دیا اور ایک نیا فرقہ قائم کیا جو کہ ابتدائی مساویانہ چرچ سے زیادہ قریب تھا۔ ان سے بھی زیادہ انقلابی جوزف سمتھ (1805-44ء) تھا' جو کہ بائبل پڑھنے سے مطمئن نہیں تھا بلکہ اس نے اپنا ہی ایک نیا صحیفہ پانے کا دعویٰ کیا۔ (The Book Of Mormon) انیسویں صدی کی سب سے زیادہ معاشرتی احتجاج والی کتاب ہے' جس میں امیروں' طاقتوروں اور علماء وفضلاء کو بری طرح رد کیا گیا ہے۔ سمتھ اور اس کا خاندان برسوں غربت کی زندگی بسر کر چکا تھا اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس بہادر نئی ری پبلک میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اولین مورمن کنورٹس ایسے ہی غریب' پچھڑے ہوئے اور مایوس لوگ تھے' سمتھ کی پیروی میں امریکہ سے قطع تعلق کرنے اور خروج کے لیے مکمل طور پر تیار تھے۔ بعدازاں مورمنوں نے پہلے الی نائے میں اور آخر میں یوٹاہ میں اپنی آزاد بادشاہت قائم کر لی۔

ایسٹیبلشمنٹ نے ڈاؤ' سٹون اور جوزف سمتھ کو بے عقل واعظ تصور کرتے ہوئے' جن کے پاس جدید دنیا کو پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا' تحقیر کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ مبلغین قدیم دور کی وحشی یادگار محسوس ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ مذہبی پیشواؤں اور امریکی اشرافیہ کا برتاؤ ویسا ہی تھا جیسا کہ دور حاضر کے بنیاد پرستوں کے ساتھ لبرل اور سیکولر لوگ روا رکھتے ہیں' تاہم ان لوگوں کو رد کر کے انہوں نے غلطی کی تھی۔ ڈاؤ اور جوزف سمتھ جیسے لوگوں کو عوامی نابغے کہا گیا ہے۔ وہ اس قابل تھے کہ جمہوریت' اظہار کی آزادی' مساوات اور آزادی جیسے انقلابی جدید تصورات کو ایک ایسی زبان میں بیان کریں جسے غیر تعلیم یافتہ لوگ بھی سمجھ سکیں اور اپنا سکیں۔ امریکہ میں وجود پذیر ہوتی ہوئی نئی دنیا میں جوہری حیثیت کے حامل یہ نئے تصورات کم مراعات یافتہ اکثریت تک ایک ایسے اساطیری تناظر میں لائے گئے جس نے انہیں معنویت عطا کی اور شورش انگیز اور انقلابی ابھاروں والے اس زمانے میں انہیں ایک ضروری تسلسل (Continuity) فراہم کیا۔ ان پیغامبروں نے شناخت کا مطالبہ کیا اور گو کہ مقتدر اشرافیہ نے انہیں مطعون کیا' پھر بھی ان کی عوامی قبولیت نے ظاہر کر دیا کہ وہ ایک حقیقی ضرورت کا جواب تھے۔ وہ پہلی عظیم بیداری (First Great Awakening) کے مبلغوں کی طرح انفرادی تبدیلیوں پر ہی قانع نہیں تھے بلکہ معاشرے کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ عوامی موسیقی اور نئے ذرائع ابلاغ کو ماہرانہ اثرات کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے ملک گیر عوامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریکیں برپا کرنے کے اہل تھے۔ انہوں نے ''بانیوں'' کی طرح اوپر سے جدید نظام مسلط کرنے کی بجائے نچلی سطح پر کام کیا اور عقلیت پسندانہ ایسٹیبلشمنٹ کے خلاف ایک عوامی بغاوت کا پیش خیمہ بنے۔ ان کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ مثال کے طور پر ایلیاس سمتھ' اوکلے' کیمبل اور سٹون کے قائم کردہ فرقوں نے مل کر ایک نیا فرقہ ''شاگردانِ عیسیٰؑ'' (Disciples Of Christ) کے نام سے بنا لیا۔ 1860ء تک ''شاگردانِ عیسیٰؑ'' کے ارکان کی تعداد کوئی 200000 تک پہنچ گئی اور یہ امریکہ میں پانچواں بڑا پروٹسٹنٹ فرقہ بن گیا۔ مورمنوں (Mormons) کی طرح ''شاگردوں'' نے بھی عوامی بے اطمینانی کو ایسا اظہار کیا جس کو ایسٹیبلشمنٹ نظرانداز نہیں کر سکی۔ تاہم روشن خیالی کی سائنسی عقلیت پسندی کے خلاف یہ عیسائی بغاوت اب بھی ایک گہرے اثر کی حامل تھی۔ ''دوسری عظیم بیداری'' (Second Great Awakening) بہت سے امریکیوں کو ''بانیوں'' کے کلاسیکی ری پبلکن ازم سے دور کر کے عوامی جمہوریت کی طرف لے گئی اور آج امریکی کلچر کی اہم خصوصیت بن جانے والی انفرادیت پسندی کو فروغ دیا۔ انہوں نے حکمران اشرافیہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور بھرپور فتح حاصل کی۔ امریکی روح کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو کہ ''دورخرد'' کے سرد نظام کی نسبت انیسویں صدی کے پیغامبروں کی عوامیت (PopuLism) اور دانش دشمنی کے زیادہ قریب ہے۔ ''دوسری عظیم بیداری'' کے ہنگامہ خیز احیاء نے امریکہ کے منفرد سیاسی سٹائل (Style) پر ایک مستقل اثر مرتب کیا' جس کی عوامی ریلیاں' بے حجاب جذبات اور بھڑکیلے کرشمے تو بہت سے یورپیوں کو چکرا کے رکھ دیتے ہیں۔ دور حاضر کی بہت سی بنیاد پرست تحریکوں کے مانند ''دوسری عظیم بیداری'' کے پیغامبروں نے نئی ریاستوں کے حقوق سے محروم اور استحصال زدہ لوگوں کو اپنے خیالات اور آوازیں زیادہ مراعات یافتہ اشرافیہ تک پہنچانے کے لیے ایک ذریعہ مہیا کیا۔ ان تحریکوں نے مارٹن لوتھر کنگ کے الفاظ میں لوگوں کو ''کچھ ہونے کا احساس'' عطا کیا۔ کافی حد تک اسی انداز سے جیسے کہ دور حاضر کے بنیاد پرست گروپ عطا کرتے ہیں۔ بنیاد پرست تحریکوں کے مانند یہ سب نئے فرقے ماضی کے اولین نظام کی طرف دیکھتے تھے اور اصلی عقیدے کو دوبارہ رائج کرنے کا عزم کیے ہوئے تھے۔ ان سب نے بائبل کو بالکل نئے انداز سے پیش کیا' وہ اس کی لفظی تعبیر کرتے تھے اور اکثر و بیشتر تخفیفی انداز میں۔ وہ سب آمریت پسندی کا بھی میلان رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے اواخر کی بنیاد پرست تحریکوں کی طرح یہ انیسویں صدی کے شروع کے امریکہ کا ایک تضاد تھا کہ لوگوں نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آزادی' خودمختاری اور مساوات کی آرزو میں جذباتی تقریریں کرنے والے مذہبی رہنماؤں کی پوری طرح پیروی کی۔ جوزف سمتھ نے حقوق کی باتیں کرنے کے باوجود حقیقتاً ایک مذہبی آمریت قائم کی تھی اور الیگزینڈر کیمبل اولین چرچ کے مساویانہ اور برادرانہ آدرشوں کی تعریفیں کرنے کے باوجود ویسٹ ورجینیا کا امیر ترین آدمی بن گیا تھا اور اس نے بھی اپنے پیروکاروں پر آمرانہ انداز میں حکومت کی۔

ملرازم اور تاریخ کی موت:

''دوسری عظیم بیداری'' نے اس امر کو واضح کر دیا کہ جب کوئی معاشرہ جدیدیت پذیری کے جھنجھوڑ دینے والے مراحل سے گزرتا ہے تو لوگ اس قسم کے حلوں (Solutions) کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ جدید بنیاد پرستوں کی طرح ''دوسری عظیم بیداری'' کے پیغامبروں نے مقتدر طبقات کی فاضلانہ عقلیت پسندی کے خلاف بغاوت برپا کی اور ایک زیادہ مذہبی تشخص پر اصرار کیا' اس کے ساتھ ہی انہوں نے جدید نظام سیاست و معاشرت کو عام لوگوں کے لیے قابل رسائی بھی بنا دیا' جن کو ڈیکارٹ' نیوٹن اور جان لاک کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے مواقع دستیاب نہیں تھے۔ امریکی ریاستوں میں امریکی پیغامبروں کی بغاوت کامیاب رہی اور اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ ہمیں جدید بنیاد پرست تحریکوں کو چند روزہ اور وقتی ''پاگل پن'' نہیں سمجھنا چاہیے۔ ممکن ہے نئے امریکی فرقے ایسٹیبلشمنٹ کے لیے انوکھا رہا ہو لیکن وہ جوہری اعتبار سے جدید اور نئی دنیا کا جزو لاینفک تھے۔ یہی بات نیویارک کے کاشتکار ولیم ملر (1849ء-1782ء) کی شروع کی ہوئی ملینیئل موومنٹ (Millennial Movement) پر صادق آتی ہے' جس نے بائبل کی پیشگوئیوں پر غور و فکر کیا اور 1831ء میں شائع ہونے والے ایک پمفلٹ میں ''ثابت'' کیا کہ عیسیٰؑ 1843ء میں دوسری مرتبہ زمین پر آئیں گے۔ ملر بائبل کو جوہری طور پر جدید انداز سے پڑھ رہا تھا۔ اسے ابدی حقیقتوں کا اساطیری اور علامتی بیان تصور کرنے کی بجائے ملر نے کتاب الہام جیسے بیانیوں کو متوقع واقعات کی پیشگوئیوں کے طور پر دیکھا' جن کو سائنسی اور ریاضیاتی درستی کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہو۔ اب لوگ بائبل کو معلومات کے لیے پڑھنے لگے۔ سچ کو لازماً منطقی اور سائنسی تصدیق کا اہل ہونا چاہیے۔ ملر بائبل کی متھوس کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ لوگوس ہو اور خود اس نے اور اس کے نائب جوشوا ہائنز نے ملر کی تحقیقات کی منظم اور سائنسی نوعیت پر زور دیا۔ یہ تحریک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوری بھی تھی۔ ہر شخص بائبل کی تشریح خود کر سکتا تھا اور ملر نے اپنے پیروکاروں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اس کے اندازوں کو چیلنج کریں اور اپنے اپنے نظریات پیش کریں۔

ملرازم (Millerism) جتنی عجیب اور ناممکن تحریک لگتی تھی' اتنا ہی اسے فوری مقبولیت حاصل ہوئی۔ کوئی پچاس ہزار امریکی باقاعدہ ملراسٹ (Millerists) بن گئے جبکہ ہزاروں لوگ باقاعدہ رکنیت حاصل کیے بغیر اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ تاہم ملرازم بائبل کی متھوس کی لفظی طور پر تعبیر کرنے کے خطرے کی ایک زندہ مثال بن گیا۔ عیسیٰؑ 1843ء میں دعوے کے مطابق نہیں آئے اور ملراسٹ برباد ہو کر رہ گئے۔ اس کے باوجود اس ناکامی کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ملرازم کا خاتمہ ہو گیا بلکہ وہ امریکہ میں ایک بڑی جذباتی تحریک کے طور پر موجود رہا۔ 1843ء کی ''عظیم مایوسی'' (Great Disappointment) سے سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ (Seventh Day Adventists) جیسے فرقے ابھرے۔ انہوں نے عیسیٰؑ کی آمد کے اوقات نامے (ٹائم ٹیبل) کو نئے سرے سے طے کیا اور پیشگوئیوں سے باز رہتے ہوئے امریکیوں کی نئی نسلوں کو تاریخ کی موت (End Of History) کی راہ دیکھنے کا اہل بنایا۔

ابتداء میں تو یہ نئی درشت اور جمہوری عیسائیت غریب اور غیر تعلیم یافتہ طبقوں تک ہی محدود رہی تھی' تاہم 1840ء کے عشرے کے دوران امریکی مذہب (American Religion) کی ایک محوری شخصیت چارلس فنی (1875ء-1792ء) اسے متوسط طبقوں میں لے آیا۔ یوں بائبل کے لفظی مطالعے اور سیکولر قوم کو عیسیٰؑ کی طرف موڑنے والی یہ ''ایوانجیلیکل'' عیسائیت انیسویں صدی کے وسط تک امریکہ کا غالب عقیدہ بن گئی۔ فنی نے قدیم مصلحین والے غیر مہذبانہ طریقے استعمال کیے تاہم وکیلوں' ڈاکٹروں اور تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ایسٹیبلشمنٹ کی مداخلت کے بغیر عیسیٰؑ کا براہ راست تجربہ کرنے' اپنے لیے سوچنے اور فاضل الٰہیات دانوں کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کرنے کی تاکید کی۔ اس نے متوسط طبقے کے اپنے سامعین کو یہ بھی تاکید کی کہ وہ معاشرے کی سماجی اصلاح کے لیے دوسرے ایوانجلیکوں کے شانہ بہ شانہ کام کریں۔

انقلاب کے بعد ریاست نے مذہب سے اپنی بریت کا اعلان کیا اور ٹھیک اسی زمانے میں تمام فرقوں کے عیسائیوں نے ریاست سے رُخ بدلنا شروع کر دیا۔ انقلاب کا سحر زائل ہونے لگا' جو کہ بہر طور نظام عدل و امن کو قائم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ پروٹسٹنٹ نے ڈی اسٹ ری پبلکن حکومت سے الگ اپنے مذہبی ''مقام'' کے لیے اصرار کرنے لگے۔ ان کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہنا تھا کہ وہ خداوند کی کمیونٹی اور وفاقی ایسٹیبلشمنٹ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پروٹسٹنٹوں کا اب بھی ایقان تھا کہ امریکہ کو ایک مذہبی قوم ہونا چاہیے اور سرکاری کاموں کو غیر سیاسی طور پر دیکھنے کا رجحان فروغ پا رہا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ معاشرے کی نجات کے لیے ریاست سے آزاد رہ کر گرجا گھروں' سکولوں اور ان گنت اصلاحی اداروں میں کام کرنا چاہیے جو کہ ''دوسری عظیم بیداری'' کے بعد شمالی ریاستوں میں 1820ء کی دہائی میں ابھرے تھے۔

عیسائیوں نے ایک بہتر دنیا کے لیے کام کا آغاز کیا۔ انہوں نے غلامی اور شراب نوشی اور دھتکارے ہوئے لوگوں پر جبر واستبداد کے خاتمے کے لیے مہم چلائی۔ ملر کے بہت سے پیروکاروں نے شراب نوشی میں اعتدال' غلامی کے خاتمے اور نسائیت پسند تنظیموں میں کام کیا۔ ان سب میں یقینی طور پر سماجی کنٹرول کا ایک عنصر موجود تھا۔ پروٹسٹنٹوں کے نیک کاموں یعنی فیاضی' متانت اور صفائی کی تاکید کا ایک مقامیت پسند محرک بھی تھا۔ پروٹسٹنٹ امریکہ میں کیتھولک تارکین وطن کے سیلاب سے پریشان تھے۔ انقلاب کے زمانے میں امریکہ ایک پروٹسٹنٹ ملک تھا اور کیتھولک کل آبادی کا صرف ایک فیصد تھے۔ تاہم 1840ء کی دہائی میں امریکہ میں پچیس لاکھ کیتھولک موجود تھے نیز رومن کیتھولک ازم امریکہ کا سب سے بڑا عیسائی فرقہ بن گیا تھا۔ یہ ایک ایسی قوم کے لیے خطرناک پیشرفت تھی جو کہ بہت طویل عرصے پوپ کو عیسیٰ کا دشمن تصور کرتی رہی تھی۔ بعض ایوانجیلیکل اصلاحی کوششیں واضح طور پر اس کیتھولک اثر کو رد کرنے کی جدوجہد تھیں۔ مثال کے طور پر شراب نوشی پر پابندی کی تحریک کو نئے پولش' آئرش اور اطالوی امریکیوں کی شراب نوشی کی عادت کی مخالفت کے لیے فروغ دیا گیا تھا۔

تاہم یہ ایوانجیلیکل تحریکیں مثبت اور جدیدیت کو فروغ دینے والی بھی تھیں۔ ان تحریکوں میں ہر انسان کی قدر و قیمت پر زور دیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک ایسی مساوات پسندی کو فروغ دیا جس سے شمالی ریاستوں میں غلامی کی مخالفت کو تقویت ملی' تاہم جنوبی ریاستوں میں نہیں کہ جو ''دوسری عظیم بیداری'' سے غیر متاثر رہا تھا اور جس کا سماجی ڈھانچہ خانہ جنگی سے پہلے کی طرح ماقبل جدید اور اشرافیانہ ہی رہا تھا۔ کم از کم شمال میں اصلاحی تحریکوں نے لوگوں کو عیسائیت کے لبادے میں لازمی انسانی حقوق کے جدید آدرش کو فروغ دیا۔ نسائیت پسندی نیز تعزیری اور تعلیمی اصلاح کی تحریکیں بھی' جن کے سرخیل ایوانجیلیکل عیسائی تھے' ترقی پسندانہ تحریکیں تھیں' خود اصلاحی گروپوں نے لوگوں کو جدید روح حاصل کرنے میں مدد دی۔ لوگ شعوری اور رضا کارانہ طور پر کسی تنظیم کے رکن بنتے اور ایک واضح طور پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متعین کردہ مقصد کے حصول کے لیے ایک عقلیت پسندانہ جدید انداز سے کام کرنا سیکھتے۔ آخرکار ایوانجیلیکل عیسائی وگ پارٹی (Whig Party) کی ریڑھ کی ہڈی بنے۔ (ری پبلکن پارٹی اسی پارٹی کی جانشین ہے)' جبکہ ان کے مخالفین (اولڈ لائٹس اور کیتھولک) ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف مائل ہوگئے۔ وگ/ری پبلکن امریکہ میں روشن خیالی کے اصولوں کی بجائے مذہبی اصولوں کی بنیاد پر ''خیر کی سلطنت'' قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط تک ایوانجیلیکل نہ تو الگ تھلگ رہے تھے اور نہ ہی حقوق سے محروم۔ انہوں نے سیکولر ایسٹیبلشمنٹ کو چیلنج کیا تھا اور اپنی آواز ان کے کانوں تک پہنچا چکے تھے۔ اب وہ امریکی معاشرے کی عیسائی *Reconquista* میں مصروف تھے' جسے انہوں نے کیتھولک نظام سیاست و معاشرت کی طرف واپس لانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ انہیں اپنے کارنامے پر فخر تھا۔ انہوں نے امریکی کلچر پر انمٹ اثر قائم کیا تھا' جو امریکہ کے سیکولر آئین کے باوجود اب پہلے سے کہیں زیادہ عیسائی ہوگیا تھا۔ امریکہ میں 1780ء سے 1860ء کے درمیانی عرصے میں عیسائی تنظیموں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا' جو کہ آبادی میں اضافے کی قومی شرح سے سبقت لے گیا۔ 1780ء میں صرف 2500 عیسائی تنظیمیں موجود تھیں' 1820ء تک ان کی تعداد 11000 اور 1860ء تک 52000 ہوگئی..... جو کہ 21 گنا اضافہ تھا۔ اس کے مقابلے میں امریکہ کی آبادی 1780ء کے چالیس لاکھ افراد سے بڑھ کر 1820ء میں ایک کروڑ ہوئی تھی اور 1860ء میں تین کروڑ دس لاکھ ..... آٹھ گنا سے کم اضافہ۔ یورپ میں مذہب اور ایسٹیبلشمنٹ میں قربت بڑھ رہی تھی جبکہ عام لوگ متبادل نظریات کی طرف مائل ہو رہے تھے لیکن امریکہ میں پروٹسٹنٹ ازم لوگوں کو ایسٹیبلشمنٹ کے خلاف تقویت دے رہا تھا اور یہ رجحان جاری رہا' اسی لیے آج امریکہ میں کسی ایسی عوامی تحریک کا ملنا دشوار ہے' جو اس انداز سے مذہب سے مربوط نہ ہو۔ 1850ء تک امریکہ میں عیسائیت فعال تھی اور ایسا لگتا تھا کہ مزید فتوحات کے لیے تیار تھی۔

یورپ کی مختلف کہانی ـــــ ہیگل:

یورپ میں یہ کہانی مختلف تھی۔ وہاں لوگوں کو جدید دنیا میں لے جانے والے نظریات مذہبی نہیں بلکہ سیکولر تھے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کی توجہ اگلی دنیا کی بجائے اسی دنیا پر مرکوز ہو رہی تھی۔ یہ امر جارج ولہیلم فریڈرک ہیگل (1831ء۔1770ء) کی فکر میں واضح تھا'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو اعلیٰ وارفع خداوند کو زمین پر لے آیا اور اسے انسانی بنا دیا۔ آسودگی مافوق الفطرت میں نہیں بلکہ ''مادی'' میں ڈھونڈی جانے لگی۔ ہیگل نے اپنی کتاب The Phenomenology Of Mind (1807ء) میں لکھا کہ آفاقی روح (Universal Spirit) اسی وقت اپنے تمام امکانات کو پا سکتی ہے جب وہ خود کو زمان اور مکان کی محدود صورت حالات میں سمو دے۔ اس کا مکمل ادراک انسانی ذہن ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح انسانوں کو یہ جاننے کے لیے کہ وہ خود ہی الوہی ہیں' ماورائی خداوند کے پرانے تصور کو ترک کرنا ہوگا۔ اسطورہ' نیز تجسیم (Incarnation) کے عیسائی عقیدے کو اس انداز سے دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ جدید لوگوں کی اس دنیا میں بیگانگی کے احساس کا مداوا ہے۔ یہ الوہیت سے خالی ہو جانے والی دنیا کو دوبارہ مذہبی بنانے کی ایک کوشش تھی نیز انسانی ذہن کے وژن کو بڑھانے کی ایک کاوش' جس کی قوتیں ایسا لگتا تھا کہ ڈیکارٹ اور کانٹ کے فلسفے میں محدود ہو گئی ہیں۔ تاہم سب سے مقدم ہیگل کی اسطورہ نے جدیدیت کی آگے بڑھانے والی حرکیات کا اظہار کیا۔ اس میں سنہرے دور کی طرف واپسی کی بات نہیں کی گئی بلکہ ہیگل کی دنیا مسلسل اپنے آپ کو دوبارہ تخلیق کرتی تھی۔ اس پرانے ادراک کی بجائے کہ ہر بات پہلے کہی جا چکی ہے' ہیگل نے ایک جدلیاتی عمل کا تصور پیش کیا' جس کے تحت انسان ماضی کے ان تصورات کو مسلسل توڑ پھوڑ رہا تھا' جو کبھی مقدس اور ناقابل تردید ہوتے تھے۔ اس جدلیاتی عمل میں ہستی کی ہر حالت کا ایک متضاد ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ تضادات آپس میں ٹکراتے ہیں اور ایک زیادہ ارتقا یافتہ امتزاج (Synthesis) میں آسودہ ہوتے اور ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں' اس کے بعد سارا عمل ایک بار پھر شروع ہو جاتا ہے۔ اس وژن میں بنیادوں کی طرف کوئی واپسی نہیں تھی بلکہ ایک بالکل نئے اور عدیم النظیر سچ کی طرف ایک مسلسل ارتقا تھا۔

کارل مارکس:

ہیگل کے فلسفے نے جدید عہد کی محرک امید پرستی کا اظہار کیا جس نے قدامت پسند روح کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تاہم کچھ لوگ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہیگل خدا سے کیوں برگشتہ تھا۔ مذہب اور اساطیر کو بعض یورپی نہ صرف فرسودہ بلکہ نقصان دہ سمجھنے لگے تھے۔ خیال کیا گیا کہ یہ ہمارے بیگانگی کے احساس کا مداوا بننے کی بجائے اسے بڑھاتے ہیں۔ ہیگل کے شاگرد لڈوگ فیورباخ (72-1804ء) نے خدا کو انسانیت کا تضاد قرار دیتے ہوئے لکھا کہ مذہب ''انسان کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خود اس سے الگ کر رہا ہے..... خدا کامل ہے' انسان ادھورا ہے۔ خدا ابدی ہے' انسان فانی ہے۔ خدا قوی ہے' انسان کمزور ہے۔'' کارل مارکس کے لیے مذہب ایک بیمار معاشرے کی علامت (Symptom) تھا' ایک مخدر (Opiate) تھا' جس نے بیمار سماجی نظام کو قابل برداشت بنا دیا تھا اور اس دنیا سے توجہ اگلی دنیا کی طرف منعطف کروا کر علاج ڈھونڈنے کا ارادہ ہی مٹا دیا تھا۔

ڈارون: دہریت کا اسم ثانی:

دہریے زور پکڑنا شروع ہو چکے تھے۔ یہ امر چارلس ڈارون (82-1809ء) کی کتاب The Origin Of Species By Means Of Natural Selection کی 1859ء میں اشاعت کے بعد واضح ہو گیا۔ اس کتاب نے جدید سائنس کے ایک نئے مرحلے کی عکاسی کی۔ حقائق اکٹھے کرنے کی بجائے' جیسا کہ بیکن بیان کر چکا تھا' ڈارون نے ایک مفروضہ (Hypothesis) پیش کیا' اور وہ یہ کہ جانور' پودوں اور انسان کو مکمل حالت میں تخلیق نہیں کیا گیا (جیسا کہ بائبل نے بیان کیا تھا) بلکہ یہ اپنے ماحول کے ساتھ ارتقائی مطابقت پذیری کے ایک طویل اور آہستہ رَوعمل کے تحت پروان چڑھے تھے۔ ڈارون نے The Descent Of Man (1871ء) میں نظریہ پیش کیا کہ انسان (Homo Sapiens) اسی پروٹوایپ سے ارتقا یافتہ ہے' جو کہ اورینگوٹن' گوریلا اور چمپینزی کا جدِ امجد ہے۔ بنیاد پرست حلقوں میں ڈارون کا نام دہریت کا اسم ثانی بن گیا' حالانکہ *Origin* میں مذہب پر حملہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ تو ایک سائنسی نظریے کا باوقار اور محتاط اظہار ہے۔ ڈارون بذاتِ خود لاادری (Agnostic) تھا' تاہم وہ ہمیشہ مذہبی عقائد کا احترام کرتا تھا۔ اس کے باوجود *Origin* ایک سیلاب کے مانند تھی۔ پہلے ہی دن اس کی 1400 جلدیں فروخت ہو گئیں۔ یقیناً یہ کتاب اور ڈارون کی بعد میں چھپنے والی کتابوں نے انسان کی عزتِ نفس کو دھچکا پہنچایا۔ کوپرنیکس نے انسانیت کو کائنات کے مرکز سے ہٹا دیا تھا' ڈیکارٹ اور کانٹ نے انسانوں کو طبیعی دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا اور اب ڈارون نے انہیں محض جانور قرار دے دیا تھا۔ انہیں خدا نے بالخصوص تخلیق نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے بھی ہر شے کی طرح ارتقا پایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ تخلیقی عمل اور دنیا میں خدا کی کوئی جگہ نہیں تھی' ''لال منہ اور پنجوں'' والے کسی الوہی مقصد کے حامل نہیں تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم Origin کی اشاعت کے فوری بعد والے برس میں کوئی مذہبی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ اس سے اگلے برس تب بہت زیادہ ہنگامہ برپا ہوگیا' جب سات ایوانجیلیکل مذہبی پیشواؤں نے بائبل پر تازہ ترین تنقید کو ایک کتاب بعنوان Essays And Reviews کی صورت میں عام قارئین تک پہنچایا۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر سے جرمن علماء (سکالرز) نے بائبل کو سائنسی تجربی منہاجیات کا موضوع بناتے ہوئے اس پر ادبی تجزیئے' آثاریات اور تقابلی لسانیات کی نئی تیکنیکوں کا اطلاق کیا تھا۔ انہوں نے استدلال کیا کہ بائبل کی پہلی پانچ کتابیں' جنہیں روایتی طور پر موسیٰ ؑ سے منسوب کیا جاتا تھا' درحقیقت بہت بعد میں لکھی گئی تھیں اور انہیں بہت سے مختلف لکھاریوں نے لکھا تھا۔ Book Of Isaiah کے کم از کم دو مختلف سرچشمے تھے اور بادشاہ داؤد ؑ نے شاید زبور (Psalms) نہیں لکھی تھی۔ بائبل میں بیان کیے گئے بیشتر معجزے محض ادبی استعارے تھے اور انہیں لفظی طور پر سمجھا نہیں جا سکتا تھا' بائبل کے بیشتر واقعات تقریباً یقینی طور پر تاریخی نہیں تھے۔ برطانوی پادریوں نے Essays And Reviews میں لکھا کے بائبل کے ساتھ خصوصی سلوک بالکل نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا مطالعہ بھی اسی تنقیدی نظر سے کیا جانا چاہیے جیسا کہ دوسری کتابوں کا کیا جاتا ہے۔ نئی ''اعلیٰ تنقید'' (Higher Criticism) اسطورہ پر لوگوس کی فتح کی ترجمانی کرتی تھی۔ عقلیت پسندانہ سائنس نے بائبل کی Mythoi کا انقلابی انداز میں جائزہ لیا اور اس حقیقت کو پایا کہ اس کے بعض دعاوی ''جھوٹے'' تھے۔ بائبل کی کہانیاں محض ''اساطیر'' تھیں' جن کا عوامی زبان میں مطلب یہ تھا کہ وہ سچی نہیں ہیں۔ اعلیٰ تنقید عیسائی بنیاد پرستوں کے لیے ایک ہوا بن گئی کیونکہ یہ مذہب پر ایک کڑا حملہ دکھائی دیتی تھی' تاہم ایسا صرف اس لیے تھا کہ مغربی لوگ اساطیر کا اصل شعور گنوا چکے تھے اور سوچتے تھے کہ بائبل کے بیانات Logoi تھے' یعنی ایسے بیانات جو واقعتاً درست معلوم ہوتے ہوں اور ایسا مظہر جس کا سائنسی تجزیہ کیا جا سکتا ہو۔ تاہم اعلیٰ تنقید یہ عیاں کرتے ہوئے کہ بائبل کو سراسر لفظی انداز سے پڑھنا ناممکن ہے' جدید عیسائی عقیدے کو ''سائنسی'' بنانے کے فروغ پذیر رجحان کا صحت مندانہ جوابی توازن مہیا کرنے پر قادر تھی۔

ڈارون کے مفروضے اور کتاب پیدائش (Genesis) کے پہلے باب میں اختلاف دیکھ کر کچھ عیسائیوں مثلاً ڈارون کے امریکی دوست اور سائنس داں ایسا گرے (1810-88ء) نے ''کتاب پیدائش'' کے لفظی معنوں کو ''فطری انتخاب'' (Natural Selection) سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد Creation Science کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیثیت سے مشہور ہونے والے پروجیکٹ میں ''کتابِ پیدائش'' کو سائنسی اعتبار سے محترم بنانے کے لیے اس سے بھی زیادہ کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ تاہم یہ اصل نکتے کو ضائع کرنے والی بات تھی' کیونکہ بائبل کا تخلیق کا قصہ' ایک اساطیر کی حیثیت سے' زندگی کی شروعات کا کوئی تاریخی بیان نہیں تھا بلکہ خود زندگی کی حتمی اہمیت کا ایک زیادہ روحانی اظہار تھا' جس کے حوالے سے سائنسی لوگوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

عیسائیت اور سائنس کے مابین صلیبی جنگ:

حالانکہ ڈارون کا ارادہ نہیں تھا' تاہم Origin کی اشاعت مذہب اور سائنس کے درمیان ایک ابتدائی نوعیت کی جھڑپ کا سبب بنی' تاہم پہلے حملے مذہبی لوگوں نے نہیں بلکہ زیادہ جارحیت پسند سیکولر لوگوں نے کیے تھے۔ انگلینڈ میں تھامس ایچ ہکسلے (1825-95ء)' اور بقیہ یورپ میں کارل ووگٹ (1817-95ء) جیکب مولسکاٹ (1823-93ء) اور ارنسٹ ہیکل (1834-1919ء) نے دوسرے شہروں میں جا جا کر اور بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کر کر کے ڈارون کے نظریے کو مقبول کیا' یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سائنس اور مذہب کو تو ایک دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ درحقیقت وہ مذہب کے خلاف ایک صلیبی جنگ (Crusade) کی تبلیغ کر رہے تھے۔

ہکسلے کو واضح طور پر اس امر کا احساس تھا کہ وہ ایک جنگ میں شریک ہے۔ اس نے زور دے کر کہا کہ عقل کو سچ کی واحد کسوٹی ہونا چاہیے۔ مصالحت بالکل نہیں ہو سکتی: ''نامعلوم عرصے پر محیط کشمکش کے بعد کسی ایک کو مٹنا ہوگا۔'' ہکسلے کے نزدیک سائنسی عقلیت پسندی ایک نیا سیکولر مذہب تھا۔ یہ تبدیلیٔ مذہب (Conversion) اور کامل وابستگی کا تقاضا کرتا ہے۔ ''عقلی معاملات میں کسی بھی فکر سے دوچار ہوئے بغیر اپنی عقل کی پیروی کرو۔'' اس نے اپنے سامعین کو تاکید کی۔ ''اور اس کے برعکس عقلی معاملات میں یہ ظاہر مت کرو کہ ایسے نتائج یقینی ہیں جن کو ثابت نہیں کیا گیا ہے یا جو ثابت نہیں کیے جا سکتے۔'' ہکسلے کو جدید' ترقی یافتہ کلچر کی پوری قوت سے تائید حاصل تھی' جس نے ایسے حیران کن نتائج حاصل کر لیے تھے کہ اب یہ دعویٰ بھرپور طریقے سے کیا جا سکتا تھا کہ وہ سچ کا واحد حکم ہے۔ تاہم سچ کو ''ثابت شدہ اور ثابت کرنے کے قابل'' قرار دے کر محدود کر دیا گیا تھا' جس نے مذہب تو ایک طرف فن (آرٹ) اور موسیقی کے بیان کردہ سچ کو بھی خارج کر دیا تھا۔ ہکسلے کے نزدیک اس کے علاوہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کوئی ممکنہ راستہ ہی نہیں تھا۔ صرف عقل ہی سچی تھی اور مذہب کی اساطیر سچ سے عاری تھیں۔ یہ قدامت پسندانہ دور کی اساطیری پابندیوں سے آزادی کا آخری اعلامیہ تھا۔ اب عقل کسی اعلیٰ دربار کی تابع نہیں رہی تھی۔ اخلاقیات اس کو پابند نہیں کر سکتی تھی۔ بلکہ اسے تو اس کو ''کسی اور شے کی پروا کیے بغیر'' اختتام تک جانے کی تحریک دینا تھی۔ انگلستان کے علاوہ باقی یورپ سے تعلق رکھنے والے یہ صلیبی جنگجو (Crusaders) مذہب کے خلاف اپنی جنگ میں مزید آگے چلے گئے۔ بکنر نے ایک بہت سخت کتاب لکھی Force And Matter' جس کی ہکسلے نے بھی مذمت کی۔ بکنر نے کہا کہ کائنات کا کوئی مقصد نہیں ہے' دنیا کی ہر شے کا محرک محض ایک خلیہ ہوتا ہے اور محض کوئی احمق ہی خدا کو مان سکتا ہے۔ تاہم اس کتاب کو پڑھنے والے لوگوں کی کثیر تعداد اور ہیکل کے لیکچروں کے سننے کے لیے اکٹھا ہو جانے والے ہجوموں نے واضح کر دیا کہ یورپ میں لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد یہ سننے کی خواہشمند تھی کہ سائنس نے مذہب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رد کر دیا ہے۔

ایسا اس وجہ سے تھا کہ مذہبی صداقتوں کو عقلیت پسندانہ Logoi تصور کرتے ہوئے برتا گیا تھا۔ جدید سائنس دانوں' نقادوں اور فلسفیوں نے انہیں نا قابل اعتبار بنا دیا۔ 1882ء میں فریڈرک نطشے (1900ء۔ 1844ء) نے اعلان کیا کہ خدا مر گیا ہے۔ اس نے The Gay Science میں اس نے ایک پاگل آدمی کی کہانی بیان کی ہے' جو ایک صبح بازار میں دوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا ''میں نے خدا کو پا لیا!'' جب مزے لینے والے اور لاپروا سے تماشائیوں نے پوچھا کیا اس کا خیال ہے کہ خدا کہیں چلا گیا ہے تو پاگل نے کہا: ''خدا کہاں چلا گیا ہے؟ ہم نے اسے قتل کر دیا ہے..... تم نے اور میں نے! ہم سب اس کے قاتل ہیں!'' ایک اہم اعتبار سے نطشے درست تھا۔ اسطورہ' رسومات اور عبادات کے بغیر تقدس کا احساس ناگزیر طور پر مر جاتا ہے۔ بعض جدید مذہبی لوگوں نے ''خدا'' کو ایک مکمل طور پر عقلی صداقت بنا کر' الوہیت تک صرف عقل کے ذریعے رسائی پانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے اپنے ہی ہاتھوں قتل کر ڈالا ہے۔ ان کے مستقبل اساس کلچر کی حرکیات نے تقدس کو پانے کے ہر روایتی طریقے کو نفسیاتی طور پر ناممکن بنا دیا ہے۔ جیسے ان سے پہلے یہودی میرانو نے اپنے آپ کو بہت مختلف وجوہات کے تحت ایک مذہبی جہنم میں دھکیل دیا تھا' بہت سے جدید مردوزن مذہب کی صداقتوں کا تجربہ انہیں معمولی' من مانی اور نا قابل فہم سمجھتے ہوئے کر رہے تھے۔

نطشے کے پاگل کا ایقان تھا کہ خدا کی موت نے انسانیت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے' زمین کو اس کے راستے سے ہٹا دیا ہے اور اسے کائنات میں بغیر کسی راستے کے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ہر وہ شے جو کبھی انسانوں کو سمت کا شعور (Sense Of Direction) دیتی تھی' معدوم ہوگئی ہے۔ اس نے سوال کیا: ''کیا اب بھی اوپر اور نیچے ہے؟ کیا ہم ایک لامحدود عدم میں نہیں جا پڑے؟'' ایک عمیق دہشت' بے معنویت ایک احساس اور منفیت جدید تجربے کا جزو ہیں۔ نطشے ایک ایسے زمانے میں یہ سب لکھ رہا تھا کہ جب جدیدیت کے زبردست فروغ نے ایک بے نام خوف کو جنم دینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے نہ صرف یورپ کے عیسائیوں پر اثر ڈالا بلکہ یہودیوں اور مسلمانوں پر بھی' جو کہ جدیدیت پذیری کے عمل سے گزر رہے تھے اور انہوں نے بھی اسے مساوی طور پر حواس باختہ کر دینے والا پایا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

جدیدیت سے یہودیوں اور مسلمانوں کا تصادم

(1700ء-1870ء)

یہودیت کا دشمن جدید نظام:

اگر جدیدیت پذیری کا عمل یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں کے لیے مسائل پیدا کر رہا تھا تو یہ مسلمانوں اور یہودیوں کے لیے بھی مساوی طور پر دشوار تھا۔ مسلمانوں نے جدیدیت کو نوآبادیات اور غیر ملکی تسلط سے مربوط ایک اجنبی اور حملہ آور قوت کے طور پر پایا تھا۔ انہیں ایک ایسی تہذیب کو اپنانا تھا' جس کا نعرہ آزادی تھا' جبکہ وہ خود سیاسی غلامی کا شکار تھے۔ جدید نظام واضح طور پر یہودیوں کا دشمن تھا۔ روشن خیال مفکر اپنی تمام تر روادارانہ باتوں کے باوجود یہودیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ فرانکوئیس میری والتیئر (1778ء-1694ء) نے اپنی کتاب (1756ء) Dictionnaire Philosophique میں انہیں ''ایک مکمل طور پر جاہل قوم'' قرار دیا۔ اس نے انہیں ''ایک حقارت آمیز درماندگی اور انہیں برداشت کرنے والی قوموں کے خلاف متشددانہ نفرت کے ساتھ انتہائی باغیانہ سوچ'' سے جوڑا۔ یورپ کے پہلے اعلانیہ دہریئے ہیرن ڈی ہولباخ (89-1723ء) نے یہودیوں کو ''نوع انسان کے دشمن'' قرار دیا۔ کانٹ اور ہیگل یہودیت کو عقل کے سراسر خلاف' پست اور فرومایہ مذہب تصور کرتے تھے۔ کارل مارکس نے' جو خود یہودی والدین کی اولاد تھا' کہا کہ یہودیت سرمایہ داری کی ذمہ دار ہے' جو اس کے خیال میں دنیا کے تمام مسائل کی جڑ تھی۔ چنانچہ یہودیوں کو ایک نفرت کی فضا میں جدیدیت کو قبول کرنا پڑا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''بیشت'' کا ظہور:

امریکہ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی پیشرفتوں نے پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو دو مخالف دھڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں مشرقی یورپ کے یہودیوں میں بھی ایک ایسا ہی تنازعہ موجود تھا۔ پولینڈ' گیلیشیا' بیلورشیا اور لتھوانیا کے یہودی دو مخالف فریقوں میں تقسیم ہو گئے تھے' جنہوں نے یہودی بنیاد پرستی کے جنم لینے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ ہیسیڈم' جو کہ نیولائٹس سے مختلف تھے' ٹھیک اسی زمانے میں رونما ہوئے' جب امریکی کیلونسٹ ''پہلی عظیم بیداری'' کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ 1735ء میں اسرائیل بین الائزر (1700-60ء) نے' جو کہ ایک شراب خانے کا مالک تھا' اعلان کیا کہ اس کو الہام ہوا ہے کہ وہ بال شیم ہے' یعنی ایک ایسا شخص جو پولینڈ کی بستیوں میں گھوم پھر کے خدا کے نام پر معجزانہ شفا مہیا کرتا ہو۔ لیکن اسرائیل نے جلد ہی ایک خصوصی شہرت حاصل کر لی' کیونکہ وہ غریبوں کی طبیعی ضروریات کے ساتھ ساتھ روحانی ضروریات بھی پوری کیا کرتا تھا' اس طرح اسے "Besht" کہا جانے لگا' جو کہ Baal Shem Tov کے ابتدائی حروف کو ملا کر بنایا گیا ایک خطاب تھا اور اس کا مطلب تھا' غیر معمولی مرتبے کا حامل شخص۔ پولینڈ کے یہودیوں کے لیے وہ بڑا تاریک دور تھا۔ یہودی شیتائی سیکنڈل کے اثرات سے پوری طرح نہیں سنبھلے تھے جبکہ 1648ء کے قتل عام کے بعد سے ہی وہ سنگین معاشی مسائل سے دوچار چلے آ رہے تھے اور اب وہ روحانی بحران کا شکار ہو گئے تھے۔ امیر یہودیوں نے بقا کی جدوجہد میں ٹیکس درست طور پر ادا نہیں کیے' غریبوں اور امیروں کے درمیان خلا بڑھ گیا' نوابوں کے درباریوں' طاقتور لوگوں نے کہیلا (Kehilla) پر تسلط جما لیا اور کمزوروں کو دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ بدترین بات یہ ہوئی کہ اس جبر و استبداد میں شامل ربیوں نے غریبوں کی بالکل پروا نہیں کی اور قانونی موشگافیوں میں اپنی دانشورانہ توانائیاں ضائع کرنے لگے۔ غریبوں کو دھتکارے جانے کا احساس ہونے لگا۔ ایک روحانی خلا پیدا ہو گیا' عوامی اخلاقیات میں زوال رونما ہوا اور توہمات کا زور ہو گیا۔ عوامی مبلغوں نے حاجات کا شکار یہودیوں کو درس دیا کہ اپنے فرائض سے روگردانی کرنے والے ربیوں کے خلاف مہم چلائیں۔ ان ہیسیڈم (''نیک لوگوں'') نے الگ عبادت گاہیں بنائیں اور لوگ سیناگوگ چھوڑ کر ان میں عبادت کرنے لگے۔ بیشت (Besht) نے 1735ء میں بال شیم ہونے کا دعویٰ کیا تو اس نے خود کو انہی ہیسیڈی حلقوں کے لیے پیش کیا تھا اور وہ ان کا ربی بن گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیشت نے اس ہیسیڈازم (Hesidism) کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا' جو بدعنوان ربیوں سے اختیارات حاصل کرنے اور لوگوں کی روحانی ضروریات پورے کرنے کے لیے کوشاں ہوا۔ 1750ء تک پولینڈ' وولہیا' گیلیشیا اور یوکرائن کے بیشتر شہروں میں ہیسیڈم کی عبادت گاہیں بن چکی تھیں۔ ایک معاصر مصنف نے لکھا ہے کہ اپنی زندگی کے اختتام پر بیشت کے چالیس ہزار پیروکار تھے' جو اپنے الگ سینا گوگوں میں عبادت کیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ہیسیڈازم پولینڈ' یوکرائن اور مشرقی گیلیشیا کی بیشتر یہودی کمیونٹیوں میں رائج ہو چکا تھا۔ یہ وائٹ رشیا اور رومانیہ کے کئی شہروں میں پھیل گیا تھا اور لتھوانیا میں عام ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نیولائٹ پروٹسٹنٹوں کی طرح ہیسیڈازم مذہبی ایسٹیبلشمنٹ کی مخالفت میں ایک عوامی تحریک بن گیا۔ ہیسیڈم نے بالکل اسی طرح اپنی الگ عبادت گاہیں قائم کر لیں جس طرح نیولائٹس نے اپنے چرچ قائم کیے تھے۔ یہ دونوں عوامی عناصر کی حامل تحریکیں تھیں۔ جس طرح انقلابی پروٹسٹنٹوں نے اپنے علم و فضل اور الٰہیاتی کمال پر غرور کرنے والی اشرافیہ پر تنقید کی تھی بالکل اسی طرح ہیسیڈم نے ربیوں کی خشک علمیت کی مذمت کی۔ بی شت نے ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے اعلان کیا کہ عبادت کو توریت پڑھنے پر فضیلت حاصل ہے۔ یہودی صدیوں سے ایک ربی کو اس کے توریت کے علم کی بنیاد پر قدر و منزلت دیتے آئے تھے لیکن چونکہ وہ مقدس کتاب میں درج کمیونٹی کے فوری سماجی مسائل پر توجہ دینے کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے تھے اس لیے ہیسیڈم نے اس مصائب انگیز علمیت کو رد کر دیا' گو کہ انہوں نے مقدس کتاب کا مطالعہ اپنے انداز سے جاری رکھا۔

تاہم نیولائٹ پروٹسٹنٹ ایک جدیدیت پذیر روحانیت کے حامل تھے جبکہ ہیسیڈازم ایک قدامت پسندانہ اصلاحی تحریک تھا۔ اس کی روحانیت اساطیری تھی' جس کی بنیاد اس الوہی روشنی کی لیوریائی علامت پر تھی' جو کہ اولین المیے کے دوران مادے میں مقید رہ گئی تھی' تاہم بیشت نے اس المناک وژن کو خدا کی ہر جگہ موجودگی کے مثبت تصور میں ڈھال لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا کی ایک جھلک قطعی طور پر ہر شے میں پائی جا سکتی ہے۔ ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں خدا موجود نہ ہو۔ ایک انتہائی تکمیل یافتہ ہیسیڈم خدا پر ہر لحہ ارتکاز کر کے اور اس سے وابستہ رہ کر (Devekut) اس الوہی جہت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ کوئی دنیاوی اور جسمانی سرگرمی لادینی نہیں۔ خدا ہر وقت موجود ہے اور ہر وقت مہیا و میسر ہے اور ہیسیڈم کھاتے' پیتے' محبت کرتے ہوئے یا کاروبار کرتے ہوئے اس کا تجربہ کر سکتا ہے۔ ہیسیڈم کو اس الوہی موجودگی کے اپنے علم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو ضرور ظاہر کرنا چاہیے۔ ہیسیڈی (Hesidic) عبادت پرشور اور وجد آمیز ہوتی تھی۔ ہیسیڈم عبادت میں خود کو پوری طرح محو کرنے کے لیے عجیب وغریب اور متشددانہ حرکتیں کرتے تھے۔ وہ تالیاں بجاتے' اپنے بازو آگے پیچھے لہراتے' دیواروں کو تھپتھپاتے اور جسموں کو جھلاتے تھے۔ ہیسیڈ کو دماغ سے زیادہ عمیق سطح پر سیکھنا ہوتا تھا کہ اس کی کل ہستی کو اپنے قرب وجوار میں موجود الوہی قوتوں سے اسی طرح اثر پذیر ہونا چاہیے جس طرح شمع کا شعلہ ہوا کی ہر حرکت سے متاثر ہوتا ہے۔ بعض ہیسیڈم تو خدا کے سامنے انا کے کامل سقوط اختیار کر لینے کے اظہار کی خاطر سینا گوگوں میں جسمانی کرتب بھی دکھاتے تھے۔

تاہم ہیسیڈازم کی بدعتوں کی جڑیں ماضی میں تھیں اور انہیں کسی قدیم صداقت کی بازیافت کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ بیشت نے دعویٰ کیا کہ اسے شیلوہ کے ایجاہ (Ahijah Of Shiloh) پیامبر ایلی جاہ (Elijah) کے استاد نے الوہی اسرار کی تعلیم دی تھی اور یہ کہ ایلی جاہ کی روح اس میں سمائی ہوئی ہے۔ بیشت اور اس کے پیروکار صحیفے کا مطالعہ اب بھی پرانے اساطیری انداز سے کرتے تھے۔ بائبل کا تنقیدی مطالعہ کرنے یا معلومات حاصل کرنے کی بجائے ہیسیڈم نے توریت کے مطالعے کو ایک روحانی سرگرمی بنا لیا تھا۔ بیشت نے اپنے شاگردوں کو کہا: ''میں تمہیں بہترین طریقے سے توریت پڑھاؤں گا' خود شعوری مت حاصل کرو' بلکہ ایک سننے والے کان جیسے بن جاؤ جو آوازوں کی دنیا کو بولتے ہوئے سنتا تو ہے لیکن خود نہیں بولتا ہے۔'' گویا ہیسیڈ کو توریت کے لیے اپنا دل کشادہ کرنا ہوتا تھا اور خود کو انا سے عاری کرنا پڑتا تھا۔ ذات کی یہ ماورائیت کیف ومستی کی ایک قسم تھی جو ہیسیڈ کی ذہنی قوتوں کو منظم انداز میں قابو میں لانے کی متقاضی تھی۔ بیشت کو لفظی مطالعے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ الفاظ سے ماورا الوہی معانی کو دیکھتا تھا' بالکل اسی طرح اس نے اپنے ہیسیڈم کو تلقین کی کہ وہ خارجی دنیا کے پار داخلی موجودگی کو دیکھیں۔ ایک روز ڈوو بر (72-1710ء) اسے ملنے آیا' وہ ایک فاضل قبالائی تھا اور وہی بیشت کے بعد ہیسیڈی تحریک کا رہنما بنا تھا۔ ان دونوں نے فرشتوں کے حوالے سے توریت پر بحث کی اور بیشت نے جانا کہ ڈوو بر کی لفظی تشریح درست تو ہے لیکن ناکافی ہے۔ اس نے اسے کہا کہ فرشتوں کے احترام میں کھڑے ہو جاؤ اور جونہی ڈوو بر کھڑا ہوا ''سارا مکان روشنی سے بھر گیا' ہر طرف آگ سی دہک اٹھی اور ان دونوں کو فرشتوں کی موجودگی کا احساس ہوا جس کا کہ ذکر کیا گیا تھا۔'' بیشت نے ڈوو بر کو کہا: ''سادہ مطالعہ ویسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو۔ لیکن تمہارے مطالعے کے طریقے میں روح کا فقدان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔'' عبادت کے مسلکی اعمال اور رجحانات کے بغیر کاملاً عقلی مطالعے سے کوئی ہیسیڈ اس غیر مرئی حقیقت کا وژن نہیں پا سکتا جس کی طرف توریت کا متن اشارہ کرتا ہے۔

کئی اعتبار سے ہیسیڈازم یورپی روشن خیالی کی روح کا تضاد تھا' جو کہ ہیشت کی زندگی کے اختتام پر مشرقی یورپ میں پہنچنا شروع ہوئی تھی۔ جہاں فلسفی اور سائنس دان یہ یقین رکھتے تھے کہ صرف عقل سچ تک لے جا سکتی ہے' وہاں ہیشت نے عقل کے دوش بدوش صوفیانہ وجدان کو فروغ دیا۔ ہیسیڈازم جدیدیت کے تحت مذہب کی سیاست سے' مقدس کی غیر مقدس سے علیحدگی کو نہیں مانتا تھا اور اس نے ایک کلی وژن اختیار کیا جو تقدیس کو ہر جگہ دیکھتا تھا۔ جہاں سائنس نے دنیا کا فسوں توڑ دیا تھا اور کائنات کو الوہیت سے خالی پایا تھا' وہاں ہیسیڈم ایک مقدس خلقیت کا تجربہ کرتے تھے۔ گو کہ یہ ایک عوامی تحریک تھی تاہم ہیسیڈازم میں نام کو بھی جمہوریت نہیں تھی۔ ہیشت کا عقیدہ تھا کہ عام ہیسیڈ براہ راست خدا سے اتحاد نہیں کر سکتے۔ اسکے خیال میں وہ صرف کسی زیڈک (Zaddik) یعنی ''نیک آدمی'' کی شخصیت ہی میں الوہیت کو پا سکتے ہیں' جو خدا کے مستقل صوفیانہ شعور دیویکٹ (Devekut) کا حامل ہوتا ہے' جو بیشتر لوگوں کی رسائی سے باہر ہے۔ چنانچہ ہیسیڈ پوری طرح اپنے زیڈک کا دست نگر ہوتا تھا۔ کانٹ نے اسی رویے کی مذمت کی تھی۔ اس طرح ہیسیڈازم اور روشن خیالی میں بعد المشرقین تھا اور جب روشن خیالی مشرقی یورپ میں پھیلنا شروع ہوئی تو بہت سے ہیسیڈم نے اسے مسترد کر دیا۔

مسنیگڈم:

جب ہیشت زندہ تھا تو ربی ایسٹیبلشمنٹ نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا لیکن نیا رہنما ایک فاضل آدمی ڈوو بر بہت مختلف تھا اور اس کی قیادت میں تحریک زیادہ عام ہوگئی۔ جب یہ تحریک لیتھوانیا پہنچی تو ایک طاقتور شخصیت نے اس پر توجہ دی اور وہ تھا اکیڈمی آف ولنا کا سربراہ (Gaon) ایلی جاہ بین سولومن زیلمن (1720-27ء) اسے ہیسڈی تحریک سے بہت دھچکا لگا تھا' خصوصاً توریت کی قدر کم کرنے سے' جو کہ اس کا جنون تھی۔ تاہم اس کا علم و فضل بدعنوان پولش ربیوں کے مغالطہ آمیز مطالعوں سے بہت مختلف تھا اور ایک عمیق صوفیانہ سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کے بیٹے ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ ساری ساری رات مطالعے میں گزارا کرتا تھا اور خود کو بیدار رکھنے کے لیے اپنے پاؤں برفیلے پانی میں ڈالے رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک توریت کا مطالعہ اس سے کہیں زیادہ شدت کا متقاضی ہے' جتنا کہ ہیسیڈم کہتے ہیں۔ وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بقول خود مطالعے کی ''کوشش'' سے لطف اندوز ہوتا اور ایسا لگتا ہے کہ اس شدید ذہنی فعالیت نے اسے آگہی کی ایک نئی سطح تک پہنچا دیا تھا۔ جب وہ خود کو سونے کی اجازت دیتا تو توریت اس کے خوابوں میں در آتی اور وہ الوہیت کی طرف ایک صوفیانہ عروج کے تجربے سے گزرتا۔ اس طرح توریت کا مطالعہ خدا سے ایک رابطہ تھا۔ جیسا کہ اس کے شاگرد ربی ہائیم وولوژنر (1821ء-1749ء) نے' جس سے ہم بعد میں ملیں گے' واضح کیا: ''جو شخص توریت کا مطالعہ کرتا ہے' وہ خدا کو پا لیتا ہے' کیونکہ خدا اور توریت ایک ہی ہیں۔'' تاہم ایلی جاہ جدید مطالعات پر بھی وقت صرف کرتا تھا۔ وہ فلکیات' تشریح الاعضاء' ریاضی اور غیر ملکی زبانوں پر دسترس رکھتا تھا۔ اس نے ہیسیڈم کو کافر اور ظلمت پرست (Obscurantist) پایا۔ تنازعہ بڑھ گیا۔ ایلی جاہ کے حامی' جنہیں ہیسیڈم مستیگدم (مخالفین) کہا کرتے تھے' بعض اوقات تب گریہ و زاری کی رسم مناتے تھے' جب ان کا کوئی ساتھی ہیسیڈ بن جاتا' گویا کہ وہ مر گیا ہو۔ دوسری طرف ہیسیڈم مستیگدم کو صحیح یہودی تصور نہیں کرتے تھے۔ آخر کار 1772ء میں ایلی جاہ نے ولنا اور بروڈی کے ہیسیڈم کو برادری سے نکال دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی کے صدمے سے ڈووبر ہلاک ہو گیا۔

ایلی جاہ کی زندگی کے آخری دنوں میں یوکرائن اور بیلورشیا کے ایک ہیسیڈی رہنما ربی شنیور زیلمن نے مصالحت کی کوشش کی لیکن ایلی جاہ نے اس بات سے انکار کر دیا۔ دراصل زیلمن کی کتاب (1791ء) Tanya کی اشاعت برادری سے اخراج کے ایک نئے فرمان کا باعث بنی۔ زیلمن ہیسیڈازم کی ایک نئی صورت وضع کر رہا تھا' جو کہ ہیبڈ (Habad) کے نام سے معروف ہوئی۔ اور جو مستیگدم کی روحانیت سے بہت قریب تھی' کیونکہ وہ عقلیت پسندانہ سوچ کو روحانی جستجو کا نقطۂ آغاز قرار دیتی تھی۔ زیلمن نے روشن خیالی کے بعض آئیڈیلز کو بھی اپنایا' جنہیں اس نے صوفیانہ لائحۂ عمل میں سمونے کی کوشش کی۔ اسے یقین تھا کہ ہماری عقلی قوتیں تنہا ہی خدا کو پانے کی اہلیت نہیں رکھتیں' اگر ہم صرف اپنے حواس پر بھروسہ کریں..... جیسا کہ سائنس دان اور فلسفی ہمیں کہتے ہیں..... تو دنیا الوہیت سے خالی محسوس ہوگی۔ تاہم ادراک کی ایک مختلف صورت کو پانے کے لیے اپنی وجدانی قوتوں کو استعمال کر سکتا ہے' جو کہ تمام مظاہر میں نہاں موجودگی کو منکشف کر دے گا۔ زیلمن عقل کا مخالف نہیں تھا تاہم وہ اسی پرانے قدامت پسندانہ مؤقف کا اظہار کر رہا تھا کہ عقلیت پسندانہ سوچ ہی ادراک کا واحد ذریعہ نہیں تھی' عقل اور صوفیانہ وجدان کو دوش بدوش کام کرنا چاہیے۔ زیمن نے استدلال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا کہ جب یہودی عقلیت پسندانہ قیاس آرائی اور جدید سیکولر مضامین کے مطالعے میں محو ہوئے تو انہیں اپنے ذہنوں کی محدودیتوں کا پتہ چلے گا اور وہ باطنی عبادت کے ذریعے ان سے ماورا جانے کی راہ ڈھونڈیں گے۔ زیلمن نے ہیشت کی متعارف کروائی ہوئیں متشددانہ سرگرمیوں کے ذریعے ماورائیت کا احساس پانے میں اپنے ہیبیڈ ہیسیڈم کی حوصلہ افزائی کی۔ زیلمن خود بھی زمین پر لوٹتا رہتا تاوقتیکہ وہ ایک وجد کی کیفیت کو پہنچ جاتا اور عام لوگوں کی طرح وحشیانہ رقص کرنے لگتا۔ تاہم اس مستی کی جڑیں مطالعے اور منظم ارتکاز میں تھیں۔ ہیبیڈ ہیسیڈم کو درس دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ذہنوں کی گہرائیوں میں اتریں یہاں تک کہ تمام عظیم روایات کے صوفیوں کی طرح اپنی ہستی میں ایک مقدس موجودگی سے آگاہ ہو جائیں۔

ہسکلاہ:

ہیسیڈم اور مسنیگڈم کے مابین تنازعے میں شدت پیدا ہوگئی۔ زیلمن کو سینٹ پیٹرز برگ میں واقعتاً کچھ سال قید میں رکھا گیا' کیونکہ مسنیگڈم نے اسے فتنہ انگیز قرار دے کر روسی حکام کے حوالے کر دیا تھا۔ تاہم انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں نفرت کم ہونے لگی۔ دونوں فریقوں کو اس حقیقت کا ادراک ہوگیا کہ انہیں ایک دوسرے سے ڈرنے کی بجائے دوسروں سے خوف کھانا چاہیے اور اسی لیے ان نئے خطروں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی قوتیں یکجا کرنی چاہئیں۔ سب سے زیادہ پریشان کن ہسکلاہ (Haskalah) یعنی یہودی روشن خیالی تھی' جو مشرقی یورپ کے یہودیوں میں پھیلنا شروع ہی ہوئی تھی اور جسے ہیسیڈم اور مسنیگڈم یکساں طور پر کافرانہ تصور کرتے تھے۔

ہسکلاہ موشے مینڈلسون (1792-86ء) کی تخلیق تھی' جو کہ ڈیسا' جرمنی کے توریت کے ایک غریب عالم کا ذہین بیٹا تھا اور چودہ برس کی عمر میں اپنے پسندیدہ استاد کے پیچھے پیچھے برلن چلا گیا تھا۔ وہاں وہ جدید سیکولر نظریات کی محبت میں مبتلا ہوگیا اور اس نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ جرمن' فرانسیسی' انگریزی' لاطینی' ریاضی اور فلسفے پر کامل دسترس حاصل کر لی۔ وہ جرمن روشن خیالی میں حصہ لینے کا آرزومند تھا۔ وہ کانٹ کا ذاتی دوست بن گیا اور اپنا سارا فالتو وقت مطالعے میں گزارنے لگا۔ اس نے اپنی پہلی کتاب (1767ء) Phaedon میں عقلی بنیادوں پر روح کی لافانیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور اس میں یہودیت کا بالخصوص کوئی حوالہ نہیں تھا۔ تاہم اپنی مرضی کے خلاف اسے روشن خیالی کی یہودی عقیدے سے نفرت کا سامنا ہونے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر یہودیت کا دفاع کرنا پڑا۔ 1769ء میں ایک سوئس پادری جوہان کیسپر لیویٹر نے عوامی سطح پر یہودیت کا دفاع کرنے کا چیلنج دیا۔ لیویٹر نے اعلان کیا کہ اگر وہ عیسائیت کو عقلی شواہد کے ذریعے رد نہیں کر سکتا تو اسے عیسائی ہونا پڑے گا۔ مینڈلسون کو سامیت دشمنی پر مبنی ایک پمفلٹ On The Civic Improvment Of The Condition Of The Jews (1781ء) نے بہت پریشان کیا۔ اس پمفلٹ کا مصنف ایک پروشیائی ریاستی افسر کرسچین ولہیلم وان ڈوم تھا۔ اس نے لکھا کہ جدید دنیا میں کسی قوم کو مؤثر اور بھرپور انداز میں فعال ہونے کے لیے اپنے زیادہ سے زیادہ افراد کے جوہروں (Talents) کو بیدار کرنا چاہیے' اسی لیے یہودیوں کو آزادی دی جانی چاہیے اور انہیں معاشرے میں پوری طرح شامل کرنا چاہیے' لیکن انہیں شہریت یا سرکاری عہدے نہیں دیئے جانے چاہئیں۔ اس کے پس پشت یہ سوچ کارفرما تھی کہ یہودی قابل اعتراض ہیں اور ان کا مذہب وحشیانہ ہے۔

مینڈلسون نے آخرکار اپنے آپ کو جواب دینے پر مجبور پایا اور 1783ء میں اس نے اپنی کتاب شائع کروائی' جس کا عنوان Jerusalem, Concerning Relgious Authority And Judaism تھا۔ جرمن روشن خیالی مذہب کے لیے مثبت تھی اور خود مینڈلسون بھی لاک کی طرح ایک باوقار ڈی اسٹ (Deist) عقیدے کا حامل تھا' گو کہ اسے یہودیت کہنا دشوار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مینڈلسون ایک مہربان خدا کی ہستی کو عقل سلیم کا معاملہ سمجھتا تھا تاہم اس نے اس امر پر اصرار کیا کہ عقل عقیدے پر فوقیت رکھتی ہے۔ ہم صرف تبھی بائبل کی اتھارٹی کو تسلیم کر سکتے ہیں جب اس کی صداقت کو عقلی طور پر ثابت کر دیں۔ اس سوچ نے روایتی' قدامت پسندانہ عقیدے کی ترجیحات کو مکمل طور پر الٹ دیا تھا' جو کہ اس بات کو یقینی سمجھتا تھا کہ عقل اس اساطیری صداقت کو ثابت نہیں کر سکتی جسے صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔ مینڈلسون نے چرچ اور ریاست کو بھی الگ الگ کرنے کی بات کی اور مذہب کو نجی معاملہ قرار دیا..... یہ بات ان یہودیوں کے لیے بہت کشش کا باعث تھی جو گیٹو (Ghetto) کی حدوں کو توڑنے اور مرکزی دھارے کے یورپی کلچر میں شامل ہونے کے آرزومند تھے۔ عقیدے کو ایک خالصتاً نجی معاملہ قرار دیتے ہوئے وہ یہودی بھی رہ سکتے تھے اور اچھے یورپی بھی بن سکتے تھے۔ مینڈلسون نے زور دے کر کہا کہ یہودیت ایک ایسا عقلیت پسندانہ عقیدہ ہے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جاتا ہے اور اس کی بنیاد عقل پر ہے۔ اس نے کہا کہ جب خدا نے کوہ سینا پر موسیٰؑ کو اپنا جلوہ دکھایا تھا تو آپؑ یہودیوں کے لیے فلسفوں کا مجموعہ نہیں بلکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک قانون لے کر آئے تھے۔ چنانچہ یہودیت کا سروکار صرف اخلاقیات اور انسانی رویے سے ہے۔ یہ یہودیوں کے ذہنوں کو کامل آزادی عطا کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مینڈلسون کو یہودیت کے صوفیانہ اور اساطیری پہلو کی بہت کم آگہی تھی۔ اس کی کوشش یہودیت کو جدید دنیا کے لیے قابل قبول بنانے کے واسطے ایک عقلیت پسندانہ سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی..... جبکہ یہ عقلیت پسندانہ سانچہ بیشتر مذاہب کی طرح یہودیت کے لیے بھی اجنبی تھا۔

مینڈلسون کے تصورات مشرقی یورپ کے ہیسیڈم اور مسنیگڈم اور مغربی دنیا (Western World) کے زیادہ آرتھوڈوکس یہودیوں کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ اسے ایک نیا سپائنوزا' عقیدہ ترک کر دینے اور غیر یہودیوں میں جا ملنے والا کافر قرار دے کر سخت برا بھلا کہا گیا۔ ان باتوں سے مینڈلسون کو بہت رنج ہوا کیونکہ جہاں اس نے روایتی یہودیت کو ناقابل اعتبار پایا تھا' وہاں وہ یہودی خدا یا اپنے یہودی تشخص کو چھوڑنے کا خواہاں نہیں تھا۔ تاہم بے شمار لوگ اس کے پیروکار بن گئے تھے۔ شبتائی زیوی کے زمانے سے بیشتر یہودیوں نے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ وہ روایتی یہودیت کی سختیوں سے ماورا ہو جانے کے خواہاں ہیں' جن کو کہ انہوں نے دم گھونٹ دینے والا پایا تھا۔ وہ مینڈلسون کی مثال پر عمل کر کے بہت خوش تھے یعنی غیر یہودی معاشرے میں گھل مل جانا' نئی سائنسوں کا مطالعہ کرنا اور اپنے مذہب کو نجی حد تک رکھنا۔ مینڈلسون ایسا پہلا شخص تھا جس نے یہودیوں کو برادری اور اپنا ثقافتی ورثہ چھوڑے بغیر گیٹو سے نکل کر جدید یورپ میں شامل ہونے کا راستہ دکھایا۔

ماسکیلم:

بعض ''ماسکیلم'' (روشن خیال) یہودیوں نے روشن خیالی کی دانش ورانہ زندگی میں شمولیت کے ساتھ ساتھ اپنے ورثے کا مطالعہ ایک زیادہ سیکولر انداز سے شروع کیا۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے' ان میں سے بعضوں نے یہودی تاریخ کو جدید اور سائنسی انداز میں پرکھا۔ دوسروں نے عبرانی میں پڑھنا لکھنا شروع کر دیا' جس کو آرتھوڈوکس یہودی مقدس زبان مانتے تھے اور صرف عبادات اور مذہبی کتابوں کے لیے مخصوص سمجھتے تھے۔ اب ماسکیلم نے اس مقدس زبان کو سیکولر بناتے ہوئے اس میں ادب تخلیق کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یہودی ہونے کا ایک جدید طریقہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ماضی کے توہمات سے چھٹکارا پانے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہودیت کو روشن خیال معاشرے کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔

تاہم مرکزی دھارے کے کلچر میں ان کی شمولیت کو خارجی طور پر عائد شدہ پابندیوں نے سنگین حد تک متاثر کیا تھا۔ یہودیوں کو ریاست نے کوئی قانونی تشخص نہیں دیا تھا' وہ سیاسی زندگی میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اور سرکاری طور پر انہیں ایک علیحدہ نسل قرار دیا گیا تھا۔ تاہم ماسکیلم روشن خیالی کی عظیم امیدوں سے سرشار تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ انقلاب امریکہ کے بعد کے یہودیوں کو سیکولر امریکہ نے شہریت دے دی تھی۔ جب روشن خیالی کی روح سے آشنا نپولین بونا پارٹ فرانس کا حکمران بنا اور اس نے ایک طاقتور سلطنت قائم کرنا شروع کی تو ایسا لگنے لگا کہ صدیوں کے ظلم و ستم کے بعد آخرکار یہودیوں کو یورپ میں بھی مساوات اور احترام حاصل ہو جائے گا۔

نپولین اور یہودی:

آزادی انقلاب فرانس کا جنگی نعرہ اور فرانس میں نپولین کی حکومت کا طرۂ امتیاز تھی۔ جو یہودی گھٹو سے فرار کے آرزومند تھے ان کی مسرت کے اسباب فراہم کرتے ہوئے نپولین نے اعلان کیا کہ فرانس کے یہودی ری پبلک کے مکمل شہری ہوں گے۔ 29/جولائی 1806ء کو یہودی کاروباریوں' بینکاروں اور ربیوں کو پیرس کے ہوٹل ڈی وائل میں مدعو کیا گیا' جہاں انہوں نے ریاست سے وفاداری کا حلف اٹھایا۔ چند ہفتوں بعد نپولین نے اہم یہودیوں پر مشتمل ایک ادارہ قائم کیا جسے اس نے ''عظیم سینہیڈرین'' (Great Sanhedrin) کا نام دیا۔ سینہیڈرین یہودیوں کی حکمران کونسل ہوا کرتی تھی' جس کا اجلاس 70ء میں یروشلم میں معبد کی تباہی کے بعد سے منعقد نہیں ہو پایا تھا۔ اس ادارے کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ گزشتہ اسمبلی کی قراردادوں کو مذہبی منظوری دے گا۔ یہودی بے انتہا خوش تھے۔ ربیوں نے اعلان کیا کہ انقلاب فرانس ''کوہ سینا سے آیا ہوا دوسرا قانون''، ''مصر سے ہمارا خروج' ہماری جدید عید (Pesach)''۔ Liberte, Egalite, Fraternite * کے اس نئے معاشرے کے ساتھ مسیحائی عہد آ گیا ہے۔ نپولین یورپ کے جس جس ملک کو فتح کرتا گیا وہاں ان مساویانہ اصولوں کو متعارف کراتا گیا: ہالینڈ' اٹلی' سپین' پرتگال اور پروشیا۔ یکے بعد دیگرے مختلف ملکوں کو اپنے ہاں موجود یہودیوں کو آزادی دینا پڑی۔

* ''آزادی' مساوات اور اخوت''۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم 1806ء کی اسمبلی میں بھی نپولین کے کمشنر لوئی کاؤنٹ مولی کے جارحانہ خطاب میں یہودیوں کے حوالے سے روشن خیالی کی نفرت سطح پر آ گئی۔ اس نے سنا تھا کہ ایلساک کے یہودی ساہوکار فوج میں لازمی بھرتی سے گریز کر رہے ہیں اور لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ چنانچہ اسمبلی میں موجود یہودی مندوبین کو اس شہری اخلاقیات کے شعور کو دوبارہ زندگی بخشنے کی ذمہ داری ادا کرنا تھی' جو کہ ''ذلت آمیز زندگی'' کی طویل صدیوں کے دوران ان کے لوگوں نے گنوا دی تھی۔ 17/مارچ 1808ء کو نپولین نے یہودیوں پر معاشی پابندیاں عائد کر دیں' جنہیں بعد میں ''مکروہ فرمان'' کہا گیا۔ ان پابندیوں کے ابتدائی تین برسوں میں ہزاروں یہودی خاندان اجڑ گئے۔ جیسا کہ امریکی تاریخ نویس نارمن کینٹر نشاندہی کرتا ہے کہ نپولین نے یہودیوں کو ایک ''فاؤسٹی سودے بازی'' (Faustian Bargain)* کی پیشکش کی: انہیں آزادی کے بدلے اپنی منفرد یہودی روح بیچنا تھی۔ Liberte کی تمام تر باتوں کے باوجود جدید' مرکزیت پسند ریاست گیٹو جیسے خودمختار علاقوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ روشن خیال نظام کو قانوناً اور ثقافتی طور پر یکساں ہونا تھا اور یہودیوں نے ''مسئلہ'' کھڑا کر دیا تھا' جس کا حل کیا جانا بہت ضروری تھا۔ انہیں لازماً بورژوا فرانسیسیوں جیسا بننا چاہیے تھا' اپنے الگ طرز حیات کو ترک کرنا اور مذہب کو نجی معاملہ بنانا چاہیے تھا: یہودیوں کو بطور یہودی معدوم ہونا تھا۔

فرانسیسی اقدام باقی یورپ میں یہودیوں کی نجات کا مثالی نمونہ بن گیا۔ پرانی علیحدگی کے مقابلے میں نئی رواداری ایک بہتری تھی' تاہم یہ صرف روشن خیالی کے شریفانہ آئیڈیلزم ہی کا نہیں بلکہ جدید ریاست کی ضرورتوں کا نتیجہ بھی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ایک ایسی ہی عملیت پسندی امریکہ میں تکثیریت (Pluralism) کی آئینی قبولیت کا پیش خیمہ بنی تھی۔ اگر انہیں جدید دنیا کے چیلنج کا مؤثر انداز میں جواب دینا اور ایک خوش حال معاشرہ تشکیل دینا تھا' تو حکومتوں کو بھی تمام دستیاب انسانی وسائل استعمال کرنا تھے۔ ریاست کا سرکاری مذہب خواہ کوئی بھی ہو' جدید معاشی اور صنعتی پروگراموں میں سبھی یہودیوں' پروٹسٹنٹوں' کیتھولکوں اور سیکولر لوگوں کی ضرورت تھی۔ یہودیوں کی داستانوی کاروباری مہارت تو بالخصوص مرغوب خاطر تھی اور اس کو ریاست کے مفاد کی خاطر استعمال کرنا لازمی تصور کیا گیا۔

* فاؤسٹ سولہویں صدی کا ایک جرمن' جس نے دنیاوی لذتوں کے حصول کی خاطر اپنی زندگی کا سودا شیطان سے کر لیا تھا۔ مارلو اور گوئٹے نے اس کردار کے حوالے سے اپنے شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاہم پرانے تعصبات باقی تھے۔ واٹرلو میں نپولین کی شکست اور اس کی سلطنت کے منہدم ہونے (1815ء) فرانس اور ہالینڈ کے علاوہ یہودیوں کو دیئے گئے حقوق واپس لے لیے گئے۔ یہودیوں کو دوبارہ گیٹوؤں میں دھکیل دیا گیا' پرانی پابندیاں دوبارہ عائد کردی گئیں اور نئے سرے سے پوگروم (Pogroms) * شروع ہوگئے۔ تاہم جدید ریاست کی ضرورتوں نے آخرکار حکومتوں کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے ہاں موجود یہودیوں کو مکمل شہریت دیں' بشرطیکہ وہ فاؤسٹی سودے بازی قبول کرلیں۔ برطانیہ' فرانس' ہالینڈ' آسٹریا اور جرمنی جیسے ملک' جنہوں نے یہودیوں کو برابری اور شہریت دی تھی' خوشحال ہوگئے۔ مشرقی یورپ کی ایسی ریاستیں جو جمہوری نہیں ہوئیں بلکہ انہوں نے جدیدیت کے ثمرات اشرافیہ تک محدود رکھنے کی کوشش کی' پسماندہ ہوگئیں۔ 1870ء تک پورے مغربی یورپ میں یہودیوں کو آزادی حاصل ہوگئی' تاہم مشرقی یورپ اور روس میں' جہاں حکومتوں نے یہودی علیحدگی پسندی کو ختم کرنے کے لیے استبدادی حربے استعمال کیے' لاکھوں یہودی جدید ریاست سے بیگانہ ہوگئے اور سرکشانہ انداز میں ربیائی (Rabbinic) اور ہیسیڈی (Hasidic) روایتوں سے وابستہ ہوگئے۔

یہودی اصلاحی تحریک:

تاہم نپولین کے عطا کردہ حقوق چھن جانے کے بعد کے ابتدائی برسوں میں بہت سے نوجوان یہودیوں نے محسوس کیا کہ وہ بے یارومددگار اور فریب خوردہ ہیں۔ انہوں نے اچھی سیکولر تعلیم حاصل کی تھی اور جدید معاشرے میں حصہ لینے کے لیے تیار تھے مگر اب انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ مینڈلسون نے انہیں گیٹو کے باہر ایک راستہ دکھا دیا تھا' نپولین نے آزادی عطا کی تھی اور وہ روایت پسندانہ طرز حیات کی طرف لوٹنے سے قاصر تھے۔ اسی اضطراب میں بہت سے جرمن یہودیوں نے عیسائیت قبول کرلی تاکہ مرکزی دھارے کے کلچر میں گھل مل سکیں۔ دوسرے اس بات کے قائل تھے کہ اگر یہودیت کو بچانا ہے تو تبدیلیٔ مذہب کے اس دھارے کو روکنے کے لیے سخت اقدام اٹھانا ہوگا۔ جرمنی میں دو تحریکوں نے جنم لیا' دونوں کی جڑیں یہودی روشن خیالی میں تھیں۔ ماسکیلم کو یقین تھا کہ وہ گیٹو اور جدید دنیا کے مابین ایک پل بن سکتے ہیں۔ وہ جرمن اچھی طرح بول سکتے تھے اور غیر یہودی لوگ ان کے دوست تھے اور عوامی سطح پر وہ یورپی طرز حیات سے کاملاً ہم آہنگ دکھائی دیتے تھے۔ اب ان میں سے چند ایک نے یہودیت کو جدید دنیا کے لیے موزوں بنانے کے واسطے اس میں اصلاح کرنے کا فیصلہ کیا۔

* یہودیوں کا قتل عام۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ یہودی اصلاحی تحریک تقریباً مکمل طور پر عملیت پسندانہ تحریک کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی اور اسے مکمل طور پر لوگوس کے اصولوں کی بنیاد پر چلایا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہودیت کی مقدس کو مٹانا تھا۔ اسرائیل جیکبسن (1828ء۔ 1768ء) کو یقین تھا کہ یہودیت جرمنوں کو جتنا کم اجنبی دکھائی دے گی' اتنا ہی آزادی کے مواقع بڑھ جائیں گے۔ وہ ایک عام آدمی اور انسان دوست (Philanthropist) تھا۔ اس نے گارز پہاڑ کے نزدیک سیسن میں ایک سکول قائم کیا' جہاں طلباء کو یہودی مضامین کے ساتھ ساتھ سیکولر مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اس نے ایک سینا گوگ بھی قائم کیا تھا' جہاں ہونے والی عبادت یہودی سے زیادہ پروٹسٹنٹ دکھائی دیتی تھی۔ عبادت عبرانی کی بجائے مقامی زبان میں کی جاتی۔ مخلوط طائفے جرمن زبان میں مناجاتیں گاتے اور جرمن زبان میں وعظ ہوتا' جو کہ عبادت میں پہلے سے زیادہ اہم ہوگیا تھا۔ روایتی رسوم کو بہت کم کر دیا گیا۔ 1815ء میں جیکبسن اور دوسرے عام آدمی اس جدید عبادت کو برلن میں لے آئے' جہاں انہوں نے مروجہ سینا گوگوں سے ممتاز ہونے کے لیے ''نجی معبد'' قائم کیے۔ 1817ء میں ایڈورڈ کلے نے ہمبرگ میں ایک نیا سینا گوگ قائم کیا' جہاں بہت زیادہ انقلابی نوعیت کی اصلاحات کی گئی تھیں۔ مسیح کی آمد اور صہیون (Zion) کی طرف واپسی کے لیے دعا مانگنے کی بجائے تمام انسانیت کی اخوت کے لیے دعائیں مانگی جانے لگیں: یہودی کس طرح فلسطین میں مسیحائی ریاست کی بحالی کے لیے دعا کر سکتے تھے کہ جب وہ جرمن شہری بن جانے کے خواہش مند تھے؟ 1822ء تک پروٹسٹنٹوں کی طرز پر لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے توثیقی عبادت ہونے لگی تھی اور عبادت کے دوران عورتوں اور مردوں کا الگ الگ بیٹھنا ختم کر دیا گیا۔ ہمبرگ کے ربیوں نے اس اصلاحی تحریک کی مذمت کی اور پروشیائی حکومت سے درخواست کر کے برلن والے معبد بند کروا دیئے۔ اسی وجہ سے آنے والے برسوں میں ایسے بہت سے نوجوان یہودی' جنہوں نے اس اصلاح شدہ یہودیت کو موافق پایا تھا' عیسائی ہوگئے۔ تاہم ہمبرگ کا معبد کھلا رہا اور لیپزگ' ویانا اور ڈنمارک میں نئے معبد قائم ہوئے۔ امریکہ میں ڈرامہ نگار آئزک ہربی نے چارلسٹن میں ایک اصلاح شدہ معبد قائم کیا۔ امریکی یہودیوں میں اصلاحی تحریک بہت مقبول ہوگئی اور 1870ء تک امریکہ کے دو سو سینا گوگوں نے تھوڑے بہت اصلاحی اعمال کو اپنا لیا۔

اصلاحی یہودیت مکمل طور پر جدید دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ عقلیت پسندانہ اور عملیت پسندانہ تھی۔ نیز مذہب کو نجی معاملہ قرار دیتی تھی۔ مصلحین ماضی سے ناطہ توڑنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور روایتی عقائد اور وابستگیوں کو چھوڑنے پر راضی ہی نہیں بلکہ اس کے شدید آرزومند تھے۔ جلاوطنی کو ایک وجودی مصیبت سمجھنے کی بجائے مصلحین پردیس میں گھر کا سا سکون محسوس کرتے تھے۔ ان سب نے یہودیت کو ایک ایسے مذہب کی حیثیت سے ترویج دی' جو جدیدیت کے تمام اوصاف سے مالا مال ہو: یہ عقلی' لبرل اور مہذبانہ ہے' اپنی پرانی مخصوصیت کو ترک کر کے ایک آفاقی عقیدہ بننے پر تیار ہے۔ اصلاح پسندوں کے پاس غیر عقلی' صوفیانہ اور سرّی (Mysterious) عقیدے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر پرانی اقدار اور عقائد یہودیوں کو جدید زندگی میں پیداواری حصہ ادا کرنے سے روکتے ہیں تو انہیں لازماً مٹا دیا جانا چاہیے۔ ابتدائی ایام میں ان کی دلچسپیاں سراسر عملی تھیں' تاہم 1840ء کی دہائی تک اصلاحی تحریک کی طرف وہ سکالر اور ربی بھی مائل ہونے لگے جنہوں نے یہودی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کیا ہوا تھا۔ لیوپولڈزنز (1886ء۔1794ء)' زکریا فرینکل (75-1801ء)' نیکمن کروکمل (1840ء۔1785ء) اور ابراہام گائیگر (74-1810ء) نے یہودیت کی مقدس کتابوں کو تحقیق کے جدید طریقوں سے پرکھا۔ انہوں نے ایک مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی' جسے ''یہودیت کی سائنس'' کے نام سے جانا جاتا تھا' اور واضح طور پر کانٹ اور ہیگل کے فلسفوں سے متاثر تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہودیت کوئی جامد عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ عقلی ہوتی جا رہی ہے۔ مذہبی تجربات' جن کا اب تک صرف وژن میں اظہار کیا جاتا تھا' اب انہیں تنقیدی ذہانت کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر متھوس اب لوگوس میں ڈھل چکی تھی۔

ان سکالروں نے مختلف یہودی مؤقفوں میں محتاط توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر کروکمل اور فرینکل روایت پسندوں سے متفق تھے کہ توریت موسیٰؑ پر کوہِ سینائی کے اوپر پوری کی پوری نازل ہوئی تھی' تاہم انہوں نے ہلاقہ (Halakhah) کے الوہی ماخذ کو رد کر کے انہیں مشتعل کر دیا تھا۔ ہلاقہ توریت کی بنیاد یہودی قانون کی تفصیلی تشریح تھی۔ فرینکل نے کہا کہ ہلاقہ مکمل طور پر انسان ساختہ ہے' عقل کی پیداوار ہے اور اسی لیے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کروکمل کا کہنا تھا کہ یہودی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہودیت ہمیشہ دوسرے کلچروں سے تصورات مستعار لیتی رہی ہے اور اسی طرح اس نے اپنے آپ کو باقی رکھا ہے۔ چنانچہ اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ یہودی جدید دنیا کا مطالعہ نہیں کر سکتے اور اس کی بعض اقدار کو اپنا نہیں سکتے۔ حقیقت میں تو یہودیوں کو جدید

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرے کے ثمرات اور چیلنجوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے عیسائیت قبول کرنے سے روکنے کا واحد طریقہ یہی ہے۔ گائیگر کو یقین تھا کہ مینڈلسون نے ایک نئے یہودی عہد کا آغاز کیا تھا' اصلاحی یہودیت عقیدے کو روشن خیال فلسفے کا صحت بخش ٹیکہ لگا کر اسے آزادی عطا کرے گی۔

تاہم ''یہودیت کی سائنس'' بعض اوقات اصلاحی تحریک پر تنقید بھی کرتی تھی۔ مثال کے طور پر کروکمل باعمل یہودی تھا اور ان پرانی رسوم کو مانتا تھا جنہیں اصلاح پسند مٹا رہے تھے۔ فرینکل اور زنز دونوں کو یقین تھا کہ روایت کو یوں کلیتاً رد کرنے میں بے پناہ خطرات مضمر ہیں۔ 1849ء میں زنز نے ایک مضمون لکھا جس میں اس نے یہودی رسوم کو بنیادی صداقتوں کی خارجی علامتیں بتایا۔ کھانے کے قوانین وغیرہ صدیاں گزرنے کے بعد یہودی تجربے کا جوہری حصہ بن چکے ہیں' ان رسوم کے بغیر یہودیت مجرد عقائد کا نظام ہی بن کر رہ جائے گی۔ زنز مسلک کی بہت زیادہ اہمیت کو سراہ سکتا تھا' جو کہ مذہب کی اساطیر اور عقائد کو قابل فہم بنا دیتا ہے۔ فرینکل یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ لوگوں کے درست روحانی رجحانات تخلیق کرنے میں رسوم کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسے خوف تھا کہ اصلاح پسند اتنے عقلی ہو رہے ہیں' کہیں وہ اپنے محسوسات ہی کو نہ گنوا بیٹھیں۔ صرف عقل جذبات کی تسکین نہیں کر سکتی یا وہ مسرت مہیا نہیں کر سکتی ہے' جو روایتی یہودیت ہمیشہ مہیا کرتی آئی ہے۔ یوم کپور (Yom Kippur) کی قدیم' پیچیدہ رسوم کو مٹانا یا صیہون کی طرف مسیحانہ واپسی کے سب بیانات کو رد کرنا غلط ہے کیونکہ ان تصورات نے یہودی شعور کی تشکیل میں مدد دی ہے اور یہ یہودیوں میں ایک احترام پیدا کرنے اور ناقابل برداشت حالات میں امید کا دامن تھامے رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ تھوڑی بہت تبدیلی یقیناً ضروری تھی تاہم ایسا لگتا ہے کہ اصلاح پسند عبادت میں جذبے کے کردار سے واقف نہیں تھے۔ زنز اور فرینکل مذہب کے جوہری اساطیری جزو سے باخبر تھے اور عقل کو صداقت کا راستہ تصور کرنے کے جدید رجحان کو مکمل طور پر قبول نہیں کرتے تھے۔ گائیگر اپنی جگہ ایک کامل عقلیت پسند اور بھرپور اصلاحات کا حامی تھا۔ تاہم وقت گزرنے پر اصلاح پسند یہودیوں نے زنز اور فرینکل کی دانش کو تسلیم کر لیا اور یہ جانتے ہوئے کہ جذباتی' اساطیری عنصر کے بغیر عقیدہ اور عبادت اپنی روح کھو بیٹھتے ہیں' انہوں نے بعض روایتی اعمال کو دوبارہ اپنا لیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فنا کا خوف:

اصلاح پسند اور یہودیت کی سائنس کے علماء اپنے مذہب کی بقا کے حوالے سے متفکر تھے' ایک ایسی دنیا میں' جو کتنی ہی مہربان سہی مگر اسے تباہ کرنے پر مائل نظر آتی تھی۔ جب وہ اپنے ساتھی یہودیوں کو بپتسمہ لینے کے لیے لپکے جاتے ہوئے دیکھتے تو انہیں یہودیت کے مستقبل کی فکر آن گھیرتی اور وہ اس کی بقا کے طریقے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مایوسی سے دوچار ہو جاتے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جدید دنیا میں بہت سے لوگ ایسی ہی اندیشگی (Anxiety) سے دوچار ہیں۔ تینوں توحیدی مذاہب میں وقتاً فوقتاً یہ احساس ابھرتا رہا ہے کہ روایتی عقیدہ سنگین ترین خطرے سے دوچار ہے۔ فنا کا خوف انسان کی انتہائی بنیادی دہشتوں میں سے ایک ہے اور جدید دنیا میں ابھرنے والی مذہبی تحریکوں میں سے بہت سی اسی فنا کے خوف سے ابھری تھیں۔ جب سیکولر روح حاوی ہو جاتی اور عقلیت پسندی عقیدے کی زیادہ دشمن بن جاتی تو مذہبی لوگ مدافعانہ پن اپناتے اور ان کی روحانیت زیادہ جنگجویانہ ہو جاتی۔

ایلٹگلا بیگن:

انیسویں صدی کے آغاز تک' روایتی یہودی .....جنہیں اصلاح پسند ''ایلٹگلا بیگن'' یعنی ''پرانے یہودی'' کہتے تھے .....خود کو محصور کرنے لگے۔ حد تو یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی وہ اسی طرح زندگی بسر کر رہے تھے گویا گیٹو کی دیواریں ہنوز اپنی جگہ موجود ہوں۔ انہوں نے خود کو توریت اور تالمود کے مطالعے میں غرق کر لیا اور اس امر پر زور دیا کہ جدیدیت سے بچنا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ غیر یہودی مطالعات یہودیت سے موزونیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کا ایک نمایاں ترجمان پریسبرگ کا ربی موشے سوفر (1839ء۔1763ء) تھا۔ وہ کسی تبدیلی یا جدیدیت سے کسی بھی قسم کی مطابقت کا مخالف تھا — خدا بہر طور تبدیل نہیں ہوتا؛ اس نے اپنے بچوں کو مینڈلسون کی کتابیں پڑھنے سے روک دیا اور اس نے انہیں سیکولر تعلیم حاصل کرنے اور جدید معاشرے میں کسی بھی طور شامل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مختصر یہ کہ اس کا جبلی ردعمل پسپائی کا تھا۔ تاہم دوسرے روایت پسندوں نے اس امر کو ضروری سمجھا کہ سیکولریت پذیری اور جدیدیت پذیری کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ تخلیقی مؤقف اپنانا چاہیے۔

1803ء میں ولنا کے ایلی جاہ کے ایک شاگرد ربی ہائیم وولوژنر نے ایک فیصلہ کن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدم اٹھایا جس نے روایتی یہودی روحانیت کو تب بالکل تبدیل کر دیا' جب اس نے وولوژن' لیتھوانیا میں ETZ HAYYIM YESHIVA کی بنیاد رکھی۔ مشرقی یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی اس صدی کے گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے Yeshivot قائم کیے گئے: میر' ٹیلز' سلوبوڈکا' لومزا اور نووگروڈوک میں۔ ماضی میں ایک Yeshiva (''بیٹھنا'' کے عبرانی مترادف لفظ سے بنایا گیا تھا یہ لفظ۔) سینا گوگ کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار پر مشتمل ہوتا تھا جہاں طلباء توریت اور تالمود کا مطالعہ کرتے تھے۔ عموی طور پر اس کا انتظام مقامی کمیونٹی کیا کرتی تھی۔ تاہم وولوژن یکسر مختلف تھا۔ یہاں سارے یورپ سے ذہین فطین طلباء بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرین سے علم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ نصاب محنت طلب تھا' اوقات بہت طویل ہوتے تھے اور اس Yeshiva میں داخلہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ربی ہائیم ایلی جاہ سے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق تالمود کے متن کا تجزیہ کرتے ہوئے اور منطقی طریقۂ کار پر زور دیتے ہوئے اس کی تعلیم دیتا تھا' تاہم اس انداز سے کہ جو روحانی ارتفاع پیدا کرتا تھا۔ یہ صرف تالمود کے بارے میں جاننے ہی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ پڑھائی' تیاری اور زوردار بحث مباحثے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی' کیونکہ اسے عبادت کی ایک صورت تصور کیا جاتا تھا' ایک ایسی رسم سمجھا جاتا تھا' جو طلباء کو تقدس کا شعور عطا کرتی تھی۔ وہ ایک بھرپور موجودگی تھی۔ نوجوان ایک خانقاہی ماحول میں سب سے الگ تھلگ ہوا کرتے تھے' Yeshiva ان کی روحانی اور دانش ورانہ حیات کی مکمل طور پر صورت گری کرتا تھا۔ وہ اپنے خاندان اور دوستوں سے دور تھے اور یہودی علمیت کی دنیا میں مکمل طور پر شامل تھے۔ بعض طلباء کو جدید فلسفے یا ریاضی پر کچھ وقت صرف کرنے کی اجازت تو تھی' تاہم ایسے سیکولر مضامین ثانوی ہوتے تھے' انہیں توریت کا وقت چوری کرنے والا تصور کیا جاتا تھا۔

نئے Yeshivot کا مقصد ہیسیڈازم کے خطرے سے نمٹنا تھا۔ Yeshivot واضح طور پر مسنیگڈی (Misnagdic) تھے اور انہیں توریت کے بھرپور مطالعے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ تاہم جوں جوں صدی گزرتی گئی یہودی روشن خیالی ایک خطرے کے طور پر زیادہ سے زیادہ حاوی ہوتی گئی اور ہیسیڈم اور مسنیگڈم ماسکیلم کے خلاف یکجا ہونے لگے' جنہیں وہ ایک طرح کے ٹروجن ہارس (Trojan Horse) تصور کرتے تھے' جو سیکولر کلچر کی برائیوں کو یہودی کمیونٹی میں عام کر رہے تھے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ نئے Yeshivot آرتھوڈوکسی کی فصیل کی برجیاں بننے لگے' جن کی بنیادی ذمہ داری اس تیزی سے بڑھتے ہوئے خطرے کو دور رکھنا تھا۔ ان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیال میں صرف توریت کا مطالعہ سچی یہودیت کو فنا ہونے سے بچا سکتا ہے۔

Yeshiva بیسویں صدی میں فروغ پانے والی الٹرا آرتھوڈوکس (Ultra-Orthodox) بنیاد پرستی کی صورت گری کرنے والے ادارے بن گئے۔ وہ مذہبیت کے اس ہنگامی اور جنگجویانہ روپ کا اولین ظہور تھے اور ہم ان سے اہم سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ بنیاد پرستی — خواہ یہودی ہو' عیسائی ہو یا مسلمان — کسی خارجی دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاذ ہی ابھرتی ہے' (وولوژن کی مثال میں غیر یہودی یورپی کلچر خارجی دشمن تھا)۔ بنیاد پرستی عموماً ایک داخلی جدوجہد کے طور پر شروع ہوتی ہے جس میں روایت پسند اپنے ہم مذہبوں ہی سے لڑتے ہیں' جن کے بارے میں ان کا ایقان ہوتا ہے کہ وہ سیکولر دنیا کو بہت زیادہ رعایات دے رہے ہیں۔ بنیاد پرست فروغ پاتی ہوئی جدیدیت کا جبلی جواب Yeshiva جیسے خالص عقیدے کے قلعے بنا کر دیتے ہیں۔ یہ بے خدا دنیا سے ایک خود انحصار کمیونٹی میں پسپائی کی ایک علامت ہوتی ہے جہاں روایت پسند لوگ تبدیلیوں سے محفوظ رہ کر ہستی کی دوبارہ صورت گری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں جوہری طور پر یہ دفاعی چال ہوتی ہے۔ تاہم اس پسپائی کے اندر مستقبل کے جوابی حملے کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ ایسے کسی Yeshiva کے طلباء اپنی اپنی کمیونٹیوں میں ایک مشترک تربیت اور نظریے کا حامل کیڈر (Cadre) بن جاتے ہیں۔ اس قسم کا قلعہ جدید معاشرے کا متبادل' ایک مشترک کلچر تخلیق کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ Yeshiva کے سربراہ (The Rosh Yeshiva) نے ہیسیڈی زیڈک (Hasidic Zaddik) کی طرح اپنے طلباء پر بھرپور اثر ڈالا۔ اس نے احکامات (Commandments) اور روایت کی مطلق پیروی کا مطالبہ کیا' جو کہ ان کی تخلیقیت اور اوریجنل فکر کی صلاحیت پر قدغن لگاتے تھے۔ اس طرح Yeshiva نے ایک ایسا نظام وضع کیا جو کہ جدید روح اور اس کی خودمختاری اور اختراع کی تلقین کا براہِ راست مخالف تھا۔

تاہم وولوژن اور اس کے ساتھی Yeshivot کا بنیادی مقصد یورپ کے سیکولر کلچر سے جنگ کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد اپنے نوجوانوں کو پرانی دنیا کی روایتوں میں محو کرتے ہوئے ان کی روحوں کو محفوظ رکھنا تھا۔ تاہم اسی میں ایک تضاد مضمر ہے' جو کہ بنیاد پرستی کی تاریخ میں مستقل طور پر نمودار ہوتا رہا۔ قدامت پسندانہ روح سے اپنی وابستگی کے باوجود وولوژن اور دوسرے نئے Yeshivot جوہری طور پر جدید Modern اور جدید بنانے والے Modernizing ادارے تھے۔ وہ مطالعہ تالمود کو مرکزیت پسندانہ اور عقلیت پسندانہ بنانے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے وقف تھے۔ ان کے قیام نے انتخاب کا موقع بھی مہیا کیا۔ گیٹو میں روایت پسندانہ طرزِ حیات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا' اس کی اقدار اور رسومات کو سوال سے ماورا تصور کیا جاتا تھا۔ یہودیوں کے لیے کوئی دوسرا طرزِ حیات ممکن نہیں رہا تھا۔ تاہم اب ایک یہودی کو شعوری فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ وولوژن جیسے کسی ادارے میں داخلہ لے اور اپنے آپ کو روایت کے لیے وقف کر دے۔ ایک ایسی دنیا میں جو مذہب کو نجی معاملہ بنا چکی تھی' وولوژن بذاتِ خود ایک رضا کار ادارہ تھا۔ حتیٰ کہ جب بنیاد پرست لوگ جدیدیت کے خلاف اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں تو ایک اعتبار سے ان کا عقیدہ جدید اور بدعتی ہوتا ہے۔

درمیانی راستے پر چلنے والے یہودی:

دوسرے یہودیوں نے ایک درمیانی راستے پر چلنے کی کوشش کی۔ 1851ء میں فرینکفرٹ کمیونٹی سے' جس پر اب اصلاحی تحریک کا غلبہ تھا' تعلق رکھنے والے گیارہ روایت پسندوں نے میونسپلٹی سے درخواست کی کہ انہیں اپنی مذہبی تنظیم قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ انہوں نے سیموئیل رافیل ہرش (88-1808ء) کو اپنا ربی بننے کی دعوت دی۔ ہرش نے ربی بنتے ہی ایسے ثانوی (سیکنڈری) اور ابتدائی (ایلیمنٹری) سکول قائم کیے' جن میں یہودی اور سیکولر مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان سکولوں کو روتھ شیلڈ (Rothschild) * خاندان کی مالی اعانت سے قائم کیا گیا تھا۔ ہرش نے کہا کہ گیٹو میں رہنے کی وجہ سے ہی یہودیوں نے فلسفے' طب اور ریاضی جیسے علوم کی تدریس کو نظر انداز کیا۔ اس نے کہا کہ ماضی میں یہودی مفکرین نے مرکزی دھارے کے کلچر کی دانش ورانہ حیات میں رہنما کردار ادا کیا تھا' بالخصوص اسلامی دنیا میں۔ گیٹو میں یہودیوں کو فطرت سے دور کر دیا گیا تھا اور مجبوراً انہوں نے فطری سائنسوں کے مطالعے کو نظر انداز کر دیا۔ ہرش کا ایقان تھا کہ یہودیت کو دوسرے کلچروں سے

* انیسویں صدی کا مشہور ترین یہودی بینکار خاندان۔ اس کا بانی فرینکفرٹ' جرمنی کا ایک سنار ایمشل موشے بائر تھا۔ اس نے 1743ء میں سونے کے سکوں کی ایک دکان کھولی' جس کے دروازے پر سرخ رنگ کی پلیٹ پر رومن شاہین کا نشان نصب تھا' اسی وجہ سے دکان کا نام Rothschild پڑ گیا' جو بعد ازاں اس کا خاندانی نام بن گیا۔ ایمشل لوگوں کو قرض دینے کا کاروبار کرتا تھا۔ اس کے بیٹے میئر روتھ شیلڈ نے افراد کی بجائے حکومتوں کو قرض دینے کا آغاز کیا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے' جنہیں اس نے تربیت دے کر یورپ کے بڑے دارالحکومتوں میں ساہوکاری کے لیے بھیج دیا۔ ان کی مالیاتی اجارہ داری کا یہ عالم ہو گیا کہ ایک شاعر نے کہا: ''زر اس زمانے کا خدا ہے اور روتھ شیلڈ اس کا نبی۔'' (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روابط استوار کرنے سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہودیوں کو جتنا ممکن ہو سکے جدید پیشرفتوں کو قبول کر لینا چاہیے' تاہم اصلاح پسندوں کی طرح مروجہ عقائد کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔

ہرش نے نوجوانی میں ایک کتاب Nineteen Letters Of Ben Uzzeie (1836ء) شائع کروائی' جس میں آرتھوڈوکس مذہبی اعمال کی جذباتی وکالت کی گئی تھی تاہم اس نے جدیدیت پر قدغن لگانے والے کٹڑ روایت پسندوں پر الزام لگایا تھا کہ انہی کی وجہ سے عیسائیت اور اصلاح پسندی پھیل رہی ہیں۔ گویا وہ ان کی بنیاد پرستی سے بھی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس کا ایقان تھا کہ یہودیوں کو بغور مطالعے اور تحقیق کے ذریعے مختلف احکامات (Commandments) کے پوشیدہ اور داخلی معنوں کو سمجھنا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی عقلی جواز نہ رکھنے والے قوانین تو محض یاددہانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ختنے کا مقصد یہ ذہن نشین کروانا ہے کہ جسم کو پاک صاف رکھا جائے' حرام گوشت اور دودھ کے کھانے پینے پر پابندی کا مطلب مخلوقات کے الوہی نظام کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کا اظہار ہے۔ تمام قوانین پر لازماً عمل کرنا چاہیے کیونکہ وہ کردارسازی کرتے ہیں اور یہودیوں کو پاک بنا کر انہیں انسانیت کے لیے اپنے اخلاقی مشن کو پورا کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ ہرش کا درمیانی راستہ نئی آرتھوڈوکسی (Neo-Orthodoxy) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی عملی زندگی جدید دنیا میں مذہبی آرتھوڈوکسی کی رضاکارانہ فطرت کو ظاہر کرتی ہے۔ جہاں کبھی روایت کو یقینی حیثیت دے دی گئی تھی' وہاں اب یہودیوں کو آرتھوڈوکس بننے کے لیے لڑنا اور بحث کرنا تھا۔

مصر پر نپولین کا قبضہ:

مصر اور ایران کے مسلمانوں کو جدیدیت پھیلانے والے مغرب کا ایک مکمل طور پر مختلف تجربہ ہوا۔ جب نپولین نے 1798ء میں مصر پر حملہ کیا تو اس نے مشرق اور مغرب کے درمیان تعلقات کے ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ سوئز میں ایک ایسا ٹھکانہ (Base) قائم کیا جائے' جہاں سے وہ انگلستان کے ہندوستان کی طرف جانے والے بحری جہازوں کو دھمکا سکے اور شاید شام سے عثمانی سلطنت پر حملہ بھی کر سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مصر اور فلسطین دنیا پر بالادستی کے لیے انگلستان اور فرانس کے مابین جنگ کا تھیٹر بن گئے تھے۔ حقیقت میں تو یہ یورپی اقتدار کا کھیل (پاور گیم) تھا تاہم نپولین نے خود کو مصریوں کے سامنے ترقی اور روشن خیالی کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کیا۔ 21 رجولائی 1798ء کو ''اہراموں کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ" (Battle Of Pyramids) میں مملوکوں کو شکست دینے کے بعد نپولین نے عربی میں ایک اعلان جاری کروایا' جس میں اس نے عہد کیا تھا کہ وہ مصر کو غیر ملکی حکمرانی سے آزادی دلوائے گا۔ اس نے کہا کہ صدیوں سے سرکیشیا اور جارجیا کے مملوک مصری لوگوں کا استحصال کرتے آئے ہیں لیکن اب یہ جبر واستبداد ختم ہو چکا ہے۔ اس نے علماء کو' جنہیں وہ مقامی مصریوں کے ترجمانوں کی حیثیت سے جانتا تھا' تسلی دی کہ وہ گزشتہ زمانے کا کوئی صلیبی جنگجو (Crusader) نہیں ہے۔ جو شخص بھی یہ سمجھتا ہے کہ وہ ان کے مذہب کو برباد کرنے آیا ہے' اُسے تسلی ہونی چاہیے۔

"کہ میں تو تمہارے حقوق بحال کروانے کے لیے آیا ہوں' جن کو کہ غاصبوں نے غصب کر رکھا تھا—— میں مملوکوں سے زیادہ خدا کی عبادت کرتا ہوں نیز رسول کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ مجید کا احترام کرتا ہوں۔ انہیں بتا دو کہ خدا کے سامنے انسان برابر ہیں—— یہ کہ ان کے درمیان واحد امتیاز ذہانت' نیکی اور سائنس کا ہے۔"

لیکن یہ آزادی اور سائنس ایک جدید فوج کے ساتھ آئے تھے۔ مصریوں نے اس غیر معمولی جنگی مشین (Figating Machin) کو مملوکوں کو شکست فاش دیتے ہوئے دیکھا تھا' صرف دس فرانسیسی فوجی ہلاک اور تیس زخمی ہوئے تھے' جبکہ مملوکوں نے اپنے دو ہزار فوجی' چار سو اونٹ اور پچاس توپیں گنوائی تھیں۔ واضح طور پر یہ آزادی ایک جارحانہ رُخ کی حامل تھی' جیسا کہ جدید سائنسی Institut d'Egypt نے کیا۔ اس علاقے کی تاریخ کے حوالے سے اسی ادارے کی محتاط تحقیق نے نپولین کو اس قابل بنایا تھا کہ وہ عربی میں اعلان جاری کرے نیز اس کو اسلام کے مثالیوں (Ideals) اور اداروں سے خوب آگاہ کروا دیا تھا۔ علم اور سائنس مشرقِ وسطیٰ میں یورپی مفادات کی ترویج اور یہاں کے عوام کو فرانسیسی حکمرانی کے تحت لانے کے ذرائع بن گئے۔

علماء متاثر نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: "یہ سب ہمیں پھنسانے کے لیے دھوکا اور چالبازی ہے۔ بونا پارٹ عیسائی ہے' ایک عیسائی کا بیٹا ہے' اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ کافرانہ حکومت کے امکان سے پریشان تھے۔ قرآن کہتا تھا کہ جب مرد وزن اپنے معاشروں کو خدا کی رضا کے مطابق تشکیل دیں گے' انہیں ناکامی سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ تاہم اب ایک غیر ملکی طاقت نے اسلامی فوجوں کو شکست دے دی تھی۔ الازہر کے ایک استاد الجبرتی نے اس حملے کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''بڑی جنگوں' ہولناک واقعات' مصیبتوں' دہشت انگیز المیوں' برائیوں کی کثرت..... زمانے میں خلل' فطری نظام کے الٹ جانے' انسان ساختہ اصول وضوابط کے غلبے''

کا آغاز تصور کیا۔

شیخ الجبرتی دنیا کی اس اکھاڑ پچھاڑ کے تجربے سے گزر رہا تھا' جس کے ساتھ اکثر وبیشتر جدیدیت پذیری کا آغاز ہوتا ہے۔ اپنی تمام تر مبالغہ آرائی کے باوجود الجبرتی کا خوف سراسر بے محل نہیں تھا۔ نپولین کا حملہ دراصل مشرق وسطیٰ پر مغربی تسلط کا آغاز تھا' جس نے لوگوں کو اپنے بیشتر بنیادی عقیدوں اور توقعات پر نظر ثانی کرنے کی تحریک دی۔

نپولین اور مصری علماء:

نپولین نے علماء کو ہمیشہ سے زیادہ اختیارات دیئے۔ وہ انہیں مملوکوں اور ترکوں کے خلاف اپنے اتحادی بنانے کا خواہاں تھا اور اسی لیے اس نے انہیں حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا' تاہم علماء اس کی خواہش کے مطابق عمل نہیں کر سکتے تھے۔ مصری اتنی طویل مدت سے مملوکوں اور ترکوں کی حکمرانی میں رہ رہے تھے کہ براہِ راست حکمرانی ان کے لیے ایک انوکھا تصور تھی۔ بعض علماء نے تو اس کے پیش کیے گئے عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہی مشاورتی کردار ادا کرنے کو ترجیح دی کہ جس کے وہ عادی تھے۔ انہیں دفاع یا قانون کے نفاذ کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور انہوں نے اسی شے سے جڑے رہنے کو ترجیح دی' جس کا انہیں خوب علم تھا یعنی مذہبی' قانونی اور اسلامی معاملات کو نمٹانا۔ تاہم بیشتر علماء نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کے پاس انتخاب کی گنجائش تھوڑی ہے' اس سے تعاون کیا۔ انہوں نے خلا کے اندر قدم رکھا اور ہمیشہ کی طرح حکومت اور عوام کے مابین ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے نظم ونسق بحال کرنے میں مدد دی۔ کچھ علماء نے اکتوبر 1798ء اور مارچ 1800ء میں فرانسیسیوں کے خلاف ناقص انداز میں بغاوت کرنے کی کوشش کی' تاہم ان بغاوتوں کو جلد ہی دبا دیا گیا۔

وہ فرانسیسیوں سے گھبرائے ہوئے ہی رہے۔ وہ نپولین کے آزادی اور خودمختاری کے روشن خیالی والے تصورات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اب اختلاف کے ایک جہاں نے مصریوں اور یورپیوں کو منقسم کر دیا تھا۔ جس وقت جبرتی نے Institüt d'Edypt کا دورہ کیا تو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نے فرانسیسی سائنس دانوں کے ولولہ و جوش اور علمیت کو سراہا' تاہم اسے ان کے تجربات پر عمل کرنے کے حوالے سے کچھ سمجھ نہیں آئی۔ وہ گرم ہوا کے غبارے سے خاص طور پر محظوظ ہوا۔ اس کی ذہنی کائنات میں اس قسم کی چیزوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی اور وہ اسے کسی یورپی کے سے انداز میں دیکھنے سے قاصر تھا' جس کے پیچھے تجربی سائنس کے دو سو سال تھے۔ بعدازاں اس نے لکھا: ''ان کے پاس انوکھی چیزیں ہیں' جو ایسے اثرات ظاہر کرتی ہیں' جنہیں سمجھنے کے لیے ہمارے ذہن چھوٹے ہیں۔''

مصر میں انتشار کا دور اور علماء:

1801ء میں برطانوی فرانسیسیوں کو مصر سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت برطانوی عثمانی سلطنت کے اتحاد کو محفوظ رکھنے کا عہد کیے ہوئے تھے' اسی لیے انہوں نے مصر پر برطانوی حکمرانی قائم کرنے کی کوئی کوشش کیے بغیر اسے ترکوں کو واپس کر دیا' تاہم یہ حوالگی انتشار انگیز تھی۔ مملوکوں نے استنبول سے بھیجے گئے نئے ترک گورنر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دو برس تک مملوکوں اور عثمانیوں کے بھیجے ہوئے ینی چریوں اور البانوی فوجیوں کے مابین لڑائی ہوتی رہی اور عوام دہشت کا شکار رہے۔ اسی بحران کے دوران محمد علی (1849ء۔1769ء) نامی ایک نوجوان البانوی افسر نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس بحران سے اکتائے ہوئے اور مملوکوں کی نااہلی سے بیزار علماء نے اس کی حمایت کی۔ علماء نے ممتاز عالم عمر مکرم کی قیادت میں ترکوں کے خلاف ایک عوامی ابھار میں رہنما کردار ادا کیا اور اس درخواست کے ساتھ ایک وفد استنبول بھیجا کہ محمد علی ہی کو پاشا یعنی مصر کا گورنر مقرر کر دیا جائے۔ سلطان نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور قاہرہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک فرانسیسی مشاہد نے لکھا کہ لوگوں کے ولولہ و جوش نے اسے انقلاب فرانس کی یاد دلا دی۔ وہ علماء کے لیے سب سے اچھا وقت تھا۔

محمد علی نے یہ یقین دہانی کروا کر ان کی تائید و حمایت پکی کر لی کہ وہ ان سے پیشگی مشورہ کیے بغیر مصر میں کوئی تبدیلی نہیں لائے گا۔ ہر شخص نے یہ سوچا کہ سٹیٹس کو بحال ہو گیا ہے اور گزشتہ کئی برسوں کی شورشوں کے بعد زندگی آخر کار معمول پر آ گئی ہے۔

لیکن محمد علی کے عزائم ہی کچھ اور تھے۔ وہ مصر میں فرانسیسیوں سے لڑ چکا تھا اور اس جدید یورپی فوج سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی فوج بھی انتہائی اہل اور جدید

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو۔ اس نے مصر کو استنبول سے آزاد ایک جدید ریاست بنانے کا بھی عزم کر رکھا تھا۔ محمد علی کو یورپ میں رونما ہونے والے دانش ورانہ انقلاب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کاشتکار طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک غیر تعلیم یافتہ آدمی تھا' جس نے چالیس برس کی عمر میں پڑھنا لکھنا سیکھا تھا اور اسے صرف ایسی کتابوں سے غرض تھی جو اسے حکومت کرنے کے بارے میں اور فوجی سائنس سے آگاہ کروائیں۔ بعد میں آنے والے بہت سے مصلحین کی طرح محمد علی بھی صرف جدید ٹیکنالوجی اور فوجی قوت کے حصول کا خواہاں تھا اور وہ ان تبدیلیوں سے ملکی کلچر اور روحانیت پر پڑنے والے اثرات کو نظر انداز کرنے پر کاملاً آمادہ تھا۔ اس کے باوجود محمد علی ایک غیر معمولی انسان تھا اور اس نے قابل لحاظ کارنامے دکھائے۔ جب 1849ء میں وہ مرا تو عثمانی سلطنت کے ایک دور دراز' پسماندہ صوبے مصر کو تقریباً تن تنہا جدید دنیا میں داخل کروا چکا تھا۔ اس کا عہد حکومت کسی غیر مغربی معاشرے میں مغربی جدیدیت کو لانے میں حائل دشواریوں سے آگاہ کرواتا ہے۔

محمد علی کا مصر:

اول' ہمیں یہ بات لازماً ذہن میں رکھنی ہوگی کہ یورپ میں جدیدیت بتدریج آئی تھی۔ یورپ اور امریکہ کے لوگوں کو وہ ٹیکنالوجی اور مہارت حاصل کرنے میں تین سو سال کا عرصہ لگا تھا' جس نے انہیں دنیا پر غلبہ دلا دیا۔ تاہم اس سب کے باوجود وہ بے انتہا پریشانیاں پیدا کرنے والا عمل تھا' جس میں روحانی اضطراب پیدا ہونے کے علاوہ بہت زیادہ کشت و خون بھی ہوا تھا۔ اب محمد علی صرف چالیس برس میں اس انتہائی پیچیدہ عمل کو دہرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جانا کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے مصری عوام کے خلاف جنگ قرار دیا جانے والا اقدام اٹھانا ہوگا۔ مصر دہشت زدگی کی کیفیت میں تھا۔ لوٹ مار اور تباہی و بربادی نے مصریوں کو نڈھال کر رکھا تھا۔ فلاحین نے اپنی زمینوں کو اجاڑ دیا تھا اور شام کو فرار ہو گئے تھے۔ ٹیکس بہت زیادہ اور ظالمانہ تھے۔ مملوکوں کی واپسی کا خطرہ الگ تھا۔ ایسے مضمحل ملک کو ایک جدید انتظامیہ اور فوج والی طاقتور اور مرکزیت پسند ریاست بنانا کس طرح ممکن تھا؟ مغرب تو بہت زیادہ آگے نکل چکا تھا۔ مصر اس تک پہنچنے کی امید کس طرح کر سکتا تھا؟ وہ کس طرح مغرب کو اُسی کے کھیل میں ہرا سکتا تھا اور آئندہ مغربی یورشوں اور تجاوزات سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد علی نے مملوک رہنماؤں کا صفایا کر کے اپنی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اگست 1805ء میں اس نے ان کے بڑے افسروں کو قاہرہ میں بلوایا اور تین افسروں کے سوا باقی سب کو قتل کروا دیا۔ باقی ماندہ بیوں (Beys) کو اس کے بیٹے ابراہیم نے اگلے دو برسوں میں ٹھکانے لگوا دیا جبکہ خود محمد علی اس دوران برطانویوں سے نبرد آزما رہا' جو کہ اس حیران کن قیادت سے چوکنا تھے۔ آخر کار اس نے عثمانی سلطان کا دباؤ قبول کر لیا اور عرب کے وہابیوں کے خلاف ایک مہم شروع کی' جو کہ عثمانی حکمرانی کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔ اس نے فوج کی قیادت اپنے بیٹے تسان کو سونپی۔ قاہرہ میں ایک عظیم الشان تقریب میں اس نے اپنے منصب کو باضابطہ طور پر حاصل کیا۔ جب جلوس شہر کی گلیوں سے گزرا تو محمد علی کے فوجیوں نے آخری مملوک سرداروں کو قتل کر دیا' ان کے گھر لوٹ لیے اور عورتوں کی آبروریزی کی۔ اس دن ایک ہزار مملوکوں کو قتل کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی مصر میں مملوک نسل کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک بار پھر جدیدیت پذیری نسل کشی (Ethnic Cleansing) کے ایک عمل سے شروع ہوئی۔

ایسا لگتا ہے کہ کسی قوم کو جدید دنیا میں لے جانے کے لیے اس کے رہنما کو خون کے سمندر سے گزرنا پڑتا ہے۔ مستحکم جمہوری اداروں کی غیر موجودگی میں مضبوط حکومت حاصل کرنے کے لیے تشدد ہی واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ محمد علی معیشت کے حوالے سے بھی اتنا ہی بے رحم تھا۔ وہ اتنا عقل مند تو تھا کہ اس حقیقت کا ادراک کر سکے کہ یورپی طاقت کی حقیقی بنیاد پیداوار کے سائنسی طریقے ہیں۔ 1805ء سے لے کر 1814ء کے دوران اس نے منظم انداز میں ملک کی تمام تر زمین کو اپنی ملکیت میں لے لیا۔ وہ مملوکوں کی جائیدادوں پر پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا' اس کے بعد اس نے ٹھیکے پر کاشتکاری کرنے والوں کی املاک پر قبضہ کیا' جو کہ مدتوں سے ایک بدعنوان نظام چلا رہے تھے۔ آخر میں اس نے اوقاف کی تمام زمینیں اور جائیدادیں اپنے قبضے میں لے لیں۔ ایسے ہی ظالمانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے اس نے ملک کے ہر تجارتی اور صنعتی ادارے کو ہتھیا لیا۔ صرف ایک عشرے کے اندر اندر اس نے اپنے آپ کو مصر کا واحد زمیندار' تاجر اور صنعت کار بنا لیا۔ مصریوں نے اس سب کچھ کو اس لیے برداشت کر لیا تھا کہ انہیں بہت زیادہ معاوضے ادا کیے جاتے تھے۔ برسوں کے انتشار اور بدنظمی کے بعد ملک میں قانون کا نفاذ عمل میں آ گیا تھا' انصاف ہر کسی کو مہیا کیا جاتا تھا اور لوگ اپنی شکایات براہ راست محمد علی تک پہنچا سکتے تھے۔ واضح طور پر وہ اپنی ہی جیبیں نہیں بھر رہا تھا بلکہ مصر کو ترقی دے رہا تھا۔ اس کا عظیم ترین کارنامہ کپاس کی کاشت تھا' جس کو برآمد کر کے اس نے ملکی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محاصل میں اضافہ کیا اور حاصل شدہ زرمبادلہ کے ذریعے اس نے یورپ سے مشینیں' ہتھیار اور تیار شدہ اشیاء خریدنا شروع کر دیں۔

تاہم اس امر سے ہی مغرب پر اس کے انحصار کی عکاسی ہوتی ہے۔ یورپ میں تو جدیدیت پذیری کے عمل کو خودمختاری کی ضرورت سے بڑھاوا ملا تھا اور اس کے دوران مختلف شعبوں میں اعلانِ آزادی ہوئے ـــ دانش ورانہ' معاشی' مذہبی اور سیاسی۔ تاہم محمد علی صرف اور صرف آمرانہ حکمرانی کے ذریعے ہی مصر کا مالک و مختار بنا اور خود کو یورپ سے آزاد کر سکتا تھا۔ جب تک وہ ایک مضبوط صنعتی بنیاد نہ رکھتا اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے ایک چینی کا کارخانہ' ایک اسلحہ سازی کا کارخانہ' تانبے کی کانیں' کپاس کے کارخانے' لوہے کے کارخانے' رنگسازی کے کارخانے' شیشہ سازی کی فیکٹریاں اور چھاپے خانے قائم کروائے۔ تاہم انڈسٹریلائزیشن فوری طور پر نہیں ہو جایا کرتی۔ یورپیوں نے جانا تھا کہ مختلف شعبوں میں کام انجام دینے کے لیے عام لوگوں کو مختلف ہنر سکھانے لازمی ہیں۔ تاہم اس کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ محمد علی کے کارخانے میں کام کرنے والے فلاحین کوئی تیکنیکی مہارت نہیں رکھتے تھے' تجربے کے حامل نہیں تھے اور اپنے شعبوں سے باہر زندگی کو اپنانے سے قاصر تھے۔ ملک کی پیداواریت میں حصہ لینے کی خاطر ان کے لیے تعلیم حاصل کرنا ضروری تھا جبکہ اس کے لیے ایک ہمہ گیر سماجی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ محمد علی کے بیشتر صنعتی ادارے ناکام ہو گئے۔

جدیدیت پذیری کا عمل دراصل بہت مشکل تھا' مسائل تقریباً لاینحل تھے۔ یورپ میں تو ایجاد و اختراع (Innovation) کا عمل کلیدی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن مصر کے بیشتر لوگوں پر اب بھی قدامت پسندانہ روح کا غلبہ تھا۔ مصر کو ایک جدید ریاست بنانے کے لیے محمد علی کے بس میں واحد طریقہ (یورپ کی طرح) اختراع نہیں بلکہ مغرب کی نقالی تھی۔ وہ انتظامی' تیکنیکی اور تعلیمی نقالی (اسلامی اصطلاح میں ''تقلید'') کے ایک پروگرام پر کاربند تھا' جو کہ جدید روح کے الٹ تھا۔ مغرب کی اعلیٰ ترین اقدار آزادی اور تخلیقیت کے بغیر مصر جیسی کوئی ریاست اپنے آپ کو کس طرح ''جدید'' کہلوا سکتی تھی؟

لیکن محمد علی کے پاس راستہ بھی تو کوئی اور نہیں تھا۔ اس نے یورپیوں' ترکوں اور لیونٹین افسروں پر' مشتمل مغربی طرز کی انتظامیہ متعارف کروائی تھی' جنہوں نے مصری معاشرے میں ایک نئے طبقے کو تشکیل کیا۔ ذہین نوجوانوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے فرانس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور انگلستان بھیجا گیا۔ کیسر لین میں 1200 طلباء کے لیے ایک فوجی کالج قائم کیا گیا' جہاں تعلیم پانے والوں کو پاشا کی طرف سے لباس اور دیگر اشیاء فراہم کی جاتی تھیں۔ تورہ اور گیزہ میں دو مزید آرٹلری سکول قائم کیے گئے' جہاں سارا عملہ یا تو یورپیوں پر مشتمل تھا یا غیر ممالک سے تعلیم یافتہ مصریوں پر۔ لڑکے کالج میں داخل ہوتے ہی پاشا کی ذاتی ملکیت بن جاتے تھے اور یورپی زبانوں' ریاضی اور مغربی فنونِ جنگ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کالجوں نے ملک کو اعلیٰ تعلیم یافتہ افسر طبقہ مہیا کیا۔ تاہم فلاحین کو بنیادی تعلیم بھی میسر نہیں تھی: وہ مصر کو اس کی زرعی بنیاد مہیا کرتے ہوئے کھیتوں میں زیادہ کارآمد تھے۔ اس کے نتائج بھی تباہ کن نکلے۔ مصر جیسے کسی جدید ہوتے ہوئے ملک میں یورپی تہذیب کے ساتھ سب سے زیادہ مربوط لوگ فوج میں ہوتے تھے۔ آبادی کی اکثریت اس عمل سے باہر ہوتی تھی۔ نتیجتاً آرمی افسر ہی اکثر و بیشتر فطری طور پر رہنما اور حکمران بن جاتے تھے' اور جدیدیت کو ایک فوجی روپ مل جاتا تھا' جو کہ مغربی جدیدیت سے مختلف تھا۔

محمد علی کو سب سے زیادہ فکر فوج کی تھی۔ اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس کی ضرورت تھی کیونکہ ساری زندگی اس نے ایک طرف برطانویوں اور دوسری طرف عثمانیوں کو اپنے خلاف کیے رکھا۔ ترکوں نے محمد علی کا ایک نیم خودمختار ریاست کو تخلیق کرنے کا اقدام صرف اس لیے گوارا کیا تھا کہ بوقتِ ضرورت وہ اس کی اعلیٰ ترین جنگی مشین کو بلا سکتے تھے مثلاً عرب میں وہابیوں کے خلاف اور یونانیوں کی بغاوت کچلنے کے لیے (28-1825ء)۔ تاہم 1832ء میں اس کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ترک فوج کو عبرتناک شکستوں سے دوچار کرتے ہوئے عثمانی صوبوں شام اور فلسطین پر قبضہ کرلیا اور اپنے باپ کے لیے سلطنت کے اندر ایک متاثر کن سلطنت قائم کی۔ مصری فوج فرانسیسی نمونے کے تحت تشکیل دی گئی تھی۔ محمد علی نے اپنی فوج میں اس نظم وضبط اور اہلیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی' جس کا مشاہدہ وہ نپولین کی فوج میں کر چکا تھا اور بلاشبہ اس نے ایک ایسی فوج تیار کرلی تھی جو کسی عددی اعتبار سے برتر فوج کو بآسانی شکست دینے کی اہلیت رکھتی تھی۔ تاہم اس کارنامے کو انجام دینے کے لیے اس نے اپنی رعایا کے خلاف ایک اور سفاکانہ اقدام کیا۔ پہلے تو اس نے سوڈان سے بیس ہزار رنگروٹوں کو جبراً بھرتی کر کے تربیت دلوائی۔ ان کو اسوان میں قائم وسیع بیرکوں میں رکھا گیا تھا۔ تاہم سوڈانی اس ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کر سکے۔ بہت سے سوڈانی محمد علی کے ابو زابل میں قائم کردہ میڈیکل کالج کے فارغ التحصیل ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود موت کے منہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں چلے گئے۔ تب پاشا نے فلاحین کو جبری بھرتی کیا۔ انہیں گھروں اور کھیتوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر لایا گیا۔ ان کے پاس اپنے خاندانوں کے لیے کوئی معقول بندوبست کرنے کی بھی مہلت نہیں ہوتی تھی' اس طرح ان کے خاندان اجڑ گئے' عورتیں مجبوراً طوائف بن گئیں۔ ایک یکسر اجنبی فوج میں جبراً دھکیل دیئے جانے کا امکان ایسا تھا کہ جس نے بہت سے فلاحین کی زندگیوں میں ایسی دہشت بھر دی کہ انہوں نے بھرتی سے بچنے کے لیے اپنی انگلیاں کٹوا دیں' دانت نکلوا دیئے اور حد تو یہ ہے کہ خود کو اندھا کر لیا۔ ایک زبردست فوج تیار تو ہوگئی لیکن انسانی قیمت پر۔ جبری بھرتی سے نہ صرف فلاحین متاثر ہوئے بلکہ جب مردوں کو ان کی زمینوں سے دور کر دیا گیا تو زراعت برباد ہوگئی۔

ہر مثبت اصلاح کا ایک منفی پہلو بھی تھا۔ محمد علی کی معاشی پالیسیوں سے یورپی تاجروں کو مصر میں آنے کا حوصلہ تو ملا لیکن مقامی صنعت کی قیمت پر۔ پاشا نے مصر کا واحد اجارہ دار بن کر مقامی تاجر طبقے کو واقعتاً برباد کر دیا تھا۔ اس نے بہت ضروری نظام آبپاشی اور ذرائع آب رسانی پر بہت رقم لگا دی تاہم Corvee میں کام کرنے والوں کی صورتحال اتنی دگرگوں تھی کہ بیان کیا جاتا ہے 23000 آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ پرانے معاشرتی نظاموں کو بے رحمی کے ساتھ برباد کر دیا گیا تاہم مصریوں کی اکثریت کا ماقبل جدید قدامت پسندانہ طرز حیات اور عقائد جوں کے توں ہی رہے۔ جدید مصر میں یکسر مختلف اصولوں کے تحت چلنے والے دو معاشرے ابھر رہے تھے — ایک صرف فوجی اور انتظامی افسروں پر مشتمل جدید معاشرہ تھا جبکہ دوسرا معاشرہ جدید نہیں تھا۔

مصری علماء اور جدیدیت:

علماء نے جدیدیت کے ظہور کو تباہ کن سمجھا۔ جب محمد علی گورنر بنا تھا تو انہیں ملک میں اختیار و اقتدار حاصل تھا۔ اس نے انہیں ساتھ ملا لیا' ان سے وعدے وعید کیے اور تین سال کا عرصہ پاشا اور مذہبی پیشواؤں کا ہنی مون کا زمانہ تھا۔ تاہم 1809ء میں علماء اپنی ٹیکس سے استثنائی حالت گنوا بیٹھے' اور عمر مکرم نے ان پر زور دیا کہ وہ محمد علی کی مخالفت کریں اور اسے نئے ٹیکس واپس لینے پر مجبور کریں۔ لیکن علماء نے شاذ ہی اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا اور پاشا ان کی اچھی خاصی تعداد کو ورغلانے کی قدرت رکھتا تھا۔ مکرم کو جلاوطن کر دیا گیا اور اس کے ساتھ علماء کے لیے محمد علی کی مخالفت کا آخری موقع بھی ضائع ہوگیا۔ اس کی جلاوطنی علماء کے لیے بطور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبقہ بھی ایک شکست تھی۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے محمد علی مذہبی سکالروں کو زبانی کلامی خوش رکھتا تھا لیکن اس نے بڑی تدبیر کے ساتھ انہیں محدود کر دیا اور انہیں تمام تر اختیارات سے محروم کر دیا۔ اس نے ان شیخوں کو عہدوں سے ہٹا دیا جنہوں نے اس کی مخالفت کی اور جبرتی کہتا ہے کہ نتیجتاً بیشتر علماء نے نئی پالیسیوں کو چپ چاپ مان لیا۔ اس نے انہیں مالیاتی اعتبار سے بھی محدود کر دیا۔ اوقاف کی جائیدادوں سے حاصل ہونے والے محاصل کو خود وصول کر کے اس نے علماء کی آمدنی کا اہم وسیلہ ان سے چھین لیا۔ 1815ء تک روایتی مدارس کھنڈرات بن گئے تھے۔ ساٹھ سال بعد اسلامی ایسٹیبلشمنٹ شدید ترین مالی محرومی کا شکار تھی۔ اساتذہ کو کسی قسم کا وظیفہ نہیں ملتا تھا اور اماموں' مؤذنوں' حافظوں' قاریوں اور مسجدوں کے محافظوں کو مزید مالی امداد دینا بند کر دیا گیا۔ مملوکوں کی عظیم عمارات تباہ و برباد ہو گئیں اور حد تو یہ ہے کہ جامعہ الازہر بھی انتہائی خراب حال میں تھی۔

اس دشوار صورتحال میں مصری علماء مرعوبیت اور ردعمل کا شکار ہو گئے۔ حکومت میں ان کے روایتی مشاورتی کردار کو غیر ملکی منتظمین نے چھین لیا تھا' جن کی اکثریت مقامی روایات کا بہت کم احترام کرتی تھی۔ علماء ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور پاشا نے انہیں ان کی کتابوں اور مسودات کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔ چونکہ اختلاف کرنا علماء کے لیے ناممکن تھا' اس لیے انہوں نے تبدیلی سے منہ موڑ لیا اور اپنی علمی روایتوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ مصر میں علماء کا یہی بنیادی رویہ رہا۔ انہوں نے جدیدیت کو ایک دانش ورانہ چیلنج تصور نہیں کیا بلکہ اس کی بجائے انہوں نے اسے اپنے اختیارات اور دولت چھین لینے والے اور اپنے عزت و احترام اور اثر و رسوخ کے اذیت دہ زیاں سے دوچار کرانے والے گھناؤنے اور تباہ کن ضوابط کا ایک سلسلہ سمجھا۔ چنانچہ جب مصری مسلمانوں کو نئے مغربی تصورات کا سامنا ہوا تو انہیں مذہبی پیشواؤں سے کوئی رہنمائی حاصل نہ ہوئی اور وہ مدد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

مصر میں علماء اور حکمران اشرافیہ کے درمیان صدیوں سے شراکت چلی آ رہی تھی۔ محمد علی نے اس تعلق کو ختم کر دیا اور ایک نئے سیکولرازم کو متعارف کروایا۔ اس کا کوئی نظریاتی پس منظر نہیں تھا بلکہ اسے ایک اٹل سیاسی حقیقت کے طور پر لاگو کر دیا گیا تھا۔ مغرب میں تو لوگوں نے چرچ اور ریاست میں بتدریج علیحدگی سے موافقت پیدا کر لی تھی اور انہوں نے تو ایک دنیادارانہ روحانیت بھی تخلیق کر لی تھی تاہم بیشتر مصریوں کے لیے سیکولرائزیشن بیگانہ اور پریشان کن ہی رہی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عثمانی سلطنت میں جدید اصلاحات:

اُدھر عثمانی سلطنت میں جدید اصلاحات عمل میں لائی جارہی تھیں تاہم استنبول میں عظیم مغربی قلب ماہیئت کے پسِ پشت کارفرما تصورات کی آگاہی بہت زیادہ تھی۔ عثمانی یورپ میں سفارت کار بن کر گئے تھے اور سلطان کے دربار میں موجود یورپی مدبروں سے گھل مل چکے تھے۔ 1820ء اور 1830ء کی دہائیوں کے دوران جدید دنیا سے خوب آگاہ اور سلطنت کی اصلاح کے جذبے سے سرشار ایک نسل پروان چڑھ چکی تھی۔ وزیراعظم کے منصب پر فائز ہونے والے احمد وفیق پاشا کا باپ پیرس میں ترک سفارتخانے میں کام کر چکا تھا' خود احمد گبن' ہیوم' ایڈم سمتھ' شیکسپیئر اور ڈکنز کا مطالعہ کر چکا تھا۔ مصطفیٰ رشید پاشا نے بھی پیرس میں تربیت حاصل کی تھی اور وہاں اس نے ادب اور سیاست کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس بات کا قائل ہوگیا تھا کہ عثمانی سلطنت کی بقا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ ایک مرکزیت پسند ریاست نہیں بنتی' جدید فوج تیار اور ایک نیا قانونی اور انتظامی نظام قائم نہیں کرتی' جس میں کہ تمام شہریوں کو مساوی تسلیم کیا گیا ہو۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو مزید ذمی نہیں رہنا چاہیے بلکہ انہیں بھی مسلمان شہریوں کے مساوی حیثیت لازماً دی جانا چاہیے۔ انہی یورپی تصورات کے عام ہو جانے کی وجہ سے سلطان محمد دوم کے لیے 1826ء میں ''تنظیمات'' کو متعارف کروانا آسان ہوگیا۔ ''تنظیمات'' کے تحت ینی چریوں کو ختم کر دیا گیا' فوج کو جدید بنانے کے عمل کا آغاز ہوا اور تیکنیکی اختراعات کو متعارف کروایا گیا۔ اول اول تو سلطان نے سوچا کہ سلطنت کے بڑھتے ہوئے زوال کو روکنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے تاہم یورپی طاقت میں زبردست اضافے اور اسلامی علاقوں میں ان کے معاشی اور سیاسی دخول کی وجہ سے بتدریج یہ امر واضح ہوگیا کہ زیادہ بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہو چکی ہیں۔

1839ء میں سلطان عبدالحمید نے رشید پاشا کی تحریک پر ''گولہان فرمان'' جاری کیا' جس نے اسلامی قانون کو تو نہیں چھیڑا' تاہم سلطان کی مطلق یک شخصی حکومت کو اپنی رعایا کے ساتھ ایک تعہدی تعلق (Contractual Relationship) کا پابند بنا دیا۔ اس کے تحت سلطنت کے اداروں کو زیادہ منظم اور فعال بنانے کی لازمی ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے بنیادی تبدیلی کی پیش بینی کی گئی تھی۔ اگلے تین عشروں میں مرکزی اور مقامی حکومتوں کو قائم کیا گیا نیز فوجداری اور تجارتی ضوابط اور عدالتوں کو تشکیل دیا گیا۔ 1856ء میں حطی ہمایوں فرمان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے مذہبی اقلیتوں کو مکمل شہریت عطا کر دی گئی۔ تاہم اس کے ناگزیر نتیجے کے طور پر علماء سے تنازعہ پیدا ہو گیا' جو اِن نئے اقدامات کو شریعت کی خلاف ورزی تصور کرتے تھے۔ اسی وجہ سے جو لوگ اصلاح کا عزم کیے ہوئے تھے انہیں اس سوال کا زیادہ سامنا ہونے لگا کہ مسلمان اپنے اسلامی ورثے کو ترک کیے بغیر کس طرح جدید دنیا کا حصہ بن سکتے ہیں' جس طرح عیسائیت ماڈرنائزیشن اور روشن خیال فکر کے اثرات کے تحت تبدیل ہوئی تھی اور تبدیل ہو رہی تھی' بالکل اسی طرح آنے والے برسوں میں اسلام کو بھی تبدیل ہونا تھا۔

یہ سوال فوری جواب کا متقاضی تھا کیونکہ ہر گزرتے برس کے ساتھ مغرب کے مقابلے میں اسلامی دنیا کی کمزوری دردناک انداز میں نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ محمد علی سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے قابل تھا لیکن 1840ء میں یورپی طاقتوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ نئے قبضہ شدہ شام' عرب اور یونان اسے واپس کر دے۔ یہ ایک تلخ سبق تھا' جس کے اثرات سے وہ کبھی پوری طرح سنبھل نہیں سکا۔ اس کا پوتا عباس (54-1813ء)' جو اس کے بعد 1849ء میں مصر کا پاشا بنا تھا' یورپ سے اور مغرب کی ہر شے سے نفرت کرتا تھا۔ وہ ایک فوجی تھا اور عثمانی مصلحین کے برعکس لبرل تعلیم سے محروم تھا۔ مغرب کا مفہوم اس کے نزدیک استحصال اور تحقیر و تذلیل تھا۔ اس کو مصر میں یورپی منتظمین اور کاروباریوں کے مراعات حاصل کر لینے سے سخت نفرت تھی اور اسے یورپیوں پر شدید غصہ تھا کہ انہوں نے اس کے دادا پر دباؤ ڈال کر اپنے مالی فائدے کے لیے ناممکن منصوبے بھی منظور کروا لیے تھے۔ اس نے محمد علی کے عملے کو برطرف کر دیا' فوج میں تخفیف کی اور نئے سکول بند کر دیئے۔ تاہم عباس مصریوں میں بھی نامقبول تھا اور اس کو 1854ء میں قتل کر دیا گیا۔ محمد سعید پاشا (63-1822ء) اس کا جانشین بنا' جو کہ محمد علی کا چوتھا بیٹا تھا اور عباس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ فرانسیسی سانچے میں ڈھلا ہوا شخص تھا۔ اس نے مغربی طرز حیات کو اپنایا۔ وہ غیر ملکیوں کی صحبت سے لطف اندوز ہوا اور فوج کو بحال کر دیا۔ لیکن اپنے عہد حکومت کے اختتام پر سعید پاشا بھی بعض یورپی کمپنیوں اور کاروباری افراد کی عیارانہ کارروائیوں اور گھناؤنے منصوبوں کی وجہ سے تنفر کا شکار ہو گیا تھا۔

نہر سوئز کی تعمیر:

ان یورپی منصوبوں میں سب سے زیادہ تحیر انگیز نہر سوئز کی تعمیر تھی۔ محمد علی نے بحیرۂ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احمر (Red Sea) اور بحیرۂ روم (Mediterranian) کو ملانے کے منصوبے کی ہمیشہ مخالفت کرتا رہا تھا کیونکہ اسے خوف تھا کہ اگر ایسا ہوگیا تو اس کی وجہ سے یورپی طاقتوں کی توجہ مصر کی طرف زیادہ ہوجائے گی اور مغربی یورشوں اور تسلط کے ایک نئے مرحلے کا پیش خیمہ بنے گا۔ تاہم سعید پاشا اس تصور سے مسحور تھا۔ اسے اس کے ایک پرانے دوست فرانسیسی مشیر فرڈیننڈ ڈی لیسپز (1805-94ء) نے قائل کرلیا تھا کہ یہ نہر مصر کو برطانیہ کے برابر کھڑا کر دے گی جبکہ مصر کو اس پر خرچ بھی کچھ نہیں کرنا ہوگا' کیونکہ اسے فرانسیسی سرمائے سے تعمیر کیا جائے گا۔ سعید سادہ آدمی تھا' اس نے 30 نومبر 1854ء کو جس رعایت پر دستخط کیے' وہ مصر کے لیے تباہ کن تھی۔ سلطان اور انگلستان کے لارڈ پامرسٹن نے اس منصوبے کی مخالفت کی لیکن لیسپز آگے بڑھتا رہا' اس نے اپنی کمپنی قائم کرلی اور امریکہ' برطانیہ' روس' آسٹریا اور عثمانی سلطنت کو حصص خریدنے کی پیشکش کی۔ جب انہوں نے حصص نہیں خریدے تو پاشا نے ذاتی طور پر اس منصوبے میں سب سے زیادہ سرمایہ کاری کی۔ کام اپریل 1859ء میں شروع ہوگیا۔

مصر نے تقریباً تمام سرمایہ' محنت اور میٹریل فراہم کیا' دوسو مربع میل مصری علاقے کی مفت فراہمی اس کے علاوہ تھی۔ 1863ء میں سعید مر گیا اور اس کا بھتیجا اسمٰعیل (1830-95ء) اس کا جانشین ہوا' جو خود بھی نہر کا حامی تھا بلکہ اس نے مصر کے لیے بہتر فوائد کی امید میں رعایت فرانس کے بادشاہ نپولین سوم کے حوالے کردی۔ 1864ء میں کمپنی کا مفت مصری محنت حاصل کرنے کا حق ختم کردیا گیا اور کچھ زمین واپس لے لی گئی تاہم کمپنی کو اس کی تلافی کے طور پر مصری حکومت کی طرف سے آٹھ کروڑ چالیس لاکھ فرانک (تیس لاکھ سے زیادہ پونڈ) ادا کیے جانے تھے۔ اسمٰعیل کے پاس اسے قبول کرنے کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا' اور نہر پر کام دوبارہ شروع ہوگیا۔ اس کے افتتاح کی تقریب عظیم الشان تھی۔ مہمانوں کو مصر آنے کے اخراجات اور رہائش فراہم کی گئی اور قاہرہ کے نئے اوپیرا ہاؤس میں ورڈی کا اوپیرا ایڈا بلوایا گیا۔ مہمانوں کو اہراموں تک لے جانے کے لیے ایک خصوصی سڑک تعمیر کی گئی۔ اس اسراف کا مقصد بین الاقوامی برادری کو مصر کی خوشحالی کا یقین دلانا اور زیادہ سرمایہ کاری کا حصول تھا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ مصر کا دیوالیہ نکلنے ہی والا تھا۔

نہر نے یقیناً مصر کی کمزور معیشت کو سہارا دیا لیکن وہ تنہا سارا بار نہیں اٹھا سکتی تھی۔ اسمٰعیل کا دورِ حکومت ایک بار پھر ظاہر کرتا ہے کہ کسی غیر مغربی ملک میں جدیدیت کی قیمت کتنی بھاری ہوتی ہے۔ اسمٰعیل آزادی کا خواہاں تھا۔ اس کا مقصد مصر کو عثمانی تسلط سے آزاد کروانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ وہ خودمختاری کے جدید تصور کا حامل تھا تاہم وہ اس کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکا کہ ایک یورپی طاقت کا دست نگر بن گیا اور بالآخر اسی نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ محمد علی ایک فوجی تھا اور اس نے لڑ کر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جبکہ اسمٰعیل نے آزادی کو خریدنے کی کوشش کی۔ 8 جون 1867ء کو اس نے اپنے لیے سلطان سے ''خدیو'' کا خطاب خریدا تاکہ دیگر عثمانی پاشاؤں سے ممتاز ہو سکے۔ اس خطاب کے لیے اس نے استنبول کو سالانہ محاصل میں تین لاکھ پچاس ہزار پونڈ اضافی دینا قبول کیا۔ اسے نہر کے اخراجات بھی برداشت کرنا تھے' کپاس کی قیمتوں میں اچانک ہونے والی کمی سے نمٹنا تھا' جو کہ امریکی خانہ جنگی کا نتیجہ تھی' اور اس کے علاوہ اسے جدیدیت پذیری کے منصوبوں کے لیے سرمایہ فراہم کرنا تھا۔ ان منصوبوں میں شامل تھے: 900 میل لمبی ریلوے لائن کی تنصیب' 430 پلوں اور 112 نہروں کی تعمیر' جو کہ اب تک غیر مزروعہ 1,373,000 ایکڑ زمین کو سیراب کرتیں۔ خدیو کی حکمرانی میں مصر نے کسی بھی سابقہ حکمران سے زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کی۔ اس کے پاس دونوں اصناف کے لیے تعلیم' سائنسی تحقیق اور جغرافیائی تجربوں کے منصوبے بھی تھے۔ قاہرہ متاثر کن نئی عمارتوں' وسیع سایہ دار سڑکوں اور تفریحی باغات والا ایک جدید شہر بن گیا۔ بدقسمتی سے اسمٰعیل کے پاس ان پر صرف کرنے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔ سرمائے کے حصول کے لیے اس نے آسان قرضوں کا ایک نظام شروع کیا جس کی وجہ سے قابل لحاظ سرمایہ یورپی دلالوں (Brokers) بینکاروں اور کاروباری لوگوں کی جیبوں میں چلا گیا' جو اسے مزید اخراجات کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ خدیو ساہوکاروں کا شکار بن گیا اور جب مصری سکیورٹیز (Securities) کے ساتھ عثمانی سکیورٹیز اکتوبر 1875ء میں لندن سٹاک ایکسچینج میں خسارے کا شکار ہوئیں تو یہ نقصان اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا۔

نہر سوئز نے مصر کو ایک بالکل نئی سٹریٹیجک اہمیت عطا کی تھی اور یورپی طاقتیں اس کی مکمل تباہی کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ برطانیہ اور فرانس نے اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے خدیو پر مالیاتی گرفت قائم کر لی' ایسی مالیاتی گرفت جو سیاسی بن جانے کا ڈراوا تھی۔ محمد علی کا یہ خوف درست تھا کہ نہر مصر کی آزادی کو خطرے میں ڈال دے گی۔ مصری حکومت کے مالیاتی معاملات پر نظر رکھنے کے لیے یورپی وزراء متعین کر دیئے گئے تھے اور جب اسمٰعیل نے اپریل 1879ء کو انہیں برخواست کر دیا تو یورپ کی بڑی طاقتیں — برطانیہ' فرانس' جرمنی اور آسٹریا — اس کے خلاف متحد ہو گئیں اور انہوں نے سلطان پر دباؤ ڈالا کہ وہ خدیو کو اقتدار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ہٹا دے۔ اسمٰعیل کا جانشین اس کا بیٹا توفیق (1852-92ء) بنا' جو ایک مہذب نوجوان تھا لیکن یہ امر واضح تھا کہ وہ یورپی طاقتوں کی کٹھ پتلی ہے۔ اسی لیے وہ فوج اور عوام میں نامقبول تھا۔ جب 1881ء میں ایک مصری افسر احمد بے عروبی (1911ء-1840ء) نے' فوج اور حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر مصریوں کو فائز کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے انقلاب برپا کیا اور ملک کا انتظامی کنٹرول حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو برطانیہ نے مداخلت کی اور ملک پر فوجی قبضہ کرلیا۔ اسمٰعیل مصر کو یورپ کا حصہ بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ تاہم وہ اسے یورپ کی صرف ایک نوآبادی ہی بنا پایا۔

محمد علی سفاک اور نہایت بے رحم انسان تھا' جبکہ اس کے جانشین سادہ' لالچی اور کوتاہ نظر تھے۔ تاہم انصاف کی بات تو یہ ہے کہ وہ خود کو ناقابل حصول ممکنات کے مقابل حقیر بنا رہے تھے۔ اول' وہ جس قسم کی تہذیب کی نقالی کرنے کی کوشش کررہے تھے' وہ تہذیب مکمل طور پر نئی تھی۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے کہ یہ لوگ' یورپ کے اپنے انتہائی محدود تجربے کی وجہ سے یہ سمجھ نہیں پائے کہ چند فوجی اور تیکنیکی اصلاحات کسی قوم کو ''جدید'' بنانے کے لیے ناکافی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے تو پورے معاشرے کو منظم کرنا پڑتا' ایک آزاد صنعتی معیشت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنا ہوتا اور پرانی قدامت پسندانہ روح کی جگہ ایک نئی ذہنیت کو دینا ہوتی۔ ناکامی مہنگی پڑتی کیونکہ اس وقت تک یورپ بہت زیادہ طاقتور ہو چکا تھا۔ یورپی طاقتیں مصر کو نہر کی تعمیر کے لیے سرمایہ فراہم کرنے پر تو مجبور کرسکتی تھیں لیکن کسی ایک کو اس کا مالک نہیں بننے دے سکتی تھیں۔ نام نہاد ''مشرقی بحران'' (78-1875ء) پہلے ہی ظاہر کرچکا تھا کہ ایک عظیم یورپی طاقت (روس) عثمانی سلطنت کے قلب میں داخل ہوسکتی تھی اور اسے ترکوں کا نہیں بلکہ دوسرے یورپی ملکوں کا خطرہ ہی روک سکتا تھا۔ حد یہ ہوگئی تھی کہ مسلم قوت کا آخری مضبوط گڑھ یعنی عثمانی سلطنت خود اپنے صوبوں کو کنٹرول کرنے سے قاصر ہوگئی تھی۔ یہ حقیقت اس وقت دردناک انداز میں عیاں ہوگئی جب 1881ء میں فرانس نے تیونس پر قبضہ کرلیا اور 1882ء میں مصر پر برطانیہ نے قبضہ کرلیا۔ یورپ اسلامی دنیا پر حملہ آور ہورہا تھا اور سلطنت کو توڑنا شروع ہوگیا تھا۔

مزید یہ کہ مصری حکمرانوں کی تباہ کن غلطیوں سے مبرا ہوکر یہ کمزور اسلامی ملک اس طرح سے ''جدید'' نہیں ہوسکتے تھے جس طرح یورپی یا امریکی ہوئے تھے' کیونکہ ان غیر مغربی سرزمینوں پر جدیدیت پذیری کا عمل بنیادی طور پر مختلف تھا۔ 1843ء میں فرانسیسی ادیب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیرارڈ ڈی نرول نے قاہرہ کی سیر کی اور طنزیہ انداز میں لکھا کہ ایک اسلامی شہر میں فرانسیسی بورژوا اقدار رائج کی جارہی ہیں۔ محمد علی کا نیا محل بیرکوں کی طرح تعمیر کیا گیا تھا اور اسے مہاگنی کی آرم چیئرز (Arm Chairs) اور نئی فوجی وردیاں پہنے پاشا کے بیٹوں کی روغنی تصاویر (Oil Paintings) سے سجایا گیا تھا۔ نرول کے تخیل والا مشرقی قاہرہ:

> دھول اور راکھ تلے پڑا ہے' جدید روح اور اس کی ہنگامہ خیزیاں موت کی طرح اس پر حاوی ہوچکی ہیں۔ دس برس کے عرصے میں یورپی گلیاں اس گرد آلود اور بے کیف شہر کو موزوں زاویوں سے کاٹ چکی ہوں گی.....فرانکوں' برطانویوں' مالٹیز اور مارسیلز کے فرانسیسیوں والا علاقہ تابناک اور وسعت پذیر ہے۔''

محمد علی اور اسمٰعیل کی تعمیر کروائی ہوئیں عمارتیں غلبے کے آرکیٹکچر (Architecture) کی عکاسی کرتی تھیں۔ یہ امر برطانوی قبضے کے دوران زیادہ واضح ہوگیا' جب قاہرہ کے مختلف حصوں میں تعمیر ہونے والے سفارت خانے' بینک' ولا (Villas) اور یادگاریں مشرق وسطیٰ کے اس ملک میں یورپی سرمایہ کاری کو ظاہر کرنے لگی تھیں۔ یہ سب یورپ میں بے ربطی باور کیے جانے والے اسلوبوں (Styles)' ادوار اور اعمال کے ایک بے ہنگم اختلاط کو نمایاں کرتی تھیں۔ کیونکہ' جیسا کہ برطانوی ماہرعلم بشریات (Anthropologist) مائیکل گیلزنن نے نشاندہی کی ہے' قاہرہ ''ترقی کے اس یک سوتسلسل کے مراحل سے نہیں گزر رہا تھا' جن سے یورپ سرمایہ داری کی طرف سفر میں گزر چکا تھا۔'' وہ نہ تو کوئی صنعتی مرکز بن رہا تھا' نہ ہی بامعنی انداز میں روایت سے جدیدیت کی طرف گامزن تھا اور نہ ہی نئی شہری پیوستگی حاصل کررہا تھا:

> ''بلکہ اسے تو ایک دست نگر مقامی عروس البلاد (میٹروپولس) بنایا جارہا تھا' جس کے ذریعے معاشرے پر غلبہ قائم رکھا اور اس کا انتظام چلایا جا سکتا تھا۔ طاقت اور عالمی معاشی نظام کے تحت مکانی صورتیں پروان چڑھی تھیں' جن کے ذریعے برطانیہ نے اہم کردار ادا کیا۔''

مشرق وسطیٰ میں جدیدیت کے عام ہونے کا پورا تجربہ ہی انتہائی مختلف تھا۔ یہ یورپ کی طرح اقتدار دینے' خودمختاری عطا کرنے اور ایجادات و اختراعات کو عام کرنے والا نہیں بلکہ محرومی' دست نگری اور ادھوری' خام نقالی کا عمل تھا۔

لوگوں کی اکثریت کے لیے' جو کہ اس عمل میں شریک نہیں تھے' یہ بیگانگی کا بھی ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجربہ تھا۔ محمد علی کے قاہرہ جیسا ایک ''جدید'' شہر مصر کے مقامی شہروں کو معنویت دینے والے اصولوں سے یکسر مختلف اصولوں کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ جیسا کہ گیلزنن نشاندہی کرتا ہے کہ سیاح اور نوآبادیات کاروں نے مشرقی شہروں کو اکثر پریشان کن اور خوفزدہ کر دینے والا پایا تھا: بے نام اور بے نمبر گلیاں اور خمدار راستے کسی بھی نظام سے عاری دکھائی دیتے' مغربی تو کھو کر رہ جاتے اور اپنے گردوپیش کو بالکل نہیں سمجھ سکتے تھے۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے نوآبادیاتی لوگوں کے لیے نئے مغربیت زدہ شہر اتنے ہی ناقابل فہم تھے اور ''ان کے'' شہر کے جبلی شعور سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ خود کو اپنے ہی ملک میں کھویا ہوا سا محسوس کرتے تھے۔ ان حاوی ہو جانے والے مغربیت زدہ شہروں میں سے بہت سوں کے گرد ''پرانا شہر'' موجود تھا' جو مقابلتاً تاریک اور دہشت انگیز اور منطقی انداز میں منظم کی گئی جدید دنیا سے باہر کا دکھائی دیتا۔ یوں مصری دہری دنیا میں جینے پر مجبور تھے: ایک' جدید اور مغربی جبکہ دوسری روایتی تھی۔ یہ دہرا پن تشخص کے خطرناک بحران کا پیشہ خیمہ بنا اور جدیدیت کے کچھ دیگر تجربوں کے مانند بعض حیران کن مذہبی حلوں (Solutions) کا۔

ایران: یورپی پاور گیمز کا مہرہ:

مشرق وسطیٰ میں نپولین کی آمد سے ایران پر بھی ایک یورپی قوم کے غلبے کا دور شروع ہو چکا تھا تاہم وہ ابھی جدیدیت کے عمل سے گزرنا شروع نہیں ہوا تھا۔ نپولین کا ارادہ روس کے شہنشاہ کی مدد سے برطانوی ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا تھا۔ اس وجہ سے یورپی طاقتوں کی نگاہ میں ایران کو ایک بالکل نئی سٹریٹجک اہمیت حاصل ہوگئی۔ 1801ء میں برطانیہ نے ایرانی تائید و حمایت کے عوض برطانوی فوجی آلات اور ٹیکنالوجی فراہم کرنے کا وعدہ کر کے دوسرے قاچار شاہ فتح علی (1834ء۔1798ء) کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ ایران یورپ کی پاور گیمز (Power Games) میں ایک مہرہ بن گیا' جو کہ نپولین کے زوال کے بعد طویل عرصے تک جاری رہیں۔ برطانیہ ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لیے خلیج فارس اور ایران کے جنوب مشرقی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا تھا' جبکہ روس ایران کے شمال میں ایک ٹھکانا (Base) قائم کرنے کا خواہاں تھا۔ ان دونوں طاقتوں نے ایران کو نوآبادی نہیں بنایا بلکہ اس کی آزادی کے تحفظ کے لیے کام کیا' تاہم عملی طور پر صورتحال یہ تھی کہ شاہ ایک طاقت کی مدد کے بغیر دوسری طاقت پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ یورپیوں نے خود کو ترقی اور تہذیب کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علمبرداروں کی حیثیت سے ایرانیوں کے سامنے پیش کیا' تاہم برطانیہ اور روس ہر دو نے وہی ترقیاتی کام کیے جو ان کے اپنے مفادات کو بڑھاوا دیتے تھے اور دونوں ہی نے ایرانی عوام کو فائدہ دینے والی اختراعات' مثلاً ریلوے' کو متعارف نہیں کروایا' انہیں ڈر تھا کہ اس سے ان کے سٹریٹیجک منصوبوں کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو جائے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ولی عہد شہزادہ عباس نے' جو کہ آذربائیجان کا گورنر تھا' ایک جدید فوج کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور اس نے مطلوبہ مہارت کے حصول کی خاطر نوجوانوں کو یورپ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا۔ اس کے بعد قاچار شاہوں نے جدیدیت رائج کرنے کے لیے اکا دکا کوششیں کیں۔ شاہ کمزور تھے اور انہیں برطانیہ اور روس نے اتنا زیادہ اثر میں لیا ہوا تھا کہ وہ اپنی فوج کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے' انہیں یقین تھا کہ ہنگامی صورتحال میں یورپی ان کا تحفظ کریں گے۔ جس احساس نے محمد علی کو تحریک دی تھی' وہ یہاں مفقود تھا۔ تاہم یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ مصر کی نسبت ایران میں جدیدیت کو رائج کرنا بہت زیادہ مشکل تھا۔ ایران کے دور دراز فاصلوں اور دشوار علاقے نیز خطے کے خانہ بدوش قبائل کی خودمختارانہ قوت نے بیسویں صدی کی پیچیدہ ٹیکنالوجی کے بغیر مرکزیت کو ناممکن بنا دیا تھا۔

ایران کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ساری دنیا سے زیادہ خراب صورتحال کا حامل ہے۔ وہ غیروں کا دست نگر تھا' اس نے سنجیدہ سرمایہ کاری یا نوآبادیت کے کوئی ثمرات حاصل نہیں کیے تھے۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں روس اور برطانیہ نے ایران میں ''مراعاتِ خصوصی'' (Capitulations) حاصل کیں' جنہوں نے عثمانی سلطانوں کی خودمختاری کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ مراعاتِ خصوصی کے تحت برطانوی اور روسی تاجروں کو ایرانی تیل کے حوالے سے خصوصی رعایات دی گئی تھیں یعنی انہیں ملکی قانون سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا اور ان کی اشیاء پر متعینہ ٹیکس ہی عائد تھا۔ یہ بہت زیادہ غلط اقدام تھا۔ اس نے یورپیوں کو ایرانی علاقے میں مداخلت کرنے کے قابل بنا دیا جبکہ قونصلر عدالتیں جہاں اکثر ان کے مقدمات سنے جاتے تھے' اتنی جانبدار تھیں کہ سنگین جرائم پر بھی واقعتاً کوئی سزا نہ سنائی جاتی۔ مراعات مقامی صنعتوں کے لیے بھی تباہ کن تھیں کیونکہ کم قیمت مغربی مصنوعات نے ہاتھ کی بنی ہوئیں ایرانی اشیاء کی جگہ لے لی تھی۔ تاہم مغربی تجارت سے فائدہ بھی ضرور ہوا: کپاس' افیم اور قالین یورپ برآمد کیے جاتے تھے۔ تاہم ریشم کی صنعت اس وقت تباہ ہوگئی جب ایک یورپی فرم نے ریشم کے بیمار کیڑے درآمد کر لیے۔ ایرانی کرنسی کی اساس چاندی کی بین الاقوامی قیمت میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈرامائی انداز میں کمی ہوگئی اور 1850ء کی دہائی کے دوران' جب مذکورہ طاقتوں نے خاص سرگرمیوں کے لیے رعایتوں کا مطالبہ کرنا شروع کیا تو ایران میں یورپی معاشی اثر ورسوخ بہت زیادہ ہوگیا۔ برطانیہ اور ہندوستان کے مابین مواصلات کو بہتر بنانے کے لیے برطانویوں نے 1850ء کی دہائی کے اواخر میں ایران سے ٹیلیگراف کی تمام لائنوں کے لیے رعایتیں حاصل کرلیں۔ 1847ء میں ایک برطانوی شہری بیرن جولیس ڈی رائٹر (99-1816ء) نے ایران میں ریلوے اور سٹریٹ کار' تمام معدنیات کو نکالنے' آبپاشی کے تمام نئے ذرائع' ایک قومی بینک اور بہت سے صنعتی منصوبوں کے غیر معمولی حقوق حاصل کرلیے۔ یہ رعایت وزیراعظم مرزا حسین خان نے دی تھی جو کہ اصلاح کا حامی تھا بلکہ شاید وہ یہ سوچتا تھا کہ شاہ بے حد نالائق ہیں' اس لیے برطانویوں کو اجازت دینا بہتر ہے کہ وہ ملک کو جدید بنائیں۔ اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ شاہ کی بیوی کی قیادت میں متعلقہ حکام کے ایک گروپ اور علماء نے رائٹر کو دی جانے والی رعایت پر شدید احتجاج کیا اور مرزا خان استعفیٰ دینے پر مجبور ہوگیا۔ بایں ہمہ انیسویں صدی کے اختتام تک برطانیہ اور روس ایران میں زبردست معاشی رعایتیں حاصل کر چکے تھے' جو بعض شعبوں میں سیاسی کنٹرول کا باعث بنیں۔ جدیدیت کے فوائد کو سمجھنے پر قادر مگر قابل فہم انداز میں غیر ملکی اثر ورسوخ کے اضافے سے خوفزدہ تاجروں نے حکومت کے خلاف مہم شروع کردی۔

ایران میں علماء کا کردار:

انہیں علماء کی مدد حاصل تھی' جو کہ مصری علماء کی نسبت بہت زیادہ مضبوط حیثیت کے حامل تھے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ''اصولی'' فتح نے مجتہدین کو ایک طاقتور ہتھیار فراہم کردیا تھا' کیونکہ اصولی طور پر شاہ بھی ان کے فیصلوں کے پابند تھے۔ وہ قاچاروں کے تابع فرمان اور حاشیہ نشیں نہیں تھے کیونکہ قاچاروں کو ان کی ضرورت تھی۔ علماء محفوظ مالیاتی بنیاد کے حامل تھے اور ان کے مراکز قاچاروں کی پہنچ سے دور عثمانی عراق میں نجف اور کربلا کے مقدس شہر تھے۔ ادھر ایران میں دارالحکومت تہران مقدس شیعی شہر قم سے بہت دور تھا۔ اس طرح وہاں مذہب اور سیاست میں ایک مؤثر علیحدگی موجود تھی۔ محمد علی کے برعکس قاچار شاہوں کے پاس جدید فوج نہیں تھی اور تعلیم' قانون اور اوقاف کے انتظام جیسے معاملات ان کی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے کوئی مرکزی بیوروکریسی بھی نہیں تھی' یوں یہ معاملات علماء کے لیے مخصوص ہوگئے تھے۔ تاہم انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شیعی روایت کے وفادار مذہبی پیشواؤں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو سیاست سے دور رکھا گیا۔ جب شیخ مرتضیٰ انصاری پہلا مجتہد بنا' جسے امام غائب کا نائب اعلیٰ' ''مرجع تقلید'' تسلیم کیا جاتا ہے' تو اس نے ایک اور زیادہ فاضل شخص کو ترجیح دی' جو کہ اپنی رضا سے تاجروں اور مقامات مقدسہ کے زائرین کے تجارتی اور نجی معاملات میں قانونی مشیر کے طور پر عمل کرتے ہوئے ''عوام کے معاملات میں شامل'' ہوگیا تھا۔ مدعا یہ تھا کہ مومنوں کا سپریم جج ایک عام آدمی نہیں بلکہ عالم کو ہونا چاہیے۔

تاہم جوں جوں ایران میں یورپی زیادہ تجارتی طاقت حاصل کرتے گئے تاجر اور دستکار ہدایت کے لیے علماء کی طرف رجوع کرنے لگے۔ مذہبی پیشوا اور تاجر اور بازار کے دستکار' جو ''بازاری'' کے نام سے مشہور تھے' فطری اتحادی تھے۔ وہ یکساں خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور یکساں مذہبی مثالیوں کے حامل تھے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران علماء نے غیر ملکی مداخلت پر تاجروں کے اعتراضات کو دانش ورانہ سہارا مہیا کیا: انہوں نے کہا کہ اگر شاہوں نے کافروں کو اتنے زیادہ اختیارات دینا جاری رکھا تو ایران اسلامی ملک نہیں رہے گا۔

شاہوں نے عوام کے مقبول مذہب سے رجوع کرتے ہوئے بالخصوص حضرت حسینؓ کی ماتمی تقریبات میں شرکت کر کے ان اعتراضات کو رد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے پاس اپنے مرثیہ خواں تھے' جو روزانہ سانحۂ کربلا کے واقعات سناتے تھے۔ وہ ہر سال محرم کے پانچ دن شاہی محل کے بہت بڑے صحن میں تعزیہ نکالتے اور غم حسینؓ مناتے۔ حضرت حسینؓ اور یزید کے درمیان جنگ کے واقعات بیان کیے جاتے' امام حسینؓ اور ان کے بیٹوں کی شہادت بیان کی جاتی اور عاشورہ کی رات ایک بہت بڑا جلوس نکالا جاتا' جو شہداء کے روضوں کی بڑی بڑی شبیہوں اور نوحہ خواں بچوں کے ساتھ گلیوں سے گزرتا' جبکہ عام لوگ سینہ کوبی کرتے پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ پورے محرم کے دوران تمام مسجدوں پر سیاہ پردے لٹکا دیئے جاتے اور چوکوں میں بوتھ بنا دیئے جاتے' جن میں مرثیہ خواں پرسوز لہجے میں بآواز بلند مرثیے پڑھتے رہتے۔ اس وقت ملک میں بہت سے ممتاز مرثیہ خواں موجود تھے' جو تفوق کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے تھے۔

قاچاروں کی حکمرانی میں یہ ماتمی رسوم ایران کی اہم روایات بن گئیں۔ یہ رسوم بادشاہت کو حضرت حسینؓ اور کربلا سے جوڑنے اور یوں قاچار حکومت کو جائز ٹھہرانے میں مدد دینے کے علاوہ عام لوگوں کو ان کی فرسٹریشن اور بے اطمینانی کے اخراج کا ذریعہ فراہم کرتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئے ایک سیفٹی والو (Safety Valve) کا کام بھی انجام دیتی تھیں۔ لوگ خاموش تماشائی نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مرثیہ خوانی کے دوران اپنی موجودگی کو محسوس کرواتے تھے۔ جیسا کہ ایران کا دورہ کرنے والے ایک فرانسیسی نے لکھا کہ ''سارے سننے والے ان کا جواب آنسوؤں اور آہوں سے دیتے ہیں۔'' جنگ کے مناظر کے بیان کے دوران حاضرین سسکیاں لے لے کر روتے' وہ سینہ کوبی کرتے اور آنسوان کے رخساروں پر بہہ رہے ہوتے۔ وہ علامتی طور پر بیک وقت میدانِ کربلا اور اپنی دنیا میں ہوتے تھے' اپنے ذاتی المیوں اور دکھوں پر روتے ہوئے۔ امریکی سکالر ولیم بیمین لکھتے ہیں کہ سامعین کو اس دن اپنے گناہوں اور اپنی مصیبتوں پر رونے اور خود کو حضرت حسینؓ کی عظیم ترین ابتلا کی یاد دلانے کا درس دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ واقعۂ کربلا کو ان رسوم کے ذریعے زمانۂ حال میں لاسکتے تھے اور یوں اس تاریخی المیے کو لازمانیت دیتے تھے۔ یہ دن انہیں شر کے مسئلے پر سوچنے کی دعوت بھی دیتا ہے' خیر کرب و بلا کا شکار کیوں ہوتا ہے اور شر بظاہر کیوں غالب آجاتا ہے؟ جب وہ آہیں بھرتے ہیں' اپنے ماتھے پیٹتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں تو وہ اپنے اندر عدل کی اس آرزو کو ابھارتے ہیں جو شیعی ایمان میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر سال ماتمی تقریبات انہیں یاد دلاتی ہیں کہ شر دنیا پر مسلط ہے نیز شر کی آخری فتح پر ان کے ایمان کو مضبوط کرتی ہیں۔

یہ عوامی عقیدہ مجتہدوں کی قانون پسندانہ' عقلیت پسندانہ شیعیت سے واضح طور پر بہت مختلف تھا۔ یہ ایک واضح انقلابی امکان کا بھی حامل تھا۔ یہ معاشرے میں موجود برائیوں اور موجودہ حکمران اور یزید میں مشابہت کی نشاندہی کرسکتا تھا — اور اس نے ایسا کیا بھی۔ تاہم صفویوں کی طرح قاچاروں کے عہد میں بھی یہ باغیانہ موتیف (Mofit) محدود تھا اور زور اب بھی حضرت حسینؓ کے مصائب پر تھا۔ انیسویں صدی کے دوران لوگوں نے تعزیہ کے وسیلے سے بغاوت نہیں کی تھی بلکہ دو مسیحائی (Messianic) تحریکوں میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔

شیخی تحریک:

پہلی تحریک کی قیادت محمد کریم خان کرمانی (71-1810ء) نے کی تھی' جو ایک قاچار شہزادہ اور فتح علی شاہ کا سوتیلا بیٹا تھا' اس کا باپ شورش انگیز صوبے کرمان کا گورنر تھا۔ وہاں کریم خان ایک انقلابی صوفیانہ تحریک شیخیہ فرقے میں شامل ہوگیا' جس کی بنیاد کربلا کے شیخ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احمد الاحصائی (1826ء۔1753ء) نے رکھی تھی۔ وہ مُلّا صدرا کے تصوف اور اصفہان کے مکتبۂ فکر سے بہت زیادہ متاثر تھا' جسے اصولی ملاؤں نے دبانے کی کوششیں کی تھیں۔ احصائی اور اس کے شاگرد سید کاظم رشتی (1843ء۔ 1759ء) کی تعلیمات یہ تھیں کہ ہر پیغمبر اور امام الوہی رضا کی کاملاً ترجمانی کرتے تھے اور وہ ساری نوعِ انسان کو کاملیت کی حالت کی طرف لے جا رہے تھے۔ امام غائب اس دنیا میں پوشیدہ نہیں ہیں' وہ عالم المثال میں چلے گئے ہیں' بعد ازاں انہوں نے اپنے ارضی نمائندوں کے ذریعے انسانوں کی رہنمائی جاری رکھی۔ احصائی نے کہا کہ دنیا میں ہمیشہ ایک ''کامل شیعہ'' موجود ہوتا ہے' کمیاب اور منزہ عن الخطا لوگوں کا ایک گروپ' جو کہ مراقبے کے وجدانی طریقوں کے ذریعے امام غائب سے رابطے کے اہل ہوتے ہیں۔ مدعا یہ تھا کہ مجتہدوں کا عقیدہ ادھورا' قانون پسندانہ اور سطحی تھا' جو احصائی اور اس کے شاگردوں کی صوفیانہ بصیرتوں سے کمتر تھا۔

شیخی مکتبۂ فکر' جیسا کہ اسے کہا جاتا تھا' عراق اور آذربائیجان میں بہت مقبول تھا تاہم وہ ٹھوس سیاسی پروگرام کی بجائے ایک فلسفہ' ایک تصور ہی رہا۔ رشتی کی موت کے بعد کریم خان شیخی رہنما بن گیا۔ اس نے اس فرقے کو مجتہدوں کے خلاف بغاوت میں بدل دیا۔ اس نے ان کی محدود قانون پسندی' غیر تخیلاتی سطحیت پسندی اور نئے تصورات میں دلچسپی کے فقدان پر کھلم کھلا تنقید کی۔ اس کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کو ایسا بالکل نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کا واحد فرض تقلید ہے۔ ہر شخص صحیفۂ خداوندی کی تعبیر کی اہلیت رکھتا ہے۔ مجتہدین تو پرانی صداقتوں ہی کو دہرا رہے ہیں جبکہ دنیا کو کسی مکمل طور پر نئی شے کی ضرورت ہے۔ نوعِ انسان مستقل طور پر تبدیل ہوتی اور ارتقاء پاتی ہے۔ ہر نسل میں ''کامل شیعہ'' قرآن اور شریعت کے باطنی مفاہیم کو بے نقاب کرتے ہیں۔ مومنوں کو ان صوفی قائدین کی باتوں پر کان ضرور دھرنے چاہئیں' جنہیں امام نے متعین کیا ہے اور جن کے اقتدار کو مجتہدوں نے غصب کر رکھا ہے۔

کریم خان کا عقیدہ تھا کہ یہ ارتقائی انکشاف تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ انسانی فطرت جلد ہی کاملیت حاصل کر لے گی۔ وہ واضح طور پر ان تبدیلیوں پر ردعمل ظاہر کر رہا تھا جو کہ یورپی ایران میں لا رہے تھے۔ کریم خان جمہوریت پسند (Democrate) نہیں تھا۔ تمام ماقبل جدید فلسفیوں کی طرح وہ اشرافیہ پسند (Elitist) اور مطلقیت پسند (Absolutist) تھا' وہ مجتہدوں کے مابین آراء کے اختلاف پر مضطرب تھا۔ اس کا ارادہ لوگوں پر اپنے وژن کو نافذ کرنے کا تھا۔ بایں ہمہ وہ یورپ کے نئے تصورات سے شناسائی حاصل کرنے والا پہلا ایرانی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبی پیشوا تھا۔ جہاں آرتھوڈوکس علماء برطانویوں اور روسیوں کی تجارتی مداخلت کی فقط مخالفت ہی کر رہے تھے' وہاں کریم خان اتنا دوراندیش تھا کہ مغرب کی نئی سائنس اور سیکولرازم سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ فالتو وقت میں وہ فلکیات' بصریات' کیمیا اور لسانیات کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور اپنے سائنس کے علم پر اسے فخر تھا۔ 1850ء اور 1860ء کے عشروں کے دوران' کہ جب بہت کم ایرانیوں کو یورپ کا فرسٹ ہینڈ علم حاصل تھا' کریم خان نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ مغربی کلچر ایرانی تہذیب کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جانے والا ہے۔ وہ عبوری زمانہ تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس عدیم النظیر چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئی تدابیر لازماً ڈھونڈنا ہوں گی۔ اسی لیے کسی نئی چیز کی امکانیت کو روا قرار دینے والی اس کی ارتقائی الٰہیات اور مستقبل کی وجدانی توقع ایک انقلابی تبدیلی تھی۔

تاہم شیخی تحریک کی جڑیں علم کے اپنے اشرافیانہ وژن کی وجہ سے پرانی دنیا ہی میں تھیں۔ انڈسٹریلائزڈ مغرب کے اثر کو محسوس کرتے ہوئے یہ تحریک مدافعانہ بھی تھی۔ کریم خان نئے دارالفنون کا سخت مخالف تھا۔ یہ تہران کا پہلا مفت ہائی سکول تھا' جسے اصلاحات کرنے والے وزیر امیر کبیر نے قائم کیا تھا۔ اس سکول میں یورپی اساتذہ مترجموں کی مدد سے فطری سائنسیں' اعلیٰ ریاضی' غیر ملکی زبانیں اور جدید فن جنگ کی تعلیم دیتے تھے۔ کریم خان نے اس سکول کو یورپی اثر کو بڑھانے اور اسلام کو تباہ کرنے کی سازش کا ایک حصہ سمجھا۔ اس نے کہا کہ جلد ہی علماء خاموش ہو جائیں گے' مسلمان بچے عیسائی سکولوں میں پڑھیں گے اور ایرانی جعلی یورپی بن جائیں گے۔ وہ مستقبل کے بیگانگی اور لاقانونیت کے خطروں کو بھانپ سکتا تھا اور بڑھتی ہوئی یورپی مداخلت کی صورت میں اس کا کردار ایک رد کرنے والے اور علیحدگی پسند کا تھا۔ اس کے صوفیانہ نظریے کو اس طور بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ ایرانیوں کے ذہن ایک بالکل نئے حل (Solution) کے لیے کشادہ کرنے کی ایک کوشش تھی' تاہم خواہ اچھی تھی یا بری' ایران میں مغربی موجودگی زندگی کی ایک حقیقت تھی اور اس سے مطابقت اختیار نہ کرنے والی کوئی اصلاحی تحریک کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی تھی۔ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ کریم خان اپنی مذہبی حکومت قائم کرنے والا ہے' اسے عدالت میں حاضر ہونے کے لیے بلا بھیجا گیا اور اٹھارہ ماہ تک زیر نگرانی رکھا گیا۔ 1850ء اور 1860ء کے عشروں کے دوران وہ عوامی زندگی سے رفتہ رفتہ الگ ہو گیا' اس نے اپنی آراء اپنے تک ہی رکھیں اور شکست خوردگی اور تلخی زدگی میں مر گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بابی تحریک:

اس دور کی دوسری مسیحائی تحریک کی جڑیں بھی قدامت پسندانہ روح میں تھیں' تاہم اس نے بعض نئی مغربی اقدار کو بھی اپنا لیا تھا۔ اس تحریک کا بانی سید علی محمد (50-1819ء) نجف اور کربلا میں شیخی تحریک میں شامل تھا' لیکن 1844ء میں اس نے دعویٰ کیا کہ وہ الوہیت کا دروازہ (''باب'') ہے' جسے علماء نے امام غائب کی غیبت کے زمانے سے بند قرار دے رکھا تھا۔ اصفہان' تہران اور خراسان کے علماء' اہم لوگ اور دولتمند تاجر اس کی تحریک کی طرف مائل ہو گئے۔ کربلا میں اس کی ذہین فطین شاگرد قرۃ العین (52-1814ء) نے زبردست عوامی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس کے مرد شاگردوں ملا صادق (المعروف بہ مقدس) اور مرزا محمد علی برفروشی نے' جسے قدوس کا خطاب دیا گیا تھا (وفات: 1849ء)' ایک واقعتاً نئے مذہب کا پرچار کیا: اب ''باب'' کا نام اذان میں شامل کر دیا گیا اور نماز پڑھنے والوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس کے شیراز میں واقع گھر کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔ جب باب حج کو گیا تو اس نے کعبہ کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ وہ امام غائب کا جسمانی ظہور ہے۔ اس کے پندرہ ماہ بعد' جوزف سمتھ کی طرح' باب نے ایک نیا الہامی صحیفہ ''بیان'' پیش کیا۔ اس نے کہا کہ تمام پرانی کتابیں منسوخ کر دی گئی ہیں۔ اس کے جسم میں ماضی کے تمام عظیم لوگوں کا ظہور ہو چکا ہے' اس لیے وہ اپنے عہد کا انسانِ کامل (Perfect Man) ہے۔ اب انسانیت کاملیت کو پہنچ رہی ہے اور پرانے عقیدے مزید کارآمد نہیں رہے۔ مورمن کی کتاب کی طرح ''بیان'' میں ایک نئے اور زیادہ منصفانہ معاشرتی نظام کی بات کی گئی تھی اور جدیدیت کی بورژوا اقدار کو تسلیم کیا گیا تھا۔ ''بیان'' پیداواری کام کو بہت اعلیٰ مقام عطا کرتی تھی' آزاد تجارت کو روا قرار دیتی تھی' ٹیکسوں میں کمی کا مطالبہ کرتی تھی' نجی ملکیت اور عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانے کی ضمانت دیتی تھی۔ سب سے بڑھ کر باب نے انیسویں صدی کے اس ایقان کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہم صرف اسی دنیا کے حامل ہیں۔ شیعہ روایتی طور پر ماضی کے المیوں اور مسیحائی مستقبل کو مانتے تھے' باب نے حاضر و موجود (Here-And-Now) پر توجہ مرکوز کی۔ اس نے ایرانیوں کو تلقین کی کہ کسی اچھے عہد کا انتظار کرنے کی بجائے انہیں اسی کرۂ ارض پر ایک بہتر معاشرے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے اور اپنی زندگیوں میں ہی آزادی پانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بابی تحریک کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جو شبتائی زیوی کی زندگی کی یاد دلاتے ہیں۔ باب نے شبتائی جیسا ہی فسوں پھونکا تھا۔ جب حکام نے اسے زنداں میں ڈال دیا تو قید کے ایک مقام سے دوسرے کی طرف اس کی منتقلی ایک فاتحانہ پیشرفت بن گئی' کیونکہ لوگ بہت بڑی تعداد میں اس سے ملاقات کرنے کے لیے اکٹھے ہوجایا کرتے تھے۔ اس کے زنداں زیارت گاہوں میں ڈھل جاتے تھے۔ جہاں وہ زنداں سے قاچار ''غاصب'' محمد شاہ کو سخت لہجے میں خطوط لکھا کرتا تھا' وہاں اُسے اپنے شاگردوں کے ہجوموں سے ملنے کی بھی اجازت تھی۔ حد تو یہ تھی کہ جب حکام نے اسے ایک دوردراز علاقے میں واقع قلعے میں منتقل کیا تو اس کے ہال میں باب کے تمام ملاقاتیوں کے سمانے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی اور بے شمار لوگ قلعے کے باہر کھڑے رہنے پر مجبور ہوتے تھے۔ جب وہ عوامی حماموں میں نہانے جاتا تو لوگ اس کا استعمال کردہ پانی خرید لیا کرتے تھے۔ جب 1848ء میں اسے آخری مقدمے کے لیے تبریز لایا گیا تو زبردست ولولہ و جوش پیدا ہوگیا۔ سینکڑوں لوگوں نے اس کا استقبال کیا اور وہ فاتحانہ انداز میں کمرۂ عدالت میں داخل ہوا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران اس کے پیروکاروں کا ہجوم عدالت کے باہر منتظر کھڑا تھا کہ باب اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کردے گا اور انصاف' پیداواریت اور امن کے ایک عہد کا آغاز کرے گا۔ تاہم' شبتائی کی طرح' ایک صدمہ انگیز اینٹی کلائمیکس (Anti-Climax) رونما ہوا۔ باب اپنا احتساب کرنے والوں پر غالب نہیں آیا۔ حقیقت میں اس کی کارکردگی بہت مایوس کن تھی۔ اس کے محتسبوں نے عربی زبان' الٰہیات اور فلسفہ میں اس کی نااہلی کو عیاں کر ڈالا۔ وہ نئی سائنسوں کا بھی کوئی علم نہیں رکھتا تھا۔ ایسا شخص کیونکر امام ہوسکتا تھا' جو کہ علم سے مالا مال نہیں تھا؟ عدالت نے خطرات کا اندازہ لگانے میں سنگین غلطی کرتے ہوئے اسے واپس زنداں بھیج دیا۔ اس کے بعد بابی تحریک محض اخلاقی اور مذہبی اصلاح کی دعوت دینے تک محدود نہ رہی بلکہ وہ ایک نئے سماجی سیاسی (Sociopolitical) نظام کا مطالبہ کرنے لگی۔

جس طرح شبتائیت (Shabbateanism) نے تمام سماجی طبقوں کو متاثر کیا تھا' بالکل اسی طرح باب نے بھی اپنی مسیحائیت سے عوام کو اپنی طرف مائل کیا' فلسفے اور باطنیت کی طرف راغب لوگوں کو اپنی صوفیانہ الٰہیات کے ذریعے اور زیادہ سیکولر ذہن رکھنے والے انقلابیوں کو اپنے سماجی نظریات کے وسیلے سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ابتدائی یہودی تحریکوں کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح ایک وجدانی شعور موجود تھا کہ پرانی دنیا ماضی کے اندھیروں میں اتر رہی ہے اور روایتی امتناعات مزید کارگر نہیں رہے۔

جون 1848ء میں بابی قائدین نے خراسان میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ اس میں قرآن کو باقاعدہ طور پر منسوخ قرار دے دیا گیا اور شریعت کو اس وقت تک رائج رہنے کی منظوری دی گئی جب تک دنیا باب کو تسلیم نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک باب کے پیروکاروں کو علماء پر انحصار کرنے کی بجائے صرف اپنے ضمیر کی پیروی کرنی چاہیے اور خیر و شر میں خود امتیاز کرنا سیکھنا چاہیے۔ اگر وہ چاہیں تو شریعت کے قوانین کو رد کرنے میں بالکل آزاد ہوں گے۔ خاتون کرشماتی مبلغ قرۃ العین نے عورت کی محکومی کے خاتمے اور پرانے مسلم دور کے اختتام کی علامت کے طور پر پردہ ترک کر دیا۔ تمام ''حرام'' اشیاء کو ''حلال'' قرار دے دیا گیا۔ شیخائی کی طرح بابی بھی ایک نئی مذہبی تکثیریت تک رسائی پا رہے تھے: نئے نظام میں تمام سابقہ مذاہب ایک ہو جائیں گے۔

خراسان والے اجلاس میں شریک بہت سے بابی خوف کا شکار ہو گئے۔ دیگر راسخ العقیدہ مسلمان کافروں پر حملہ آور ہو گئے اور اجلاس بدنظمی پر ختم ہوا۔ تاہم قائدین کا کام تو ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ وہ الگ الگ مازندران لوٹ گئے جہاں بابی قائد مُلّا حسین بشروئی (وفات: 1849ء) نے دو سو افراد کو اکٹھا کیا۔ اس نے ایک شعلہ فشاں تقریر کی: بابیوں کو چاہیے کہ وہ امام حسینؓ کو مثال بنائیں اور انہیں اپنی دنیاوی املاک کو قربان کر دینا چاہیے۔ صرف موت کو گلے لگا کر ہی وہ ''نوروز'' کو رونما کر سکتے ہیں کہ جب باب پست لوگوں کو بلند کر دے گا اور غریبوں کو امیر بنا دے گا۔ اس نے کہا کہ ایک سال کے اندر اندر باب دنیا کو فتح کر لے گا اور تمام مذاہب کو ایک کر دے گا۔ بشروئی ایک بہترین کمانڈر ثابت ہوا اور اس کی چھوٹی سی فوج نے شاہی فوجیوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے درباری وقائع میں پڑھا ہے کہ وہ اس طرح بھاگے تھے ''جیسے بھیڑوں کا ریوڑ بھیڑیوں سے بچ کر فرار ہو رہا ہو۔'' بابیوں نے قتل و غارت، لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ شروع کر دیا۔ زیادہ مذہبی رجحان والے لوگ اس ابھار کو کربلا سے زیادہ اہم قرار دیتے تھے جبکہ غریب، جنہوں نے ہوسکتا ہے کہ تحریک میں زیادہ دنیاوی وجوہات کے تحت شرکت کی ہو، سب سے زیادہ کٹڑ حامی تھے۔ انہیں پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ انہیں اگر مساویانہ طور پر نہیں تو قابل قدر رفقائے کار کے طور پر شمار کیا جا رہا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس انقلاب کو حکومت نے بالآخر کچل دیا۔ تاہم 1850ء نے یزد' تہران اور زنجان میں نئے ابھار دیکھے۔ بابیوں نے زبردست دہشت کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مقامی طلباء کی طرح سیاسی منحرفین نے بھی اس انقلاب میں حصہ لیا۔ حد تو یہ ہے کہ عورتیں بھی مردانہ لباس پہنے بہادری کے ساتھ لڑیں۔ اس تحریک نے ان سب لوگوں کو متحد کر دیا تھا جو کہ حکومت سے مطمئن نہیں تھے۔ مُلّا — جو مغرور مجتہدوں کے جبر کا شکار تھے' تاجر — جو ایرانی وسائل کی غیر ملکیوں کے ہاتھوں فروخت پر ناراض تھے' بازاری' زمیندار اور مفلس کاشتکار سب کے سب بابی مذہبی جیالوں (Enthusiasts) میں شامل ہو گئے تھے۔ شیعیت نے طویل عرصے سے ایرانیوں میں سماجی انصاف کی آرزو بیدار کر رکھی تھی اور جب صحیح قائد اور صحیح فلسفہ رونما ہوئے تو عدم اطمینانی کی سب صورتوں نے ایک مذہبی جھنڈے تلے لڑنے کو فطری سمجھا۔

اس وقت تو حکومت باغیوں کو کچل دینے کی اہل تھی۔ باب کو 9 رجولائی 1850ء کو سزائے موت دے دی گئی۔ قائدین کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور دیگر مشکوک افراد کا گھیراؤ کر کے تہہ تیغ کر دیا گیا۔ کچھ لوگ باب کے نامزد جانشین مرزا یحییٰ نورِ صبحِ ازل (1912ء-1830ء) کی پیروی کرتے ہوئے بغاوت کے سیاسی مقاصد سے وابستہ رہے۔ بعدازاں ان ''ازلیوں'' میں سے بہت سوں نے بابی تصوف کو ترک کر دیا اور سیکولر اور قوم پرست بن گئے۔ شیتائیتی تحریک کی طرح امتناعات کو توڑنے' پرانے قوانین کو نہ ماننے اور بغاوت کے مزے نے انہیں مذہب سے آزاد ہونے کا اہل بنا دیا تھا۔ یوں ایک بار پھر ایک مسیحائی تحریک نے ایک سیکولر نظریئے تک جانے کے لیے پل کا کام دیا تھا۔ تاہم بیشتر بچ رہنے والے بابی صبحِ ازل کے بھائی مرزا حسین علی نور بہاء اللہ (92-1817ء) کی پیروی کرتے رہے' جس نے سیاست ترک کر دی اور نیا بہائی مذہب تخلیق کیا۔ اس نے مذہب اور ریاست کی علیحدگی' مساوی حقوق' تکثیریت اور رواداری کے جدید مغربی تصورات اپنائے۔

بابی بغاوت کو جدیدیت کے ایک عظیم انقلاب کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے ایران میں نمونہ قائم کیا۔ بیسویں صدی میں ایسے دوسرے مواقع بھی آئے' جب مذہبی پیشواؤں اور عام لوگوں' سیکولر لوگوں اور صوفیوں' مومنوں اور دہریوں نے ملکر جابرانہ ایرانی حکومت کو چیلنج کیا۔ انصاف کے لیے جنگ نے' جو کہ شیعوں کے لیے ایک مقدس قدر بن چکی تھی' ایرانیوں کی بعد کی نسلوں کو ایک بہتر نظام لانے کی غرض سے شاہ کی فوج سے ٹکرا جانے کی جرأت عطا کی۔ کم از کم دو مواقع پر شیعی آئیڈیالوجی نے ایرانیوں کو اپنے ملک میں جدید سیاسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادارے قائم کرنے کے قابل بنایا۔ ایک بار پھر بابی انقلاب نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مذہب نے جدیدیت کے تصورات اور ولولوں (Enthusiasms) کو ایک بیگانہ سیکولر محاورے سے ایک ایسی زبان' اساطیر اور روحانیت میں ڈھالتے ہوئے کہ جنہیں لوگ سمجھ سکتے تھے اور انہیں اپنا بنا سکتے تھے' لوگوں کو ان سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد دی۔ اگر جدیدیت مغرب کے عیسائیوں کے لیے دشوار ثابت ہوئی تھی تو یہ یہودیوں اور مسلمانوں کے لیے کہیں زیادہ پریشان کن ثابت ہوئی۔ اسے جدوجہد — اسلامی اصطلاح میں جہاد مطلوب تھا' جو بعض اوقات ایک مقدس جنگ بھی بن سکتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ دوم

بنیاد پرستی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

ابتدائی بنیاد پرست تحریکیں

(1870ء-1900ء)

خوف' خالی پن اور بے معنویت کا دور:

انیسویں صدی کے اواخر تک یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ نیا معاشرہ' جو کہ مغرب میں تکمیل کو پہنچ چکا تھا' آفاقیت کا حامل نہیں تھا' جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے تھے۔ حرکیاتی امید پسندی (Optimism)' جس نے ہیگل کے فلسفے کو فیضان بخشا تھا' الجھن زدہ شک اور اضطراب کو راہ دے چکی تھی۔ ایک طرف یورپ طاقتور ہوتا جارہا تھا۔ صنعتی انقلاب قومی ریاستوں (Nation States) کو ہمیشہ سے زیادہ دولت اور قوت عطا کر چکا تھا اور انہیں اعتماد اور کاملیت کے فخریہ احساس سے سرشار کر چکا تھا۔ لیکن اس کی خصوصیات وہی علیحدگی' بیزاری اور تنہائی تھی جو چارلس بادلیئر نے (1857ء) Les Fleurs Du Mal میں دریافت کی تھیں' وہی بیمار کر دینے والا شک تھا' جو الفرڈ ٹینی سن نے (1850ء) In Memoriam میں بیان کیا تھا اور فلابیئر کے ناول (1856ء) Madame Bovary کی ہیروئن والی بے کیفی و ماندگی اور عدم اطمینان تھا۔ لوگ ایک مبہم سے خوف کا شکار تھے۔ اس کے بعد سے لوگوں نے جدید معاشرے کے حاصلات کی خوشی کے ساتھ ساتھ ایک خالی پن کا تجربہ بھی کیا' جس نے زندگی کو بے معنویت سے بھر دیا۔ بعضوں نے جدیدیت کی الجھنوں کے درمیان یقینیت کی آرزو کی' بعضوں نے اپنے خوفوں سے خیالی دشمن تراشے اور عالمی سازش کے خواب دیکھے۔ ہم ان تمام عناصر کو بنیاد پرستی کی ان تحریکوں میں پائیں گے جو جدید کلچر کے دوش بدوش تین توحیدی عقیدوں میں پروان چڑھیں۔ انسان اس احساس کے بغیر جینا تقریباً ناممکن پاتے ہیں کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی حتمی معنویت اور قدر کی حامل ہے' حالانکہ شواہد اس کے الٹ اور غم انگیز رہے ہیں۔ پرانی دنیا میں اساطیر اور رسوم نے لوگوں میں مقدس اہمیت کا وہ احساس پیدا کیا جس نے انہیں خالی پن سے محفوظ رکھا' بلکہ آرٹ کے عظیم شاہکاروں نے بھی یہی کام انجام دیا تھا۔ لیکن مغربی قوت اور کامیابی کے سرچشمے یعنی سائنسی عملیت پسندی نے اسطورہ کو رد کر دیا اور اعلان کیا کہ وہ تنہا ہی سچ تک لے جا سکتی ہے۔ تاہم عقل ان حتمی سوالات کے جواب دینے سے قاصر تھی' جو کبھی لوگوں کے احاطۂ عمل میں نہیں رہے تھے۔ اس صورتحال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی مرد و زن کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے روایتی عقیدے پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا۔

آرزوئے مرگ:

آسٹریا کے نفسیات داں سگمنڈ فرائڈ (1939ء-1856ء) نے دریافت کیا کہ انسانوں کے لیے آرزوئے مرگ (Death Wish) بھی اتنا ہی مضبوط محرک ہے جتنی کہ جنس اور نسل افروزی کی خواہش۔ رفتہ رفتہ جدید کلچر میں فنا کی ایک کجرویانہ آرزو (اور دہشت) نمایاں ہوگئی۔ لوگ اپنی ہی تخلیق کردہ تہذیب کے فوائد سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے ڈر کر الگ ہونا بھی شروع ہوگئے تھے۔ یہ جدید سائنس کا احسان ہے کہ مغرب میں بیشتر لوگ زیادہ صحت مند اور طویل تر زندگیاں جیتے تھے اور ان کے جمہوری اداروں نے مساوات پیدا کر دی تھی۔ امریکی اور یورپی اپنے کارناموں پر درست فخر کرتے تھے۔ تاہم روشن خیال مفکرین نے آفاقی برادری کا جو خواب دیکھا تھا' وہ باطل نکلا۔ فرانس پروشیا جنگ (71-1870ء) نے جدید ہتھیاروں کے ہولناک اثرات کو عیاں کر دیا تھا اور اس حقیقت کا ادراک ہونے لگا تھا کہ سائنس بھی ایک ہلاکت خیز جہت کی حامل ہو سکتی ہے۔ اینٹی کلائمیکس کا احساس جنم لے چکا تھا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں انقلابی عرصے کے دوران ایسا لگتا تھا کہ بالآخر ایک نئی اور بہتر دنیا انسانیت کو حاصل ہونے ہی والی ہے۔ لیکن یہ امید کبھی پوری نہیں ہو پائی۔ اس کے بجائے صنعتی انقلاب نئے مسائل اور استحصال اور ناانصافی لے کر آیا۔ چارلس ڈکنز نے Hard Times میں صنعتی شہر کو دوزخ کے طور پر پیش کیا اور دکھایا کہ جدید عملیت پرست (Pragmatic) عقلیت پسندی اخلاقیات اور انفرادیت (Individuality) کو تباہ کر سکتی ہے۔ نئے مہانگر (Megacities) بے پناہ ذہنی انتشار کو جنم دیتے ہیں۔ رومانوی شعراء جنہوں نے ''تاریک شیطانی کارخانوں'' کی مذمت کی تھی' شہری زندگی سے نفور تھے اور انہوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے تباہی سے محفوظ دیہاتوں کی مثبت امنگ پیدا کی۔ برطانوی نقاد جارج سٹائنر لکھتا ہے کہ 1830ء کی دہائی کے دوران پنپنے والا مصوری کا انوکھا مکتب ''جدیدیت کا ردِ خواب'' (Counter-Dream Of Modernity) قرار دیا جا سکتا ہے۔ جدید شہروں' لندن' پیرس اور برلن کو' جو کہ مغرب کے عظیم کارنامے کی علامت ہیں' کسی ناقابل تصور المیے کی زد میں آ کر کھنڈر بنے ہوئے دکھایا گیا تھا۔لوگ تہذیب کی بربادی کا تصور کرنے لگے تھے اور اس کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے عملی اقدامات اٹھانا شروع ہو گئے تھے۔

فرانس پروشیا جنگ کے بعد یورپ کی اقوام نے اسلحے کی ایک مجنونانہ دوڑ شروع کر دی' جو کہ پہلی عالمی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جنگ کو ڈارونی وجوب (Darvinian Necessity) تصور کر رہے تھے' جس میں صرف طاقتور ترین ہی زندہ بچتا۔ کسی جدید قوم کو سب سے بڑی فوج اور انتہائی ہلاکت خیز ہتھیاروں کا حامل ہونا چاہیے تھا' جو کہ سائنس مہیا کر سکتی تھی جبکہ یورپی ایک ایسی جنگ کے خواب دیکھتے تھے جو قوم کی روح کو ایک اذیت دہ تحریم و تقدیس کے ذریعے پاک صاف کر دے گی۔ برطانوی ادیب آئی۔ ایف۔کلارک نے واضح کیا ہے کہ 1871ء سے لے کر 1914ء کے دوران کوئی برس نہیں تھا جب بعض یورپی ملکوں میں کسی نہ کسی ناول یا افسانے میں مستقبل میں ہونے والی ہولناک جنگ کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ "Next Great War" کو ایک دہشت ناک لیکن ناگزیر آزمائش تصور کیا گیا: تباہی اور بربادی کے بعد قوم ایک نئی اور اعلیٰ زندگی کی طرف جائے گی۔ تاہم انیسویں صدی کے عین اختتام پر برطانوی ناول نگار ایچ۔جی۔ویلز (H.G.Wells) نے اس یوٹوپیائی خواب کو (1898ء) The War Of The Worlds میں باطل ٹھہرایا اور واضح کیا کہ یہ کہاں لے جا رہا ہے۔ اس ناول میں حیاتیاتی جنگ کے نتیجے میں آبادی سے خالی ہو جانے والے لندن کی ہولناک تصویریں پیش کی گئی تھیں اور انگلستان کی سڑکوں کو پناہ گزینوں سے بھرا ہوا دکھایا گیا تھا۔ وہ فوجی ٹیکنالوجی کے خطرات کی پیش بینی پر قادر تھا۔ وہ درست تھا۔ اسلحے کی دوڑ سومے (Somme) کی طرف لے گئی اور جب 1914ء میں جنگ عظیم چھڑی تو چالیس برس سے جنگوں کو ختم کر دینے والی جنگ کے خواب دیکھنے والے یورپ کے لوگ اس تنازعے میں جوش و خروش کے ساتھ شامل ہوئے' جسے یورپ کی اجتماعی خودکشی کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ جدیدیت کے کارناموں کے باوجود وہاں ایک آرزوئے مرگ (Death Wish) موجود تھی' کیونکہ یورپ کی قومیں خود کو تباہ کرنے کے کجرویانہ تصور میں محو تھیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکہ کی ابتر صورتِ حال:

امریکہ میں بعض زیادہ قدامت پسند پروٹسٹنٹ ایسے ہی ایک تصور کی گرفت میں تھے' تاہم ان کے ڈراؤنے خواب نے ایک مذہبی صورت اپنا لی تھی۔ امریکہ بھی ایک ہولناک تنازعے اور نتیجے میں رونما ہونے والے اینٹی کلائمیکس سے گزر چکا تھا۔ امریکیوں نے شمالی اور جنوبی ریاستوں کے مابین خانہ جنگی (65-1861ء) کو الہامی تناظر میں دیکھا تھا۔ شمال والوں کو یقین تھا کہ یہ تنازعہ قوم کو پاک صاف کر دے گا۔ سپاہی ''لارڈ کی آمد کی شان'' کے گیت گاتے تھے۔ مبلغین ایک آرماگیڈن (Armageddon) * روشنی اور تاریکی' آزادی اور غلامی کے مابین ایک جنگ کی باتیں کرتے تھے۔ وہ پیش بینی کرتے کہ اس آتشیں آزمائش سے' ققنس * کی طرح ایک نیا انسان اور ایک نیا نظام ابھرے گا۔ لیکن امریکہ میں تو کوئی بہادر نئی دنیا بھی نہیں تھی۔ اس کے بجائے جنگ کے اختتام تک' پورے کے پورے شہر برباد ہو چکے تھے' خاندان منتشر ہو گئے تھے اور سفید فام جنوبی ردعمل نمودار ہوا تھا۔ یوٹوپیا کی بجائے شمالی ریاستیں زرعی سے صنعتی معاشرے کی طرف تیز رفتار اور اذیت دہ منتقلی کے تجربے سے گزریں۔ نئے شہر تعمیر ہوئے' پرانے شہر بہت زیادہ پھیل گئے۔ جنوبی اور مشرقی یورپ سے تارکین وطن کے ہجوم امڈ پڑے۔ سرمایہ داروں نے لوہے' تیل اور سٹیل کی صنعتوں سے خوب مال کمایا جبکہ محنت کش غربت کی سطح سے بھی نیچے زندہ تھے۔ کارخانوں میں عورتوں اور بچوں کا استحصال ہوتا تھا: 1890ء تک ہر پانچ میں سے ایک بچہ مزدوری کرتا تھا۔ حالاتِ کار (Conditions) بے حد خراب' اوقاتِ کار (Hours) بہت لمبے اور آلاتِ کار (Machinery) غیر محفوظ ہوتے تھے۔ شہر اور دیہات میں ایک نئی خلیج جنم لے چکی تھی' کیونکہ امریکہ کے کافی زیادہ علاقے خصوصاً جنوبی علاقے' زرعی ہی رہے۔ اگر یورپ کی خوشحالی تلے ایک خلا موجود تھا تو امریکہ ایک ایسا ملک بن رہا تھا جس کا قلب (Core) نہیں تھا۔

---

* یہ بائبل کی اصطلاح ہے' جو معرکہ حق و باطل کا مفہوم رکھتی ہے۔ (مترجم)

* قدیم مصری قصے کہانیوں کا ایک خوبصورت پرندہ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی قسم کا منفرد پرندہ تھا' جو پانچ یا چھ سو سال زندہ رہنے کے بعد اپنے آپ کو جلا کر راکھ کر لیتا تھا اور اسی راکھ سے بالکل جوان ہو کر جنم لیتا تھا۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکی پری ملینیئل ازم:

''مستقبل کی جنگ'' کا سیکولر تصور' جس نے یورپ کے لوگوں پر سحر طاری کر رکھا تھا' زیادہ مذہبی امریکیوں کو راغب نہیں کر پایا۔ اس کے بجائے بعض امریکیوں نے معاشرے کو عروج پر لے جانے والی خداوند اور شیطان کی آخری جنگ کا خواب دیکھتے ہوئے ایک زیادہ مبالغہ آمیز دلچسپی پروان چڑھا لی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں امریکہ میں فروغ پانے والے نئے الہامی وژن کو pre millennialism کہا جاتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مطابق حضرت عیسیٰ " اپنی ہزار سالہ بادشاہت قائم کرنے سے ''پہلے'' زمین پر واپس آئیں گے۔ (روشن خیالی کے زیادہ پرانے اور امید پرستانہ post millennialism کے مطابق' جس کو لبرل پروٹسٹنٹ ہنوز مانتے تھے' انسان اپنی کوشش سے خداوند کی بادشاہت قائم کریں گے۔ یعنی حضرت عیسیٰ " ہزار سالہ دور قائم ہو جانے کے ''بعد'' زمین پر واپس آئیں گے) امریکہ میں نئے پری میلینیئم ازم کا پرچار انگریز جان نیلسن ڈربی (82-1800ء) نے کیا تھا' جس نے برطانیہ میں کچھ پیروکار تو حاصل کر لیے تھے تاہم اس نے زیادہ مقبولیت کے لیے 1859ء سے لے کر 1877ء کے دوران چھ مرتبہ امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ اس کے وژن کے مطابق تباہی کی طرف بڑھتی ہوئی جدید دنیا میں کوئی شے اچھی نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انسان زیادہ نیک ہونے کی بجائے' جیسا کہ روشن خیال مفکروں کو امید تھی' اس قدر اخلاق باختہ ہو رہے ہیں کہ خداوند کو جلد مداخلت کرنا پڑے گی اور وہ نوعِ انسان پر ناگہانی آفت نازل کرتے ہوئے معاشرے کو تباہ کر دے گا۔ تاہم اس سخت آزمائش کے بعد سچے عیسائی سرخرو ہوں گے اور حضرت عیسیٰ کی آخری فتح اور عظیم الشان بادشاہت میں مزے کریں گے۔

تاریخ کا اختتام:

ڈربی نے بائبل میں صوفیانہ معانی نہیں ڈھونڈے' وہ تو اسے ایک ایسی دستاویز تصور کرتا تھا جس میں صداقت بہت کم تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کتاب الہام کے مصنفین نے علامتی انداز میں بات نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے درست پیش گوئیاں کی تھیں' جو جلد ہی لفظ بہ لفظ پوری ہونے والی ہیں۔ گویا اب پرانی اساطیر کو حقیقی Logoi کے طور پر دیکھا گیا تھا' صداقت کی واحد شکل' جسے بہت سے مغربی لوگ تسلیم کر سکتے تھے۔ ڈربی نے نجات کی پوری تاریخ کو سات ادوار یا ''مذہبی نظاموں'' میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس نے یہ سکیم بائبل کے بغور مطالعے سے اخذ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ اس نے توضیح کی کہ ہر دور کا خاتمہ تب ہو گیا جب انسان اس قدر برے ہو گئے کہ خداوند کو انہیں سزا دینا پڑی۔ گزشتہ ادوار زلزلے' سیلاب' اور حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیے جانے جیسے المیوں پر ختم ہوئے تھے۔ اب انسان چھٹے دور میں جی رہا ہے' خداوند اسے بھی جلد ہی ایک عدیم النظیر خوفناک تباہی سے دوچار کر دے گا۔ اینٹی کرائسٹ (Anti Christ) ' جھوٹا نجات دہندہ' جس کی اختتام The End سے قبل آمد کے بارے میں سینٹ پال پیش گوئی کر چکا ہے' اپنی جھوٹی ترغیبات سے دنیا کو دھوکا دے گا اور ہر شخص کو ورغلا لے گا اور یوں نوع انسان پر فتنہ و فساد کا عہد وارد ہو گا۔ سات سال تک اینٹی کرائسٹ جنگ چھیڑے رکھے گا' ان گنت لوگوں کو قتل کر دے گا اور ہر مخالف کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ آخر کار حضرت عیسیٰؑ زمین پر آئیں گے' اینٹی کرائسٹ کو شکست دیں گے' یروشلم کے باہر آرماگیڈن کے میدان میں شیطان اور شر کے لشکر سے آخری جنگ کریں گے اور ساتویں دور کا آغاز کریں گے۔ وہ ہزار برس تک حکومت کریں گے' پھر آخری حساب کتاب پر تاریخ کا اختتام ہو جائے گا۔ یہ یورپ کی مستقبل کی جنگ کے تصور کا مذہبی روپ تھا۔ یہ تصور حقیقی ارتقا کو تنازعے اور تقریباً مکمل تباہی سے لاینفک قرار دیتا تھا۔ الوہی نجات اور رحمت کے خواب کے باوجود یہ ایک فنا پرستانہ (Nihilistic) تصور تھا' جو کہ جدید آرزوئے مرگ کا اظہار کرتا تھا۔ عیسائیوں نے جدید معاشرے کی فنائے کامل کی شدید آرزو کرتے ہوئے سودائیوں کے مانند اس کا تصور کیا۔

تاہم ایک اہم فرق بھی تھا۔ جہاں یورپی یہ تصور کرتے تھے کہ ہر شخص اگلی عظیم جنگ کی آزمائش کے لیے مصروف کار ہے' وہاں ڈربی نے راہ نجات کے حامل چند منتخب لوگوں کی بھی بات کی۔ سینٹ پال کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد کے وقت جو عیسائی زندہ ہوں گے انہیں ''ہوا میں خداوند سے ملوانے کے لیے..... بادلوں میں لے جایا جائے گا۔'' اس قول کی بنیاد پر ڈربی نے کہا کہ فتنہ و فساد کے شروع ہونے سے تھوڑا ہی پہلے دوبارہ جنم لینے والے عیسائیوں پر ''وجد'' طاری ہو گا' جنہیں آسمان پر اٹھا لیا جائے گا اور اس طرح وہ آخری زمانے کی ہولناک مصیبتوں سے بچ جائیں گے۔ پری ملینیلسٹ اس وجد کو حقیقی تصور کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ جہاز' کاریں اور ٹرینیں ٹکرا جائیں گی کیونکہ دوبارہ پیدا ہونے والے پائلٹوں' آٹو ڈرائیوروں کو اوپر اٹھا لیا جائے گا' اس طرح ان کی گاڑیاں کنٹرول سے نکل جائیں گی۔ سٹاک مارکیٹ بیٹھ جائے گی اور حکومتیں ٹوٹ جائیں گی۔ جو لوگ پیچھے رہ جائیں گے' انہیں اس حقیقت کا ادراک ہو گا کہ وہ تو بدنصیب ہیں اور یہ کہ سچے عقیدے والے حق پر تھے۔ ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناخوش لوگوں کو نہ صرف فتنہ وفساد جھیلنا پڑیں گے بلکہ انہیں پتا چلے گا کہ ابدی ذلت ان کا مقدر ہے۔ پری ملینیئل ازم ایک منتقمانہ تصور تھا: منتخب لوگ بلندی سے ان افراد کی مصیبتوں کا نظارہ کریں گے جنہوں نے ان کے عقائد کا مذاق اڑایا تھا' انہیں نظر انداز کیا تھا اور اب انہیں اپنی غلطی کا' بہت دیر بعد احساس ہوگا۔ آج کل پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں کے گھروں میں ایک تصویر عام پائی جاتی ہے' جس میں ایک شخص اپنے مکان کے باہر گھاس کترتے ہوئے اپنی دوبارہ جنم لینے والی بیوی کو اوپر والی منزل کی کھڑکی سے آسمان پر جاتے ہوئے حیرت سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اساطیری واقعات کی تصویروں کے مانند یہ منظر بھی بے معنی دکھائی دیتا ہے' تاہم جو حقیقت پیش کرتا ہے وہ بڑی سفاک اور المناک ہے۔

ستم ظریفی تو دیکھئے' پری ملینیئل ازم (Premillennialism) جن سیکولر فلسفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا' مذہبی اساطیر کے مقابلے میں انہیں سے زیادہ اشتراک رکھتا تھا۔ ہیگل' مارکس اور ڈارون سب کا یہ ایقان تھا کہ ارتقا کشمکش (Conflict) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مارکس نے بھی تاریخ کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا تھا' جو ایک یوٹوپیا کی طرف ارتقا پا رہی ہے۔ ارضیات کے ماہروں نے چٹانوں اور پہاڑیوں میں متحجر (Fossilized) نباتات وحیوانات کی پرتوں میں زمین کے ارتقا کے متواتر ادوار کو پایا ہے اور بعض ماہرین ارضیات (Geologists) کا خیال ہے کہ ہر دور کا اختتام کسی المیے پر ہوا تھا۔ پری ملینیئل (Premillennial) پروگرام انوکھا تو لگتا ہے تاہم یہ انیسویں صدی کی سائنسی فکر سے ہم آہنگ تھا۔ وہ اپنے لٹرل ازم (Literalism) اور جمہوریت کی وجہ سے جدید تھا۔ اس کے مطابق ایسے کوئی پوشیدہ یا علامتی معانی نہیں ہیں۔ جن تک صرف ایک صوفیانہ اشرافیہ کی رسائی ہو۔ چنانچہ سب عیسائی' خواہ ان کی تعلیم کتنی ہی تھوڑی ہو' بائبل میں' ہر شخص کے لیے واضح طور پر موجود' سچ کو پا سکتے ہیں۔ بائبل جو کہتی ہے' وہی اس کی مراد ہوتی ہے: ایک ہزار سے مراد ہوتا ہے دس صدیاں' 484 برسوں سے اتنے ہی برس مراد ہیں' اگر پیغمبروں نے ''اسرائیل'' کی بات کی تھی تو انہوں نے چرچ کا نہیں بلکہ یہودیوں کا حوالہ دیا تھا' جب کتاب الہام'' کے مصنفین یروسلم کے باہر آرماگیڈن کے میدان میں حضرت عیسیٰؑ اور شیطان کی جنگ کی پیشگوئی لکھتے ہیں تو ایسا ہی وقوع پذیر ہوگا۔

فوری طور پر بیسٹ سیلر (Best Seller) بن جانے والی The Scofield Reference Bible (1909ء) کی اشاعت کے بعد ایک اوسط درجے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے عیسائی کے لیے بھی بائبل کا پری ملینیئل (Premillennial) مطالعہ بہت آسان ہو گیا۔ سی۔آئی۔سکوفیلڈ نے نجات کی تاریخ کا یہ ادواری تصور بائبل کے متن کے ساتھ پوری تفصیل سے بیان کیا۔ یہ تفصیلات بہت سے بنیاد پرستوں کے لیے اتنی ہی مسلمہ حیثیت اختیار کر گئیں' جتنی کہ خود بائبل کا متن رکھتا تھا۔

پری ملینیئل ازم یقینیت (Certainty) کی اس شدید خواہش کو عیاں کرتا ہے جو ایک ایسی جدیدیت کا ردعمل ہوتی ہے' جس نے ارادتاً سوالات کو بے جواب چھوڑ دیا ہو اور مطلق صداقت کے امکان کو مسترد کر دیا ہو۔ امریکی پروٹسٹنٹ بہت طویل عرصے سے ایسے ماہروں سے معاندت رکھتے تھے' جو خود کو جدید معاشرے کے طریقہ کار کا واحد سمجھنے والا باور کراتے ہوں۔ انیسویں صدی کے اواخر تک بظاہر تو جو نظر آتا تھا ویسا تھا نہیں۔ امریکی معیشت اس عرصے کے دوران ایسے شدید اتار چڑھاؤ سے گزری' جو زرعی زندگی سے مانوس لوگوں کو حواس باختہ کر دینے والے تھے۔ زبردست ابھار کے بعد شدید گراوٹ نمودار ہو جاتی' جو مالداروں کو کنگال کر دیتی' ایسا لگتا تھا معاشرے کو پراسرار' غیر مرئی ''مارکیٹ فورسز'' قابو کئے ہوئے ہیں۔ عمرانیات دانوں نے بھی کہا کہ انسانی زندگی ایک ایسی معاشی حرکیات کی گرفت میں ہے' جسے ایک غیر ماہر مشاہد سمجھ نہیں سکتا۔ ڈارونیوں (Darwinists) نے لوگوں کو بتایا کہ ہستی پر ایک ایسی حیاتیاتی کشمکش کا غلبہ ہے' جو خالی آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی۔ نفسیات داں پوشیدہ ذہن لاشعور (Unconscious Mind) کی قوت کے حوالے سے بات کرتے تھے۔ اعلیٰ نقادوں نے اس امر پر اصرار کیا کہ حد تو یہ ہے کہ خود بائبل بھی وہ نہیں ہے' جو ہونے کا وہ دعویٰ کرتی ہے اور یہ کہ ظاہری طور پر سادہ متن کو حواس باختہ کر دینے والی حد تک لاتعداد ذرائع نے تحریر کیا ہے اور ایسے ایسے مصنفوں نے اسے لکھا ہے جن کے بارے میں کبھی کسی نے نہیں سنا۔ بہت سے پروٹسٹنٹ' جو یہ توقع رکھتے تھے کہ ان کا عقیدہ انہیں تحفظ دے گا' اس پیچیدہ دنیا میں خود کو ذہنی طور پر چکرایا ہوا محسوس کرتے تھے۔ وہ تو ایک سادہ عقیدہ چاہتے تھے جسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہو۔

لیکن چونکہ انیسویں صدی کے اواخر میں سائنس اور عقلیت پسندی وقت کی آواز بن چکے تھے' اس لیے مذہب کو سنجیدگی سے لیے جانے کے لیے عقلی ہونا تھا۔ بعض پروٹسٹنٹوں نے اپنے عقیدے کو منطقی اور سائنسی اعتبار سے موزوں بنانے کا تہیہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسے کسی بھی دوسرے لوگوس کی طرح لازماً واضح' مدلل اور معروضی ہونا چاہیے۔ تاہم زیادہ تر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدید سائنس کامل یقینیت کے حاجت مندوں کے لیے موزوں نہیں تھی۔ ڈارون اور فرائڈ کے نظریات نے ثابت نہ ہو سکنے والے مفروضوں سے جنم لیا تھا' جو زیادہ روایت پسند پروٹسٹنٹوں کو ''غیر سائنسی'' لگتے تھے۔ اس کی بجائے وہ فرانسس بیکن کے ابتدائی سائنسی وژن سے رجوع کرتے تھے' جو اندازوں اور قیاس آرائیوں کو فوقیت نہیں دیتا تھا۔ بیکن کا ایقان تھا کہ ہم اپنے حواس پر مطلقاً بھروسہ کر سکتے ہیں کیونکہ صرف وہی ہمیں بالکل درست معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ دنیا کو ایک سب کچھ جاننے والے خدا نے عقلی اصولوں کے ذریعے منظم کیا تھا اور یہ کہ سائنس کا کام خیال آرائی کرنا نہیں بلکہ مظاہر کو سمجھنا اور اپنی تحقیقات کو ایسے نظریات کی صورت میں ترتیب دینا ہے' جنہیں ہر شخص سمجھ سکے۔ پروٹسٹنٹ اٹھارہویں صدی کی سکاٹش روشن خیالی کے فلسفے کی طرف بھی مائل تھے' جس نے کانٹ کی موضوعی علمیات (Epistemology) کی مخالفت کی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ صداقت معروضی ہے اور ''عقل سلیم'' کے مالک ہر مخلص انسان کے لیے دستیاب ہے۔

یقینیت کی شدید خواہش اس خلا کو' جو کہ جدید تجربے میں مرکزیت رکھتا تھا۔ امریکی پروٹسٹنٹ آرتھر پیٹرسن بائبل کی توضیح ''ایک حقیقتاً غیر جانبدارانہ اور سائنسی روح'' کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی کتاب (1895ء) Many Infallible Proofs کا عنوان ہی یقینیت کی اس قسم کو ظاہر کرتا ہے' جو کہ اسے مذہب سے مطلوب تھی:

> ''میں ایسی انجیلی (Biblical) الٰہیات کو پسند نہیں کرتا ہوں..... جو مفروضے سے شروع ہوتی ہے اور حقائق اور فلسفے کو ہمارے کھوکھلے عقائد سے موزونیت کے لیے چھپاتی ہے۔ بلکہ میں تو ایک بیکونیئن (Baconian) نظام والی الٰہیات کو پسند کرتا ہوں' جو کہ پہلے تو خداوند کے کلام کی تعلیمات کو مجتمع کرتی ہے اور پھر ایسے عمومی قانون تلاش کرتی ہے' جن کی بنیاد پر حقائق کو ترتیب دی جا سکتی ہے''۔

یہ ایک قابل فہم خواہش تھی' لیکن بائبل کی Mythoi کبھی اتنی واقعی (Factual) نہیں رہی تھی جتنی کہ پیٹرسن توقع کرتا تھا۔ اساطیری زبان کو اس کی علت غائی (Raison d'etre) کھوئے بغیر اطمینان بخش انداز میں عقلیت پسندانہ زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری کی طرح یہ ایسے معانی کی حامل ہوتی ہے' جو اس قدر رفیع ہوتے ہیں کہ انہیں کسی دوسرے طریقے سے بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر الٰہیات اپنے آپ کو سائنس میں ڈھالنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی کوشش کرتی تو وہ عقلیت پسندانہ فلسفے کے صرف ایک کیری کیچر (Chricature) ہی کو جنم دے سکتی تھی' کیونکہ یہ صداقتیں سائنسی طور پر ثابت کیے جانے کے لیے نہیں ہوتیں۔ یہ جعلی مذہبی Logos ناگزیر طور پر مذہب کو مزید بے وقار کر دیتا ہے۔

پرنسٹن' نیوجرسی کے نیولائٹ پریسبائٹیرین پادریوں کی درس گاہ اسی سائنسی پروٹسٹنٹ ازم کا قلعہ بن گئی تھی۔ اصطلاح ''قلعہ'' اس لیے موزوں ہے کیونکہ عقلیت پسند عیسائیت اکثر و بیشتر عسکری مثالیں استعمال کرتی تھی اور مدافعتی سی دکھائی دیتی تھی۔ 1873ء میں چارلس ہوج نے' جو کہ پرنسٹن یونیورسٹی میں الٰہیات کا صدر نشیں تھا' اپنی دو جلدوں پر مشتمل کتاب Systematic Theology کی پہلی جلد شائع کروائی۔ اس کا عنوان ہی اس کے سائنسی جھکاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ الٰہیات داں کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ لفظوں سے ''ماورا'' معانی کو تلاش کرے بلکہ اس کی ذمہ داری تو صرف اتنی سی ہے کہ صحیفے کی واضح تعلیمات کو عمومی صداقتوں کے ایک نظام میں ترتیب دے۔ بائبل کا ہر لفظ الوہی ہے اور اسے لازماً سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے' اسے استعاراتی یا علامتی تشریحات سے مسخ نہیں کرنا چاہیے۔ چارلس کے بیٹے آرچیبالڈ اے۔ ہوج نے' جس نے 1878ء میں اپنے باپ کی جگہ سنبھالی' اپنے مضمون The Princeton Review میں' جو اس نے ایک نوجوان ساتھی بنجامن وارفیلڈ کے ساتھ مل کر لکھا تھا' بائبل کی لفظی صداقت کا دفاع کیا۔ اس مضمون نے تو کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیا۔ ان کو یقین تھا کہ بائبل کے تمام قصے اور بیانات ''مطلق طور پر غلطیوں سے مبرا ہیں اور ان پر عقیدہ رکھنا اور ان کے مطابق عمل کرنا فرض ہے۔'' بائبل نے جو کچھ کہا ہے وہ ''حقیقت'' ہے۔ اگر بائبل کہتی ہے کہ وہ الوہی ہے تو یہ درست ہے۔ یہ ایک گول مول استدلال تھا' جو اور تو سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن سائنسی نہیں۔ اس قسم کی سوچ کسی عقلی موضوعیت کی حامل نہیں ہوتی' کسی بھی متبادل سے محروم ہوتی ہے اور صرف اپنی ہی حدوں میں مقید ہوتی ہے۔ پرنسٹن کے عقل پر اعتماد نے ہی اسے جدیدیت کے موافق بنا دیا تھا لیکن اس کے دعوے حقائق سے متصادم تھے۔ وارفیلڈ نے بعد میں ایک مضمون میں لکھا: ''عیسائیت درست دلیل کے ذریعے ہی لوگوں کو مائل کر سکتی ہے۔ ایسا صرف استدلال کے توسط سے ہوا کہ وہ اپنی بادشاہت کے راستے پر اتنا آگے پہنچ گئی ہے۔ نیز یہ بھی صرف استدلال کی بدولت ممکن ہے کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کو زیر کر لے۔'' عیسائی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام ماقبل جدید مذہب کی طرح' عقل کو صرف اساطیری تناظر میں ہی استعمال کیا جاتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا ہے۔ عیسائیت نے ''درست دلیل'' کی بجائے' جو کہ عیسائیت عقیدے کی ''واحد'' کشش کبھی نہیں رہی' تصوف' وجدان اور عبادات پر بھروسہ کیا ہے۔ وارفیلڈ کی عسکری سوچ' جو استدلال کے ذریعے عقیدے کے ''دشمنوں'' کی مغلوبیت کی پیش بینی کرتی تھی' ایک عدم تحفظ کا اظہار تھی۔ اگر عیسائی صداقت حقیقتاً اتنی ہی واضح اور بدیہی تھی تو اتنے زیادہ لوگوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیوں کیا؟

پرنسٹن الٰہیات میں مایوسی موجود تھی۔ چارلس ہوج نے 1874ء میں اعلان کیا ''مذہب کو سائنسی انسانوں کے بہت بڑے طبقے کے خلاف زندگی کی جنگ لڑنا ہوگی۔'' یہ امر ان عیسائیوں کے لیے تشویش انگیز تھا' جنہوں نے تب سائنسی استدلال کا مؤقف اپنا لیا تھا کہ جب فطری سائنس دانوں کے نظریات بائبل کے لفظی معانی سے متصادم دکھائی دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہوج نے ایک مضمون بعنوان (What is Darwinism(1874ء لکھا' جو کہ ارتقاء کے مفروضے پر پہلا بھرپور مذہبی حملہ تھا۔ بیکونین (Baconian) ہوج کے لیے ڈارونیت (Darwinism) بُری سائنس تھی۔ اس نے Origin* کا بغور مطالعہ کیا اور ڈارون کی اس رائے کو سنجیدگی سے نہیں لیا کہ فطرت کا سارا نظام خدا سے آزادانہ طور پر اتفاقاً وجود میں آیا ہے۔ اس طرح اس نے رونما ہوتی ہوئی پروٹسٹنٹ بنیاد پرستی کی محدود ذہنیت کو بے نقاب کر دیا: ہوج کا عقیدہ فقط یہ تھا کہ جو عقیدہ اس سے مختلف ہے' وہ غلط ہے۔ اس نے زور دے کر کہا کہ ''ایک عام ذہن کے لیے یہ یقین کرنا مطلقاً ناممکن ہے کہ آنکھ اتفاقاً بن گئی تھی۔'' انسانوں کا فرض ہے کہ ڈارون کے جیسے ''تمام مفروضوں اور نظریات'' کی مخالفت کریں' ''جو کہ مسلمہ صداقتوں سے متصادم ہوں۔'' یہ ''عقل سلیم'' کے لیے ایک جوابِ دعویٰ تھا' خدا نے انسانی ذہنوں کو ''بے خطا وجدان'' عطا کیے ہیں اور اگر ڈارون' ان سے اختلاف کرتا ہے تو اس کے مفروضے مہمل اور رد کر دیئے جانے کے قابل ہیں۔ پرنسٹن میں پروان چڑھنے والی سائنسی عیسائیت دو کشتیوں کی سوار تھی۔ ہوج قدامت پسندانہ انداز میں عقل پر قدغن لگانے کے لیے کوشاں تھا اور اس نے عقل کو وہ آزادانہ کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جو کہ جدیدیت کی خصوصیت تھا۔ تاہم اساطیر کو لوگوس کی سطح تک گھٹاتے ہوئے وہ پرانی دنیا کی روحانیت سمیت عمل کر رہا تھا۔ اس کی الٰہیات بری سائنس اور ناکافی مذہب تھی۔

تاہم پرنسٹن ہی خاص نہیں تھا۔ جہاں ہوج اور وارفیلڈ عیسائیت کو ایک درست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقیدے کے طور پر پیش کرنے کا آغاز کر رہے تھے اور عقائدی آرتھوڈوکسی پر زور دے رہے تھے وہاں دیگر پروٹسٹنٹ ایک زیادہ لبرل مؤقف اپنا رہے تھے مثلاً ایک اہم انسدادیت پسند (Abolitionist) * ہنری وارڈ بیچر (87-1813ء) کے خیال میں کٹر مذہبی عقیدہ (Dogma) ثانوی اہمیت کا حامل تھا اور دوسروں کو مختلف الٰہیاتی آراء کا حامل ہونے کی وجہ سے سزا دینا غیر عیسائی (Unchristian) عمل تھا۔ لبرل لوگ ڈارون ازم یا بائبل کی تنقید عالیہ (Higher Criticim) * جیسے جدید سائنسی نظریات کو قبول کرتے تھے۔ بیچر کی رائے میں خدا کوئی دور دراز' الگ تھلگ حقیقت نہیں بلکہ یہیں فطری اعمال میں موجود ہے لہٰذا نظریہ ارتقا خدا کی اپنی تخلیق میں مسلسل دلچسپی لینے کی شہادت دیتا ہے۔ عقائدی اصلاح سے زیادہ بہتر عیسائی محبت کو عملی طور پر اپنانا ہے۔ لبرل پروٹسٹنٹ اس یقین کے ساتھ کہ انسان دوستی کے ذریعے دنیا میں انصاف والی خدا کی بادشاہت قائم کر سکتے ہیں' غریبوں کی بستیوں اور شہروں میں سماجی خدمات کی انجام دہی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ یہ ایک امید پسندانہ الٰہیات تھی' جس نے خوش حال متوسط طبقے کو متاثر کیا' جو کہ جدیدیت کے ثمرات سے لطف اندوز ہونے کی حیثیت میں تھے۔ 1880ء کی دہائی تک شمالی ریاستوں کے اہم پروٹسٹنٹ سکولوں میں اس نئی الٰہیات کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ جان ہیسکن نے (1897ء) Evolution and Religion میں اور جان فسک نے (1899ء) Through Nature to God میں اس یقین کا اظہار کیا کہ سائنس اور مذہب میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ دونوں ہی الوہی ہستی کو دنیا میں ہر جگہ موجود مانتے ہیں' نبض کائنات کی ہر حرکت خدا کی موجودگی کو منکشف کرتی ہے۔ ساری تاریخ میں انسان روحانی شعور کو پروان چڑھاتا رہا ہے اور اب نوع انسان ایک نئی دنیا کی دہلیز پر کھڑی ہے' جس میں مردوزن بالآخر اس حقیقت کا ادراک کریں گے کہ نام نہاد ''مافوق الفطرت'' (Supernatural) دنیوی

* چارلس ڈارون کی کتاب "Origin Of Species" کا معروف حوالہ جاتی نام۔ اسی کتاب میں اس نے اپنا تاریخ ساز نظریہ ارتقا پیش کیا تھا۔ (مترجم)

* Abolitionism یا انسدادیت ایک امریکی رجحان تھا' جو انیسویں صدی میں سماجی برائیوں اور بالخصوص غلامی کے انسداد کے لیے رونما ہوا تھا۔

* بائبل کا ایسا مطالعہ جس میں اس کی تالیف کی تاریخ' تاریخی اعتباریت' استناد اور مصنفین کے مدعا اور مرادی معانی پر زور دیا جائے۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انہیں خدا سے اپنی عمیق ہم آہنگی کا ادراک ہوگا اور ایک دوسرے کے ساتھ امن کے ساتھ جییں گے۔ تمام ملینیل تصورات کے مانند اس لبرل الٰہیات کا مقدر بھی مایوسی تھی۔ عظیم تر ہم آہنگی پانے کی بجائے امریکی پروٹسٹنٹوں کو آگاہی ہو رہی تھی کہ وہ عمیق حد تک اختلافات کا شکار ہیں۔ ان کے اختلافات فرقوں کو منقسم کر دینے کا خطرہ بن گئے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فساد کی جڑ نظریہ ارتقا نہیں بلکہ تنقید عالیہ (Higher Criticism) تھی۔ لبرل لوگوں کا ایقان تھا کہ ہوسکتا ہے نئے نظریات بائبل کے بعض پرانے اعتقادات کو رد کرتے ہوں تاہم آگے چل کر وہ صحیفے کے گہرے مطالعے کا پیش خیمہ بنیں گے۔ لیکن روایت پسند لوگوں کے لیے ''تنقید عالیہ'' ایک ڈراؤنی اصطلاح تھی۔ یہ پرانی یقینیت کو مٹانے والے صنعتی معاشرے کی ہر غلط شے کی علامت دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت مقبولیت دینے والوں نے نئے تصورات کو عام لوگوں تک پہنچا دیا تھا اور عیسائی یہ جان کر سخت الجھن کا شکار تھے کہ پرانے مسلمہ عقائد غلط تھے۔ 1888ء میں برطانوی ناول نگار مسز ہمفری وارڈ نے Robert Elsmere شائع کروایا' جس میں ایک نوجوان پادری کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ تنقید عالیہ اس کے عقیدے کی جڑیں کھوکھلی کر دیتی ہے اور وہ اپنے منصب سے استعفیٰ دے کر لندن کے علاقے ایسٹ اینڈ میں فلاحی خدمات انجام دینے لگتا ہے۔ یہ ناول بیسٹ سیلر بن گیا' جس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی تھی کہ لاتعداد لوگ ہیرو جیسے شکوک کا شکار تھے۔ جیسا کہ رابرٹ کی بیوی بھی اپنے شک اظہار کرتی ہے۔

جدید دنیا کی عقلیت پسندی نے اب بہت سے مغربی عیسائیوں کے لیے اسطورہ کے کردار اور قدر و قیمت کی تفہیم ناممکن بنا دی تھی۔ وہ سوچتے تھے کہ عقیدے کو عقلی ہونا پڑے گا' مقدس کو لوگوس میں ڈھلنا ہوگا۔ اب واقعی یا سائنسی صداقت کے علاوہ کسی اور طرح کی صداقت کا تصور کیا جانا دشوار تھا۔ ادھر ایک گہرا خوف بھی پیدا ہو گیا تھا کہ یہ نئے انجیلی نظریات عیسائیت کے بنیادی ڈھانچے کو زمیں بوس کر دیں گے اور باقی کچھ نہیں رہے گا۔ ایک مرتبہ پھر خلا نمایاں ہو گیا تھا۔ امریکی میتھڈسٹ پادری الیگزینڈر میک الستر نے کہا: ''اگر ہمارے پاس کوئی خطا سے مبرا معیارات نہیں ہوئے تو پھر ہوسکتا ہے کوئی معیار ہی نہ رہے۔ ایک معجزے کو رد کیا جائے تو پھر سبھی کو رد کرنا پڑتا ہے۔ لوتھرن پادری جیمز ریمینائیڈر نے کہا کہ ایک پرانے عقیدے کو رد کرنے کے بعد دوسرے کی حقانیت پر بھی سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جب ایک مرتبہ انجیلی صداقتوں کو اس انداز سے رد کر دیا گیا تو تمام شائستہ اقدار مٹ جائیں گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میتھڈسٹ مبلغ لینڈر ڈبلیو۔ مچل نے الزام لگایا کہ تنقید عالیہ تاریکی' کفر اور لاادریت (Agnosticism) پھیلا رہی ہے۔ پریسبائیٹرین ایم۔بی۔لیمبڈن نے اسے طلاق' ناجائز نفع خوری' بدعنوانی' جرائم اور قتل کی بڑھتی ہوئی شرح کی وجہ قرار دیا۔

تنقید عالیہ پر مزید عقلی طور پر بحث نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے بنیادی خوف ابھار دیئے تھے۔ جب ایک لبرل پریسبائیٹرین چارلس برگز پر کفر کا الزام لگایا گیا اور تنقید عالیہ کا کھلم کھلا دفاع کرنے پر 1891ء میں نیویارک پریسبائیٹری (Persbytery) نے اس پر مقدمہ قائم کر دیا' یہ خبر ''نیویارک ٹریبیون'' نے اپنے صفحۂ اول پر شائع کی۔ جب اسے بری الذمہ قرار دیا گیا تو اسے نیویارک ٹریبیون نے تنقید عالیہ کی فتح قرار دیا' لیکن فرقے کی جنرل اسمبلی نے فیصلہ نامنظور کر دیا اور برگز کو پادری کا منصب چھوڑنا پڑا۔ یہ مقدمہ تند و تلخ ہو گیا تھا' اس سے جنم لینے والے احتجاج کے بعد فرقہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد دو سو پریسبائیٹرینوں نے ووٹ ڈالے' نوے نے برگز کے خیالات کی مخالفت کی۔ یہ اس زمانے میں کفر کا سب سے زیادہ مشہور مقدمہ تھا' جس کے دوران یکے بعد دیگرے لبرل لوگوں کو ان کے فرقوں سے نکال دیا گیا۔

1900ء تک ایسا لگتا تھا کہ جنون ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ تنقید عالیہ کے تصورات ہمہ گیر قبولیت پا چکے تھے' لبرل اب بھی بیشتر فرقوں میں اہم مناصب پر فائز تھے اور قدامت پسند پرسکون اور خاموش تھے۔ تاہم یہ ظاہری سکون فریب کارانہ تھا۔ اس زمانے کے مشاہدین اس امر سے آگاہ تھے کہ تقریباً تمام فرقوں ـــ پریسبائیٹرین (Presbyterian)' میتھڈسٹ (Methodist)' ڈسائپلز (Disciples)' اپیسکوپیلین (Episcopalian)' اور بپٹسٹ (Baptist) ـــ میں بائبل کو پڑھنے سمجھنے کے ''نئے'' اور ''پرانے'' طریقوں کی ترجمانی کرنے والے دو متخالف ''چرچ'' موجود تھے۔

امریکی بنیاد پرستی کا بانی:

بعض عیسائیوں نے مستقبل کی جدوجہد کے لیے تحریک دینا شروع کر دی تھی۔ 1886ء میں احیاء پسند ڈوائٹ موڈی (99-1837ء) نے تنقید عالیہ کی تعلیمات سے مقابلہ کرنے کے لیے شکاگو میں موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد ''گیپ مین'' ("Gap-Men") کا کیڈر تشکیل دینا تھا' جو پادریوں اور عام لوگوں کے درمیان کھڑے ہو سکیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ان جھوٹے تصورات سے جنگ کریں جو اس کے ایقان کے مطابق قوم کو تباہی کے دھانے پر لے آئے تھے۔ موڈی کو امریکی بنیاد پرستی کا بانی (Father of the American Fandamentalism) کہا جاتا ہے اور پرنسٹن کی طرح اس کا بائبل انسٹی ٹیوٹ بھی قدامت پسندانہ عیسائیت کا قلعہ بن گیا۔ تاہم موڈی کو ہوج اور وار فیلڈ کی نسبت کٹر مذہبی عقائد (Dogma) سے کم دلچسپی تھی۔ اس کا پیغام سادہ اور بنیادی طور پر جذباتی تھا: گناہوں سے بھری ہوئی دنیا کو عیسیٰؑ ہی پاک کر سکتے ہیں۔ موڈی کی ترجیح روحوں کی نجات تھی اور وہ گناہگاروں کو بچانے کے کام میں سب عیسائیوں کے ساتھ تعاون کر سکتا تھا' خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی ہو۔ وہ لبرل لوگوں کی طرح سماجی اصلاح کا حامی تھا اور اس کے انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل ہونے والے گریجویٹ غریبوں کے لیے مبلغ بن جاتے تھے۔ تاہم موڈی ایک پری ملینیلسٹ (Permillennialist) تھا اور اسے یقین تھا کہ اس کے زمانے کے بے خدا نظریات دنیا کی تباہی کا پیش خیمہ ہوں گے۔ جیسا کہ لبرل لوگوں کا ایقان تھا کہ معاملات صحیح نہیں چل رہے تھے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ 1886ء میں یعنی جس سال اس نے اپنا بائبل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تھا' ہے مارکیٹ سکوائر' شکاگو میں ایک ایسا المیہ وقوع پذیر ہوا' جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹریڈ یونین کے ایک جلوس کے دوران پولیس اور مظاہرین کے مابین کشمکش ہو رہی تھی کہ ایک بم پھٹا' جس سے سات پولیس والے ہلاک اور ستر زخمی ہو گئے۔ ہے مارکیٹ کا فساد صنعتی معاشرے کی ساری برائیوں اور خطرات کا نچوڑ لگتا تھا اور موڈی اسے صرف مذہبی تناظر ہی میں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے پیش گوئی کی کہ ''یا تو ایسے لوگوں کو ایونجیلائزڈ کرنا ہو گا یا پھر کمیونزم اور کفر اتنے پھیل جائیں گے کہ اس ملک میں دہشت کا ایسا راج قائم ہو گا جو پہلے کسی نے سنا بھی نہیں ہو گا''۔

بائبل انسٹی ٹیوٹ ایک اہم بنیاد پرست ادارہ بن گیا۔ وولوژن Yeshiva کی طرح وہ بھی بے خدا دنیا میں ایک محفوظ اور مقدس قلعہ بن گیا' جس نے جدید معاشرے کے خلاف مستقبل میں جوابی حملہ کرنے کے لیے ایک کیڈر تیار کرنا تھا۔ دوسرے قدامت پسند پروٹسٹنٹوں نے' جنہوں نے آگے چل کر رونما ہونے والی بنیاد پرست تحریک میں کردار ادا کرنا تھا' موڈی کی راہ اپنا لی۔ 1920ء میں ولیم بیل ریلے نے نارتھ ویسٹرن بائبل سکول کی بنیاد رکھی اور 1907ء میں تیل کے مہابیوپاری (Oil Magnet) لائمین سٹیوارٹ نے لاس اینجلس میں

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بائبل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ بڑے فرقوں میں جو قدامت پسند خود کو لبرلوں سے بچھڑے ہوئے محسوس کرتے تھے' وہ متحد ہونے لگے۔ انیسویں صدی کے آخر میں پہلی ''پیش گوئی اور بائبل کانفرنس'' (Prophecy and Bible Conferences) منعقد ہوئیں۔ یہاں قدامت پسند پروٹسٹنٹ بائبل کو ایک لفظی اور عام فہم انداز میں پڑھ سکتے تھے' تنقید عالیہ سے اپنے ذہنوں کو صاف کر سکتے تھے اور اپنے پری ملینیل تصورات پر گفتگو کر سکتے تھے۔ وہ ایک الگ تشخص کو مستحکم کرنے کا آغاز کر رہے تھے اور زیادہ سے زیادہ پر ہجوم ہوتی ہوئیں کانفرنسوں کے دوران انہیں ایک آزاد قوت کے طور پر اپنے خفیہ امکان کا ادراک ہو رہا تھا۔

ایک مخصوص و منفرد تشخص کی تخلیق جدید تجربے کا ایک فطری ردعمل تھا۔ تازہ تازہ انڈسٹریلائزڈ شمالی شہر ایک کٹھالی (Melting Pot) بنے ہوئے تھے۔ 1890ء تک نیویارک کے ہر پانچ میں سے چار شہری یا تو نئے تارکین وطن تھے یا نئے تارکین وطن کی اولاد تھے۔ امریکہ انقلاب کے زمانے میں ایک پروٹسٹنٹ قوم تھا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ Wasp تشخص کو ''پاپسٹ'' ("Papist") سیلاب غرق کرنے والا ہے۔ بدقسمتی سے تشخص کی جدوجہد کے ساتھ یک رخے (Stereotyped) ''غیر'' (Other) کا خوف ضرور ہوتا ہے' جن کے خلاف لوگ اپنے آپ کو آنکتے ہیں۔ سازش کا ایک نفسیاتی خوف جدیدیت کے ردعملوں کی خصوصیت رہا ہے اور اسے یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کی بنیاد پرستانہ تحریکوں میں دیکھا جا سکتا ہے' جنہوں نے اپنے دشمنوں کا ایک مسخ شدہ اور اکثر و بیشتر ضرر رساں تصور وضع کر لیا تھا' جنہیں بعض اوقات تو شیطانی برائی کے طور پر پیش کیا گیا۔ امریکی پروٹسٹنٹ طویل عرصے سے رومن کیتھولکوں سے نفرت کر رہے تھے اور ڈی اسٹوں (Deists)' فری میسنوں اور مورمنوں کی سازشوں سے بھی خوف زدہ تھے' ان سب کے بارے میں کسی نہ کسی زمانے میں یہ یقین کیا جاتا تھا کہ وہ معاشرے کے عیسائی تانے بانے کو برباد کر رہے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں یہ خوف دوبارہ پیدا ہو گئے تھے۔ 1887ء میں American Protective Association قائم کی گئی' جو کیتھولوں کے خلاف قوم کی سب سے بڑی تنظیم بن گئی اور اس کے ارکان کی تعداد بائیس لاکھ پچاس ہزار افراد تک پہنچ گئی۔ انہوں نے ''پادریوں کے خطوط'' پیش کئے' جن میں امریکی کیتھولک پادریوں نے اپنے پیروکاروں سے کہا تھا کہ وہ سب پروٹسٹنٹوں کو قتل کر دیں اور امریکہ کی کافر حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ 1885ء میں جوشیاہ سٹرانگ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے Our Countryi Its Possible Future And Its Present Crisis: شائع کروائی' جس میں ''کیتھولک خطرے'' کو قوم کو درپیش سب سے زیادہ تباہ کن خطرہ قرار دیا گیا تھا۔ اس نے لکھا کہ کیتھولکوں کو ووٹ دینے سے امریکہ شیطانی اثرات کا آسان شکار بن جائے گا' امریکہ میں پہلے ہی Romanists تارکین وطن اتنی بڑی تعداد میں موجود ہیں' جو پانچویں صدی میں رومن سلطنت کے زوال کا باعث بننے والے گوتھوں اور وینڈلوں (Vandals) کی یورشوں سے دگنی ہے۔ امریکی مکمل بربادی کے واہموں کا شکار تھے' سازش کے مریضانہ نظریات نے انہیں اپنے بے نام اور بے صورت خوف کو ٹھوس دشمنوں پر چسپاں کرنے کے قابل بنا دیا تھا اور یوں اس کا علاج کرنے میں مدد دی تھی۔

سائنسی نسل پرستی:

یورپ میں ایک منفرد تشخص کی تخلیق سے مربوط سازش والا خوف ایک نئی ''سائنسی'' نسل پرستی کی صورت اختیار کر چکا تھا' جو 1920ء کی دہائی میں امریکہ میں پہنچا۔ اس کا بڑا ہدف یہودی تھے اور یہ اس جدید سائنسی کلچر کی پیداوار تھی' جس نے یورپیوں کو اپنے ماحول کو عدیم النظیر مہارت کے ساتھ قابو کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ طب اور باغبانی جیسے جدید کاموں نے لوگوں کو ضرر رساں' بھدی یا بے فائدہ اشیاء کو مٹا دینا سکھا دیا تھا۔ ایک ایسے وقت جب قوم پرستی (Nationalism) یورپی ریاستوں کا بنیادی نظریہ بن رہی تھی' یہودی خلقی اور غیر متبدل حد تک کاسموپولیٹن دکھائی دیتے تھے۔ Volk کے جوہری حیاتیاتی اور جینیاتی اوصاف کو متعین کرنے کے لیے وضع کیے گئے سائنسی نظریات اتنے محدود تھے کہ یہودیوں کو شامل کرنے سے قاصر تھے۔ جب نئی قومیں نے نئے سرے سے اپنی تعریف متعین کرنے لگیں تو انہیں ایک ''غیر'' (Other) کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے خلاف وہ اپنا نیا تعین کر سکیں اور ''یہودی'' آسانی سے دستیاب تھے۔ یہ جدید نسل پرستی' جو یہودیوں کو معاشرے سے اسی طرح نکال باہر کرنا چاہتی تھی جیسے کوئی باغباں جڑی بوٹیوں کو نکال پھینکتا ہے یا جیسے کوئی سرجن سرطان کے پھوڑے کو کاٹ دیتا ہے' سماجی انجینئرنگ کی ایک صورت تھی' جو اس تصور سے ابھری تھی کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں نہ تو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تصور صدیوں پرانے عیسائی مذہبی تعصب سے پیدا ہوا تھا اور اسے سائنسی جواز دے دیا گیا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہودی: خوف کی علامت:

تاہم اسی زمانے میں یہودی ایک ایسی علامت بھی بن گئے تھے' جس سے لوگ جدیدیت کے سماجی ابھار کے حوالے سے اپنے خوف اور تحفظات کو بڑھا سکتے تھے۔ جب یہودی گیٹوؤں سے اپنے عیسائی اڑوس پڑوس میں منتقل ہوئے اور سرمایہ دارانہ معیشت میں غیر معمولی حد تک کامیاب ہو گئے تو ایسا لگتا تھا کہ پرانے نظام کو فنا کرنے والے وہی تھے۔ یورپ کے لوگ جدیدیت کے تجربے کی ''کٹھالی'' سے گذر رہے تھے۔ نئی انڈسٹریلائزڈ دنیا پرانی حدوں کو توڑ رہی تھی اور کچھ لوگ اس اب ظاہری طور پر بے صورت' حدوں سے محروم معاشرے کو انتشار انگیز اور فنا کارانہ سمجھ رہے تھے۔ مرکزی دھارے میں گھل مل جانے والے یہودی بالخصوص تشویش انگیز لگتے تھے۔ کیا وہ اب ''غیر یہودی'' ہو گئے تھے اور اب بھی بعض لوگوں کو ناقابل عبور دکھائی دینے والی تقسیم پر غالب آ گئے تھے؟ جدید سامیت دشمنی (Antisemitism) سے ایسے لوگوں کو' جو جدیدیت کے خلفشار اور ہمہ گیر سماجی افراتفری سے پریشان تھے' اپنی مایوسی اور آزردگی کا ایک ہدف مل گیا تھا۔ ''تعین'' ان دہشت انگیز تبدیلیوں کی حدیں قائم کرنا تھا' جیسے بعض پروٹسٹنٹوں نے کٹر عقائدی تعریفوں میں یقینیت ڈھونڈی' دوسرے نے پرانی سماجی حدود کو دوبارہ استوار کر کے خلا سے بچنے کے لیے کوشاں تھے۔

1880ء کی دہائی تک روشن خیالی کی رواداری کا المناک پن واضح ہو گیا تھا۔ 1881ء میں روس میں لبرل زار الیگزینڈر کے قتل کے بعد یہودیوں پر ایک بار پھر پابندی عائد کر دی گئی کہ وہ کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔ 1891ء میں دس ہزار سے زیادہ یہودیوں کو ماسکو سے نکال دیا گیا اور 1893ء سے لے کر 1895ء کے دوران دوسرے علاقوں سے بھی یہودیوں کو بڑی تعداد میں نکال دیا گیا۔ وزارت داخلہ کی چشم پوشی یا ایما پر پوگرم (Pogrom) بھی ہوئے' جن میں یہودی کو لوٹا اور قتل کیا گیا اور کشینیو کے پوگروم (1905ء) میں تو انتہا ہو گئی کہ پچاس یہودیوں کو قتل جبکہ پانچ سو کو زخمی کر دیا گیا۔ یہودی پچاس ہزار نی سال کی اوسط سے مغرب کی طرف بھاگنے لگے اور مغربی یورپ' امریکہ اور فلسطین میں آباد ہو گئے۔ لیکن یورپ میں ان عجیب وغریب لباسوں اور اجنبی رسوم والے مشرقی یہودیوں کی آمد نے پرانے تعصّبات کو ابھار دیا۔ 1886ء میں جرمنی نے سرکاری طور پر ایک سامیت دشمن پلیٹ فارم پر اپنے پہلے پارلیمنٹری ڈپٹی کو منتخب کیا' 1893ء تک ان کی تعداد 16 ہو گئی۔ یہودیوں کو آزادی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دینے والی پہلی جدید یورپی قوم فرانس بھی سامیت دشمن کی لپیٹ میں آ گئی۔ 5 رجولائی 1895ء کو جنرل سٹاف کے واحد یہودی افسر کیپٹن الفرڈ ڈرائفس پر جھوٹے شواہد کے تحت جرمنوں کو راز منتقل کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا جبکہ ایک مشتعل ہجوم باہر نعرے لگاتا رہا: ''ڈرائفس مردہ باد! یہودی مردہ باد!''

کچھ یہودیوں نے عیسائیت قبول کر کے یا مکمل طور پر سیکولر زندگی گزارتے ہوئے گھلنے ملنے کا عمل جاری رکھا۔ کچھ یہودی روس اور دوسرے مشرقی یورپی ملکوں میں انقلابی سوشلسٹ بن کر یا ٹریڈ یونینوں کے نمایاں کارکن بن کر سیاست میں چلے گئے۔ دوسروں نے فیصلہ کیا کہ غیر یہودی معاشرے میں یہودیوں کے لیے گنجائش نہیں ہے' انہیں لازماً صیہون (Zion)' مقدس سرزمین کی طرف واپس جانا ہوگا اور وہاں ایک یہودی ریاست قائم کرنا ہو گی۔ دیگر نے ایک جدید مذہبی حل کو ترجیح دی مثلاً اصلاحی' قدامت پسند یا نیوآرتھوڈوکس (Neo-Orthodox) یہودیت۔ کچھ نے جدید معاشرے سے منہ موڑنا اور روایتی آرتھوڈوکسی سے چمٹے رہنا ہی جاری رکھا۔ یہ ہیریڈم (Haredim) یعنی ''ڈرنے والے لوگ'' نئی دنیا میں یہودیت کے مستقبل کے حوالے سے متفکر تھے اور انہوں نے پرانی دنیا کو دوبارہ تخلیق کرنے کی مایوسانہ کوشش کی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ مغربی یورپ یا امریکہ میں بھی وہ فر کے ہیٹ' سیاہ نیکریں اور کفتان پہنتے رہے جو ان کے آباؤ اجداد روس یا پولینڈ میں پہنتے تھے۔ بیشتر یہودی ایک معاند دنیا میں فنا ہونے سے بچنے اور مطلق تحفظ اور یقینیت پانے کی جدوجہد کرتے ہوئے ایک یہودی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔ بہت سوں نے خود کو مصروف جنگ تصور کیا' کچھ بقا کی جدوجہد کرتے ہوئے زیادہ عسکریت پسند بن گئے۔

یہودی بنیاد پرستی کا آغاز:

یہ کیفیت ہیبیڈ ہیسیڈ ازم میں ہونے والی ایک نئی پیشرفت میں نمایاں ہوئی' جس کا مرکز اب لیوبیوچ' روس میں تھا اور ربی شنیور زیلمن کی اولادیں سلسلہ وار اس پر حکمران تھیں۔ پانچواں ربی آر۔ شالوم ڈوبر (1920ء-1860ء)' جس نے 1893ء میں یہ خطاب حاصل کیا' یہودیوں کے مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ متفکر تھا۔ اس نے کافی سفر کیے تھے' لیتھوانیا کے مسنیگڈم سے رابطہ رکھے ہوئے تھا اور مذہب پر عمل میں کمی کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ 1897ء میں اس نے وولوژن' سلوبود کا اور میر کے مسنیگڈی Yeshivot کی طرز پر ایک ہیبیڈ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Yeshiva قائم کیا۔ وہ بھی ''لارڈ کے دشمنوں'' سے لڑنے کے لیے نوجوانوں کا ایک کیڈر تیار کرنا چاہتا تھا۔ یہ ''دشمن'' زار اور اس کے حکام نہیں تھے' بلکہ لیو بیوچ ہیسیڈازم ایک بنیاد پرست تحریک بن رہا تھا' جو ایسی تحریکوں کے عمومی انداز میں اپنے ہم مذہبوں کے خلاف مہم سے شروع ہوئی۔ پانچویں رب کے لیے خدا کے دشمن دوسرے یہودی ہی تھے' ماسکیلم' صیہونی' یہودی سوشلسٹ اور مسنیگڈم' جو اس کی رائے میں مذہب کے لیے سنگین خطرہ تھے۔ اس کے Yeshiva کے طلباء کو تامیم (Tamimim) یعنی ''پاکیزہ'' کہا جاتا تھا۔ انہیں رب کی فوج کا سپاہی بننا تھا' جو یہودیت کی بقا کو یقینی بنانے کے لیے ''کسی رورعایت یا مصالحت کے بغیر'' لڑے گی۔ ان کی جدوجہد مسیح کی آمد کا راستہ ہموار کرے گی۔

صیہونیت کا آغاز:

جدیدیت کے ان نئے یہودی ردعملوں میں سب سے زیادہ تصوراتی اور دوررس اثر والی تحریک صیہونیت (Zionism) تھی' جو فلسطین میں ایک یہودی وطن تخلیق کرنا چاہتی تھی۔ یہ کوئی یک سطحی تحریک نہیں تھی بلکہ صیہونی لیڈر ایک دوسرے سے بہت مختلف جدید نظریات سے متاثر تھے' جن میں شامل تھے: قوم پرستی' مغربی استعماریت' سوشلزم اور یہودی روشن خیالی کا سیکولر ازم۔ ڈیوڈ بن گوریان (1973ء-1886ء) کی ''لیبر زائیونزم'' (Labour Zionism)' جو کہ فلسطین میں سوشلسٹ نظام رائج کرنا چاہتی تھی' آخرکار غالب صیہونی نظریہ بن گئی' تاہم صیہونی تحریک سرمایہ داریت (Capitalism) کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ 1880ء سے لے کر 1917ء کے درمیانی عرصے میں یہودی کاروباری افراد نے فلسطین میں زمینوں کے مالک عرب اور ترک غیر حاضر زمینداروں سے لاکھوں ڈالر کی اراضی خرید کی۔ دوسرے یہودی مثلاً تھیوڈور ہرزل (1904ء-1860ء) اور شائیم ویزمین (1952ء-1874ء) سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لیے سرگرم کار ہو گئے۔ ہرزل مستقبل کی یہودی ریاست کو مشرق وسطیٰ میں ایک یورپی نوآبادی کے طور پر دیکھتا تھا۔ دوسرے بھی ایک قومی ریاست کے خواہاں نہیں تھے بلکہ نئے وطن کو یہودیوں کا ایک ثقافتی مرکز تصور کرتے تھے۔ بہت سوں کو متوقع سامیت دشمن المیے کا خوف لاحق تھا' لہٰذا یہودیوں کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری تھا کہ وہ ایک محفوظ علاقہ اور پناہ گاہ بنا لیں۔ ان کا فنا کا خوف کوئی اخلاقی یا نفسیاتی خلا نہیں' بلکہ جدیدیت کے قاتلانہ پہلو کا حقیقت پسندانہ اندازہ تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آرتھوڈوکس یہودی صیہونیت کی ہر صورت سے نفرت کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے دوران مذہبی صیہونیت (Religious Zionism) کو تخلیق کرنے کی دو کوششیں کی گئیں' تاہم کسی ایک کو بھی زیادہ حمایت حاصل نہیں ہو سکی۔ 1845ء میں سراجیوو کے ایک سیفرڈی یہودی الموسوم بہ یہودی ہئی الکلائی (1878ء-1798ء) نے صیہون کی طرف واپسی کی پرانی مسیحانہ اسطورہ کو سیاسی عمل کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ مسیح کوئی شخص نہیں ہوگا بلکہ یہ تو ایک عمل کا نام ہے جو ''یہودیوں کی اپنی جدوجہد سے شروع ہوگا' اس لیے انہیں لازماً متحد اور منظم ہو جانا چاہیے' قائدین منتخب کرنا چاہیں اور وطن سے نکل کر جن ملکوں میں آئے ہیں' انہیں چھوڑ دینا چاہیے۔'' اس کے بیس برس بعد ایک پولش یہودی زوی ہرش کیلیشر (1874ء-1795ء) نے اپنی کتاب (1862ء) Devishat Zion یعنی ''صیہون کی تلاش'' میں اسی موقف کو پیش کیا۔ الکلائی اور کیلیشر دونوں ہی قدیم اساطیر کو عقلیت پسندانہ رنگ دینے کی کوشش کر رہے تھے وہ اسے حقیقی روپ دے کر سیکولر بنانے کے خواہاں تھے۔ تاہم باعمل اور راسخ العقیدہ یہودیوں کی اکثریت کے لیے اس قسم کا ہر تصور ملعون و مردود تھا۔ جب انیسویں صدی کے اواخر میں صیہونی تحریک نے زور پکڑ لیا اور باسل اور سوئٹزرلینڈ کی بڑی کانفرنسوں کے ذریعے بین الاقوامی سطح پر بہت نمایاں مقام حاصل کر لیا تو آرتھوڈوکس یہودیوں نے سخت ترین الفاظ میں اس کی مذمت کی۔ ماقبل جدید دنیا میں اسطورہ کو عمل کا ایک خاکہ (Blueprint) تصور نہیں کیا جاتا تھا' بلکہ اسے لوگوس کے لیے ہی مخصوص سمجھا جاتا تھا۔ اسطورہ کا کردار تو ایسے عمل کو معنویت اور روحانی بنیاد عطا کرنا تھا۔ شبتائی زیوی کے معاملے نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ سائیکی کے غیر مرئی جہان سے تعلق رکھنے والی کہانیوں اور تصورات کا اطلاق سیاست کی اقلیم میں کس قدر تباہ کن ہو سکتا ہے۔ اس صدمے کے بعد سے مسیحائی متھوس کو لوگوس سمجھ کر اسے عملی اطلاق کے قابل تصور کرنے کی پرانی ممانعت اب یہودی متخیلہ میں ایک ٹیبو (Taboo) کی سی قوت و اثر کی حامل ہو گئی تھی۔ وہ سوچنے لگے تھے کہ نجات پانے یا ارض مقدس میں بادشاہت کو حقیقتاً قائم کرنے کے لیے عملی اقدامات کر کے ''اختتام کو جلد لانے'' کی انسانی کوششیں غلط ہیں۔ حد تو یہ تھی کہ یہودی صیہون کی طرف واپسی کی غرض سے زیادہ عبادت کرنے سے بھی خوفزدہ تھے۔ ان کے نزدیک اس قسم کا کوئی اقدام خدا کے خلاف بغاوت ہوتا' جو کہ تنہا نجات دلانے پر قادر تھا۔ جو شخص ایسا اقدام کرتا وہ ''دوسری طرف'' یعنی شیطانی دنیا میں چلا جاتا۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ یہودیوں کو سیاسی حوالے سے لازماً غیر فعال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہنا چاہیے۔ یہ جلا وطنی کی وجودی (Existential) صورتحال کا ایک رخ تھا۔ یہودیوں نے اپنی تاریخ سے یہ سبق سیکھا تھا کہ اسطورہ کو تاریخ میں مجسم کرنے کا عمل کس قدر ہولناک امکانات کا حامل ہوسکتا ہے اور اسی آگاہی کے ساتھ بالکل شیعہ مسلمانوں کے مانند انہوں نے بھی سیاسی عمل کو ممنوع قرار دے لیا تھا۔

عہد حاضر تک صیہونیت اور اس کی تخلیق کردہ یہودی ریاست یہودی دنیا میں جدیدیت سے کہیں زیادہ تقسیم کار ثابت ہوئی ہیں۔ صیہونیت اور یہودی ریاست کے خلاف ردعمل ہی یہودی بنیاد پرستی کے ہر روپ کے لیے طاقتور محرک بن گیا۔ ایسا بہت حد تک صیہونیت کے ذریعے ممکن ہو سکا تھا کہ سیکولر جدیدیت یہودی حیات (Jewish Life) میں داخل ہوئی اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ صرف اسی وجہ سے اولین صیہونی یہودیت کی مقدس ترین علامتوں میں سے ایک یعنی سرزمین اسرائیل کو ایک عقلی' دنیوی' اور عملی حقیقت میں ڈھالنے میں کامیاب رہے۔ سرزمین اسرائیل کو اساطیری یا ہلاقائی (Halakhically) حوالے سے پیش کرنے کی بجائے صیہونیوں نے اسے طبعی' تزویراتی اور عسکری حوالوں سے پیش کیا۔ ان ابتدائی برسوں میں بیشتر آرتھوڈوکسوں کے لیے یہ عمل ایک مقدس حقیقت کو توہین آمیز انداز میں روندنے کے مترادف تھا۔ یہ نجاست آمیزی کا ایک ارادی عمل تھا' جو صدیوں پرانی مذہبی روایت کو بے حرمت کر رہا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ سیکولر صیہونی مذہب کو کھلم کھلا رد کرتے تھے۔ ان کی تحریک دراصل یہودیت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ دہریے' سوشلسٹ اور مارکسی تھے۔ ان میں سے چند ایک ہی افراد توریت کے احکامات (Cmmamdments of Torah) پر عمل کرتے تھے۔ کچھ صیہونی مذہب سے مثبت انداز میں نفرت کرتے تھے' جو ان کے خیال کے مطابق یہودیوں کے بے عملی اپنانے اور مسیح کے انتظار میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ناکام ہو چکا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہب نے یہودیوں کو جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کرنے کا درس دینے کی بجائے انہیں دنیا سے منہ موڑ کر عجیب و غریب صوفیانہ سرگرمیوں اور مبہم کتابوں کے مطالعے میں غرق کر دیا تھا۔ یروشلم میں قدیم معبد کی آخری یادگار مغربی دیوار (Western Wall) سے لپٹ کر گریہ وزاری کرتے ہوئے یہودیوں کا نظارہ صیہونیوں کو تلخی سے لبریز کر دیتا تھا۔ مافوق الفطرت پر یہ واضح ملتجیانہ انحصار ہر اس شے کے برعکس تھا' جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ کوششیں کر رہے تھے۔ صیہونی ایک نئی یہودی شناخت تخلیق کرنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے آرزومند تھے' ایک ''نیا یہودی'' جو گیٹو کی غیر صحت بخش' محدود زندگی سے آزاد ہو۔ ان کے خیال میں ''نیا یہودی'' خودمختار ہو گا' اپنے وطن میں اپنی منزل خود متعین کرنے والا۔ تاہم جڑوں اور عزت نفس کی یہ جستجو یہودی مذہب سے آزادی کا اعلان ثابت ہوئی۔

ہر شے سے قطع نظر صیہونی عملیت پسند تھے اور اسی وصف نے انہیں جدید عہد کے افراد بنا دیا تھا۔ تاہم وہ وطن کی علامت کے دھماکہ خیز اثر سے بھی مکمل طور پر آگاہ تھے۔ یہودیت کی اساطیری دنیا میں وطن دو انتہائی مقدس حقیقتوں یعنی خدا اور توریت سے جڑا ہوا تھا۔ قبالہ کے صوفیانہ سفر میں وطن علامتی طور پر ذات (Self) کے اندر داخلی ارتفاع کا آخری مرحلہ تھا اور اس الوہی موجودگی سے مماثل تھا' جسے قبالائی اپنی ہستی میں دریافت کرتے تھے۔ اس طرح وطن یہودی تشخص میں بنیاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ صیہونیوں کی سوچ کتنی ہی عملی رہی ہو وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ کوئی اور ملک یہودیوں کو ''محفوظ'' نہیں رکھ سکتا اور انہیں نفسیاتی صحت عطا نہیں کر سکتا۔ ربیائی ایسٹیبلشمنٹ کا شدید ترین مخالف پیرز سمولینسکن (95-1842ء) اس امر کا قائل تھا کہ یہودی ریاست کے لیے واحد موزوں مقام فلسطین تھا۔ لیوپنسکر (91-1821ء) رفتہ رفتہ اس تصور کا حامی ہو گیا کہ یہودی ریاست فلسطین میں قائم ہونی چاہیے۔ تھیوڈور ہرزل نے جب دوسری صیہونی کانفرنس منعقدہ باسل (1898ء) میں یوگنڈا کو ریاست کے لیے تجویز کیا تو اس کی قیادت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ توبہ کرنے کے لیے مندوبین کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور Psalmist کے ان الفاظ کو دہرائے ''یروشلم! اگر میں تجھے بھلا دوں تو میرا دایاں ہاتھ ٹوٹ جائے!'' صیہونی اپنی اس مکمل طور پر سیکولر بلکہ بے خدا مہم کو حقیقی دنیا میں ایک جاندار حقیقت بنانے کی غرض سے اس متھوس کی قوت کو استعمال کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ تاہم جب انہوں نے اس اساطیری' مقدس جغرافیہ کو ٹھوس حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کی تو اس سے مسائل کھڑے ہو گئے۔ اولین صیہونی فلسطین کی گزشتہ دو ہزار سالہ تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ ان کے نعرے ''لوگوں سے محروم ایک سرزمین' وطن سے محروم لوگوں کے لیے'' نے اس حقیقت سے ان کی کامل بے اعتنائی کو ظاہر کر دیا کہ اس علاقے میں فلسطینی عرب آباد تھے' جو اس ملک سے اپنی آرزوئیں اور امنگیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ صیہونیت ایک سیکولر یہودی ریاست قائم کرنے کے اپنے محدود' عملیت پسندانہ اور جدید مقصد کے حصول میں کامیاب تو ہو گئی لیکن اس نے اسرائیل کے لوگوں کو ایک ایسے تنازعے میں الجھا دیا' جس کے زیر نظر کتاب کو قلمبند کرنے تک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو حل ہونے کے آثار بہت کم ہیں۔

☆☆☆

اسلامی بنیاد پرستی کا آغاز:

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مصر اور ایران کے مسلمانوں نے پہلے پہل جدیدیت کو جارح' حملہ آور اور استحصالی تصور کیا تھا۔ آج مغرب کے لوگ مسلمان بنیاد پرستوں کی طرف سے اپنے کلچر کی مذمت' اپنی پالیسیوں کو شیطانی قرار دینے اور سیکولرازم' جمہوریت اور انسانی حقوق جیسی اقدار کی تحقیر کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایک تصور موجود ہے کہ ''اسلام'' اور مغرب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں' ان کے مثالئے سراسر متضاد ہیں اور یہ کہ ''اسلام'' ہر اس موقف کے خلاف ہے جسے مغرب اپنا چکا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کا ادراک کرنا اہمیت کا حامل ہے کہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم دوسرے باب میں دیکھ چکے ہیں' مسلمان اپنی روحانیت کے زیر اثر ایسے بہت سے تصورات اور اقدار تک رسائی پا چکے تھے۔ جو کہ ہمارے جدید تصورات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھنے کی حکمت کو سراہا تھا اور وہ فرد کی دانش ورانہ آزادی کا تصور بھی وضع کر چکے تھے نیز عقلیت پسندانہ فکر کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔ عدل اور مساوات کی قرآنی اقدار کو جدید مغربی نظام بھی یکساں تقدس دیتا ہے۔ اسی لیے یہ امر حیران کن نہیں ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں بہت سے ممتاز مسلمان مفکرین مغرب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ یہ ملاحظہ کر سکتے تھے کہ یورپی (Europeans) اور مسلمان یکساں اقدار کے حامل ہیں۔ یورپ کے لوگ ایک ایسا کارگزار' فعال اور تخلیقی معاشرہ تشکیل دے چکے ہیں' جسے مسلمانوں کو اپنے ملکوں میں تشکیل دینے کی بہت طویل عرصے سے آرزو تھی۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ایران میں دانشوروں' مفکروں' سیاستدانوں اور ادیبوں کا ایک ایسا حلقہ موجود تھا' جو کہ یورپی کلچر کی والہانہ ستائش کرتا تھا۔ ملکوم خان (1908ء-1833ء)' عبدالرحیم طالب زادہ (1911ء-1834ء) اور مرزا آقا خان کرمانی (96-1853ء) بعض حوالوں سے صیہونیوں جتنے ہی باغی تھے۔ علماء سے ان کا مستقل ٹکراؤ رہتا تھا' وہ ایک مکمل طور پر سیکولر معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے اور وہ مذہب کو بنیادی تبدیلی لانے کے لیے استعمال کرنے کے خواہاں تھے۔ صیہونیوں کی طرح وہ بھی اس ایقان کے حامل تھے کہ روایتی عقیدہ ــــ ان کے معاملے میں شیعیت ــــ لوگوں کی پسماندگی کا سبب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے' اس نے ارتقا پر روک لگا رکھی ہے اور ان تصورات پر بحث مباحثے پر پابندی عائد کی ہوئی ہے' جو کہ مغرب کی عظیم قلب ماہیئت میں انتہائی اہم ثابت ہوئے تھے۔ آقا خان کرمانی بالخصوص زیادہ نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس کی رائے میں اگر مذہب عملی نہیں تو وہ بے کار ہے۔ اگر غریبوں کو حقیقتاً انصاف میسر نہیں ہے تو پھر ماضی کے واقعات پر رونے سے کیا حاصل؟

''جہاں یورپ کے اہل علم ریاضی' سائنسز' سیاسیات' معاشیات اور انسانی حقوق کے مطالعے میں مصروف ہیں' وہاں سوشلزم اور غریبوں کی صورتحال میں بہتری کی جدوجہد کے دور میں ایرانی علما صفائی اور دیگر مذہبی مسائل پر بحث مباحثے میں الجھے ہوئے ہیں۔''

کرمانی نے باصرار کہا کہ سچے مذہب کا مطلب عقلیت پسندانہ روشن خیالی اور مساوی حقوق ہے۔ اس کا مطلب ''اونچی عمارات' صنعتی ایجادات' کارخانے' ذرائع مواصلات کا پھیلاؤ' علم کا فروغ' فلاح عامہ' منصفانہ قانون کا نفاذ'' ہے۔ لیکن کرمانی بلاشبہ غلطی پر تھا۔ مذہب ایسا کوئی کام نہیں کرتا' یہ تو لوگوں' عقلیت پسندانہ سوچ تھی' جو ان عملی معاملات سے متعلق تھی۔ مذہب کا کام ان عملیت پسندانہ سرگرمیوں کو حتمی معنویت فراہم کرنا تھا۔ تاہم ایک اعتبار سے کرمانی درست بھی تھا' اس صورت میں کہ جب وہ ارتقا پر روک لگانے کے حوالے سے شیعیت پر الزام لگاتا تھا۔ قدامت پسند اور ماقبل جدید عقیدے کا ایک کام لوگوں کو اپنے معاشرے کی پابندیوں کو قبول کرنے میں مدد دینا تھا اور اگر ایرانی ارتقا کے لیے وقف جدید دنیا میں بھرپور طور پر شامل ہونا چاہتے تھے تو مذہب انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اسلام کو تبدیل ہونا تھا۔ لیکن کیسے؟

بہت سے سیکولر لوگوں کی طرح کرمانی اور اس کے دوستوں نے مذہب کو اپنی قوم کے انتشار کا الزام دیا۔ مغرب کے حوالے سے ان کا تصور بھی ناکافی اور معصومانہ تھا' جس کی بنیاد یورپی کتابوں کا غیر منظم مطالعہ تھا۔ یہ مصلحین (Reformers) مغربی جدیدیت کی پیچیدہ نوعیت کو پوری طرح نہیں جانتے تھے بلکہ اس کے اداروں کو ایک قسم کی ''مشین'' (انیسویں صدی کی ترقی' سائنس اور قوت کی علامت) تصور کرتے تھے' جو سارے کے سارے یورپی تجربے کو بے خطا اور مکینیکل انداز میں بنا سکتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایرانی (شریعت کی بجائے) مغربی سیکولر قانونی نظام اپنا لیں یا یورپی طرز کی تعلیم رائج کر دیں تو وہ بھی جدید اور ترقی پذیر ہو جائیں گے۔ مغربی تعلیم یقیناً نوجوان ایرانیوں پر نئے دروازے کھول دیتی لیکن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اگر معاشرے کا زیریں ڈھانچہ (Infrastructure) تبدیل نہ ہوتا تو وہ اپنی تعلیم کو پوری طرح کام میں لانے سے قاصر ہوتے۔ گو جدیدیت ایران میں طفولیت کے ایام میں نہیں تھی تاہم ایرانیوں نے اپنے زرعی کلچر کو ایک صنعتی، ٹیکنیکل معاشرے میں تبدیل کرنے کے اذیت دہ اور مشکل ترین عمل سے گزرنا تھا۔ صرف اس طرح ہی ایرانی مصلحین کی خواہش کے مطابق لبرل تہذیب کو پا سکتے تھے، جس میں ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچ اور لکھ سکتا تھا۔ ایک زرعی معاشرہ ایسی آزادی فراہم نہیں کر سکتا۔ مغربی ادارے فائدہ مند ہو سکتے تھے، تاہم صرف وہی ایسے لوگوں کی ذہنیت کو تبدیل نہیں کر سکتے تھے، جن کے ذہنی آفاق اب بھی قدامت پسندانہ دور والے ہی تھے۔

بلاشبہ خود مصلحین ابھی تک ایک قدم پرانی دنیا میں رکھتے تھے۔ اگر جدید معاشرے سے ان کی ابتدائی نوعیت کی واقفیت کو مدنظر رکھیں تو اس امر پر بمشکل حیرت ہوتی تھی۔ انہوں نے اصفہان کے صوفیانہ فلسفے کے مکتب ''بابیت'' (Babism) اور تصوف کے علاوہ مغربی کتابوں کے مطالعے سے اپنے ترقی پسندانہ تصورات اخذ کئے تھے۔ ان شیعی روحانی تحریکوں نے انہیں پرانی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے آزادی اور جرأت تو عطا کی تھی لیکن ایک مکمل طور پر قدامت پسندانہ انداز میں۔ کرمانی اکثر دعویٰ کیا کرتا تھا کہ وہ ایک مکمل عقلیت پسند ہے: ''عقل اور سائنسی شواہد میری تحریروں کے سرچشمے اور میرے اعمال کی بنیاد ہیں''۔ تاہم اس کی عقلیت پر پسندی ایک اساطیری اور صوفیانہ زاویۂ نظر مکمل طور پر حاوی تھا۔ وہ تاریخ کے ارتقائی تصور کا تو حامل تھا لیکن ڈارونیت (Darwinism) کو ملا صدرا کے اس تصور سے مماثل قرار دیتا تھا، جس کے مطابق ہر زندہ شے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی ایک کامل حالت کی طرف گامزن ہے۔ ملکوم خان نے بھی اسی کے مانند کام کیا۔ وہ فقط ''علم'' کے پرانے اسلامی تصور میں مغربی سائنسی عقلیت پسند شامل کر کے اسے توسیع دے رہے تھے۔ یہ مصلحین جدید فلسفیوں سے زیادہ وسطی عہد کے فیلسوفوں (Faylsufs) کے مانند استدلال کرنے پر مائل تھے۔ ان سب نے شاہوں کے اختیارات کو محدود کر دینے والی آئینی حکومت کے آدرش کو فروغ دیا اور ایران میں اس مباحثے کا آغاز کر کے انہوں نے ایک اہم کام انجام دیا۔ تاہم وہ ماقبل جدید فلسفیوں ہی کے مانند اشرافیہ پسند (Elitist) تھے۔ یقیناً وہ اکثریت کی رائے کے ذریعے قائم ہونے والی حکومت کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔ ملکوم خان کا وژن ایک جدید سیاسی سائنس دان (Political Scientist) کے جمہوری وژن کی نسبت فلسفی بادشاہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Philosopher-King) کے پرانے فلسفیانہ تصور سے زیادہ مماثلت رکھتا تھا۔ طالب زادہ کثیر جماعتی نظام کی اہمیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے خیال میں حزب اختلاف کا کردار صرف اتنا تھا کہ وہ حکومتی جماعت کو فقط لعنت و ملامت کرتی رہے اور بحران میں اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے پر تولے رہے۔ مغربی لوگوں کو اپنے جمہوری آدرش وضع کرنے میں معاشی' سیاسی' صنعتی اور سماجی تبدیلی کی صدیاں لگی تھیں' اس لیے اس میں بھی حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی کہ مصلحین اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکے۔ وہ اپنے لوگوں کو تبدیلی کی سمت توجہ دلانے والی عبوری شخصیات تھیں__ اور ہو بھی یہی سکتی تھیں__ تاہم وہ جدیدیت کو مکمل طور پر پیش کرنے سے قاصر تھیں۔

کرمانی اور ملکوم خان جیسے دانشور ایران کی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتے رہے اور انہوں نے اکثر و بیشتر خود کو علماء کے ساتھ متصادم پایا۔ تاہم صدی کے اختتام کے قریب مذہبی پیشواؤں نے ظاہر کیا کہ وہ ہمیشہ پرانی کتابوں ہی میں غرق نہیں رہے بلکہ اگر انہیں محسوس ہوا کہ شاہوں نے عوام کی بہبود کو خطرے میں ڈال دیا ہے تو وہ سیاست میں بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ 1891ء میں ناصر الدین شاہ (96-1829ء) نے ایک برطانوی کمپنی کو ایران میں تمباکو کی پیداوار اور فروخت پر اجارہ داری عطا کر دی۔ قاچار بادشاہ برسوں سے اس قسم کی رعایتیں دیتے آئے تھے تاہم اب تک ایسا صرف انہی شعبوں میں ہوا تھا' جن میں ایرانی شامل نہیں تھے' لیکن تمباکو تو ایران کی ایک عام فصل تھی اور ہزاروں زمین داروں' دکانداروں اور برآمد کنندگان کا بڑا ذریعۂ آمدنی تھی۔ سارے ملک میں وسیع پیمانے پر احتجاج ہونے لگا' جس میں بازاری (Bazaaris) اور علماء پیش پیش تھے۔ تاہم دسمبر میں نجف کے ممتاز مجتہد مرزا حسن شیرازی نے ایک فتویٰ جاری کر کے ایران میں تمباکو کی فروخت اور استعمال پر پابندی عائد کر دی۔ یہ ایک زبردست چال تھی۔ ہر شخص نے' حتیٰ کہ غیر مسلموں اور شاہ کی بیویوں تک نے تمباکو نوشی چھوڑ دی۔ حکومت کو مجبوراً جھکنا پڑا اور رعایت واپس لے لی گئی۔ یہ ایک انتہائی اہم لمحہ تھا اور اس نے ایرانی علماء کی امکانی قوت کو عیاں کر دیا تھا' جو کہ امام غائب کے واحد ترجمان ہونے کے ناطے' شاہوں کو بھی سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ فتویٰ عقلیت پسندانہ' عملیت پسندانہ اور مؤثر تو تھا' لیکن امام کے استناد سے جاری ہوتے ہوئے صرف پرانے اساطیری تناظر ہی میں اہمیت رکھتا تھا۔

مصر میں بھی 1870ء کی دہائی کے دوران جدید یورپ کو ولولہ انگیز اور فیضان عطا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے والا تصور کیا گیا۔ اسے اسلامی روح کے موافق اور ہم آہنگ سمجھا گیا اور یہ سب جدیدیت پذیری کے عمل کی مشکلات اور تکالیف کے باوجود ہوا۔ یہ ولولہ و جوش مصری ادیب رفاح التحتوی (73-1801ء) کی تحریروں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ وہ محمد علی کا زبردست معترف تھا' جامعہ الازہر میں تعلیم حاصل کر چکا تھا اور نئی مصری فوج میں امام کے طور پر خدمات انجام دے چکا تھا' اس ادارے کے لیے تحتوی عمیق احترام کا حامل تھا۔ تاہم 1826ء میں تحتوی کو محمد علی نے ان اولین طلباء میں شامل کر لیا' جنہیں پیرس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس کے لیے تو یہ ایک انکشاف کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ پانچ برس میں اس نے فرانسیسی سیکھی' قدیم تاریخ' یونانی اساطیر' جغرافیہ' ریاضی اور منطق پڑھی۔ روشن خیالی کے تصورات نے' جن کے عقلیت پسندانہ وژن کو اس نے فلسفہ (Falsafah) سے بہت مماثل پایا تھا' اسے تو مسحور کر دیا۔ وطن واپسی سے پہلے تحتوی نے اپنی ڈائری شائع کروائی' جو ہمیں ایک پردیسی (Outsider) کے زاویہ نظر سے جدید مغرب کی قابل قدر ابتدائی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ تحتوی بعض تحفظات کا حامل تھا۔ اس نے مذہب کے حوالے سے یورپیوں کی رائے کو حقارت آمیز اور فرانسیسی مفکروں کے اپنی بصیرتوں کو پیغمبروں کی تعلیمات پر خود پسندانہ فوقیت دینے کے حوالے سے متکبر پایا۔ تاہم پیرس میں جس طرح سے سب کچھ ایک ترتیب سے ہوتا تھا' وہ تحتوی کو بے حد پسند آیا۔ وہ پیرس کی صاف گلیوں' فرانسیسی بچوں کی بہترین تعلیم' کام سے محبت اور کاہلی سے نفرت کی تعریف کرتا ہے۔ وہ فرانسیسی کلچر کی عقلیت پسندانہ تیزی اور توازن کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس نے لکھا' ایسا نہیں ہے کہ پیرس کے رہنے والے ''روایتوں کے اسیر نہیں ہیں' تاہم وہ ہر بات کے ماخذ اور اس کے شواہد کو جاننے کے ہمیشہ شائق رہتے ہیں۔'' وہ اس بات سے بہت متاثر تھا کہ عام لوگ بھی پڑھ لکھ سکتے تھے ''اور ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق دوسروں کی طرح اہم معاملات میں حصہ لیتا ہے۔'' اسے ایجاد و اختراع کے جذبے ــــ جدید روح کے جوہری جزو ــــ نے بھی بہت متاثر کیا۔ اس کے خیال میں یہ لوگوں کو تغیر پذیر اور متلون بنا سکتا تھا تاہم سیاست جیسے اہم معاملات میں نہیں۔ ''ہر وہ شخص جو کسی ہنر کا ماہر ہے' کوئی نہ کوئی ایسی چیز ایجاد کرنے کا آرزومند ہے' جو پہلے غیر معلوم ہو' یا کسی ایسی چیز کو مکمل کرنا چاہتا ہے' جو پہلے ایجاد ہو چکی ہے۔''

جب وہ مصر واپس آیا اور نئے دارالترجمہ کا ڈائریکٹر بنا' تو اس نے مصریوں کو تاکید کی کہ انہیں مغرب سے ضرور سیکھنا چاہیے۔ ''اجتہاد کے دروازوں'' کو لازماً کھولنا ہوگا' علماء کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زمانے کے ساتھ چلنا اور شریعت کو جدید دنیا کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ ڈاکٹروں' انجینئروں اور سائنس دانوں کو مسلمان مذہبی سکالروں جتنا ہی رتبہ دیا جانا چاہیے۔ جدید سائنس اسلام کے لیے خطرہ نہیں ہے۔ یورپی لوگوں نے دراصل سپین کے مسلمانوں سے سائنسی علوم حاصل کئے تھے' اس لیے جب مسلمان مغربی سائنسوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہی کچھ واپس لے رہے ہوتے ہیں جو اصل میں انہی سے تعلق رکھتا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ ترقی اور ایجاد و اختراع پر قدغن نہیں لگائے بلکہ اسے تو رہنمائی کرنی چاہیے' کیونکہ تبدیلی اب زندگی کا قانون بن چکی ہے۔ تعلیم کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ فرانس کی طرح عام لوگوں کو تعلیم دی جانی چاہیے نیز لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی پڑھایا جائے۔ تحتوی کو یقین تھا کہ مصر ایک شاندار مستقبل کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ اسے جدیدیت نے مخمور کر دیا تھا۔ اس نے بھاپ کے انجن کی تعریف میں ایک نظم لکھی نیز نہر سوئز اور امریکہ کی ٹرانس کانٹی نینٹل ریلویز کو انجینئرنگ کے ایسے کارنامے تصور کیا' جو کرۂ ارض کے دور دراز علاقوں میں آباد لوگوں کو اخوت اور امن کی لڑی میں پروتے ہیں۔ فرانسیسی اور برطانوی سائنس دانوں اور انجینئروں کو مصر میں آنے دو! اس سے ترقی کی رفتار میں اضافہ ہو جائے گا۔

1870ء کی دہائی کے دوران' آج لبنان اور شام کہلانے والے علاقوں سے ادیبوں کا گروپ آیا اور قاہرہ میں آباد ہو گیا۔ ان میں سے زیادہ تر ادیب عیسائی تھے' جو فرانسیسی اور امریکی مشنری سکولوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے' یوں ان کی رسائی مغربی کلچر تک تھی۔ وہ نئی صحافت کے عاملین تھے اور انہوں نے عثمانی علاقوں سے زیادہ آزادی خدیو اسمٰعیل کے قاہرہ میں پائی۔ انہوں نے نئے جرائد کا اجرا کیا' جن میں طب' فلسفہ' سیاست' جغرافیہ' تاریخ' صنعت' زراعت' اخلاقیات اور عمرانیات پر مضامین شائع ہوتے جو عام عرب قاری کو بنیادی اہمیت کے حامل جدید تصورات سے آشنا کرواتے۔ ان کے اثرات ہمہ گیر تھے۔ خاص طور پر عیسائی عرب اس بات کے زیادہ خواہش مند تھے کہ مسلمان ریاستیں سیکولر ہو جائیں اور اس امر پر اصرار کرتے تھے کہ مذہب نہیں بلکہ صرف سائنس تہذیب کی اساس ہے۔ تحتوی کے مانند انہیں بھی مغرب سے عشق تھا اور انہوں نے اس ولولے کو مصری عوام میں منتقل کیا۔

جمال الدین افغانی:

بعد میں رونما ہونے والی نفرت و عداوت کی روشنی میں اس ابتدائی مدح و ستائش پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر ڈالنا ایک دل چیر دینے والا عمل ہے۔تحتوی اور شامی صحافی مشرق اور مغرب کے درمیان ہم آہنگی کے ایک مختصر عرصے میں جی رہے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ یورپ میں اسلام سے صلیبی جنگوں والی پرانی نفرت ختم ہوگئی ہے اور تحتوی فرانس اور برطانیہ کو خطرہ نہیں سمجھتا تھا' حالانکہ پیرس سے اس کی روانگی کے زمانے میں ہی فرانس نے الجیریا کو سفاکانہ انداز میں اپنی نوآبادی بنایا تھا۔ تحتوی تو فرانس اور برطانیہ کو فقط ترقی کے علمبردار تصور کرتا تھا۔ تاہم 1871ء میں ایک ایرانی قاہرہ آیا' وہ مغرب سے خوفزدہ تھا۔اس کا کہنا تھا کہ مغرب دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم کررہا ہے ۔ حالانکہ جمال الدین (97-1839ء) ایرانی اور شیعہ تھے' تاہم انہوں نے اپنے آپ کو''الافغانی'' کہلوایا' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو سُنّی ظاہر کرکے اسلامی دنیا میں زیادہ توجہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے روایتی مدرسہ تعلیم حاصل کی تھی' جس میں فقہ اور فلسفہ وعرفان کے باطنی علوم شامل ہوتے تھے ۔ تاہم برطانوی ہندوستان کی سیر کے دوران وہ اس امر کے قائل ہوگئے کہ جدید سائنس اور ریاضی مستقبل کی کلید ہیں۔ تاہم جمال الدین افغانی پیرس کے لوگوں سے مسحور تحتوی کی طرح مغرب کے دام الفت میں نہیں پھنسے ۔ ان کے دورے کے زمانے ہی میں برطانوی حکمرانی کے خلاف ہندوستان میں بغاوت ہوئی۔ (1857ء)' جس نے برصغیر میں تادیر رہنے والی ایک تلخی پیدا کی۔ جمال الدین افغانی نے عرب' ترکی' روس اور یورپ کے سفر کیے اور مغرب کی طاقت اور ہر جگہ موجودگی سے انتہائی تشویش زدہ ہوگئے' جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ وہ اسلام دنیا کو کچلنے ہی والا ہے۔ جب وہ 1871ء میں قاہرہ پہنچے تو وہ ایک مشن کے حامل انسان تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو اسلام کے پرچم تلے متحد ہوجانے کا درس دینے اور مغربی سامراجیت کے خطرے کو مذہب کے ذریعے روکنے کا عزم کررکھا تھا۔

جمال الدین افغانی ایک پرجوش مقرر اور تیز مزاج کے جذباتی انسان تھے۔انہوں نے بعض اوقات برا تاثر بھی قائم کیا تاہم بلاشبہ وہ ایک کرشماتی وصف کے حامل تھے۔ قاہرہ میں جلد ہی انہوں نے بہت سے شاگرد اکٹھے کرلیے اور انہیں اپنے پان اسلامک تصورات پھیلانے کی حوصلہ افزائی دی۔اس زمانے میں اس معاملے پر زوردار بحث ہورہی تھی کہ جدید مصر کو کون سا روپ اپنانا چاہیے۔شامی صحافی سیکولر ریاست کے تصور کو فروغ دے رہے تھے جبکہ تحتوی اس ایقان کا حامل تھا کہ مصریوں کو مغربی طرز کی قوم پرستی (Nationalism) اپنانی چاہیے۔افغانی ان دونوں تصورات کے خلاف تھے۔ان کے خیال میں اگر مذہب کمزور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگیا تو اسلامی معاشرہ لازماً بکھر جائے گا۔ مسلمان ملکوں کے دوبارہ طاقتور ہونے اور سائنسی جدیدیت کے اپنے روپ کو تشکیل دینے کے لیے ضروری ہے کہ اسلام میں اصلاح کی جائے اور اپنی منفرد ثقافتی اور مذہبی روایات سے مخلص رہا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر مسلمانوں نے بھرپور اقدام نہ کیا تو امت جلد ہی وجود کھو بیٹھے گی۔ وقت بہت کم ہے۔ سامراجی یورپی ہر روز مضبوط سے مضبوط ہوتے جا رہے ہیں اور بہت مختصر عرصے بعد اسلامی دنیا پر مغربی کلچر کا غلبہ ہو جائے گا۔

چنانچہ جمال الدین افغانی کے مذہبی وژن کا محرک فنا کا وہی خوف تھا' جسے ہم جدیدیت کی مشکلات کے ایک عمومی ردعمل کے طور پر دریافت کر چکے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ جدید ہونے کے لیے مغربی طرز حیات اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان اپنے طریقے سے جدید ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی روایات پر مغربی قدار کو ترجیح دیتے ہوئے فرانس اور برطانیہ کی نری نقالی کریں گے تو وہ اپنے آپ کو گنوا دیں گے۔ وہ نہ ادھر کے رہیں گے اور نہ ادھر کے' محض بھدی نقول (Bad Reproductions) بن کر رہ جائیں گے اور اپنی ہی کمزوری کا باعث بنیں گے۔ تاہم انہیں جدید سائنس کی ضرورت ہے اور وہ انہیں یورپ سے حاصل کرنا ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ یہ امر ''ہماری کمزوری اور زوال کا ثبوت ہے کہ ہم یورپیوں کی نقل کر کے ہی تہذیب یافتہ بنتے ہیں''۔ جلال الدین افغانی نے دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی۔ جہاں مغربی جدیدیت ایجاد و اختراعات اور اوریجنیلٹی کے ذریعے کامیابی حاصل کر چکی تھی' وہاں مسلمان اپنے معاشرے کو صرف نقل کر کے ہی جدید بنا سکتے تھے۔ گویا جدیدیت اپنانے کے پروگرام میں خلقی طور پر اور ناگزیر عیب موجود تھا۔

چنانچہ جمال الدین افغانی نے ایک حقیقی مسئلے کو شناخت کر لیا تھا تاہم ان کا پیش کردہ حل مناسب دکھائی دینے کے باوجود مناسب نہیں تھا کیونکہ وہ مذہب سے بہت زیادہ توقعات رکھتے تھے۔ جمال الدین افغانی کی یہ پیش گوئی بالکل درست تھی کہ ثقافتی تشخص کو کھو دینے کا نتیجہ کمزوری' اضطراب اور معاشرتی انحطاط کی صورت میں نکلے گا۔ ان کی یہ بات بھی درست تھی کہ اسلام کو نئی صورتحال سے تخلیقی انداز میں نبرد آزما ہونے کے لیے لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ تاہم مذہبی اصلاح کسی ملک کو جدید نہیں بنا سکتی اور اسے مغرب کے خطرے سے نہیں بچا سکتی۔ جب تک صرصنعتی ملک نہ بنتا' ایک متحرک جدید معیشت کو پروان نہ چڑھاتا اور زرعی تہذیب کی محدودیتوں سے ماورا نہ ہوتا' اس وقت تک کوئی بھی نظریہ اسے یورپ کے مساوی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ملک نہیں بنا سکتا تھا۔ مغرب میں خودمختاری' جمہوریت' دانش ورانہ آزادی اور رواداری کے جدید تصورات کی تشکیل میں معیشت کا کردار فلسفیوں اور سیاسی سائنس دانوں کے برابر تھا۔ واقعات نے تھوڑے ہی عرصے بعد ثابت کر دیا کہ مصری اپنے آپ کو کتنا ہی آزاد اور جدید محسوس کرتے ہوں' ان کی معاشی کمزوری انہیں مغرب کا محتاج اور سیاسی اعتبار سے آسان شکار بنا سکتی ہے نیز یہ تحقیر آمیز محتاجی ان کے لیے حقیقی جدید روح کو پانا زیادہ مشکل بنا دے گی۔

جمال الدین افغانی جدیدیت کی طلب کے باوجود' ایرانی دانشوروں کی طرح' جن سے ان کے روابط استوار تھے' اب بھی کئی اعتبار سے پرانی دنیا سے ہی منسلک تھے۔ ذاتی طور پر وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے' نماز پڑھتے تھے اور اسلامی رسوم پر عمل کرتے تھے اور اسلامی قانون کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ ملاصدرا کے تصوف پر کاربند تھے' جس کے ارتقائی تبدیلی کے وژن سے وہ بہت متاثر تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو فلسفہ (Falsafah) کے باطنی علم کا بھی درس دیتے تھے اور اکثر وسطی عہد کے کسی فلسفی کی طرح گفتگو کرتے تھے۔ اس عہد کے دوسرے مذہبی مفکروں کی طرح انہوں نے اپنے عقیدے کو عقلیت پسندانہ اور سائنسی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ قرآن بغیر ثبوت کے کسی بات کو تسلیم نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے' چنانچہ وہ جدید دنیا سے موزونیت رکھتا ہے۔ جمال الدین افغانی اسلام کو جدید سائنسی عقلیت پسندی سے ہم آہنگ قرار دینے میں یہاں تک چلے گئے کہ انہوں نے کہا رسول کریمؐ پر جو قانون نازل ہوا تھا' وہ فطرت کے قوانین سے مختلف نہیں تھا اور یہ کہ اسلام کے سب عقائد کو منطق اور فطری دلائل کے ذریعے درست ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ انہوں نے ایک دوسری کیفیت میں سائنس کی محدودیت کے بارے میں بڑی فصاحت کے ساتھ لکھا کہ یہ ''خواہ کتنی ہی خوبصورت ہو..... نوع انسان کو کامل اطمینان عطا نہیں کرتی' جو کہ آدرش کی پیاسی ہے اور ایسے تاریک اور دور دراز گوشوں میں رہنا پسند کرتی ہے جن کے بارے میں نہ تو فلسفی اور سکالر سوچ سکتے ہیں اور نہ دریافت کر سکتے ہیں''۔ ایرانی دانشوروں کے مانند جمال الدین افغانی کا ایک قدم پرانی دنیا ہی میں تھا جبکہ وہ اسی زمانے میں نئی دنیا کی تمنا بھی کر رہے تھے۔ وہ اپنے عقیدے کو مکمل طور پر عقلیت پسندانہ بھی بنانا چاہتے تھے تاہم قدامت پسند دور کے ہر صوفی کی طرح وہ دلی طور پر اس امر سے بھی آگاہ تھے کہ ان کے مذہب نے انسانیت کو ایسی بصیرتیں عطا کی تھیں' جو سائنس نہیں دے سکتی۔

شاید یہ متلون مزاجی ناگزیر تھی' کیونکہ جمال الدین افغانی ایک عبوری شخصیت تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن یہ ان کی اندیشگی (Anxiety) سے بھی ابھری تھی۔ وقت گزرا چلا جارہا تھا اور جمال الدین افغانی اپنی فکر کے تمام تضادات کو دور کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ مسلمانوں کو ضرور عقلیت پسند ہونا چاہیے۔ اسے ان کی اولین ترجیح ہونا چاہیے۔ انہوں نے فطری سائنسوں کو نظرانداز کیا تھا۔ نتیجتاً یورپ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ انہیں ''اجتہاد کے دروازے'' بند رکھنے اور علماء اور ماضی کے داناؤں کی ہدایات تسلیم کرنے کا کہا جاتا رہا ہے۔ جمال الدین افغانی نے بااصرار کہا کہ اس روش کا مسلمہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اطاعت کو بڑھاوا دیتی ہے جو کہ نہ صرف جدید روح کے سراسر خلاف ہے بلکہ اسلام کی ''جوہری خصوصیات یعنی غلبہ وتسلط اور برتری'' کو بھی رد کرتی ہے۔ اب مغرب نے سائنس کو اپنا لیا ہے جبکہ مسلمان کمزور اور آسان شکار بن گئے ہیں۔ جمال الدین افغانی یہ دیکھ سکتے تھے کہ اجتہاد کے بند دروازوں کی علامت والا قدامت پسندانہ نظام مسلمانوں کو پسماندہ رکھے ہوئے ہے۔ تاہم ہر ایسے مصلح کی طرح' جو مذہب کی متھوس کو لوگوس کے مانند کارگر بنانے کی کوشش کرتا ہے' انہوں نے ایک طرف تو ناکافی مذہبی حوالے دیئے' دوسری طرف غلط سائنس پیش کی۔

یہی بات ان کی عمل پسندی (Activism) کے حوالے سے کہی جاسکتی ہے۔ جمال الدین افغانی نے یہ بات درست کہی تھی کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو عمل میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ وہ قرآن کی اس آیت کا حوالہ دینا پسند کرتے تھے: ''خدا انہیں تبدیل نہیں کرتا جو اپنے آپ کو نہیں بدلتے۔'' ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلمان اسلام کو بچانا چاہتے ہیں تو انہیں مدرسوں میں پسپا ہونے کی بجائے سیاست کی دنیا میں آنا ہوگا۔ جدید دنیا میں صداقت عملیت پسندانہ ہوتی ہے' اسے طبیعی' تجربی دنیا میں کارگر ہوکے دکھانا پڑتا ہے۔ افغانی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اسلامی صداقت ان کے زمانے کی دنیا میں مغربی نظریات جتنی ہی اثر آفریں ہے۔ انہیں اس حقیقت کا ادراک تھا کہ یورپ جلد ہی کرۂ ارض پر حکمران ہوجائے گا اور انہوں نے اپنے عہد کے مسلمان حکمرانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کا عزم کررکھا تھا۔ جمال الدین افغانی کی انقلابی سکیمیں اکثر اوقات خودشکن اور اخلاقی اعتبار سے مبہم ہوتی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ثمرآور ثابت نہیں ہوئی اور وہ محض ان کی سرکاری تحدید کا پیش خیمہ ہی بنیں۔ انہیں حکومت مخالف احتجاج کروانے کے الزام میں 1879ء میں مصر سے اور 1891ء میں ایران سے نکال دیا گیا اور اگرچہ انہیں استنبول میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاہم عثمانی حکام نے انہیں کڑی نگرانی میں رکھا۔ مذہبی صداقت کو سیاسی لائحۂ عمل میں ڈھالنے کی کوشش منفیت پسندی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور تباہی کے خطرے سے معمور ہوتی ہے اور جمال الدین افغانی نے اپنے آپ کو اس ''الزام'' کے لیے عیاں کر دیا تھا کہ انہوں نے ناپختہ فکری پر مبنی اپنی انقلابی عمل پسندی کو سہارا دینے کے لیے اسلام کو سطحی انداز میں استعمال کیا۔ واضح بات ہے کہ وہ مذہبی اصولوں کو اپنی سیاست سے پوری طرح مربوط نہیں کر پائے۔

ان کی فکر کے واضح نقائص ان کی مایوسی سے پیدا ہوئے تھے۔ جمال الدین افغانی کو یقین تھا کہ سامراجی مغرب جلد ہی اسلامی دنیا کو مٹا کر رکھ دے گا۔ جب وہ 1880ء کی دہائی کے دوران پیرس میں قیام پذیر تھے تو ماہر لسانیات ارنسٹ رینان (92-1823ء) کی کتابوں کے ذریعے ایک نئی سائنسی نسل پرستی سے ان کا پالا پڑا اور ان دونوں کے مابین جدید دنیا میں اسلام کے مقام کے حوالے سے مباحثہ ہوا۔ رینان کا ایقان تھا کہ سامی زبانیں عربی اور عبرانی فرسودہ زبانیں ہیں اور محدود ارتقا کا نمونہ ہیں۔ ان میں ''آریائی'' لسانی نظاموں میں پائی جانے والی ترقی پسندانہ خصوصیات کا فقدان ہے او وہ اپنے آپ کو دوبارہ تخلیق نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح سامی نسلوں نے کوئی حقیقی آرٹ' تجارت یا تہذیب تخلیق نہیں کی۔ اسلام جدید دنیا سے بالخصوص کوئی موزونیت نہیں رکھتا جیسا کہ مسلم ممالک کی کمتری' ان کی حکومت کی پستی اور مسلمانوں کی ''دانش ورانہ نااہلی'' سے عیاں ہے۔ افریقہ کے لوگوں کی طرح اسلامی دنیا کی آبادی بھی ذہنی طور پر سائنسی عقلیت پسندی کو سمجھنے کی اہل نہیں ہے اور کوئی ایک تصور بھی وضع کرنے سے قاصر ہے۔ رینان نے اعتماد کے ساتھ کہا کہ جب سائنس پھیلے گی تو اسلام مرجھا جائے گا اور مستقبل میں وجود گنوا دے گا۔ چنانچہ اس امر پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ جمال الدین افغانی کو اسلام کی بقا کا خوف لاحق تھا یا اس پر کہ وہ مسلم وژن کی سائنسی عقلیت پسندی پر اتنا زیادہ زور دیتے تھے۔ ایک حقیقی خطرے کے ردعمل میں مسلم فکر میں ایک نیا مدافعانہ پن سرایت کر گیا۔ رینان جیسے جدید مفکرین کی فکر میں اسلام کے غلط اور یک رخے تصور پر مبنی تاثر نے ہی اسلامی ملکوں پر نوآبادیاتی حملے کا جواز مہیا کیا تھا۔

مسلمان ملکوں پر نوآبادیاتی غلبہ:

نوآبادیاتی نظام یورپ کی توسیع پاتی ہوئی سرمایہ دارانہ معیشت کے تقاضوں سے ابھرا تھا۔ ہیگل نے کہا تھا کہ صنعتی معاشرہ ''صارفین اور وسائل کی تلاش کی غرض سے اپنی حدوں سے باہر'' پھیلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ نئی منڈیوں کی یہ جستجو ''نوآبادیات کا پیش خیمہ بھی ہے'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کی طرف مکمل طور پر ترقی یافتہ بورژوا طبقہ لپکتا ہے۔'' صدی کے اختتام تک مشرقِ وسطیٰ کو نوآبادیات بنانے کا عمل کافی آگے جا چکا تھا۔ فرانس نے 1830ء میں الجیریا کو فتح کیا جبکہ نو برس بعد برطانیہ نے عدن پر قبضہ کر لیا۔ تیونس پر 1881ء میں' سوڈان پر 1889ء اور لیبیا اور مراکش پر 1912ء میں قبضہ کیا گیا۔ 1915ء میں قریب المرگ عثمانی سلطنت کے علاقوں کو برطانیہ اور فرانس نے پہلی عالمی جنگ میں فتح کی توقع میں سائیکس پائیکاٹ معاہدے کے تحت آپس میں بانٹ لیا۔ یہ نوآبادیاتی یلغار ایک شدید دھچکا تھی' جس کا مطلب ان ملکوں کے روایتی طرزِ حیات کی تباہی تھا' جو کہ فی الفور ثانوی درجے کو پہنچ گئے تھے۔

نوآبادی ملک برآمد کے لیے خام مال پیدا کرتا تھا' جسے یورپی صنعتی عمل میں جھونک دیا جاتا اس کے بدلے میں اسے سستی مغربی مصنوعات حاصل ہوتیں' جس کا مطلب تھا مقامی صنعت کی بربادی۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ نئی نوآبادی جدید ٹیکنیکل نظام سے ہم آہنگ رہے' پولیس اور فوج کو یورپی خطوط پر دوبارہ تشکیل دیا جاتا تھا' معیشت کے مالیاتی تجارتی اور پیداواری پہلوؤں کو حسبِ منشا ڈھالا جاتا تھا اور ''مقامیوں'' کو جدید تصورات سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرنا ہوتی تھی۔ رعایا اس جدیدیت پذیری کو جابرانہ اور نہایت انتشار انگیز تصور کرتی تھی۔ جمال الدین افغانی چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو جدید بنائیں اور اپنے معاشرے کو یورپ کی ایک کمتر نقل میں بدلنے سے محفوظ رکھیں۔ نوآبادیاتی نظام نے اسے ناممکن بنا دیا۔ مغرب کے زیرِ تسلط آنے والے مشرقِ وسطیٰ کے ملک اپنی شرائط پر ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک زندہ تہذیب کو نوآبادیات کاروں نے ایک دست نگر بلاک میں تبدیل کر دیا تھا اور خودمختاری کے اس فقدان نے اطاعت کا ایک ایسا رجحان اور عادت راسخ کر دی جو کہ جدید روح کے سراسر برخلاف تھی۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ تحتوی اور ایرانی مصلحین میں عیاں ہونے والی یورپ کی محبت اور تحسین ماند پڑ گئی اور آزردگی میں ڈھل گئی۔

قاہرہ میں جمال الدین افغانی کے قیام کے دوران مصر رفتہ رفتہ اس نوآبادیاتی جال میں پھنستا جا رہا تھا' گو کہ وہ کبھی مکمل طور پر نوآبادی نہیں بنا۔ خدیو اسمٰعیل کی مہنگی اصلاحات اور جدیدیت پذیری کے منصوبوں نے ملک کو دیوالیہ کر دیا اور پوری طرح یورپی قرضوں کا محتاج بنا دیا۔ 1875ء میں خدیو نہر سوئز برطانویوں کے ہاتھوں بیچنے پر مجبور ہو گیا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں 1876ء میں یورپی حصہ داروں (شیئر ہولڈرز) نے مصری معیشت پر قبضہ جما لیا۔ جب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسمٰعیل نے آزادی کی کوشش کی تو برطانیہ نے عثمانی سلطان کے ساتھ مل کر سخت اقدام کیا اور اسے اقتدار سے بے دخل کروا دیا اور اس کا بیٹا توفیق خدیو بنا دیا گیا۔ 1881ء میں مصری فوج کے کچھ افسروں نے ایک افسر احمد بے عروبی کی قیادت میں بغاوت کی کوشش کی۔ ان کے ساتھ افغانی کے کچھ شاگرد اور مصر میں آئینی حکمرانی کے حامی بھی آ ملے۔ عروبی نئے خدیو پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس فتح کے بعد ایک مقبول عوام قوم پرست ابھار پیدا ہو گیا' برطانوی حکومت نے حصہ داروں کے مفادات کی حفاظت کے لیے مداخلت کا فیصلہ کر لیا۔ 11 رجولائی 1882ء کو برطانوی بحریہ نے اسکندریہ پر حملہ کر دیا اور 13 رستمبر کو تل الکبیر میں عروبی کی فوجوں کو شکست دی۔ پھر برطانویوں نے مصر پر اپنا فوجی تسلط قائم کر لیا اور خدیو توفیق کو سرکاری طور پر بحال کر دیا۔ یہ امر واضح تھا کہ مصر کا حکمران برطانوی پروقونصل (Proconsul) ایولین بیرنگ' لارڈ کرومر تھا۔

لارڈ کرومر ایک مخصوص قسم کا نوآبادیات کار (Colonialist) تھا۔ اس کے خیال میں مصری پیدائشی طور پر پسماندہ لوگ تھے اور انہیں نوآبادی بنا لیا جانا انہی کے مفاد میں تھا۔ رینان کے مانند جب اس نے مسلمان ملکوں کا موازنہ اپنی جدید ترقی یافتہ قوم سے کیا تو اس نے سوچا کہ یورپ ہمیشہ ترقی کا پیشرو رہا ہے۔ اس نے اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا کہ برطانیہ اور فرانس جیسے ملک کبھی مشرقِ وسطیٰ جتنے ہی ''پسماندہ'' ہوتے تھے اور یہ کہ وہ تو محض ایک ادھورے جدید ملک کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ''مشرقیوں'' کو پیدائشی' جینیاتی طور پر عیب دار تصور کرتا تھا۔ مصر میں کرومر کے کارنامے قابل لحاظ تھے۔ اس نے معیشت کو مستحکم کیا' ملک میں آب پاشی کو بہتر بنایا اور کپاس کی پیداوار میں اضافہ کروایا۔ اس نے Corve'e یعنی جبری مشقت کا پرانا نظام ختم کر دیا اور ایک مؤثر عدالتی نظام قائم کیا۔ تاہم اس ترقی کی قیمت بھی بھرنا پڑی تھی۔ اگرچہ خدیو بظاہر حکمران تو تھا لیکن ہر وزارت میں ایک انگریز ''مشیر'' موجود تھا' جس کی تجاویز احکامات کا درجہ رکھتی تھیں۔ کرومر اسے ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا ایقان تھا کہ یورپی ہمیشہ عقلیت پسند' اہل اور جدید ہوتے ہیں جبکہ مشرقی فطری طور پر غیر منطقی' ناقابل اعتبار اور بدعنوان ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ اسلام کو بھی ''ایک سماجی نظام کے طور پر سراسر ناکام'' تصور کرتا تھا۔ اس نے واضح کر دیا کہ بری طرح زوال کا شکار اس ملک کو کچھ عرصے کے لیے براہ راست برطانوی نگرانی کی حاجت ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد عبدہٗ کے افکار:

برطانوی قبضے نے مصری معاشرے میں شگاف پیدا کر دیئے۔ علماء کو مغربی تعلیم یافتہ لوگوں نے معلمین اور علم کے سرپرستوں کے رتبے سے محروم کر دیا۔ لارڈ کرومر کی قائم کردہ یورپی سول عدالتوں نے شرعی عدالتوں کی جگہ لے لی۔ دستکار اور چھوٹے تاجر بھی متاثر ہوئے۔ لیکن شاید سب سے زیادہ نقصان دہ امر یہ تھا کہ مصریوں نے اپنے حوالے سے نوآبادیات کاروں کی منفی رائے کو قبول کر لیا۔ اس طرح جمال الدین افغانی کے ایک شاگرد محمد عبدہٗ (1905ء۔1849ء) برطانوی قبضے سے بہت نالاں تھے۔ انہوں نے جدید عہد کو ''سائنس کا سیلاب'' قرار دیا' جو کہ روایتی مذہبی انسان کو ڈبوئے دے رہا ہے:

> یہ ایک ایسا عہد ہے' جس نے ہمیں مہذب اقوام کی اعلیٰ ترین صورتحال .....اور ہماری متوسط صورتحال سے آگاہ کرواتے ہوئے ان کے اور ہمارے درمیان ایک ایسا ربط قائم کیا ہے' جس نے ان کی دولت مندی اور ہماری غربت' ان کی عزت اور ہماری ذلت' ان کی قوت اور ہماری کمزوری' ان کی فتوحات اور ہماری شکستوں کو عیاں کر دیا ہے۔''

نوآبادیوں کے لوگوں کی مذہبی زندگی میں سرایت کر جانے والے اس گھلا دینے والے احساسِ کمتری نے محمد عبدہٗ جیسے مصلحین کو مجبور کیا کہ وہ نوآبادیات کاروں کے الزامات کے جواب دیں اور یہ ثابت کریں کہ اسلام مغرب کے کسی بھی نظام کی طرح ہی عقلی اور جدید ہے۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے فاتحین کو اپنا دانشورانہ ایجنڈا طے کرنے کی اجازت دی تھی۔

محمد عبدہٗ نے عرابی کے انقلاب میں حصہ لیا تھا اس لیے برطانوی فتح کے بعد انہیں وطن بدر کر دیا گیا۔ وہ پیرس میں جمال الدین افغانی کے ساتھ رہنے لگے۔ ان دونوں انسانوں میں بہت سی خصوصیات مشترک تھیں۔ عبدہٗ پہلے پہل جمال الدین افغانی کے حلقے میں ''عرفان'' سے' جسے وہ ''مسرت کی کلید'' کہا کرتے تھے' اپنی محبت کے سبب داخل ہوئے تھے۔ تاہم جمال الدین افغانی نے انہیں مغربی سائنسوں سے بھی متعارف کروایا اور بعدازاں محمد عبدہٗ نے گیوزو' ٹالسٹائی' رینان' سٹراس اور ہربرٹ سپنسر کا مطالعہ کیا۔ محمد عبدہٗ نے یورپ میں اجنبیت بالکل محسوس نہیں کی اور یوروپیوں کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوئے۔ جمال الدین افغانی کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح وہ بھی اس بات کے قائل تھے کہ اسلام جدیدیت سے مطابقت رکھتا ہے اور انہوں نے یہ استدلال کہا کہ یہ ایک عقلیت پسند عقیدہ ہے اور یہ کہ ''تقلید'' کی عادت خرابی کا باعث اور غیر مسلمہ ہے۔ تاہم جمال الدین افغانی کی طرح محمد عبدہٗ بھی صوفیانہ حوالے سے عقلیت پسندانہ غور وفکر کے قائل تھے۔ وہ بھی ابھی تک پرانی دنیا کی روحانیت سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ آخر کار محمد عبدہٗ کا سیاست کے حوالے سے جمال الدین افغانی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ ان کو یقین تھا کہ مصر کو انقلاب سے زیادہ اصلاح کی حاجت تھی۔ وہ اپنے استاد سے زیادہ عمیق فکر کے حامل تھے اور یہ دیکھ سکتے تھے کہ جدیدیت پذیری اور آزادی کی کوئی راہِ مختصر (Shortcut) نہیں ہوتی۔ جمال الدین افغانی کی خطرناک اور بے مقصد سکیموں میں شمولیت کی بجائے وہ مصر کے بعض گمبھیر مسائل کو تعلیم کے ذریعے حل کرنے کے آرزومند تھے اور 1888ء میں انہیں وطن واپسی کی اجازت مل گئی۔ وہ ملک میں ایک سب سے زیادہ چاہے جانے والے انسان بن گئے۔ ان کے تعلقات مصریوں اور برطانویوں کے ساتھ بہت اچھے تھے اور وہ کرومر اور خدیو دونوں کے ذاتی دوست بن گئے تھے۔

اس وقت تک ملک میں بہت زیادہ بے چینی پیدا ہو چکی تھی۔ پہلے تو تعلیم یافتہ مصری برطانوی قبضے کو بلاشبہ ناپسند کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ لارڈ کرومر خدیو اسمٰعیل سے زیادہ اہلیت کے ساتھ حکومت کر رہا ہے۔ 1890ء کی دہائی تک برطانویوں کے ساتھ تعلقات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے کی نسبت برطانوی افسر اب کمتر درجے کے تھے اور وہ مصریوں کے ساتھ تعلقات کو پختہ بنانے کے لیے کوششیں بھی کم کرتے تھے۔ انہوں نے ''جزیرہ'' کے علاقے میں اپنا مراعاتی نوآبادیاتی علاقہ بنا لیا تھا۔ مصری سول افسروں نے دیکھا کہ ان کی ترقیوں کا راستہ نوجوان برطانویوں نے روک لیا ہے اور ''مراعات'' کے تحت برطانویوں اور دیگر غیر ملکیوں کو' جو کہ ملک کے قانون سے بالا تھے' حاصل ہونے والی سہولیات نے ان میں آزردگی پیدا کر دی۔ قوم پرست مصطفیٰ کمال (1908ء۔1874ء) کی شعلہ فشاں تقاریر سننے کے لیے لوگ زیادہ سے زیادہ اکٹھے ہونے لگے' جس نے برطانویوں کے فوری انخلا کا مطالبہ کیا تھا۔ محمد عبدہٗ مصطفیٰ کمال کو برا مقرر تصور کرتے تھے۔ وہ اس بات کو سمجھ سکتے تھے کہ اس سے قبل کہ مصری ایک جدید آزاد ریاست پر حکومت کے قابل ہوں' انہیں چند سنگین معاشرتی مسائل سے نمٹنا ہوگا' جو کہ برطانوی قبضے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد عبدہٗ کے خیال میں سیکولر تصورات اور ادارے ایک بہت زیادہ مذہبی ملک میں نہایت تیزی سے متعارف کروائے جا رہے تھے۔ لوگوں کو ان سے ہم آہنگ ہونے کے لیے مہلت نہیں دی جا رہی تھی۔ محمد عبدہٗ یورپ کے سیاسی اداروں کا زبردست احترام کرتے تھے' تاہم وہ سوچتے تھے کہ انہیں مصر میں جوں کا توں رائج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت نئے قانونی نظام کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی' اس کی روح اور احاطۂ کار ان کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ نتیجتاً مصر ایک قانون سے محروم ملک بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جدید صورت حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسلامی قانون پر نظر ثانی کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ ان کی وفات کے بعد 1920ء کی دہائی میں روبہ عمل آیا اور مصر میں آج بھی یہی نظام رائج ہے۔ محمد عبدہٗ دیکھ سکتے تھے کہ مصری معاشرہ تقسیم کا شکار ہے' اس لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ قانونی اور آئینی پیشرفتوں کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ بنایا جائے۔ بصورت دیگر مصریوں کی اکثریت' جو مغربی تصورات سے زیادہ واقف نہیں' نئے اداروں کو سمجھنے سے قاصر رہے گی۔ مثال کے طور پر ''شوریٰ'' کا اسلامی اصول واضح طور پر جمہوریت سے ہم آہنگ تھا' جبکہ امت کا ''اجماع'' اب لوگوں کو آئینی حکمرانی کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے' جس کے تحت رائے عامہ حکمران کے اختیارات کو محدود کر سکتی ہے۔

ان کے خیال میں تعلیمی اصلاح کی فوری ضرورت تھی۔ محمد عبدہٗ نے لکھا کہ اس وقت تین بالکل مختلف قسم کے تعلیمی نظام رائج ہیں' جو یکسر مختلف مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے معاشرے میں ختم نہ ہونے والی تقسیم رونما ہو رہی ہے۔ مذہبی سکولوں (مدرسوں) میں' جن پر اب بھی قدامت پسندی کا غلبہ ہے' طلباء کو آزادانہ غور و فکر سے روکا جاتا ہے۔ عیسائی مشنری سکولوں میں' جو نوآبادیاتی نظام کو تقویت دیتے ہیں' نوجوان مسلمان اپنے ہی ملک اور مذہب سے بیگانہ کیے جا رہے ہیں۔ ریاستی سکول دنیا میں سب سے زیادہ خراب سکول ہیں: وہ تو یورپی سکولوں کی ادھوری نقلیں ہی ہیں اور کسی مذہب کی تعلیم نہیں دیتے۔ ایسے لوگ جنہوں نے علماء سے تعلیم حاصل کی ہے' وہ تبدیلی کی مزاحمت کرتے ہیں' جبکہ مغربی تعلیم یافتہ نوجوان ہر تبدیلی کو قبول کر لیتے ہیں تاہم وہ یورپی کلچر سے محض سطحی واقفیت رکھتے ہیں اور اپنے کلچر سے بیگانہ ہیں۔

1899ء میں محمد عبدہٗ کو مفتیٔ مصر بنا دیا گیا اور انہوں نے روایتی مذہبی تعلیم میں اصلاح کا عزم کر لیا۔ وہ کہتے تھے کہ مدرسوں کے طالب علموں کو بھی سائنس کی تعلیم دی جانی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیے تاکہ وہ جدید معاشرے میں بھرپور کردار ادا کرسکیں۔ محمد عبدہٗ کے خیال میں اس وقت جامعہ الازہر ہر اس شے کا نمونہ ہے' جو فی الوقت اسلام کے لیے درست نہیں ہے: اس نے جدید دنیا سے منہ موڑ لیا ہے اور ایک مدافعتی سہوِ زمانی (Anachronism) بن گئی ہے۔ محمد عبدہٗ جو اصلاحات کرنے کی کوشش میں مصروف تھے' علماء نے ان کی مخالفت کی۔ محمد علی کے عہد سے انہیں جدیدیت کا تجربہ بطور ایک تباہ کن حملے کے ہوا تھا' جس نے سیاست' قانون' تعلیم اور معیشت میں ان کے عمل دخل کو محدود کر دیا تھا۔ انہوں نے ہر ایسی کوشش کی مدافعت کی' جو انہیں جدید دنیا میں لے جاتی' اور ایرانی علماء کے بالکل برعکس وہ مدرسے کے باہر والی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ محمد عبدہٗ کو ان کے حوالے سے بہت تھوڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ جامعہ الازہر کی انتظامیہ کو جدید بنانے اور اساتذہ کی تنخواہیں اور حالاتِ کار (Working Conditions) بہتر بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ تاہم علماء اور طالب علموں نے نصاب میں جدید سیکولر مضامین کو شامل کرنے کی ہر کوشش کی زبردست مخالفت کی۔ اس قسم کی مخالفت کا سامنا ہونے سے محمد عبدہٗ بے حوصلہ ہوگئے۔ 1905ء میں انہوں نے مفتی کے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد وفات پا گئے۔

جمال الدین افغانی اور محمد عبدہٗ کی کاوشیں اس امر کو واضح کر دیتی ہیں کہ قدامت پسند عہد میں بارآور ہونے والے کسی عقیدے کو جدید دنیا کے بالکل مختلف نظامات سے ہم آہنگ بنانا کس قدر دشوار ہے۔ وہ دونوں تیز رفتار سیکولرائزیشن کے خطرات سے آگاہ تھے .....اور وہ اس حوالے سے بالکل درست تھے۔ اسلام ایک عبوری مرحلے میں مطلوبہ تسلسل فراہم کرنے پر قادر تھا۔ مصری ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے جا رہے تھے اور جو لوگ مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے' وہ اپنے کلچر سے بیگانہ ہوگئے تھے۔ وہ نہ تو مشرق میں رچ بس سکنے پر قادر تھے اور نہ مغرب میں نیز کبھی زندگی کو معنویت دینے والی صوفیانہ اور عقائدی سرگرمیوں سے دور ہونے کی وجہ سے وہ اس خلا میں گرنا شروع ہوگئے تھے' جو کہ جدید تجربے کے قلب میں بستا تھا۔ پرانے ادارے تباہ کیے جا رہے تھے جبکہ نئے ادارے اجنبی اور بالکل ناقابل فہم تھے۔ محمد عبدہٗ اور جمال الدین افغانی پرانی روحانیت کے پروردہ تھے۔ جب وہ اصرار کرتے کہ مذہب کو ضرور عقلی ہونا چاہیے تو وہ تمام مذہبی صداقتوں کی نفی کرنے والے یورپی عقلیت پسندوں اور سائنس دانوں سے زیادہ ملاصدرا کے قریب تر ہوتے تھے۔ جب وہ باصرار کہتے کہ عقل صداقت کی واحد حکم ہے اور یہ کہ تمام عقیدوں کو لازماً عقلی طور پر قابل ثبوت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونا چاہیے تو وہ باعمل صوفیوں کی طرح کلام کرتے تھے۔ قدامت پسندانہ اصولوں کے پروردہ ہونے کی وجہ سے وہ عقل اور وجدان کو ایک ہی تصور کرتے تھے۔ تاہم مغربی عقلیت پسندی کی روح سے آشنا بعد کی نسلوں نے یہ بات جان لی کہ تنہا عقل الوہیت کا احساس عطا کرنے سے قاصر ہے۔ ماورائی معنویت کا یہ زیاں آزادی کے فوائد کے ذریعے مغرب کی طرح توازن ختم کرنے والا نہیں تھا' اس کی وجہ یہ تھی کہ مغرب ایجنڈا طے کر رہا تھا..... حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی۔

مصر میں عورت کی معاشرتی حیثیت:

یہ چیز کتنی پریشان کن اور مضرت رساں ہوسکتی تھی' اس کی ایک منہ بولتی مثال 1899ء میں رونما ہوئی' جب قاسم امین (1908ء۔1865ء) نے کتاب ''تحریر المراء'' (عورتوں کی آزادی) شائع کروائی' جس میں کہا گیا تھا کہ عورت کی حقیر حالت ــــ خصوصاً پردے کی روایت ــــ مصر کی پسماندگی کا باعث ہے۔ پردہ عورت اور اس کی ترقی کے مابین ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے اور نتیجتاً قوم اور اس کے ارتقاء میں بھی ایک رکاوٹ ہے۔'' اس کتاب کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی نئی بات کہہ رہی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک مغربی تعصب کو اپنا لیا تھا۔ مصر میں مرد اور عورتیں برسوں سے عورتوں کی حیثیت میں بنیادی تبدیلیوں کے لیے کوشاں تھے۔ خود محمد عبدہٗ نے کہا تھا کہ قرآن مردوں اور عورتوں کو خدا کے سامنے مساوی قرار دیتا ہے اور یہ کہ طلاق اور کثیر الازدواجی کے روایتی قانون اسلام میں ضروری نہیں تھے: انہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور تبدیل کیا جانا چاہیے۔ عورتوں کی قسمت بہتر ہوگئی تھی۔ محمد علی نے ایک ایسا سکول قائم کیا تھا جہاں عورتوں کو ابتدائی نوعیت کے طبی کاموں کی تربیت دی جاتی تھی۔ 1875ء تک تین ہزار لڑکیاں مشنری سکولوں سے تعلیم حاصل کر چکی تھیں اور 1873ء میں حکومت نے لڑکیوں کے لیے پہلا پرائمری سکول کھولا اور اس سے اگلے برس ایک سیکنڈری سکول کھولا گیا۔ سیاحوں نے محسوس کیا کہ عورتیں اب زیادہ تعداد میں گھروں سے باہر دکھائی دیتی تھیں' بعضوں نے پردہ ترک کر دیا تھا اور صدی کے اختتام تک رسالوں میں عورتوں کے مضامین شائع ہونے لگے تھے جبکہ وہ ڈاکٹر اور استانیاں بھی بننے لگی تھیں۔ جب برطانوی آئے تو اس سے پہلے ہی تبدیلی کا عمل جاری تھا اور گو کہ ایک لمبا سفر باقی تھا تاہم آغاز ہو چکا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قاسم امین کی کتاب نے پردے جیسے مسئلے کو جدیدیت پذیری کے حوالے سے ہونے والے مباحثے میں مرکزی اہمیت دلوادی۔ اس نے زور دے کر کہا کہ جب تک پردہ ختم نہیں کیا جاتا اسلامی دنیا ذلتوں کا شکار رہے گی۔ ''تحریر المراء'' کی وجہ سے پیدا ہونے والے اشتعال کے سبب پردے نے بہت سے مسلمانوں کے لیے مسلمہ حیثیت حاصل کر لی۔ امین ایسا پہلا شخص نہیں تھا' جو پردے کو اسلام کی پسماندگی کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ جب برطانوی آئے تو وہ پردے کی روایت سے بہت نفور ہوئے' حالانکہ اس زمانے میں بیشتر مغربی مرد نسائیت پسندی (Feminism) کا مضحکہ اڑاتے ہوئے اس بات کے خواہاں رہتے تھے کہ ان کی بیویاں گھروں تک محدود رہیں اور عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے مخالف تھے۔ لارڈ کرومر بھی اسی قسم کا شخص تھا: وہ ''عورتوں کے حق رائے دہی کی مخالفت کرنے والے لندن کے مردوں کی لیگ'' (Men's League For Opposing Women's Surrage) کے بانیوں میں شامل تھا' لیکن مصر کے بارے میں اپنی یادگار کتاب میں اس نے مسلمان عورتوں کی حیثیت پر بہت زیادہ فکر کا اظہار کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ عورتوں کی پست حالت ایک ایسا روگ ہے' جو بچپن ہی سے اپنا تباہ کن کام شروع کر دیتا ہے' عہد طفولیت میں وہ اپنی ماؤں کا جبر سہتی ہیں۔ پردے کی رسم ایک ایسی ''منحوس رکاوٹ'' ہے' جس نے مصریوں کو ''فکر اور کردار کی وہ رفعت'' حاصل کرنے سے روک رکھا ہے' جسے مغربی تہذیب کے ساتھ متعارف ہونا چاہیے۔ مشنریوں نے بھی پردے کے المناک اثرات کا ماتم کیا' جو ان کے ایقان کے مطابق' ایک عورت کو زندہ درگور کر دیتا ہے اور اسے پست کر کے ایک قیدی یا غلام کی حیثیت دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کے لوگوں کو مغربی نوآبادیات کاروں کی مشفقانہ سرپرستی کی کتنی حاجت ہے۔

امین نے پردے کے حوالے سے یورپیوں کے کسی حد تک مغالطہ آمیز اندازے کو قبول کر لیا۔ ''تحریر المراء'' میں نسائیت پسندی کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ امین نے تو مصری عورت کو غلیظ اور جاہل قرار دیا۔ اس نے کہا کہ ایسی ماؤں کے ساتھ مصر ایک پسماندہ اور کاہل قوم کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ کیا مصریوں نے تصور کیا ہے کہ:

> ''یورپ کے لوگ' جو ذہانت اور احساس کی ایسی کاملیت حاصل کر چکے ہیں کہ جس نے انہیں بھاپ اور بجلی کی قوت کو دریافت کرنے کے قابل بنا دیا' .....وہ لوگ جو زندگی کی مسرتوں پر عزت اور علم کی جستجو میں اپنی زندگیوں کو روزانہ خطرے میں ڈالنے کو ترجیح دیتے ہیں' ..... یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذہانتیں اور یہ روحیں جن کی ہم اتنی تعریفیں کرتے ہیں'.....اگر پردے میں کوئی اچھائی دیکھتیں تو اسے اپنے درمیان رائج رہنے کے بعد ترک کیوں کرتیں؟''

یہ امر تحیر انگیز نہیں کہ اس مریضانہ خوشامد نے شدید ردعمل پیدا کیا۔ عرب ادیبوں نے اپنے معاشرے کے اس تجزیے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس گرما گرم مباحثے کے دوران پردہ نوآبادیاتی نظام کی مزاحمت کی علامت بن گیا' اور اس کی یہ نوعیت برقرار رہی۔ اب بہت سے مسلمان پردے کو سب عورتوں کے لیے لازمی تصور کرتے تھے اور سچے اسلام کی علامت قرار دیتے تھے۔ نوآبادیات کاروں نے خود بہت تھوڑی ہمدردی رکھتے ہوئے بھی اپنے پروپیگنڈے کے ایک جزو کے طور پر چند نسائیت پسندانہ دلائل کو استعمال کر کے اسلامی دنیا میں نسائیت پسندی کے کاز (Cause) کو داغدار کر دیا اور ایک ایسے عدم توازن کو متعارف کروا کر' جو کہ وہاں پہلے وجود نہیں رکھتا تھا' عقیدے کو مسخ کر دیا۔

جدیدیت مذہب کو تبدیل کر رہی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کو یقین تھا کہ ان کے عقیدے فنا کے خطرے سے دوچار ہیں۔ اس انجام سے بچنے کے لیے انہوں نے بہت سی جنگی حکمت عملیوں کو اپنایا۔ بعضوں نے جدید معاشرے سے بالکل منہ موڑ لیا اور مقدس قلعے اور پناہ گاہ کے طور پر اپنے عسکری ادارے قائم کر لیے' کچھ جوابی حملے کی تیاری کر رہے تھے' دیگر لوگ جدیدیت کے سیکولر تعصب کو چیلنج کرنے کے لیے ایک ردِ کلچر (Counterculture) اور ایک اپنا فلسفہ وضع کر رہے تھے۔ یہ ایقان رفتہ رفتہ فروغ پا رہا تھا کہ مذہب کو جدید سائنس کی طرح عقلی ہونا پڑے گا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایک نیا مدافعانہ پن اس جنگجویانہ مذہبیت کا باعث بنا جسے آج ہم بنیاد پرستی کہتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب ششم

سیکولرازم اور قدامت پسندانہ مذہب کا ٹکراؤ

(1900-25ء)

پہلی عالمی جنگ اور اس کے اثرات:

1914ء میں یورپ میں شروع ہونے والی جنگِ عظیم' جس نے فرانس کے منظرنامے کو ڈراؤنے خوابوں والے جہنم میں تبدیل کر دیا تھا' جدید روح کے سفاکانہ اور اپنے آپ کو تباہ کرنے کے رجحان کا اظہار تھی۔ اس جنگ نے نوجوان نسل کے بہت بڑے حصے کو موت کے اندھیروں میں سلا کر یورپ کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی شاید کبھی نہیں ہو سکتی۔ جنگ کے بعد کوئی بھی اہل فکر تہذیب کے ارتقا کے حوالے سے امید پرستی کا حامل نہیں تھا۔ یورپ کی انتہائی ترقی یافتہ اقوام نئی عسکری ٹیکنالوجی کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئی تھیں اور یہ جنگ اس میکانیت کی پیروڈی لگتی تھی' جس نے اتنی دولت اور قوت مہیا کی تھی۔ جب فوج میں جبری بھرتی' فوجیوں کی نقل و حمل اور ہتھیاروں کی تیاری کا پیچیدہ نظام تشکیل پا جاتا ہے اور فعال ہو جاتا ہے تو پھر اس کو روکنا دشوار ہوتا ہے۔ خندقی جنگ کی بے مقصدیت اور مہملیت اس دور کی منطق اور عقلیت پسندی کو خاطر میں نہیں لائی اور چاہے کچھ ہوا سے انسانی احتیاج سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یورپ کے لوگوں نے اس خلاء کا براہِ راست نظارہ کیا' جس کو بعض افراد کئی عشرے قبل محسوس کر چکے تھے۔ مغرب کی معیشت بھی ڈانواڈول ہونا شروع ہو چکی تھی اور 1910ء میں اس کے زوال کا آغاز ہوا جو 1930ء کی دہائی کے مہامندے (Great Depression) کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ دنیا کسی ناقابل تصور المیے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ آئرش شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ژیٹس (1939ء۔1865ء) نے ''دوسرے جنم'' (Second

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Coming کو خیر اور امن کی فتح نہیں بلکہ ایک وحشیانہ اور بے رحمانہ عہد کا آغاز تصور کیا:

ہر شے بکھر رہی ہے' مرکز برقرار نہیں رہ سکتا
دنیا پر انتشار ہی انتشار چھایا ہوا ہے'
لہو کو ماند کر دینے والا جوار بھاٹا امڈ رہا ہے' اور ہر کہیں
معصومیت غرقاب کر دی گئی ہے'
بہترین فرد ہر یقین سے محروم ہیں' جبکہ بدترین فرد
جوش و ولولے سے معمور ہیں

تاہم یہی زمانہ بے مثال تخلیقیت اور جدید روح کے پورے جوبن کو عیاں کرتے ہوئے فنون اور سائنسوں میں کارہائے نمایاں کا بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر شعبے کے مفکر دنیا کو نئے سرے سے تخلیق کرنے' ماضی کو رد کرنے اور آزادی کی خواہش سے سرشار ہیں۔ جدید لوگ ایک بالکل مختلف ذہنیت وضع کر چکے تھے اور دنیا کو مزید جوں کا توں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے ناول ایسے بیانئے تشکیل دے چکے تھے جو علت و معلول (Cause And Effect) کی منظم پیشرفت کو ظاہر کرتے تھے جبکہ جدید بیانئے بکھراؤ کا شکار تھے' وہ قاری کو اس حوالے سے بے یقین رہنے دیتے تھے کہ واقعات کیا بیتے ہیں اور کیا سوچنا ہے۔ پابلو پکاسو (1973ء-1881ء) جیسے مصوروں نے اپنے موضوعات کو الگ الگ کر ڈالا تھا یا انہیں بیک وقت دو مختلف تناظرات سے دکھایا تھا' ایسا لگتا تھا کہ وہ دیکھنے والے کی توقعات کو جان بوجھ کر پورا نہیں کر رہے اور انہوں نے اعلان کیا تھا کہ ایک نیا وژن ضروری ہے۔ فن اور سائنس دونوں میں یہ خواہش موجود تھی کہ اولین اصولوں' تخفیف ناپذیر بنیادوں کی طرف واپسی اختیار کی جائے اور اس اساسِ صفر (Zero Base) سے دوبارہ آغاز کیا جائے۔ اب سائنس دان ایٹم یا پارٹیکل (Particle) کو تلاش کر رہے تھے اور عمرانیات داں اور ماہرین علم بشریات اولین معاشروں کی طرف پلٹ گئے تھے۔ یہ سرچشموں کی طرف قدامت پسندانہ واپسی نہیں تھی' کیونکہ مقصد ماضی کو دوبارہ تخلیق کرنا نہیں بلکہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا' ایٹم کو توڑنا اور کسی بالکل نئی شے کو وجود میں لانا تھا۔ کچھ کوششیں خدا یا فوق الفطرت کے بغیر ایک روحانیت کو تخلیق کرنے کے لیے بھی کی گئی تھیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا کی مصوری' مجسمہ سازی' شاعری اور ڈراما سب کے سب ایک بے ترتیب' تغیر پذیر دنیا میں معنویت کی جستجو تھے' وہ تناظر کے انوکھے روپ اور جدید اسطورہ تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لاشعور کی انتہائی بنیادی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تہوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنے والے سگمنڈ فرائڈ کی تحلیل نفسی والی سائنس بھی ایک نئی بصیرت کی تلاش اور روحانی قوت کے پوشیدہ سرچشمے تک رسائی کی ایک کوشش تھی۔ فرائڈ کے پاس روایتی مذہب کے لیے کوئی وقت نہیں تھا' جسے وہ سائنس کے لوگوں کا انتہائی سنگین دشمن تصور کرتا تھا۔ تاہم اس نے یونانیوں کی پرانی اساطیر کو ایک جدید مفہوم میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی اور حد تو یہ ہے کہ اپنے اساطیری افسانے بنا لئے۔ جدید تجربے کے پیدا کردہ خوف اور دہشت نے کسی غیر محسوس معنویت کی تلاش کو تحریک دی' جو کہ انسانوں کو مایوسی سے بچا سکے' تاہم اسے منطقی' استدلالی فکر کے معمول کے عمل کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ فرائیڈ نے سائنسی عقلیت پسندی سے اپنی مکمل وابستگی کے باوجود یہ حقیقت واضح کی کہ عقل تو ذہن کی محض بالائی پرت ہی کی عکاسی کرتی ہے' جو کہ ہمارے رویوں پر عمیق اثرات ڈالنے والے' مگر ہماری گرفت میں بہت کم آنے والے لاشعوری' غیر منطقی اور غیر تہذیب یافتہ مہیجات کے کھولتے ہوئے کڑھاؤ پر تنی ہوتی ہے۔

بنیاد پرستی: ایک مابعد جدید مذہبیت:

مذہبی لوگ بھی بنیادوں (Fundamentals) پر ایک نیا وژن استوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انتہائی دور اندیش لوگوں نے اس حقیقت کو جان لیا تھا کہ مکمل طور پر جدید ہو جانے والے لوگوں کے لئے پرانے انداز سے مذہبی بننا ناممکن ہے۔ قدامت پسندانہ روحانیت' جو کہ لوگوں کو انتہائی ضروری پابندیوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے اور معاملات کو جوں کا توں قبول کرنے میں مدد دیتی تھی' عقیدہ شکن اور مستقبل اساس (Future Oriented) ماحول میں کسی کام نہیں آ سکتی تھی۔ ان کی سوچ اور ادراک کا پورا ڈھانچہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ مغرب کے بہت سے ایسے لوگ' جنہوں نے مکمل طور پر عقلی تعلیم حاصل کی ہوئی تھی' ماضی میں ماورائیت کا احساس جگانے والی اساطیری' صوفیانہ اور عقائدی رسوم سے آگاہ نہیں تھے۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر وہ مذہبی ہونا چاہتے تو انہیں ایسی رسوم' عقائد اور اعمال وضع کرنے پڑتے' جو انقلابی انداز میں تبدیل ہو جانے والے حالات میں ان کے لیے کارآمد ثابت ہوں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں لوگ مذہبی ہونے کے نئے طریقے ڈھونڈنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جیسا کہ پہلے محوری دور (200 قبل از مسیح تا 700ء) کے لوگوں نے محسوس کیا تھا کہ پرانی فطرت پرستی ان کے عہد کی نئی صورت حالات میں کارآمد نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہی اور انہوں نے نئے عقائد وضع کیے تھے' اسی طرح دوسرے محوری دور میں بھی ویسا ہی چیلنج درپیش تھا۔ کسی بھی حقیقی تخلیقی جدوجہد کی طرح جدید (اور بعدازاں مابعد جدید Postmodern) عقیدے کی تلاش انتہائی دشوار تھی۔ تلاش جاری ہے' تاحال کوئی حتمی تو کیا اطمینان بخش حل بھی دریافت نہیں ہوا ہے۔ البتہ جس مذہبیت (Religiosity) کو ہم ''بنیاد پرستی'' کہتے ہیں' وہ ان چند کوششوں میں سے ایک ہے۔

امریکہ کے پروٹسٹنٹ کچھ عرصے سے کسی نئی چیز کی ضرورت سے آگاہ تھے۔ انیسویں صدی کے اختتام تک فرقوں میں تقسیم رونما ہو چکی تھی تاہم ایسا لگتا تھا کہ کفر کے مقدمات اور فرقہ بدری کا نظارہ کرنے والا 1890ء کی دہائی کا بحران قصۂ پارینہ بن گیا ہے۔ صدی کے ابتدائی برسوں میں لبرل اور قدامت پسند لوگ صنعت کے تیز رفتار اور بے ضابطہ ارتقاء اور شہری زندگی سے ابھرنے والے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرنے والے نام نہاد ترقی پسند دور (20-1900ء) کے سماجی پروگراموں میں شامل تھے۔ تمام فرقوں کے پروٹسٹنٹ' باہمی اعتقادی اختلافات کے باوجود ترقی پسندانہ آدرش سے مخلص تھے اور امتناع یا بہتر تعلیم کے لیے غیر ملکی مشنوں اور مہمات میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ زبردست مشکلات سے دوچار ہونے کے باوجود بیشتر لوگ پراعتماد تھے۔ لبرل الٰہیات داں والٹر راشنبک نے 1912ء میں لکھا کہ امریکہ ''عیسائی'' ہو رہا ہے' اب صرف کاروبار اور صنعت کو ''عیسیٰؑ کی فکر اور روح'' کے مطابق ڈھالنے کا کام باقی ہے۔

پروٹسٹنٹوں نے بے خدا شہروں اور کارخانوں کو عیسائی بنانے کے لیے ''سوشل گوسپیل'' (Social Gospel) بنالی تھی۔ یہ ان کے نقطۂ نظر سے ان عبرانی پیغمبروں اور خود حضرت عیسیٰؑ کی بنیادی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کی ایک کوشش تھی' جنہوں نے اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی تھی کہ قیدیوں سے ملاقات کیا کریں' بے لباسوں کو لباس مہیا کیا کریں اور بھوکوں کو کھانا کھلایا کریں۔ سوشل گوسپیلروں (Social Gospelrs) نے اپنے بقول ''رواجی چرچ'' (Institational Churches) قائم کیے تاکہ غریبوں اور نئے تارکین وطن کو عبادت اور تفریح کی سہولیات مہیا کی جاسکیں۔ نیویارک کے ایک انتہائی گنجان آباد اور مایوس کن علاقے میں 1911ء میں پہلا ''نیویارک لیبر ٹیمپل'' قائم کرنے والے چارل سٹیلزل جیسے لبرل پروٹسٹنٹوں نے سوشلزم کو بپتسمہ دینے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ عیسائیوں کو انجیلی تاریخ کی جزئیات کا مطالعہ کرنے کی بجائے شہری اور محنت کشوں کے مسائل سے آگاہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونا چاہیے اور بچوں کی محنت کشی جیسی برائیوں کے خلاف لڑنا چاہیے۔ صدی کے ابتدائی برسوں میں قدامت پسند عیسائی بھی سماجی پروگراموں میں لبرل پروٹسٹنٹوں کی طرح شریک تھے۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے سماجی کروسیڈز (Crusades) کو شیطان کے خلاف جنگ یا غالب آتی ہوئی مادیت پرستی کے لیے ایک روحانی چیلنج تصور کرتے ہوں' تاہم وہ کم اجرتوں' بچوں کی محنت کشی اور خراب حالات کار پر اتنے ہی متفکر تھے جتنے کہ سٹیلزل جیسے لبرل۔ قدامت پسند بعد میں سوشل گوسپیل پر بہت زیادہ نکتہ چینی کرنے لگے اور یہ استدلال دینے لگے کہ ایک ایسی دنیا کو بچانے کی کوششیں بے سود ہیں' جس کا مقدر ہی فنا ہونا ہے۔ تاہم صدی کے ابتدائی برسوں میں ولیم بی۔ ریلے جیسے ممتاز قدامت پسند' جس نے 1902ء میں نارتھ ویسٹرن بائبل کالج قائم کیا تھا' سماجی مصلحین کے شانہ بشانہ کام کرنے کے لئے رضامند تھے۔ وہ سٹیلزل جیسے سوشل گوسپیلروں کے طریقہ کار کو پسند نہیں کرتا تھا' جس نے اپنے ٹیمپل میں لیون ٹراٹسکی اور ایما گولڈ مین کو خطاب کرنے' کے لیے مدعو کیا تھا' تاہم اس وقت تک قدامت پسند لوگ سیاسی منظر نامے کے دائیں طرف نہیں گئے تھے اور پورے امریکہ میں سماجی فلاح و بہبود کے کام سرانجام دیتے تھے۔

تاہم 1909ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ایمیریٹس چارلس ایلیٹ نے ''مذہب کا مستقبل'' کے عنوان سے ایک خطاب کیا' جس نے زیادہ قدامت پسند لوگوں کے دلوں میں ہول پیدا کر دیا۔ یہ مرکزی قدر کی طرف واپسی کی ایک اور کوشش تھی۔ ایلیٹ کا ایقان تھا کہ نئے مذہب کا صرف ایک حکم (Commandment) ہو گا: خدا سے محبت' جو دوسروں کی عملی خدمت میں ظاہر ہو گی۔ نہ تو چرچ کی ضرورت ہو گی اور نہ صحیفوں کی' نہ گناہ کی الٰہیات اور نہ عبادت کی۔ خدا کی موجودگی اتنی واضح ہے کہ کسی ظاہری عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ صداقت پر صرف عیسائیوں کی اجارہ داری نہیں ہے کیونکہ سائنس دانوں' سیکولر لوگوں یا مختلف عقیدوں سے تعلق رکھنے والوں کے نظریات بھی اتنے ہی صادق ہیں۔ دوسرے انسانوں کا خیال رکھنے کے حوالے سے مستقبل کا مذہب جمہوریت' تعلیم' سماجی اصلاح اور حفظانِ صحت جیسے سیکولر آدرشوں سے مختلف نہیں ہو گا۔ سوشل گوسپیل کا یہ انتہائی روپ حالیہ عشروں کے اعتقادی تنازعات کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا۔ صرف عقلی اور سائنسی اعتبار سے ثابت کی جا سکنے والی صداقت کو اہمیت دینے والے معاشرے میں کٹر عقیدہ ایک مسئلہ بن گیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ الٰہیات ایک پوجمان (Fetish) بن سکتی تھی' ایک الفاظ سے ماورا اور بیان نہ کی جا سکنے والی حقیقت کی علامت کے بجائے اعلیٰ ترین قدر کا حامل ہو جانے والا ایک بت۔ ایلیٹ عقیدے سے روگردانی کرتے ہوئے اپنے خیال کے مطابق بنیاد یعنی خدا اور ہمسائے سے محبت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دنیا کے تمام عقیدوں نے سماجی انصاف اور کمزوروں کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے۔ تمام روایات نے رحم اور مہربانی کے منظم اور عملی اظہار کو تقدس کا احساس پیدا کرنے والا پایا تھا' بشرطیکہ یہ انا کی تسکین کا عمل نہ بن جائے۔ اس طرح ایلیٹ آرتھوڈوکس عقائد کی نسبت عمل پر زیادہ زور دینے والا مذہب تشکیل دیتے ہوئے جدید دنیا میں عیسائیت کے حقیقی مخمصے سے نمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تاہم قدامت پسند مشتعل ہو گئے۔ ان کے خیال کے مطابق حتمی عقائد سے خالی عقیدہ عیسائیت نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اس لبرل خطرے کا مقابلہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ 1910ء میں صحیفے کی حتمیت کا عقیدہ وضع کر لینے والے پرنسٹن کے پریسبائیٹرینوں نے پانچ ناقابل تغیر عقیدوں کی فہرست جاری کی' جنہیں وہ بنیادی اہمیت کے حامل تصور کرتے تھے: (1) صحیفہ غلطیوں سے پاک ہے۔ (2) عیسیٰؑ کنواری مریمؑ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ (3) عیسیٰؑ نے صلیب پر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کیا تھا۔ (4) وہ جسمانی طور پر آسمان کو اٹھ گئے تھے۔ (5) ان کے معجزے معروضی حقائق تھے۔ (اس آخری عقیدے کی جگہ بعد ازاں ''پری ملینیل ازم'' کی تعلیمات کو دے دی گئی)۔ مزید برآں 1908ء میں ''تنقید عالیہ'' کو روکنے کے لیے لاس اینجلس میں بائبل کالج قائم کرنے والے تیل کے لکھ پتی تاجروں لائمین اور ملٹن سٹیوارٹ نے لوگوں کو مرکزی اہمیت کے حامل شعائر کی تعلیم دینے کے ایک منصوبے کے لیے رقوم مہیا کیں۔ 1910ء سے لے کر 1915ء کے درمیانی عرصے میں انہوں نے ''بنیادیں'' (The Fundamemtals) کے عنوان سے بارہ پمفلٹ شائع کروائے' جن میں ممتاز قدامت پسند الٰہیات دانوں نے تثلیث جیسے عقائد کو آسان الفاظ میں بیان کیا' ''تنقید عالیہ'' کی تردید کی اور انجیل کی صداقت کو پھیلانے کی تاکید کی۔ ان بارہ پمفلٹوں کی تیس تیس لاکھ نقول پورے امریکہ میں ہر پادری' پروفیسر اور الٰہیات کے طالب علم کو مفت بھیجی گئیں۔ بعد ازاں اس پروجیکٹ کو زبردست علامتی اہمیت حاصل ہو گئی کیونکہ بنیاد پرست اسے اپنی تحریک کے فروغ کا سبب سمجھتے تھے۔ تاہم اس وقت ان پمفلٹوں نے تنقید کم کی تھی اور ان کا لہجہ نہ تو انقلابی تھا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور نہ ہی بالخصوص عسکریت پسندانہ۔

جنگِ عظیم اور امریکی پری ملینیئل ازم:

تاہم جنگ عظیم کے دوران قدامت پسندانہ پروٹسٹنٹ ازم میں دہشت کا ایک عنصر شامل ہو گیا اور وہ بنیاد پرست ہو گیا۔ امریکیوں میں ہمیشہ یہ رجحان موجود رہا تھا کہ وہ ہر تنازعے کو الہامی تناظر میں دیکھتے تھے اور جنگ عظیم نے بہت سے امریکیوں کو ان کے پری ملینیئل اعتقادات میں پختہ کر دیا۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری دنیا کے اختتام کی شروعات ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ وہی جنگ ہے جس کی پیشگوئی ''کتاب الہام'' میں کی جا چکی ہے۔ اس ''زمانے کی مزید علامتیں'' ڈھونڈنے کے لیے سکوفیلڈ ریفرنس بائبل کی تحقیق پر مبنی تین پیش گوئی کانفرنسیں 1914ء سے لے کر 1918ء کے درمیان منعقد کی گئیں۔ ہر شے اشارہ کر رہی تھی کہ پیشگوئیاں سچ ہو رہی ہیں۔ عبرانی پیغمبروں نے پیشگوئی کی تھی کہ دنیا کے اختتام سے پہلے یہودی اپنے وطن واپس آ جائیں گے' لہٰذا جب برطانوی حکومت نے فلسطین میں یہودیوں کے وطن کے لیے حمایت کا عہد کرتے ہوئے اعلان بالفور (1917ء) جاری کیا تو پری ملینیلسٹ خوف کے ساتھ ساتھ فخر بھی محسوس کرنے لگے۔ سکوفیلڈ نے کہا تھا کہ روس وہ ''شمالی طاقت'' ہو گا' جو آرماگیڈن سے تھوڑا عرصہ پہلے اسرائیل پر حملہ کرے گا اور کمیونزم کو ریاستی نظریہ بنا دینے والے بالشویک انقلاب (1917ء) نے اس بات کو پختہ کر دیا۔ لیگ آف نیشنز کے قیام نے الہام 16:14 کو واضح طور پر پورا کر دیا یعنی یہ رومن سلطنت کا احیاء تھی' جس پر جلد ہی اینٹی کرائسٹ کا غلبہ ہو جانا تھا۔ عالمی حالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے پری ملینیئل پروٹسٹنٹ سیاسی اعتبار سے زیادہ حساس ہو گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فرقوں کے اندر لبرل لوگوں کے ساتھ ایک خالصتاً اعتقادی جھگڑا تہذیب کے مستقبل کے لیے ایک کشمکش میں ڈھل رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ان شیطانی طاقتوں کے خلاف پہلی صف میں دیکھتے تھے' جنہوں نے دنیا کو جلد ہی تباہ کر دینا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جنگ کے دوران اور فوری بعد جرمنوں کے ظلم و ستم کی کہانیوں نے قدامت پسندوں کی تصدیق کر دی تھی کہ انہوں نے تنقید عالیہ کی خالق قوم کو رد کر کے کتنا درست کیا تھا۔

تاہم یہ وژن گہرے خوف کا پیدا کردہ تھا۔ یہ کیتھولکوں' کمیونسٹوں اور ناقدین عالیہ (Higher Critics) کے ذریعے قوم میں سرایت کر جانے والے غیر ملکی اثرات کے خوف سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھرا ہوا تھا۔ یہ بنیاد پرستانہ عقیدہ جدید دنیا کے گہرے خوف کو ظاہر کرتا ہے۔ قدامت پسند پروٹسٹنٹ جمہوریت کے حوالے سے دو متضاد جذبات کے حامل تھے' ان کا خیال تھا کہ وہ ''ہجوم کی حکمرانی'' ''سرخ ری پبلک'' ''دنیا کی سب سے زیادہ ابلیسی حکومت'' کا پیش خیمہ بنے گی۔ اس کے بعد سے لیگ آف نیشنز جیسے امن قائم کرنے والے اداروں کو بنیاد پرستوں نے ہمیشہ شیطانی رنگ میں رنگا ہوا دیکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ لیگ آف نیشنز واضح طور پر اینٹی کرائسٹ کا مسکن ہے' جس کے بارے میں سینٹ پال نے کہا تھا کہ وہ ایک بظاہر معقول نظر آنے والا جھوٹا ہوگا جو ہر کسی کو دام فریب میں پھانس لے گا۔ بائبل نے کہا تھا کہ اختتامی زمانے میں امن نہیں بلکہ جنگ ہوگی لہٰذا لیگ آف نیشنز غلط راستے پر گامزن ہے۔ بلاشبہ اینٹی کرائسٹ ایک امن قائم کرنے والا ہوگا۔ لیگ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں سے بنیاد پرستوں کی سخت ذہنی برگشتگی جدیدیت کی مرکزیت پذیری کے ایک گہرے اندرونی خوف اور عالمی حکومت سے مشابہت رکھنے والی کسی شے کی دہشت کو بھی عیاں کرتی تھی۔ جب کچھ لوگوں کا سامنا جدید معاشرے کی آفاقیت سے ہوا تو وہ قبائلیت کی طرف جبلی طور پر پسپا ہو گئے۔

سازش کا اس قسم کا خوف' جو لوگوں کو یہ احساس دیتا ہے کہ وہ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں' آسانی جارح ہو سکتا ہے۔ عیسیٰؑ ڈوائٹ موڈی کے پرچار والے محبت کے مسیحا نہیں رہے۔ جیسا کہ ممتاز پری ملینیلسٹ آئزک ایم۔ ہالڈمین نے توضیح کی کہ کتاب الہام والے عیسیٰؑ ''آئندہ محبت یا دوستی ڈھونڈنے والے کی حیثیت سے نہیں آئیں گے..... ان کا لباس لہو میں تر ہوگا' دوسروں کے لہو سے۔ وہ انسانوں کا خون بہانے آئیں گے''۔ قدامت پسند لوگ ایک جنگ کے لیے تیار تھے جبکہ اس اہم ترین زمانے میں لبرل پروٹسٹنٹ جارحیت پر اتر آئے تھے۔

جنگ عظیم اور لبرل:

جنگ نے لبرل لوگوں کو بھی دشواری میں ڈال دیا تھا۔ اس نے خداوند کی بادشاہت کی طرف بے روک ٹوک سیدھی بڑھتی ہوئی دنیا کے ان کے وژن کو چیلنج کر دیا تھا۔ اس سے نمٹنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ وہ اسے تمام جنگوں کو ختم کرنے والی جنگ تصور کریں' جو دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنا دے گی۔ وہ پری ملینیل ازم کے تشدد نیز جمہوریت اور لیگ آف نیشنز پر اس کی تباہ کن تنقید سے خوف زدہ تھے۔ انہیں ایسے اعتقادات نہ صرف غیر امریکی بلکہ خود عیسائیت کا انکار محسوس ہوتے تھے۔ انہوں نے حملے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی محبت اور رحم کی انجیل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے باوجود ان کی مہم سفاکانہ اور غیر متوازن تھی۔ 1917ء میں امریکہ میں لبرل عیسائیت کے ممتاز علمی ادارے یونیورسٹی آف شکاگو کے ڈوائٹی سکول (Divinity School) کے الٰہیات دانوں نے شہر کی دوسری سمت واقع موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ پر حملے شروع کر دیئے۔ پروفیسر شرلے جیکسن نے پری ملینیلسٹوں پر الزام لگایا کہ وہ ملک کے غدار ہیں اور جرمنوں سے پیسہ حاصل کر رہے ہیں۔ ایلوا ایس۔ ٹیلر نے بالشویکوں سے ان کا موازنہ کیا' جو دنیا کو ایک ہی دن میں ازسرنو بنانا چاہتے تھے۔ ''کرسچین رجسٹر'' کے مدیر ایلفرڈ ڈنقباخ نے پری ملینیل ازم کو مذہبی فکر کے میدان میں انتہائی حیرت ناک ذہنی گمراہی'' قرار دیا۔

موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ کو' دشمنوں سے جوڑ کر' جو نہ صرف ان کے سیاسی حریف تھے بلکہ جنہیں وہ شیطان تصور کرتے تھے' لبرل لوگوں نے اوچھا وار کیا تھا۔ قدامت پسندوں نے بھی سخت جواب دیا۔ ''موڈی بائبل انسٹی ٹیوٹ منتھلی'' کے مدیر اور انسٹی ٹیوٹ کے صدر جیمز ایم۔ گرے نے لبرل لوگوں کی امن پسندی (Pacifism) کو اسلحہ کی دوڑ میں جرمنی سے امریکہ کے پیچھے رہ جانے کی وجہ قرار دیا' لہٰذا وہی جنگ میں شکست کے خطرے کا باعث تھے۔ ایک پری ملینیل رسالے ''دی کنگز بزنس'' میں تھامس سی۔ ہارٹن نے لکھا کہ لبرل لوگ جرمنوں کے رفیق ہیں' کیونکہ وہ جس تنقید عالیہ کی تعلیم اپنے ڈوائٹی سکول میں دیتے ہیں' وہ جنگ کا باعث اور جرمنی میں تمام شائستہ اقدار کی شکست و ریخت کی ذمہ دار ہے۔ دیگر قدامت پسندانہ مضامین میں عقلیت پسندی اور نظریۂ ارتقاء کو جرمنوں کے ظلم و ستم کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ بائبل انسٹی ٹیوٹ آف لاس اینجلس کے ہاورڈ ڈبلیو۔ کیلوگ نے باصرار کہا ''دنیا میں ہر ایک عفریت کے غلبے' تہذیب کی تباہی اور خود عیسائیت کی بربادی'' کا ذمہ دار ارتقاء کا فلسفہ ہے۔ دونوں فریقوں کے اس تلخی سے بھرے اور غیر عیسائی (Unchristian) جھگڑے نے فنا کا گہرا احساس پیدا کیا۔ تنقید عالیہ کے حوالے سے' جسے اب قدامت پسند مطلق شر تصور کرتے تھے' مفاہمت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انجیل کی لفظی صداقت خود عیسائیت کے لیے حیات و موت کا معاملہ بن گئی تھی۔ بپٹسٹ پادری جان سٹریٹن نے اپنے مشہور وعظ بعنوان ''اگر نیویارک شہر تائب نہ ہوا تو کیا وہ تباہ ہو جائے گا؟'' میں اعلان کیا کہ بائبل تنقید کرنے والوں کے اس عمل کا نتیجہ انارکی اور تہذیب کے انہدام کی صورت میں نکلے گا۔ یہ تنازعہ قابو سے باہر ہو گیا تھا اور صلح تقریباً ناممکن ہو گئی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکہ میں ورلڈز کرسچین فنڈامینٹلز ایسوسی ایشن کا قیام:

اگست 1917ء میں ولیم بیل ریلے نے ''دی فنڈامینٹلز'' کے ایک مدیر اے۔سی۔ ڈکسن (1925ء-1854ء) اور احیاء پسند روبن ٹوری کے ساتھ ملاقات کی اور بائبل کی لفظی تعبیر اور پری ملینیل ازم کے ''سائنسی'' اعتقادات کو فروغ دینے کے لیے ایک تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ 1919ء میں ریلے نے فلاڈیلفیا میں ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کی' جس میں تمام پروٹسٹنٹ فرقوں سے تعلق رکھنے والے چھ ہزار قدامت پسندوں نے شرکت کی اور ''ورلڈز کرسچین فنڈامینٹلز ایسوسی ایشن'' (WCFA) کو باقاعدہ طور پر قائم کیا گیا۔ اس کے فوری بعد ریلے نے چودہ مقرروں اور انجیل گانے والوں کے ایک طائفے سمیت پورے امریکہ میں اٹھارہ شہروں کا ایک انتہائی منظم دورہ کیا۔ لبرل اس یلغار کے لیے قطعاً تیار نہیں تھے اور بنیاد پرست (فنڈامینٹلسٹ) مقرروں کو اتنے والہانہ طور پر سنا گیا کہ ریلے کو یقین ہو گیا کہ اس نے ایک اور ''ریفارمیشن'' کا آغاز کر دیا ہے۔ بنیاد پرستانہ مہم کو ایک جنگ تصور کیا گیا۔ قائدین مستقل طور پر عسکری مثالیں استعمال کر رہے تھے۔ ای۔اے۔وولم نے ''کرسچین ورکرز میگزین'' میں لکھا ''مجھے یقین ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے جب اس ملک کی ایوانجیلیکل قوتوں' بنیادی طور پر بائبل انسٹی ٹیوٹس' کو نہ صرف عقیدے کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہونا چاہیے بلکہ ایک متحد اور حملہ آور قوت بن جانا چاہیے۔'' اس رسالے کے اس شمارے میں جیمز ایم۔گرے نے اس امر سے اتفاق کیا کہ ''چرچ کا ایک حملہ آور اور مدافعتی اتحاد تشکیل دیا جائے۔'' 1920ء میں ''جنوبی بپٹسٹ کنونشن'' کے ایک اجلاس میں کرٹس لی لازنے ''بنیاد پرست'' کی تعریف بیان کرتے ہوئے اسے ایک ایسا شخص قرار دیا' جو اینٹی کرائسٹ کے قبضے میں چلے جانے والے علاقے کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے تیار ہو اور ''عقیدے کی بنیادوں (فنڈامینٹلز) کے لیے جنگ کرنے پر کمربستہ ہو۔ ریلے اس سے بھی آگے چلا گیا۔ اس نے کہا کہ یہ محض کوئی الگ تھلگ جنگ نہیں بلکہ ''یہ تو ایک لامختتم جنگ ہے۔''

بنیاد پرستوں کا اگلا قدم تمام فرقوں سے لبرل لوگوں کا اخراج تھا۔ بیشتر بنیاد پرست یا تو بپٹسٹ تھے یا پریسبائٹیرین' اور انہی فرقوں میں سب سے زیادہ ہولناک جنگیں برپا ہوئیں۔ بنیاد پرستوں کے سب سے بڑے دانشور پریسبائٹیرین الٰہیات داں جے۔گریشم میکن (1937ء-1881ء) نے اپنی مشہور کتاب (1923ء) Christianity and Liberalism

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں لکھا کہ لبرل کافر ہیں' جو بعض بنیادی عقائد کو مسترد کر کے عیسائیت ہی کا انکار کر رہے ہیں۔ جب بنیاد پرست پریسبائٹیرینوں نے چرچ پر اپنا پانچ نکاتی مسلک مسلط کرنے کی کوشش کی تو فرقوں کی جنرل اسمبلیوں میں خوفناک لڑائیاں ہوئیں۔ ایک تلخ ترین جھگڑے کے بعد ریلے نے بپٹسٹ اسمبلی سے الگ ہو کر کٹر پسندوں کی ''بائبل بپٹسٹ یونین'' بنا لی۔ بعض بنیاد پرست بپٹسٹ اندر رہ کر اصلاح کی امید میں مرکزی فرقے میں ہی رہ گئے تاہم انہیں ریلے کی نفرت ہی کمانا پڑی۔

کیا بنیاد پرست جیتیں گے؟

یہ اختلافات جاری رہے اور اس حد تک فروغ پا گئے کہ لگتا تھا ثالثی کی کوئی بھی کوشش معاملات کو بدتر بنا دے گی۔ جب ایک امن پسند انسان اور اس زمانے میں امریکہ کے انتہائی بااثر مذہبی پیشوا لبرل مبلغ ہیری ایمرسن فوسڈک (1969ء-1878ء) نے 1922ء کے بپٹسٹ کنونشن میں اپنے وعظ میں' (جو بعد ازاں ''دی بپٹسٹ'' میں'' کیا بنیاد پرست جیتیں گے؟'' کے عنوان سے شائع ہوا)۔ رواداری اپنانے کا کہا تو ردعمل کی تلخی نے ظاہر کر دیا کہ یہ لبرل تصورات کتنی شدید نفرت پیدا کرتے تھے۔ یہ نفرت دوسرے فرقوں تک پھیل گئی۔ وعظ کے بعد ایسا لگتا تھا کہ بنیاد پرست طبقے کی طرف زبردست جھکاؤ پیدا ہو گیا: زیادہ قدامت پسند ڈسائپلز آف کرائسٹ (Disciples of Christ)' سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ (Seventh-Day Adventist) پینٹی کوسٹل (Penticostals)' مورمن (Mormons) اور سالویشن آرمی (Salvation Army) بنیاد پرست کاز کی طرف راغب ہو گئے۔ حد تو یہ تھی کہ اس تنازعے سے الگ تھلگ رہنے والے میتھڈسٹوں اور اپسکوپیلین (Episcopalian) کو بھی قدامت پسندوں نے کہا کہ وہ ''عیسائیت کی زندہ اور ابدی صداقتوں'' کو لازماً اپنائیں۔ 1923ء تک ایسا لگتا تھا کہ بنیاد پرست بلاشبہ جیت جائیں گے اور یہ کہ وہ عیسائی فرقوں کو لبرل خطرے سے نجات دلا دیں گے۔ لیکن پھر ایک نئی مہم نے قوم کی توجہ حاصل کر لی اور اس نے بالآخر پوری بنیاد پرست تحریک ہی کو بے وقار بنا دیا۔

1920ء میں ڈیموکریٹک سیاستدان اور پریسبائٹیرین ولیم جینگز برائن (1925ء-1860ء) نے سکولوں اور کالجوں میں نظریۂ ارتقا پڑھانے کے خلاف ایک کروسیڈ شروع کر دیا۔ اس کے خیال میں تنقید عالیہ نہیں بلکہ ڈارونیت (Darwinism) پہلی عالمی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ کا باعث تھی۔ برائن دو ایسی کتابوں سے متاثر رہا تھا جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا تھا کہ انہوں نے نظریۂ ارتقا اور جرمن عسکریت پسندی میں براہ راست ربط قائم کیا تھا۔ ایک کتاب بنجامن کڈ کی (1918ء) The Science of Power اور دوسری ورنن ایل۔ کیلوگ کی (1917ء) Headquarter Nights تھی' اس میں جرمن افسروں کے انٹرویو شامل تھے' جنہوں نے جنگ برپا کرنے کے لئے جرمنوں کے فیصلہ کرنے میں مبینہ طور پر ڈارونیت کے اثرات کو بیان کیا تھا۔ برائن نے لکھا کہ نہ صرف اس تصور نے کہ صرف مضبوط ہی زندہ رہ سکتا ہے یا رہنا چاہیے ''تاریخ کی خونیں ترین جنگ کا آغاز کیا بلکہ ایسی سائنس نے جس نے فوجیوں کے دم گھونٹ دینے والی زہریلی گیسیں تیار کیں' پرچار کر رہی تھی کہ انسان کے آباؤ اجداد وحشی تھے اور بائبل سے معجزات اور مافوق الفطرت واقعات کو مٹا رہی تھی۔ اسی زمانے میں برائن مار کے نفسیات داں جیمز ایچ۔ لیوبا نے اپنی کتاب Belief in God and Immortality میں ایسے اعداد و شمار پیش کئے جو ''ثابت کرتے تھے'' کہ کالج کی تعلیم سے مذہب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ڈارونیت خدا' بائبل اور عیسائیت کے دوسرے بنیادی عقائد پر نوجوان مردوزن کے ایقان کو زائل کر رہی ہے۔ برائن نہ تو مخصوص قسم کا بنیاد پرست تھا' نہ پری ملینیلسٹ اور نہ ہی اس نے نئی سخت گیر لفظ پرستی کے ساتھ بائبل کو پڑھا تھا۔ تاہم اس کی ''تحقیق'' نے اس کو قائل کر لیا تھا کہ نظریۂ ارتقا اخلاقیات' شائستگی اور تہذیب کی بقا کے خلاف ہے۔ جب اس نے "The Menace of Darwinism" کے عنوان سے پورے امریکہ میں خطابات کئے تو بے شمار لوگ اسے سننے آتے اور ذرائع ابلاغ نے اسے بھرپور کوریج دی۔

برائن کے نتائج سطحی' سادہ اور نادرست تھے تاہم لوگ اسے سننے پر تیار تھے۔ پہلی عالمی جنگ نے سائنس کے ساتھ ہنی مون کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اب اس کے خوفناک امکانات کے حوالے سے ایک بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور بعض حلقوں میں تو یہ خواہش جنم لے چکی تھی کہ اسے محدود ہی رکھا جائے۔ ان کے نزدیک ڈارون کا سائنسی نظریہ بعض سائنسی ماہروں کے ''عقل سلیم'' کے خلاف کام کرنے کے رجحان کی ایک نمایاں مثال تھی۔ ایسے لوگ' جو سادہ مذہب کے خواہش مند تھے' نظریۂ ارتقا کو رد کرنے کے لیے ایک بظاہر معقول وجہ کو پانے کے بے حد شائق تھے۔ برائن نے انہیں وہ وجہ فراہم کر دی' اور تن تنہا نظریۂ ارتقا کے موضوع کو بنیاد پرستانہ ایجنڈے میں سرفہرست لے آیا۔ یہ وجہ بنیاد پرستوں کے لیے مرغوب خاطر تھی کیونکہ ڈارونیت بائبل کے لفظی معانی سے اختلاف کرتی تھی اور اس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اثرات کے بارے میں برائن کی مریضانہ تشریحات نے ان خوفوں کو بڑھا دیا جو پہلی عالمی جنگ کے بعد ابھرے تھے۔ جیسا کہ پچاس برس پہلے چارلس ہوج نے لکھا تھا کہ ڈارون کا مفروضہ (Hypo thesis) بیکونین (Baconian) انداز فکر کے حامل بنیاد پرستوں کے لیے بے جوڑ تھا' جواب بھی ابتدائی جدیدیت کے سائنسی تناظر سے جڑے ہوئے تھے۔ امریکہ کے مشرق کے بڑے شہروں نیز ییل اور ہارورڈ یونیورسٹیوں کے دانشور اور سفطائی تو ہوسکتا تھا ان نئے تصورات کو ولولہ و جوش کے ساتھ مان لیتے تاہم وہ چھوٹے شہروں کے رہنے والے امریکیوں کے لیے عجیب وغریب تھے' جو یہ محسوس کرتے تھے کہ سیکولر ایسٹیبلشمنٹ نے ان کے کلچر کو مٹا دیا ہے۔ تاہم نظریۂ ارتقا کے خلاف مہم نے بنیاد پرستانہ خوف کے طور پر تنقید عالیہ کی جگہ نہیں لی تھی' کیونکہ وہ جنوب میں ڈرامائی انداز میں عام نہیں ہوئی تھی' جس نے اس وقت تک بنیاد پرستانہ جنگ میں کم حصہ لیا تھا۔

شہرۂ آفاق سکوپس مقدمہ:

جنوب والوں کو بنیاد پرست بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس زمانے میں جنوب کی ریاستیں شمال کی نسبت زیادہ قدامت پسند تھیں اور جنوبی فرقوں میں لبرل لوگ اتنے کم تھے کہ ان کی وجہ سے بنیاد پرستانہ مہم شروع نہیں ہوسکتی تھی۔ تاہم جنوب والوں کو سکولوں میں نظریۂ ارتقا کی تدریس پر تشویش ضرور تھی۔ یہ ایک اجنبی نظریے کے ذریعے ان کے معاشرے کو نوآبادی بنائے جانے کی ایک مثال تھی اور فلوریڈا' مس سپی' لوئیزیانا اور ارکنساس کی ریاستی مقننہ میں ڈارون کے نظریے کی تدریس پر پابندی لگانے کے لیے مسودہ ہائے قانون پیش کیے گئے۔ ٹینی سی میں ارتقا مخالف قوانین بالخصوص سخت تھے اور ڈیٹن جیسے چھوٹے قصبے کے ایک نوجوان استاد جان سکوپس نے یہ اعتراف کر کے اس قانون کو آزمائش میں ڈالا اور آزادیٔ اظہار کے لیے ایک علامتی مُکا مارا کہ جب ایک مرتبہ اس نے سکول کے پرنسپل کی جگہ حیاتیات (بیالوجی) کی جماعت کو پڑھایا تھا تو اس قانون کو توڑ دیا تھا۔ جولائی 1925ء میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور نئی تنظیم امریکن سول لبرٹیز یونین (ACLU) نے اس کے دفاع کے لئے وکلاء کی ایک ٹیم بھیجی' جس کا سربراہ عقلیت پسند وکیل کلارنس ڈیرو (1938ء-1857ء) تھا۔ ریلے اور دیگر بنیاد پرست قائدین کی درخواست پر ولیم جینگز برائن قانون کی مدد کرنے پر راضی ہوگیا۔ جب ڈیرو اور برائن وارد ہوگئے تو وہ محض شہری آزادیوں کا مقدمہ ہی نہیں رہا بلکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب اور سائنس کے مابین ایک مقابلے میں ڈھل گیا۔

سکوپس مقدمہ دو یکسر مختلف نکتہ ہائے نظر کے درمیان ایک تصادم تھا۔ برائن اور ڈیرو دونوں ہی انتہائی اہم امریکی اقدار کا دفاع کر رہے تھے۔ ڈیرو آزادئ اظہار کا اور برائن' جو کہ مدتوں سے فاضل ماہرین اور سپیشلسٹوں کے اثر کو ناپسند کرتا آ رہا تھا' عام لوگوں کے حقوق کا۔ برائن کی تمام سیاسی مہمات عام لوگوں میں مقبول ہوئی تھیں۔ In His Image(1922ء) پر تبصرے میں برائن نے ڈارون کا جواب دیتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ''ایسے لوگوں کے عددی اعتبار سے بڑے حصے کا ترجمان تھا' جن میں سے زیادہ تر اظہار کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ان کے تصورات کا اظہار کرنے والا واحد ایسا شخص ہے جسے لوگ توجہ سے سنتے ہیں۔'' بلاشبہ یہ بات سچ تھی لیکن بدقسمتی سے برائن مقدمے کے دوران ان بالکل ابتدائی نوعیت کے اور مبہم اندیشوں کو مناسب انداز میں پیش نہیں کر پایا۔ جہاں ڈیرو نے نہایت عمدگی سے یہ بات واضح کی کہ سائنس آزادی کا اظہار کرتی اور اسے فروغ دیتی ہے' وہاں پریسبائٹیرین اور بیکونین برائن نے اس بات پر زور دیا کہ واضح ثبوت کی عدم موجودگی میں لوگوں کو حق ہے کہ وہ ڈارونیت جیسے کسی ''ثابت نہ ہو سکنے والے مفروضے'' کو اس کے غیر اخلاقی اثرات کی وجہ سے رد کر دیں۔ جہاں سکوپس اس سارے مقدمے کو مضحکہ خیز ڈھونگ تصور کر رہا تھا' وہاں ڈیرو اور برائن انتہائی دیانت داری سے حصہ لے رہے تھے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے خیال کے مطابق مقدس اور ناقابل انحراف اقدار کے لیے لڑ رہا تھا۔ تاہم جب ڈیرو نے برائن کو کٹہرے میں کھڑا کر کے بے رحمانہ جرح کا نشانہ بنایا تو اس سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ برائن کی آراء کس قدر سادہ اور پریشان خیالی کا نتیجہ تھیں۔ ڈیرو نے برائن کو گھیر کر اسے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ دنیا بائبل کے لفظی بیان کی بجائے چھ ہزار برس سے زیادہ پرانی ہے' یہ کہ اس نے بائبل کے ماخذات کے حوالے سے کوئی تنقیدی تحریر کبھی نہیں پڑھی' یہ کہ اسے کسی دوسرے عقیدے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور آخری بات یہ کہ ''میں ان چیزوں کو بے سوچے سمجھے قبول کر لیتا ہوں۔'' اور ''کبھی کبھار'' ہی غور کرتا ہوں۔ یہ تو شکست فاش تھی۔ ڈیرو اس مقدمے سے واضح عقلی فکر کا ہیرو بن کر ابھرا جبکہ بوڑھا برائن خام' نااہل اور جہل پسندی کے حامی کے طور پر نمایاں ہوا۔ اپنی مشقتوں کے نتیجے میں وہ مقدمے کے بعد چند دنوں کے اندر اندر مر گیا۔

سکوپس کو مجرم قرار دے دیا گیا' لیکن اے سی ایل یو (ACLU) نے اس کا جرمانہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادا کیا اور ڈیٹن میں بلاشبہ ڈیرو اور جدید سائنس جیت گئے۔ اخبارات نے برائن اور اس کے حامیوں کو اپنے زمانے سے مطابقت نہ رکھنے والے بے بس لوگ قرار دیا۔ بالخصوص صحافی ایچ۔ایل۔مینکن نے بنیاد پرستوں کو قوم کو مصیبتوں میں مبتلا کرنے والوں کے طور پر پیش کیا۔ اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا یہ بالکل ٹھیک ہوا ہے کہ برائن ''ٹینیسی کی ایک گھوڑے والی بستی'' میں مرا' کیونکہ وہ دیہاتیوں سے محبت کرتا تھا' بشمول ''بالائی وادیوں کے جنگلی انسانوں'' کے۔ بنیاد پرست ہر جگہ موجود ہیں وہ

''گیس کے کارخانوں کی عقبی گندی گلیوں میں موجود ہیں۔ وہ ہر جگہ انسانی دماغوں پر بھاری باتوں کو پڑھ رہے ہیں۔''

بنیاد پرست ماضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سائنس اور دانش ورانہ آزادی کے دشمن ہیں اور جدید دنیا میں کوئی جائز حصہ نہیں لے سکتے۔ جیسا کہ مینارڈ شپلے نے اپنی کتاب The War On Modern Science (1927ء) میں لکھا کہ اگر بنیاد پرستوں کو فرقوں کی قیادت حاصل ہو جائے اور وہ اپنے سخت گیر قوانین نافذ کر دیں تو امریکہ اپنے کلچر کے بہترین حصے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور قرون مظلمہ (Dark Ages) میں لوٹ جائے گا۔ اس نے کہا کہ کلچر تو ایک مقابلہ ہوتا ہے' جس میں مختلف گروپ اپنے اپنے وژن کو حاوی کرنے کی جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ ڈیٹن میں سیکولر لوگوں نے جنگ جیت لی تھی اور بنیاد پرستوں کو حقیر کر دیا تھا' ایسا لگتا تھا کہ یہ عیاں ہوتے ہوئے کہ انہیں سنجیدگی سے نہیں لیا جا سکتا یا نہیں لیا جانا چاہیے' وہ مغلوب ہو گئے تھے۔ سکوپس مقدمے کے بعد بنیاد پرست لب بستہ ہو گئے جبکہ لبرل لوگوں نے فرقوں کا کنٹرول حاصل کر لیا۔ لگتا تھا کہ ولیم بیل ریلے اور اس کے پیروکاروں نے اپنی جدوجہد ترک کر دی ہے۔ اس عشرے کے اختتام تک ریلے لبرل شخص ہیری فوسڈک کے ساتھ ایک پینل میں بیٹھنے پر راضی ہو گیا تھا۔

لیکن بنیاد پرست حقیقت میں پسپا نہیں ہوئے تھے۔ مقدمے کے بعد ان کے خیالات زیادہ انتہا پسندانہ ہو گئے۔ انہیں تلخی محسوس ہوتی تھی اور مرکزی دھارے والے کلچر کے خلاف انہوں نے دلوں میں کینہ پالنا شروع کر دیا۔ ڈیٹن میں انہوں نے سیکولر لوگوں کے اس خیال سے ـــ برے انداز میں ـــ لڑنے کی کوشش کی تھی کہ مذہب فرسودہ ہو چکا ہے اور صرف سائنس ہی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اس نکتۂ نظر کا اظہار مؤثر انداز میں نہیں کر سکتے تھے اور انہوں نے ایسا کرنے کے لیے غلط مقام چنا تھا۔ برائن کا جرمنوں کے خلاف خوف مریضانہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ڈارون کو شیطان قرار دینا غلط تھا۔ تاہم مذہب کے اخلاقی اور روحانی اصول انسانیت کے لیے اہم ہیں اور انہیں بے لگام عقلیت پسندی کی خاطر تاریخ کے کوڑے دان میں بے سوچے سمجھے نہیں پھینکا جانا چاہیے۔ سائنس اور اخلاقیات کے مابین رشتہ ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ تاہم بنیاد پرست ڈیٹن میں اپنا مقدمہ ہار گئے تھے اور انہیں ایسا لگتا تھا کہ وہ ذلت کا شکار ہیں اور معاشرے میں بالکل الگ تھلگ کر دیئے گئے ہیں۔ پچاس سال قبل امریکہ میں نیولائٹس اکثریت میں تھے' سکوپس مقدمے کے بعد وہ اجنبی سے ہو کر رہ گئے۔ تاہم مینکن جیسے سیکولر لوگوں کی مضحکہ خیزی نقصان دہ تھی۔ بنیاد پرست عقیدے کی جڑیں ایسے خوف اور تشویش زدگی میں تھیں کہ جنہیں خالصتاً عقلی دلائل سے دھیما نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈیٹن کے بعد تو وہ زیادہ انتہا پسند ہو گئے۔ مقدمے سے پہلے نظریہ کار تقاء ان کے لیے کوئی اہم مسئلہ (Issue) نہیں رہا تھا اور چارلس ہوج جیسے لفظ پرستوں نے تو تسلیم کر لیا تھا کہ دنیا کی عمر چھ ہزار سال سے زیادہ ہے' خواہ بائبل کچھ ہی کہتی ہو۔ بعض بنیاد پرست نام نہاد ''تخلیقی سائنس'' میں دلچسپی رکھتے تھے' جو تخلیق کائنات کے عیسائی تصور (Genesis) کی ہر تفصیل کو سائنسی اعتبار سے درست قرار دیتی تھی۔ تاہم ڈیٹن کے بعد بنیاد پرستوں نے اپنے ذہنوں کو مزید بند کر لیا اور بائبل کو صرف لفظی طور پر درست تسلیم کرنے کے تصور نے بنیاد پرستانہ طرز فکر میں مرکزی جگہ حاصل کر لی۔ وہ سیاسی منظر نامے پر بھی بالکل دائیں طرف چلے گئے۔ جنگ سے پہلے ریلے اور جان آر۔ سٹرانٹن جیسے بنیاد پرست سماجی اصلاح کے لیے اور بائیں بازو والے لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر راضی تھے۔ اب ''سوشل گوسپیل'' (Social Gospel) کو بنیاد پرستوں کو فرقوں میں شکست دینے والے لبرل لوگوں سے تعلق کی بنا پر داغ لگ گیا تھا۔ یہ ہماری کہانی کا مستقل خیال (Theme) ہوگا۔ بنیاد پرستی اور جارحانہ لبرل ازم یا سیکولرازم کا چولی دامن کا ساتھ (Symbiotic Relationship) ہوتا ہے اور بنیاد پرستی حملے کا نشانہ ہو تو زیادہ انتہا پسندانہ' تلخ اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔

ڈیرو اور مینکن کا یہ خیال غلط تھا کہ بنیاد پرست لوگوں کا تعلق مکمل طور پر پرانی دنیا سے ہے۔ بنیاد پرست تو اپنے انداز سے سرگرم جدیدیت پسند تھے۔ ''بنیادوں'' (Fundamentals) کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بیسویں صدی کی اوائل کے دیگر دانش ورانہ اور سائنسی لہروں سے مطابقت رکھتے تھے۔ وہ دیگر جدیدیت پسندوں ہی کی طرح سائنسی عقلیت پسندی کے نشے کا شکار تھے' گو کہ وہ کانٹ پسندوں (Kantians) کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجائے بیکن پسند (Baconian) تھے۔ جیسا کہ اے۔سی۔ڈکسٹن نے 1920ء میں واضح کیا تھا کہ وہ اس لیے ایک عیسائی ہے ''کیونکہ میں ایک مفکر' ایک عقلیت پسند' ایک سائنس پسند ہوں۔'' عقیدہ اندھیرے میں جست نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ ''نپے تلے عمل اور درست سوچ'' پر منحصر ہوتا تھا۔ عقیدے کوئی الٰہیاتی قیاسات نہیں بلکہ حقائق تھے۔ یہ ایک مکمل طور پر جدید مذہبی پیشرفت تھی جو کہ قدامت پسندانہ دور کی ماقبل جدید روحانیت سے کروڑوں برس کے فاصلے پر تھی۔ بنیاد پرست ایک ایسی دنیا میں' جو کہ ہر شے پر سائنس کے لوگوس کو فوقیت دیتی تھی' مذہبی ہونے کے ایک نئے طریقے کو تشکیل دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ صرف وقت نے بتانا تھا کہ ان کی کوشش مذہبی اعتبار سے کتنی کامیاب رہے گی تاہم ڈیٹن نے تو عیاں کر دیا تھا کہ بنیاد پرستی بری سائنس تھی' جو بیسویں صدی کے سائنسی معیارات پر پورا اترنے سے قاصر تھی۔

عین اسی زمانے میں' کہ جب بنیاد پرست اپنا جدید عقیدہ وضع کرنے کے لیے کوشاں تھے' پینٹی کوسٹلسٹ (Penticostalists) ایک مابعد جدید (Postmodern) وژن تخلیق کر رہے تھے' جس نے روشن خیالی کی عقلی جدیدیت کو سرے سے ہی رد کر دیا تھا۔ جہاں بنیاد پرست اپنے خیال کے مطابق عیسائیت کی اعتقادی بنیاد کی طرف لوٹ رہے تھے' وہاں پینٹی کوسٹل' جنہیں کٹڑ عقائد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' ایک اور بھی زیادہ بنیادی سطح کی طرف لوٹ رہے تھے یعنی خام مذہبیت کی طرف' جو کہ عقیدے کے مسلکی روپ کے نیچے موجود ہوتی ہے۔ جہاں بنیاد پرستوں نے اپنے عقیدے کو بائبل کے لکھے ہوئے لفظ پر استوار کیا تھا' وہاں پینٹی کوسٹلسٹوں نے زبان (Language) کو نظرانداز کر دیا' جو ان کے خیال کے مطابق تصور اور عقل سے ماورا ''حقیقت'' کو صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔ ان کی مذہبی فکر بنیاد پرستوں والا لوگوس نہیں تھی بلکہ الفاظ سے ماورا جاتی تھی۔ پینٹی کوسٹلسٹ زبانوں (Tongues) کی بات کرتے تھے۔

پینٹی کوسٹل ازم:

پینٹی کوسٹلسٹوں کا پہلا گروپ ''روح'' (The Spirit) کے تجربے سے لاس اینجلس کے ایک چھوٹے سے مکان میں 9 راپریل 1906ء کو گزرا۔ اس گروپ کا قائد ولیم جوزف سیمور (1915ء۔1870ء) تھا۔ اس کے والدین غلام تھے جو خانہ جنگی کے بعد آزاد ہوئے تھے۔ وہ طویل عرصے سے سفید فاموں کے رسمی پروٹسٹنٹ فرقوں کی نسبت زیادہ کھرا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور آزادانہ قسم کا مذہب ڈھونڈ رہا تھا۔ 1900ء تک اس نے ''ہولی نیس سپیری چوئیلٹی'' (Holyness Spirituality) قبول کر لی تھی' جو یقین رکھتی تھی کہ آخری زمانے سے فوری پہلے خداوند کے ماننے والوں کو شفا بخشی' کیف' زبانوں اور پیشگوئی کی وہ نعمتیں دوبارہ حاصل ہو جائیں گی جو کہ کبھی اولین چرچ کو حاصل ہوتی تھیں۔ جب سیمور اور اس کے دوست روح کے تجربے سے گزرے تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ افریقی امریکیوں اور فیض سے محروم سفید فاموں کی اتنی بڑی تعداد اس کی اگلی عبادت میں شرکت کے لیے آئی کہ اسے ازوسا سٹریٹ میں واقع ایک پرانے ویئرہاؤس میں منتقل ہونا پڑا۔ چار برس کے اندر اندر پورے امریکہ میں سینکڑوں پینٹی کوسٹل گروپ وجود میں آ چکے تھے اور تحریک پچاس ملکوں میں پھیل گئی تھی۔ تاہم یہ پہلا پینٹی کوسٹل ابھار دوسری عوامی بیداری (Awakening) تھا' جو کہ جدید عہد کے دوران وقتاً فوقتاً رونما ہوئیں کہ جب لوگوں کو کامل یقین ہو گیا کہ عظیم تبدیلی نزدیک ہے۔ سیمور اور اولین پینٹی کوسٹلسٹ اس امر کے قائل تھے کہ آخری زمانہ شروع ہو چکا ہے اور عیسیٰؑ جلد واپس آئیں گے اور ایک منصفانہ نظام قائم کریں گے۔ تاہم پہلی عالمی جنگ کے بعد' جب ایسا لگتا تھا کہ عیسیٰؑ اتنی جلدی نہیں آئیں گے جتنی انہیں توقع تھی' پینٹی کوسٹلسٹوں نے اپنی زبانوں کی صفت کو مختلف انداز میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اب وہ اسے خدا سے کلام کرنے کا ایک طریقہ تصور کرنے لگے۔ سینٹ پال نے توضیح کی تھی کہ جب عیسائیوں کو دعا کرنا دشوار ہو تو ''روح اظہار سے ماورا کراہوں کے ساتھ ان کی سفارش کرے گی۔'' وہ ایک ایسے خدا کو پار رہے تھے جو کہ کلام سے ماوراء وجود رکھتا تھا۔

ان ابتدائی برسوں میں ایسا لگتا تھا کہ ان پینٹی کوسٹل عبادات میں ایک نیا عالمی نظام (New World Order) وجود میں آ رہا تھا۔ معاشی عدم تحفظ اور بڑھتے ہوئے زینوفوبیا (Xenophobia) * کے زمانے میں سیاہ فام اور سفید فام لوگ اکٹھے عبادت کرتے اور ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو جاتے۔ سیمور کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ زبانوں کے تحفے کی بجائے یہ نسلی اتحاد ہے' جو کہ آخری زمانے کی فیصلہ کن نشانی ہے۔ پینٹی کوسٹل تحریک مکمل طور پر سادہ نہیں تھی۔ اس میں رقابتیں اور گروہ بندیاں بھی تھیں' جبکہ بعض سفید فام پینٹی کوسٹلوں نے اپنے الگ چرچ بھی بنا لیے تھے۔ تاہم اس تحریک کا غیر معمولی پھیلاؤ سٹیٹس کو (Status Quo) کے خلاف ایک بغاوت کی عکاسی کرتا تھا۔ پینٹی کوسٹل عبادت کے دوران مرد و زن زبانوں

* غیر ملکیوں یا اجنبیوں یا دوسری نسل کے لوگوں سے نفرت۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(Tongues) میں بولتے' وجد میں آ جاتے' خود کو ہوا میں اڑتا دیکھتے اور محسوس کرتے کہ ان کے جسم ناقابل بیان مسرت سے کھلکھلا رہے ہیں۔ لوگ ہوا میں روشن لکیریں دیکھتے اور کیف کے عالم میں زمین پر چت لیٹ جاتے۔ یہ وحشیانہ مستی خطرناک تھی' تاہم ان ابتدائی برسوں میں کم از کم یہ تو تھا کہ لوگ مایوسی کا شکار نہیں ہوتے تھے' جیسا کہ ''گریٹ اویکننگ'' کے دوران بعضوں کے ساتھ ہوا تھا۔ افریقی امریکی اس کیف آور روحانیت میں زیادہ آگے تھے' گو کہ بعدازاں کچھ سفید فام' جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے' ذہن کی غیر صحتمندانہ اور فناپرستانہ حالتوں میں چلے گئے تھے۔ اپنے ابتدائی دور میں اس تحریک نے محبت اور شفقت کی اہمیت پر زور دیا۔ سیمور کہا کرتا تھا کہ ''اگر تم غصے کا شکار ہوئے یا تم نے برا کلام کیا یا غیبت کی تو میں اس کی پروا نہیں کروں گا کہ تم کتنی زبانوں کے حامل ہو' تم ہولی سپرٹ کے بپتسمہ یافتہ نہیں ہو گے۔'' پینٹی کوسٹل ازم کے ایک اولین شارح ڈی۔ ڈبلیو۔ مے لینڈ نے 1910ء میں کہا: ''خداوند نے اسے غریب اور ذات باہر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا ہے نیز ہر کسی سے محبت کرنے کا درس دینے کے لیے۔ خداوند محروموں کو عزت عطا کر رہا ہے۔'' محبت کی یہ تلقین بنیاد پرستانہ عیسائیت کی روش سے مختلف تھی۔

امریکی سکالر ہاروے کاکس نے پینٹی کوسٹل ازم کے ایک بھرپور مطالعے میں کہا ہے کہ جدید مغرب جن تجربوں کو رد کر چکا تھا یہ تحریک انہیں بحال کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اسے عقل کے جدید مسلک کے خلاف ایک عوامی بغاوت تصور کیا جا سکتا ہے۔ پینٹی کوسٹل ازم اس زمانے میں عام ہوا جب لوگ سائنس کے حوالے سے شکوک میں مبتلا ہونا شروع ہو گئے تھے اور جب مذہبی لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک ہونے لگا تھا کہ صرف عقل پر انحصار کرنے سے عقیدے کو نقصان پہنچ رہا ہے' جو روایتی طور پر زیادہ وجدانی' تخیلاتی اور جمالیاتی ذہنی ضابطوں پر انحصار کرتا تھا۔ جہاں بنیاد پرست اپنے بائبل اساس مذہب کو سراسر عقلی اور سائنسی بنانے کی کوشش کر رہے تھے' وہاں پینٹی کوسٹلسٹ مذہبیت کے مغز کی طرف مراجعت کر رہے تھے' جسے کاکس نے یوں واضح کیا تھا ''سائیکی کا ناتراشیدہ نیوکلیئس' جس میں مقصد اور اہمیت کی ایک لامختتم کشمکش جاری رہتی ہے۔'' جہاں بنیاد پرست لوگ عقیدے کو عقلی طور پر ثابت شدہ ڈوگما سے مطابقت دیتے ہوئے مذہبی تجربے کو ذہن کی خارجی سطح تک محدود کر رہے تھے' وہاں پینٹی کوسٹلسٹ اساطیر اور مذہبیت کے لاشعوری سرچشمے کی طرف لوٹ رہے تھے' جہاں بنیاد پرست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگ لفظ پر زور دیتے تھے' وہاں پینٹی کوسٹلسٹ روایتی کلام سے آگے نکل جاتے تھے اور انہوں نے روایت کی اعتقادی صورتوں کے نیچے موجود اولین روحانیت تک رسائی پانے کی کوشش کی تھی۔ جہاں جدیدیت اس امر پر زور دیتی تھی کہ مردوزن عملیت پسندانہ انداز میں صرف دنیا پر توجہ مرکوز کریں' وہاں پینٹی کوسٹلسٹوں نے کیف اور ماورائیت کے لیے انسانی آرزو کا اظہار کیا۔ اس قسم کے عقیدے کے دھماکہ خیز ظہور نے عیاں کر دیا کہ ہر شخص جدیدیت کی سائنسی عقلیت پسندی کا گرویدہ نہیں تھا۔ جدیدیت سے اس دُوری نے دکھا دیا کہ مغرب کی بہادر نئی دنیا میں کسی شے کی کمی تھی۔

ہم اپنی کہانی میں اکثر اس چیز کا مشاہدہ کریں گے کہ جدیدیت کے بڑے فوائد سے محروم لوگوں کے مذہبی رویے سے روحانیت کی ضرورت کا بھرپور اظہار ہوتا تھا' جسے سیکولر معاشرے سے اکثر و بیشتر یا تو بالکل نکال دیا جاتا ہے یا محدود رکھا جاتا ہے۔ امریکی نقاد سوسن سونٹج نے ''زبان سے دائمی عدم اطمینان''، جو کہ ہر اس موقعے پر مغربی اور مشرقی تہذیبوں میں نمایاں ہوا ہے جب ''فکر پیچیدگی اور روحانی سنجیدگی کے ایک خاص ''اذیت دہ'' نظام تک رسائی پاتی ہے۔'' ایسے لمحوں میں لوگ انسانی کلام کی صلاحیت کے ذریعے صوفیوں کی بے قراری میں حصہ لینے لگتے ہیں۔ تمام عقیدوں کے صوفیا نے تاکید کی ہے کہ حقیقت مطلق جوہری اعتبار سے ناقابل اظہار اور بیان سے باہر ہوتی ہے۔ کچھ صوفیا نے' پینٹی کوسٹلوں کے ''زبان میں بولنے'' کے طریقے سے ملتے جلتے کیف آور اظہار کے انداز وضع کیے' جن کی مدد سے طالب میں مقدس اور ماورا کی موجودگی میں الفاظ اور جن عقلی تصورات کا وہ اظہار کرتے ہیں' ان کی ناکامی کا احساس بیدار کیا جاتا تھا: مثال کے طور پر تبتی بھکشو ایک بھنبھناہٹ کی سی آواز نکالتے ہیں اور ہندو گرو رونے کی سی آواز نکالتے ہیں۔ ازوسا سٹریٹ میں پینٹی کوسٹلسٹوں نے الوہیت کو خالصتاً انسانی فکری نظاموں میں مقید ہونے سے محفوظ رکھنے کی مختلف روایات کے حامل مستحکم طریقوں میں سے ایک پر دفعتاً ضرب لگائی تھی جبکہ بنیاد پرست ایک بالکل مختلف سمت میں بڑھ رہے تھے۔ تاہم پینٹی کوسٹلسٹوں اور بنیاد پرستوں کے مختلف انداز میں ظاہر ہونے والے ردعمل نے اس حقیقت کو عیاں کر دیا کہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں تک مغربی فکر عدیم النظیر پیچیدگی تک پہنچ چکی تھی۔ سکوپس مقدمے میں برائن نے عام لوگوں کی ''عقل سلیم'' کے لیے لڑائی لڑی تھی اور ماہرین اور سپشلسٹوں کے جبر و استبداد کو ضرب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کاری لگانے کی کوشش کی تھی۔ پینٹی کوسٹلسٹ عقل کی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کر رہے تھے تاہم بنیاد پرستوں کی طرح وہ بھی کم تعلیم یافتہ لوگوں کے بات کرنے کے حق پر اصرار کر رہے تھے اور ان کی آوازیں لوگوں کی سماعتوں تک پہنچا رہے تھے۔

''شیطان کی آخری قے'':

بنیاد پرست اپنے مخصوص اور مذمتی مذہب سے اخلاص کے ساتھ پینٹی کوسٹلسٹوں سے نفرت کرتے تھے۔ وارفیلڈ نے لکھا کہ مافوق العقل واقعات کا زمانہ چلا گیا ہے اور پینٹی کوسٹلسٹ رومن کیتھولکوں کی طرح اپنے اس ایقان کی وجہ سے برے ہیں کہ خداوند آج بھی باقاعدہ طور پر فطرت کے قوانین بدلتا ہے۔ بنیاد پرست ایک ایسی دنیا میں جو عقیدے کے خلاف دکھائی دیتی تھی' اسے زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتے ہوئے اس پر سائنسی اور لفظی کنٹرول قائم کرنا چاہتے تھے جبکہ پینٹی کوسٹلسٹوں کی لاعقلی اس کی مزاحمت کرتی تھی۔ دوسرے بنیاد پرست پینٹی کوسٹلسٹوں پر توہم پرستی اور تخیل پسندی کا الزام دھرتے تھے۔ ایک بنیاد پرست تو اتنا آگے چلا گیا کہ اس نے اس تحریک کو ''شیطان کی آخری قے'' قرار دے دیا۔ یہ ملامت انگیز اور فیصلے صادر کرنے والا انداز نئی پروٹسٹنٹ بنیاد پرستی کی سب سے زیادہ کراہت انگیز خصوصیات میں سے ایک تھا اور سکوپس مقدمے کے بعد یہ ملامت انگیز رویہ' جو کہ بائبل کی روح سے بہت بعید تھا' زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ تاہم اپنے اختلافات کے باوجود بنیاد پرست اور پینٹی کوسٹلسٹ دونوں ہی جدید مغربی دنیا میں عقل کی فتح سے پیدا ہونے والے خلا کو بھرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محبت پر اپنے اصرار اور اپنے فلسفے کی محتاط روی میں پینٹی کوسٹلسٹ اس ابتدائی مرحلے میں درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے لبرل پروٹسٹنٹوں سے زیادہ قریب تھے' گو کہ بعدازاں اس صدی میں' جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے' بعض پینٹی کوسٹلسٹ انتہا پسندی پر مائل ہو گئے اور کٹر بنیاد پرستوں میں شامل ہو گئے اور انہوں نے خیرا کو اولیت دینے کا اپنا شعور گنوا دیا۔

صیہونیت اور روایتی یہودیت:

یہودی دنیا میں بھی علامات ظاہر ہو رہی تھیں کہ لوگوں نے انیسویں صدی کے دوران تشکیل پانے والی عقیدے کی زیادہ عقلی صورتوں سے بیزار ہونا شروع کر دیا ہے۔ جرمنی میں ہرمن کوہن (1842ء۔1918ء) اور فرانزروزن وائیگ (1886ء۔1929ء) جیسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفیوں نے روشن خیالی کی اقدار کو زندہ رکھنے کی کوششیں کیں' گو کہ روزن وائیگ نے ایک ایسے انداز سے اساطیر کے پرانے تصورات اور رسوم کے احیاء کی کوشش کی' جسے جدید لوگ پسند کریں۔ اس نے توریت کے مختلف احکامات (Commondments) بیان کیے' جن کی توضیح ہمیشہ عقلی انداز سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ ان کوششوں نے ایک ایسا داخلی رجحان پیدا کیا جس نے یہودیوں کو ایک سماعتی' انتظاری روش اختیار کرنے میں مدد دیتے ہوئے ''تقدیس'' کا امکان مہیا کیا۔ اس نے کہا کہ بائبل کی کہانیاں حقائق نہیں ہیں بلکہ ہماری داخلی زندگیوں کی روحانی حقیقتوں کا اظہار ہیں۔ مارٹن بیوبر (1965ء۔ 1878ء) اور گرشم شولم (1982ء۔1897ء) جیسے دوسرے سکالروں نے عقیدے کی ان صورتوں کی طرف توجہ دلائی جنہیں عقلیت پسند مؤرخین نے نظرانداز کردیا تھا۔ بیوبر نے ہیسڈازم کے تنوع اور شولم نے جہانِ قبالہ کو دریافت کیا۔ تاہم ایک مختلف دنیا سے تعلق رکھنے والی یہ روحانیتیں عقلی روح سے متصف یہودیوں کے لیے اجنبی سی تھیں۔

صیہونیوں نے اپنے سیکولر نظریے کو ایسے طریقوں سے برتا تھا کہ جو کبھی مذہبی کہے جاتے تھے۔ لوگوں کو کسی نہ کسی طرح روحانی خلا کو بھرنا ہی تھا تاکہ منفیت پسندانہ مایوسی سے بچ سکیں۔ اگر روایتی مذہب کارآمد نہیں رہا تھا تو انہیں ایک سیکولر روحانیت تخلیق کرنا تھی جو ان کی زندگیوں کو ماورائی معنویت سے بھر دے۔ صیہونیت دوسری جدید تحریکوں کی طرح ایک ایسی واحد' بنیادی قدر کی طرف مراجعت تھی جس نے یہودی ہونے کا ایک نیا انداز مہیا کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ''وطن'' کی طرف واپسی سے نہ صرف یہودی سر پر منڈلانے والے سامیت دشمن المیے سے اپنے آپ کو بچالیں گے بلکہ وہ خداوند' توریت یا قبالہ کے بغیر نفسیاتی صحت حاصل کرلیں گے۔ صیہونی ادیب ایشر گنسبرگ (1927ء۔1856ء) 'جو ''ایک انسان'' (Ahad Ha-Am) کے قلمی نام سے لکھا کرتا تھا' اس امر کا قائل تھا کہ یہودیوں کو دنیا کا مشاہدہ کرنے کا ایک زیادہ عقلی اور سائنسی انداز وضع کرنا ہوگا۔ تاہم ایک سچے جدید انسان کی حیثیت سے وہ یہودیت کے ''جوہر'' کی طرف مراجعت کا خواہاں تھا' جو کہ صرف اسی وقت پایا جاسکتا تھا کہ جب یہودی اپنی جڑوں کی طرف لوٹتے اور فلسطین میں آباد ہوجاتے۔ اسے یقین تھا کہ مذہب تو یہودیت کا محض خارجی خول ہے۔ یہودی ارض مقدس میں جو نئی قومی روح تخلیق کریں گے' وہ ان کے لئے وہی کام انجام دے گی' جو کبھی خداوند نے ان کے لیے انجام دیا تھا۔ وہ ''زندگی کے تمام معاملات میں رہنما ہوگی' قلب کی گہرائیوں تک رسائی پائے گی اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسان کے سب محسوسات سے جڑ جائے گی"۔ اس طرح صہیون کی طرف واپسی ویسا ہی داخلی سفر بن گئی تھی جیسا کہ کبھی قبالائیوں نے کیا تھا یعنی ثبات حاصل کرنے کے لئے سائیکی کی گہرائیوں تک رسائی۔

صیہونی' جو کہ مذہب سے نفرت کرتے تھے' جبلی طور پر آرتھوڈوکس اصطلاحات میں بات کرتے تھے "نقل مکانی" کے لئے استعمال ہونے والا عبرانی لفظ "ایلی یاہ" (Aliyah) درحقیقت ایک ایسی اصطلاح تھی جو ہستی کی اعلیٰ تر سطح تک پہنچنے کو بیان کرتی تھی۔ وہ نقل مکانی کرنے والے کو "اولم" (Olim) کہتے تھے یعنی "ایسا شخص جو بلند ہو گیا ہو" یا یہ لفظ "زائرین" کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ایک "رائد" (Pioneer)' جو نئی زرعی آبادی میں شامل ہو گیا ہو' "کیلٹز" (Chalutz) کہلاتا تھا' یہ بھی ایک مذہبی لفظ تھا' جو نجات' آزادی اور بچاؤ کے مفاہیم رکھتا تھا۔ جب صیہونی جافہ کی بندرگاہ پر پہنچتے تو زمین کو بوسہ دیتے تھے۔ وہ اپنی نقل مکانی کو ایک نیا جنم تصور کرتے تھے اور بائبل کے فادروں کی طرح بعض اوقات اپنی قوت کے اظہار کے لئے نام بھی بدل لیتے تھے۔

لیبر زائیونزم (Labor Zionism):

لیبر زائیونزم (Labor Zionism) کی روحانیت کو انتہائی فصاحت اور قوت کے ساتھ بیان کرنے والا شخص اہرون ڈیوڈ گورڈن (1922ء-1856ء) تھا' جو 1944ء میں فلسطین پہنچا تھا اور گیلیلی میں ڈینگانیا کی نئی تعاون باہمی والی آبادی میں کام کرتا تھا۔ وہاں وہ اس تجربے سے گذرا جسے مذہبی یہودی شخینا (Shekhina) کہتے تھے۔ گورڈن ایک آرتھوڈوکس یہودی اور قبالائی تھا لیکن وہ کانٹ' شوپنہار' نطشے' مارکس اور ٹالسٹائی کا طالب علم بھی تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ جدید صنعتی معاشرہ مرد و زن کو اپنے آپ سے جدا کر دیتا ہے' وہ زندگی کے حوالے سے یک رخی اور بہت زیادہ عقلیت پسندانہ سوچ پروان چڑھا لیتے ہیں۔ اس کے ردعمل کے طور پر انہیں "چواپاہ" (Chavayah) پیدا کرنا پڑتا یعنی فطری مناظر کی زندگی میں جتنا ممکن ہو اتنا ڈوب کر "تقدس" کا ایک اصلی' صوفیانہ تجربہ کرنا' کیونکہ "لامتناہی" اپنے آپ کو اسی طرح انسانوں پر عیاں کرتا ہے۔ یہودیوں کے لئے وہ منظر فلسطین تھا۔ گورڈن نے زور دے کر کہا کہ "یہودی کی روح سرزمین اسرائیل کے فطری ماحول کا ثمر ہے۔" کوئی یہودی صرف وہیں اس تجربے سے گزر سکتا ہے جسے قبالائی "شفافیت' ایک لامتناہی حد تک صاف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آسمان کی وسعتیں' ایک واضح تناظر' خالص پن کی دھند'' قرار دیتے ہیں۔ ایک رائد محنت (Avodah) کے ذریعے ''الوہی غیر معلوم'' کا تجربہ کرے گا' اور اپنے آپ کو دوبارہ تخلیق کرے گا' جس طرح کہ صوفیا اپنی روحانی ریاضتوں کے ذریعے کرتے تھے۔ وطن میں کام کرتے ہوئے جلاوطنی میں ''غیر فطری' عیب دار' انتشار زدہ ہو جانے والا شخص ایک فطری اور کامل انسان میں ڈھل جائے گا جو کہ اپنے ساتھ سچا ہو گا''۔ گورڈن کے نزدیک یہ اتفاقی امر نہیں تھا کہ ''محنت'' یا ''عبادت'' کے لیے استعمال ہونے والا لفظ "Avodah" کسی زمانے میں ''معبد'' میں عبادت کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ صیہونیوں کے لئے تقدس اور کاملیت روایتی مذہبی افعال میں دستیاب نہیں رہی تھی بلکہ گیلیلی کی پہاڑیوں اور کھیتوں میں محنت مشقت میں موجود تھی۔

ربی کک:

سیکولر کو روحانی بنانے کی ایک انتہائی متنوع اور جرأت مندانہ کوشش ربی ابراہام تیزاک کک (1935ء-1865ء) نے کی' جو 1904ء میں فلسطین آیا تھا تاکہ نئی آباد ہونے والی کمیونٹیوں کا ربی بن سکے۔ یہ ایک عجیب وغریب تقرر تھا۔ بیشتر آرتھوڈوکسوں کے برخلاف کک صیہونی تحریک سے بہت متاثر تھا' تاہم وہ باسل میں 1898ء میں ہونے والی دوسری صیہونی کانگرس کے اس بیان کو سن کر بہت دہشت زدہ ہوا تھا: ''صیہونیت کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے''۔ اس نے بھرپور الفاظ میں اس بیان کی مذمت کی۔ اس نے کہا کہ یہ بیان ''ہماری نفیس' پیاری نئی نویلی قومی تحریک کو عین اس کی زندگی اور اس کی تابندگی کے سرچشمے سے کاٹ کر اس پر موت کے ہولناک' تاریک سائے پھیلاتا ہے۔'' یہ ایک ''غلیظ عمل اور انحراف'' ایک ''زہر'' ہے جو صیہونیت کو ''گلا سڑا کر اور کیڑوں کی خوراک بناتے ہوئے'' اس کی بربادی کا باعث بن رہا ہے۔ یہ صیہونیت کو صرف ''کھوکھلا ہی کر سکتا ہے..... جو کہ تباہی اور عذاب کی روح سے بھری ہو گی''۔ کک اکثر و بیشتر زمانہ قدیم کے مصلحین کی طرح بات کرتا تھا تاہم اس کی فکر میں جدید عناصر بھی موجود ہوتے تھے۔ وہ ان اولین مذہبی لوگوں میں سے تھا جنہوں نے پہلی عالمی جنگ سے بہت پہلے یہ ادراک کر لیا تھا کہ قوم پرستی (Nationalism) مہلک ثابت ہو گی اور تقدس کے شعور سے خالی سیاست شیطانی ہو سکتی ہے۔ اس نے انقلاب فرانس کی مثال دی' جو اتنے اعلیٰ آدرشوں کے ساتھ برپا ہوا تھا لیکن قتل و غارت اور سفا کی پر منتج ہوا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک خالصتاً سیکولر نظریہ مردوزن میں الوہیت کو روند سکتا تھا' اگر وہ ریاست کو اپنی اعلیٰ ترین قدر بنا لے تو دنیا کی کوئی طاقت حکمران کو رعایا کا قلع قمع کرنے سے نہیں روک سکتی تھی' جو کہ اس کے خیال کے مطابق قوم کی بہتری میں رکاوٹ ہوتی۔ اس نے تنبیہہ کی کہ ''جب صرف قوم پرستی لوگوں میں راسخ ہوتی ہے تو جہاں وہ ان کی روح کو رفعت عطا کرتی ہے وہیں اسے پست اور غیر انسانی بھی بنا دیتی ہے''۔

بلاشبہ ایسے سیکولر نظریات بھی ہیں' جو مافوق الفطرت سے رجوع کئے بغیر ہی ہر انسان کے احترام کا عمیق احساس پیدا کرتے ہیں' جبکہ مذہب اتنے ہی ہلاکت انگیز رہے ہیں جتنا کہ کوئی سیکولر تصور۔ تاہم کک نے بروقت تنبیہہ دی تھی' کیونکہ بیسویں صدی میں آغاز سے اختتام تک قوم پرست' سیکولر حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے نسل کشی کروائی۔ کک کو تشویش تھی کہ کہیں صیہونیت بھی اتنی ہی جابرانہ اور یہودی ریاست ایک خطرناک دیوتا نہ بن جائے۔ تاہم اسے یہ بھی یقین تھا کہ یہودی ریاست کو خدا سے الگ کرنے کی کوشش غلط ثابت ہوگی کیونکہ یہودی وجودی طور پر الوہیت سے مربوط ہیں' خواہ انہیں اس کا علم ہو کہ نہ ہو۔ جب کک فلسطین پہنچا تو اس کی اولین ذمہ داریوں میں سے ایک تھیوڈور ہرزل' جو المناک انداز میں نوجوانی ہی میں فوت ہو گیا تھا' کے اعزاز میں ایک تعزیتی تقریر کرنا تھی' فلسطین کی آرتھوڈوکس کمیونٹی کو' جو صیہونیت کو خلقی طور پر برائی تصور کرتی تھی' اس وقت بہت غصہ آیا' جب کک نے ہرزل کو ہاؤس آف جوزف کے مسیح کے طور پر پیش کیا' جو یہودیوں کے مقبول عام عقیدۂ جرم وسزا میں ایک نجات دہندہ تھا' جس کی آمد مسیحا کے عہد کے شروع میں متوقع تھی کہ وہ یہودی کے دشمنوں سے لڑتا اور یروشلم کے دروازوں پر موت کو گلے لگاتا۔ تاہم اس کی مہم ہاؤس آف ڈیوڈ کے آخری مسیح کی آمد کا راستہ ہموار کر دیتی' جو کہ سب کو نجات دلاتا۔ کک نے ہرزل کو اس طرح سے پیش کیا تھا۔ اس کے بہت سے کارنامے تعمیری تھے' تاہم جہاں تک اس کا اپنے نظریے سے مذہب کو خارج کرنے کا تعلق تھا' اس کا کام نقصان رساں رہا تھا۔ جوزفی (Josephic) مسیح کی طرح ناکامی اس کا بھی مقدر تھی۔ تاہم کک نے یہ بھی کہا کہ صیہونیت کی مخالفت کرنے والے آرتھوڈوکس بھی مساوی طور پر تخریب کار تھے' انہوں نے خود کو ''مادی تبدیلی کا دشمن'' بنا کر یہودیوں کو کمزور کر دیا۔ مذہبی اور سیکولر یہودیوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے' کوئی ایک دوسرے کے بغیر نہیں جی سکتا۔

اس سے ایک قدامت پسندانہ وژن نئے سرے سے پیدا ہوا۔ ماقبل جدید دنیا میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب اور عقل الگ الگ لیکن ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے شعبوں پر حاوی تھے۔ دونوں ضروری رہے تھے اور ہر ایک دوسرے کے بغیر تہی داماں تھا۔ کک ایک قبالائی تھا اور قدامت پسند دور کی اساطیر اور تصوف سے متاثر تھا۔ تاہم ان چند مصلحین کے مانند کہ جن کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں' وہ اپنے اس ادراک کے حوالے سے جدید تھا کہ اب تبدیلی حیات کا قانون بن چکی ہے اور یہ کہ زرعی کلچر کے طوق اتار پھینکنا نہایت ضروری ہے' خواہ یہ کتنا ہی اذیت دہ عمل کیوں نہ ہو۔ اسے یقین تھا کہ نوجوان صیہونی آبادکار یہودیوں کو ترقی دیں گے اور بالآخر انہیں نجات دلوا دیں گے۔ ان کا بے رحمانہ حد تک عملیت پسندانہ نظریہ لوگوس تھا جس کی اس دنیا میں بقا اور موثر عمل کے لیے ضرورت تھی۔ تاہم جب تک اس کا ربط یہودی اساطیر کے ساتھ تخلیقی انداز میں قائم نہیں کیا جاتا' وہ اپنی معنویت کھو دے گا' زندگی کے سرچشمے سے کٹ جائے گا' مرجھا جائے گا۔

جب کک فلسطین پہنچا تو اس کی ملاقات پہلی مرتبہ ان سیکولر نوجوانوں سے ہوئی۔ چند سال پہلے ان کے مذہب کو رد کرنے سے وہ ان سے متنفر ہو گیا تھا لیکن جب اس نے انہیں ارض مقدس میں مصروف کار دیکھا تو وہ اپنے تصورات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کو علم ہوا کہ وہ اپنی ہی روحانیت کے حامل تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ڈھیٹ اور گستاخ ہوتے تھے' تاہم وہ ''مہربانی' دیانتداری' انصاف پسندی اور رحمدلی.....'' جیسی عظیم صفات کے بھی حامل تھے ''نیز (ان میں) علم کی لگن اور مثالیت پسندی بھی عروج پر تھی''۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ ان کا باغیانہ پن' جس نے ''نظم و نسق کی دنیا میں رہنے والے' اعتدال پسند اور شائستہ لوگوں'' کو بہت مضطرب کیا' یہودیوں کو ترقی دیتا' ان کی تحرک پسندی یہودیوں کی ترقی اور ان کی تقدیریں سنوارنے کے لئے نہایت ضروری تھی۔ جب اس نے صیہونیت کے رائدین (Pioneers) کی تعریف کی تو اس نے ایسی صفات کو منتخب کیا' جو ماقبل جدید دور کے کسی دانشمند کے لئے ناپسندیدہ ہوتیں' کہ جس دور میں لوگوں کو موجودہ نظام کے آہنگوں اور پابندیوں کو قبول کرنا ہوتا تھا اور جو فرد اپنی راہ چلتے' وہ معاشرے کو شدید نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتے تھے۔

> ''ان آتش بجاں لوگوں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے.....انہوں نے کسی حد میں رہنے کو مسترد کر دیا ہے..... طاقتور لوگ جانتے ہیں کہ طاقت کا یہ مظاہرہ دنیا' کی اصلاح کرے گا' قوم' انسانیت اور دنیا کو قوت دے گا۔ ایسا تو صرف شروعات میں ہے کہ یہ انتشار کی صورت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں عیاں ہوا ہے"۔

کیا تالمود کے زمانے کے ربیوں نے یہ پیشگوئی نہیں کی تھی کہ "گستاخی اور جسارت کا ایک ایسا دور" آئے گا' جس میں نوجوان اپنے قائدین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے؟ یہ بغاوت تو محض "مسیح کے نقش قدم ہیں..... ایک لطیف' مسرور ہستی کی طرف لے جانے والے نقش قدم"۔

کک ان اولین مذہبی مفکروں میں سے تھا جنہوں نے نئے سیکولرازم کو قبول کر لیا تھا' تاہم وہ یقین رکھتا کہ صیہونیت فلسطین میں مذہبی احیاء کا باعث بنے گی۔ مذہبی اور سیکولر لوگوں کی ـــ بالترتیب متھوس اور لوگوس کی ترجمانی کرتے ہوئے ـــ پرامن بقائے باہمی کی بجائے اس نے تضادات کا ایک ہیگلی (Hegelian) ٹکراؤ کا نظریہ پیش کیا' جس کا نتیجہ نجات کی صورت میں نکلتا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیکولر لوگ مذہبی لوگوں سے ٹکرا تو رہے ہیں تاہم صیہونیوں کی یہ بغاوت تاریخ کو ایک نئی منزل کی طرف' ساری دنیا کو' اذیت دہ انداز ہی میں سہی' الوہی ہستی سے آخری اتصال کی طرف لے جا رہی ہے۔ کک کا ایقان تھا کہ انسان اس امر کا مشاہدہ جدید سائنس دانوں کے بیان کردہ ارتقائی عملوں میں دیکھ سکتا ہے یا کوپرنیکس' ڈارون اور آئن سٹائن کے برپا کردہ سائنسی انقلابات میں' جو ایسا لگتا تھا کہ روایتی تصورات کو برباد کر رہے ہیں لیکن جو نئی مفاہمت کا باعث بنے۔ حتیٰ کہ پہلی عالمی جنگ کے عذاب کو لیوریائی (Lurianic) اصطلاح میں "ظروف کی شکست" کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے' جو کہ تخلیقی عمل کا حصہ ہے' کہ جس نے بالآخر ہماری دنیا کو مقدس بنا دینا ہے۔ مذہبی یہودیوں کو چاہیے کہ صیہونیت کو اس انداز سے دیکھیں۔ کک نے گستاخانہ انداز میں کہا "ایسے زمانے ہوتے ہیں جب توریت کے قوانین کو نظرانداز کرنا پڑتا ہے۔ جب لوگ کسی مختلف راستے کو تلاش کر رہے ہیں' ہر شے نئی اور عدیم المثال ہے' لہٰذا "کوئی ایسا نہیں ہے جو درست راہ کی نشاندہی کرے اور اس لئے مقصد کو پورا کرنے کی خاطر حدوں کو ایک دھماکے سے توڑنا ہی ہوگا"۔ یہ "خارجی طور پر قابل ملامت ہے تاہم داخلی طور پر خوشی کا سرچشمہ ہے!"۔

کک نے مشکلات پر ملمع کاری نہیں کی۔ اس نے کہا کہ مذہبی اور سیکولر لوگوں کے درمیان جنگ برپا ہے۔ ہر فریق اپنے موقف میں درست ہے: صیہونی غیر ضروری حد بندیوں کے خلاف کشمکش کرنے میں حق پر ہیں جبکہ آرتھوڈوکس روایت کے استرداد سے پیدا ہونے والے انتشار کے حوالے سے قابل فہم انداز میں مضطرب ہیں۔ تاہم دونوں فریق ادھوری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صداقت کے حامل ہیں۔ ان کے درمیان کشمکش ایک زبردست امتزاج پر منتج ہو گی جو نہ صرف یہودیوں بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچائے گا۔ اس نے پیشگوئی کرتے ہوئے کہا "ہماری روح کی نشاۃ ثانیہ سے دنیا کی تمام تہذیبوں کا احیاء ہو گا۔ تمام مذاہب نئے اور قیمتی لباس پہن لیں گے اور ہر گندی' آلودہ' نفرت انگیز شے مٹ جائے گی"۔ یہ ایک مسیحانہ خواب تھا۔ کک کو حقیقتاً یقین تھا کہ وہ آخری زمانے میں جی رہا ہے اور جلد ہی انسانی تاریخ کو اختتام پر پہنچتا ہوا دیکھے گا۔

کک اپنے زمانے کی غیر معمولی پیشرفتوں کو قبالہ کی لازماں علامتوں سے ملا کر ایک نئی اسطورہ وضع کر رہا تھا۔ تاہم جدید دور کا انسان ہونے کے ناطے اس نے اپنی اسطورہ کا رخ مستقبل کی طرف رکھا تھا' وہ ایک ایسے اذیت ناک اور پریشان کن تحرک کو بیان کرتی تھی جو تاریخ کو آگے لے جا رہا تھا۔ اپنے یہودی قارئین کو یہ تاکید کرنے کی بجائے کہ وہ معاملات کو جوں کا توں قبول کر لیں' کک نے کہا یہ ضروری ہے کہ ماضی کے قوانین کو توڑ دیا جائے اور نئے سرے سے آغاز کیا جائے۔ تاہم اس جدید تحرک کے باوجود کک کی اسطورہ ہنوز ایک اہم حوالے سے ماقبل جدید دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا مذہبی اور سیکولر لوگوں کے دو فریقین کا وژن متھوس اور لوگوس کے پرانے تصور سے بہت مماثلت رکھتا تھا۔ عقلی عملیت پسند لوگ تاریخ کو آگے لے جا رہے تھے' جیسا کہ لوگوس نے ہمیشہ کیا تھا جبکہ مذہبی لوگ' متھوس اور عقائد کی دنیا کی نمائندگی کرتے تھے' اس عمل کو معنویت عطا کر رہے تھے۔ کک نے آرتھوڈوکسوں کو بتایا کہ "ہم "ٹیفلن" (Phylacteries) * رکھتے ہیں اور رائد اینٹیں لگاتے ہیں"۔ اسطورہ کے بغیر صیہونیوں کی سرگرمیاں نہ صرف معنویت سے عاری بلکہ امکاناً شیطانی ہوتیں۔ کک کا ایقان تھا کہ ممکن ہے صیہونیوں کو علم نہیں ہوتا ہم وہ خداوند کے آلۂ کار ہیں' جو اس کے الوہی طور پر منظم منصوبے کو بروئے عمل لانے میں معاون ہیں۔ صرف اسی بات سے ان کی مذہبی بغاوت قابل قبول تھی اور بہت جلد ـــ کک نے نشاندہی کی کہ ایسا اس کی زندگی ہی میں ہو گا ـــ ارض مقدس میں ایک روحانی انقلاب برپا ہو گا اور تاریخ از سر نو زندہ ہو جائے گی۔

قدامت پسندانہ دور کے اصولوں سے مخلص ہونے کی وجہ سے کک اپنی اسطورہ کو ایک نظریہ' ایک لائحۂ عمل بنانے پر مائل نہیں تھا۔ بہرصورت اس کے بہت کم پیروکار تھے اور اس کی زندگی میں اسے ایک خبطی ہی تصور کیا گیا۔ کک نے صیہونیوں کو فلسطین میں درپیش سنگین مسائل کا کوئی سیاسی حال تجویز نہیں کیا۔ سب کچھ خداوند کے ہاتھ میں جو تھا۔ کک کی

* ایک تعویذ یا طلسم جسے یہودی تحفظ کے لیے پہنتے ہیں۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسطورہ نے لوگوں کو حقیقتاً وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو دیکھنے کے قابل بنا دیا۔ کک مستقبل کی یہودی ریاست کے سیاسی روپ سے بالکل بے نیاز لگتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے زوی یہودا (1981ء-1891ء) کو ایک خط میں لکھا ''میرے نزدیک اصل مسئلہ روحانی اطمینان ہے' جو تقدس پر استوار ہو۔ یہ بات مجھ پر واضح ہے کہ اگر روح مضبوط ہو تو' خواہ حکومتی سطح پر معاملات کیسے ہی چل رہے ہوں' وہ مطلوبہ منزل تک لے جا سکتی ہے' کیونکہ آزاد' روشن تقدس کے اعلیٰ ترین ظہور سے ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ حکومت کے تمام شعبوں کو بہتر بنا سکیں''۔ اس دور میں سیاست بدعنوان اور سفاکانہ تھی۔ کک ''شیطانی دور میں حکومت کے ہولناک مظالم سے نفرت'' کرتا تھا۔ خوش قسمتی سے 70ء میں ارض مقدس سے جلاوطن ہونے کے بعد یہودی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے سے قاصر رہے تھے۔ جب تک دنیا اخلاقی اور روحانی طور پر تبدیل نہیں ہو جاتی یہودیوں کو سیاست سے کنارہ کش رہنا چاہیے۔ ''جیکب کے لئے حکومت میں شامل ہونا بہتر نہیں ہے' جب تک کہ یہ خونریزی سے مشروط ہے' جب تک کہ اسے برائی کرنے کی ضرورت ہے''۔ تاہم بہت جلد ''دنیا بہتر ہو جائے گی''۔ اور جب ایسا ہوا تو یہودی ان سیاسی نظریوں اور عملی پالیسیوں میں دلچسپی لے سکتے تھے جنہیں وہ نافذ کرنا چاہتے تھے۔ ''لارڈ کے لوگ جب ایک دفعہ باقاعدہ طور پر اپنی سرزمین میں استحکام حاصل کر لیں تو پھر وہ (جغرافیائی Geo) سیاسی (Political) اقلیم پر توجہ مبذول کریں گے تاکہ اس کو پاک کریں' اس کے منہ پر لگا خون صاف کریں اور اس کے دانتوں میں پھنسے ریزے نکال دیں''۔ ماقبل جدید دنیا میں اسطورہ عمل میں ڈھالنے کے لئے نہیں تصور کی جاتی تھی' یہ تو لوگوس کا کام ہوتا تھا اور کک کے منصوبے میں رائدین کا۔

کک ہنوز محسوس کرتا کہ موجودہ صورتحال میں مذہب اور سیاست متضاد ہیں' یہ وہ سوچ تھی جو آرتھوڈوکس دنیا میں ایک ٹیبو (Taboo) کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ صیہونی' جو مذہب سے الگ ہو چکے تھے' صرف عمل پر زور دے رہے تھے۔

کک 1935ء میں ریاست اسرائیل کے قیام سے تیرہ سال پہلے فوت ہو گیا۔ وہ ان خوفناک مراحل کو دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہا' جن سے یہودیوں کو عرب فلسطین میں اپنے لئے ایک ریاست تخلیق کرنے کے لئے گزرنا تھا۔ اس نے 1948ء میں سات لاکھ پچاس ہزار فلسطینیوں کا ان کے اپنے گھروں سے نکال دیا جانا نہیں دیکھا' نہ ہی اسے اس حقیقت کا سامنا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنا پڑا کہ ریاست اسرائیل کے وجود میں آنے کے پچاس برس بعد بھی ''ارض مقدس'' میں یہودیوں کی اکثریت سیکولر ہی ہے۔ اس کے بیٹے زوی یہودا نے ان سب معاملات کا مشاہدہ کیا اور اس نے اپنے بڑھاپے میں اپنے باپ کی اسطورہ کو عملی' سیاسی اقدام کے لئے استعمال کیا اور ایک بنیاد پرست تحریک شروع کی۔

تاہم ایسے خوفناک زمانوں میں کیا یہودیوں کے لئے ممکن تھا کہ وہ سیاسی زندگی سے باہر رہیں؟ جدید معاشرہ نہ صرف زیادہ سے زیادہ سامیت دشمن ہوتا جا رہا تھا بلکہ یہودی کمیونٹیوں میں سیکولرازم سرایت کرنے لگا تھا اور روایتی طرز حیات کی جڑیں کھوکھلی کر رہا تھا۔ مشرقی یورپ میں جدیدیت پذیری ابھی صرف شروع ہی ہوئی تھی۔ روس اور پولینڈ کے بیشتر ربیوں نے نئی دنیا سے بے نیازی برتنا جاری رکھا ہوا تھا اور سیاست سے الگ تھلگ تھے۔ کوئی سچا یہودی کیونکر اس سودے بازی اور مفاہمت کو قبول کر سکتا تھا جو کہ ایک جمہوری ریاست میں سیاسی زندگی کا جوہری حصہ ہوتی ہے؟ وہ اسے توریت کے مطلق احکامات سے کس طرح ہم آہنگ کر سکتے تھے؟ غیر یہودیوں سے معاملہ کرتے ہوئے اور ان کے سیاسی اداروں میں شامل ہو کر یہودی اپنی کمیونٹی میں نجس دنیا کو لے آتے اور اس طرح اسے ناگزیر طور پر بدعنوان بنا دیتے۔ تاہم عظیم یشی دوت (Misnagdic Yeshivot) کے رہنما اور پولش شہر گر (Ger) کے ہیسیڈم (The Hesidim) اس سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ بہت سی صیہونی اور سوشلسٹ جماعتیں یہودیوں کو ایک بے خدا طرز حیات کی خوگر بنا رہی تھیں۔ وہ سیکولرازم کی طرف میلان کو روکنا چاہتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ ان جوہری طور پر جدید خطرات کا مقابلہ اپنے انداز سے جدید طریقوں سے ہی کرنا چاہئے۔ مذہبی یہودیوں کو سیکولر لوگوں سے انہیں کے ہتھیاروں سے لڑنا چاہئے۔ اس کا مطلب تھا آرتھوڈوکس مفادات کے تحفظ کے لئے ایک جدید سیاسی جماعت کا قیام۔ یہ ایک بالکل نیا نظریہ نہیں تھا۔ ایک طویل عرصے سے روس اور پولینڈ کے یہودی حکومت کے ساتھ یہودی کمیونٹیوں کی بہتری کے لئے سیاسی مکالمے یا مذاکرات (Shtadlanut) کر رہے تھے۔ نئی آرتھوڈوکس جماعت اسی عمل کو جاری رکھتی تاہم ایک زیادہ موثر اور منظم انداز میں۔

بنیاد پرست یہودی پارٹی ایگودات اسرائیل کا قیام:

1912ء میں مسنیگڈی Roshey Yeshivot اور گر کے ہیسیڈم نے ایک نئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جماعت ''ایگودات اسرائیل'' (اسرائیل کا اتحاد Agudat Israel) کے نام سے قائم کی۔ ان کے ساتھ مزراکی (Mizrachi) کے اراکین بھی شامل ہو گئے۔ مزراکی ''مذہبی صیہونیوں'' کی ایک تنظیم تھی' جسے 1901ء میں ربی آئزک جیکب رائنز (1915ء-1839ء) نے قائم کیا تھا۔ مزراکی ربی کک کے تصورات سے بالکل مختلف اور کم انقلابی تھی' جو فلسطین میں سیکولر یہودی مہم کو گہری مذہبی پیشرفت سمجھتا تھا۔ زیادہ راسخ العقیدہ آرتھوڈوکس رائنز اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا: اس کے خیال میں خواہ کچھ بھی ہو صیہونیوں کی سیاسی سرگرمیاں کوئی مذہبی اہمیت نہیں رکھتی تھیں بلکہ یہودی وطن کا قیام عذابوں کا شکار لوگوں کے لئے ایک عملی حل تھا اور اسی لئے آرتھوڈوکس اس کی حمایت کرتے تھے۔ مزراکی کے خیال میں اگر کسی روز فلسطین میں ایک وطن قائم ہو گیا تو یہ توریت پر عمل کرنے کے روحانی احیاء کا باعث بنے گا۔ تاہم 1911ء میں مزراکی کے مندوبین باسل میں منعقد ہونے والی دسویں صیہونی کانگرس سے اٹھ آئے کیونکہ کانگرس نے فلسطین میں ان کو مذہبی سکولوں کے قیام کی غرض سے رقوم فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چونکہ وہ مرکزی دھارے کی صیہونیت سے مزید تعاون کرنے سے قاصر تھے' جو کہ انقلابی سیکولرازم سے وابستہ دکھائی دیتی تھی' اس لیے وہ اپنی قسمتیں ''ایگودات اسرائیل'' سے وابستہ کرنے کے لئے تیار تھے' جس کی شاخیں جلد ہی مشرقی اور مغربی یورپ میں قائم ہونے والی تھیں۔

تاہم مغرب میں ایگودات کے اراکین تحریک کو روس اور پولینڈ کے یہودیوں سے بالکل مختلف روشنی میں دیکھتے تھے' جو کہ راست اقدام سے ہنوز محتاط تھے۔ روس اور پولینڈ کے یہودی ایگودات کو محض ایک مدافعتی تنظیم کے طور پر دیکھتے تھے' ان کے خیال میں اس کا کام صرف یہ تھا کہ ایک ایسے زمانے میں کہ جب مشرقی یورپ کے ملکوں کی حکومتیں جدید ہونے کی کوشش کر رہی تھیں' یہودیوں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ وہ اپنا عمل کم سے کم سطح پر رکھتے تھے' ایک جدید سیاسی لائحہ عمل کے اندر یہودیوں کی تقدیر بہتر بنانے' صیہونیت کو رد کرنے اور پولش ریاست سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے کے لئے کام کرتے تھے۔ لیکن مغرب' جہاں پر کہ جدیدیت بہت ترقی کر چکی تھی' یہودی ایک مختلف شے کے لئے تیار تھے۔ مغرب کے بیشتر لوگ نیو آرتھوڈوکس (Neo-Orthdox) تھے' جو کہ یہودیت کی ایک جدید صورت تھی۔ وہ اب جدید دنیا سے مطابقت اختیار کر چکے تھے اور صرف نئے دور کے صدمے کو محدود کرنے ہی کے لیے کوشاں نہیں تھے بلکہ اسے تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی جماعت کو ایک مدافعتی تنظیم تصور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرنے کی بجائے اس بات کے خواہاں تھے کہ ایگودات جارحیت اپنائے۔ یہ لوگ ایک ابتدائی نوعیت کی بنیاد پرستی کو پروان چڑھا رہے تھے۔

جیکب روزن ہائیم (1965ء-1870ء) کے لئے ایگودات کا قیام صرف ایک تھوڑی شرمندگی آمیز ضرورت نہیں تھی' جیسا کہ مشرقی یہودی تصور کرتے تھے' بلکہ ایک کائناتی واقعہ تھی۔ 70ء سے لے کر اس وقت تک ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ یہودی ''ایک متحد اور خوب پرعزم مرکز'' کے حامل ہوئے تھے۔ ''ایگودات'' اسرائیل پر خداوند کی حکمرانی کی علامت تھی اور اسے یہودی دنیا کی مرکزی تنظیم بننا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود روزن ہائیم سیاست کے حوالے سے قدرے احتیاط برتتا تھا اور اس امر کا خواہاں تھا کہ ایگودات اپنی سرگرمیوں کو یہودی سکولوں کے قیام اور یہودیوں کے معاشی حقوق کے تحفظ تک ہی محدود رکھے۔ نوجوان اراکین زیادہ ریڈیکل تھے اور جذبے کے اعتبار سے پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں سے زیادہ قربت رکھتے تھے۔ آئزک بروئر (1946ء-1883ء) چاہتا تھا کہ ایگودات کو پہل کرنی چاہیے اور یہودی معاشرے کی اصلاح کی کوشش کا آغاز کرنا چاہیے۔ پری ملینیلسٹوں (Premillennialists) کی طرح وہ دنیا میں خداوند کی سرگرمی کے ''نشانات'' دیکھ سکتا تھا۔ جنگ عظیم اور بالفور اعلامیہ (Balfour Declaration) ''مسیح کے نقوش قدم'' تھے۔ یہودیوں کو بورژوا معاشرے کی خراب اقدار کو رد کر دینا چاہیے' یورپی حکومتوں سے تعاون ترک کر دینا چاہیے اور ارض مقدس میں اپنا مقدس قلعہ تعمیر کرنا چاہیے' جہاں وہ توریت کی اساس پر ایک الوہی ریاست تشکیل دے سکیں۔ یہودی تاریخ غلط راستے پر گامزن رہی ہے' یہودی مقدس روایت سے انحراف برتتے رہتے ہیں' اب وقت آ گیا ہے کہ یہودی تاریخ کو درست راستے پر ڈالا جائے اور اگر یہودی پہلا قدم اٹھائیں تو بدعنوان ڈایاسپورا (Diaspora)* سے خروج (Eodus) کر جائیں اور اپنے وطن میں توریت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی اوریجنل اقدار کی طرف مراجعت کریں' خداوند مسیح کو بھیجے گا۔

بنیاد پرستی کس طرح عمل کرتی ہے:

یہودی سکالر ایلن ایل۔ ملمین لکھتا ہے کہ ایگودات کا اولین تجربہ واضح کرتا ہے کہ بنیاد پرستی کس طرح عمل کرتی ہے۔ یہ جدید سیکولر معاشرے کا فوری ردعمل نہیں ہوتی بلکہ صرف اس وقت پروان چڑھتی ہے جب جدیدیت پذیری کافی حد تک عمل میں آ چکی ہوتی ہے۔ پہلے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہل روایت پسند ــــ ایگودات کے مشرقی یورپی اراکین کی طرح ــــ نئے چیلنج سے اپنے عقیدے کی ہم آہنگی کے لئے راہیں تلاش کرتے ہیں۔ وہ بعض جدید تصورات اور اداروں کو اپنا لیتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ روایت کے لئے اجنبی نہیں ہیں' یہ کہ عقیدہ اس قدر مضبوط ہے کہ ان تبدیلیوں کو جذب کر سکتا ہے۔ تاہم جب ایک مرتبہ معاشرہ

* یہودی اس لفظ کو اسرائیل کے باہر ہر اس مقام کے لئے استعمال کرتے ہیں' جہاں وہ جلاوطنی کے بعد گیٹو (Ghetto) بنا کر رہائش پذیر ہوئے تھے یا اب بھی ہیں ــــ مثلاً امریکہ (مترجم)

مکمل طور پر سیکولر اور عقلی ہو جاتا ہے تو بعض روایت پسند اس کی اختراعات کو ناقابل قبول محسوس کرتے ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا ادراک ہونے لگتا ہے کہ سیکولر جدیدیت تو ماقبل جدید قدامت پسندانہ مذہب سے مکمل طور پر غیر ہم آہنگ ہے اور یہ کہ وہ تو جوہری اقدار کے لئے خطرہ ہے۔ وہ ایک ''بنیاد پرستانہ'' (Fundamentalist) حل وضع کرنا شروع کر دیتے ہیں' جو جوابی حملے کے طور پر اولین اصولوں اور منصوبوں کی طرف مراجعت کرتا ہے۔

☆☆☆

اسلامی دنیا میں سیکولر جدیدیت اور قدامت پسندانہ مذہب میں کشمکش:

جن مسلمانوں پر ہم غور کر رہے ہیں وہ ابھی اس مرحلے تک نہیں پہنچے تھے۔ مصر میں جدیدیت پذیری کا عمل تکمیل سے بہت بعید تھا اور ایران میں تو حقیقتاً شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ مسلمان یا تو نئے تصورات کو اسلامی تناظر میں اختیار کرنے کے لئے کوشاں تھے یا ایک سیکولر نظریہ اپنا رہے تھے۔ بنیاد پرستی اسلامی دنیا میں اس وقت تک نمودار نہیں ہوئی تھی جب تک یہ اولین چالیں' بعض مسلمانوں کی نگاہوں میں ناکافی ثابت نہیں ہو گئیں۔ انہوں نے سیکولرازم کو اسلام کے لئے تباہ کن تصور کیا اور بلاشبہ مشرق وسطیٰ میں' جہاں پر کہ مغربی جدیدیت ایک غیر ملکی تناظر میں نافذ کی جا رہی تھی' وہ بہت جارحانہ انداز میں ظاہر ہوئی تھی۔

یہ امر نئی سیکولر ترک ریاست میں واضح تھا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عثمانی سلطنت کو' جو کہ جرمنی کی طرف سے لڑی تھی' یورپی اتحادیوں نے شکست دے دی' جنہوں نے سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور پرانے عثمانی صوبوں میں انتداب (Mandates) اور ممالک محروسہ (Protectorates) قائم کر لیے۔ یونانیوں نے اناطولیہ اور پرانے عثمانی قلب پر حملہ کر دیا۔ 1919ء سے لے کر 1922ء تک مصطفیٰ کمال اتاترک (1938ء-1881ء) نے جنگ آزادی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ترکوں کی قوم پرست افواج کی قیادت کی اور یورپیوں کو ملک سے باہر رکھنے اور جدید یورپی خطوط پر کام کرنے والی ایک خودمختار ریاست قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ اسلامی دنیا میں یہ ایک عدیم النظیر اقدام تھا۔ 1947ء تک ترکی ایک اہل بیوروکریسی اور سرمایہ دارانہ معیشت کا حامل ہو چکا تھا اور مشرق وسطیٰ میں پہلی کثیر جماعتی سیکولر جمہوریت بن چکا تھا۔ تاہم اس کامیابی کا آغاز ایک نسلی صفائی (Ethnic Cleansing) سے ہوا تھا۔ 1894ء سے 1927ء کے درمیانی عرصے میں متواتر عثمانی اور ترک حکومتوں نے غیر ملکی عناصر سے چھٹکارا پانے کے لئے بورژوا طبقے کے نوے فیصد پر مشتمل اناطولیہ میں رہنے والے یونانی اور آرمینیائی باشندوں کو منظم طریقے سے یا تو ملک بدر کر دیا تھا یا قتل کروا دیا تھا۔ نہ صرف اس عمل نے نئی ریاست کو ممتاز ترک قومی تشخص عطا کیا بلکہ اس سے اناترک کو ایک مکمل طور پر ترک تاجر طبقے کو تشکیل دینے کا موقع حاصل ہوا' جو اس کی حکومت کو ایک جدید صنعتی معیشت تخلیق کرنے میں مدد دے سکتا تھا۔ کم از کم دس لاکھ آرمینیائیوں کا قتل عام بیسویں صدی میں نسل کشی کا پہلا عمل تھا اور اس نے ظاہر کر دیا' جیسا کہ رب کک کو اندیشہ تھا' کہ سیکولر قوم پرستی ہلاکت انگیز ہو سکتی ہے اور یقینی طور پر مذہب کے نام پر کی گئیں صلیبی جنگوں (کروسیڈز) جتنی ہی خطرناک ہوتی ہے۔

ترکی کو سیکولر بنانے کے لئے اناترک کے اقدامات جارحانہ بھی تھے۔ اس نے اسلام کو ''ویسٹرنائز'' کرنے اور اسے ایک نجی عقیدے کی حد تک گھٹانے کا تہیہ کیا ہوا تھا' جو کسی قسم کے قانونی' سیاسی اور معاشی اثرات کا حامل نہ ہو۔ اس کے خیال کے مطابق مذہب کو لازماً ریاست کے تابع ہونا چاہیے۔ اس نے صوفی سلسلوں کو مٹا دیا' تمام مدرسوں اور قرآنی سکولوں کو بند کر دیا گیا۔ مغربی لباس کو قانونی طور پر رائج کر دیا گیا۔ عورتوں کے پردہ کرنے اور مردوں کے فیض* پہننے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اسلام نے آخری مدافعت اس وقت کی' جب نقشبندی صوفی سلسلے کے سربراہ شیخ سعید سری کی قیادت میں بغاوت برپا ہوئی' جسے اناترک نے بڑی تیزی سے اور مؤثر انداز میں دو ماہ کے اندر اندر فرو کر دیا۔ مغرب میں سیکولرائزیشن کو آزادی عطا کرنے کے عمل کی حیثیت سے لیا گیا تھا' اسے ابتدائی مراحل میں ایک نئے اور بہتر انداز میں مذہبی ہونا تصور کیا گیا تھا۔ سیکولرازم ایک مثبت ایسی پیشرفت رہا تھا جو زیادہ تر بہت معتدل اور روادارانہ تھی۔ لیکن مشرق وسطیٰ میں سیکولرائزیشن کو ایک متشددانہ اور جابرانہ حملہ تصور

* سرخ رنگ کی مخصوص پھندنے دار اونچی ٹوپی کا ترک نام' جو پاکستان میں بھی بڑی عمر کے افراد پہنا کرتے تھے' اور برصغیر کی سیاست کے ایک ہنگامہ خیز دور کی یادگار تھے۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا گیا۔ جب بعد میں رونما ہونے والے بنیاد پرستوں نے دعویٰ کیا کہ سیکولرائزیشن کا مطلب اسلام کی بربادی ہے تو انہوں نے اکثر اتاترک کی مثال دی تھی۔

مصر نے ترکی کے مانند نہ تو جلد آزادی حاصل کی اور نہ جمہوریت۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد مصری عقلیت پسندوں نے آزادی کا مطالبہ کیا۔ بلوے شروع ہو گئے' انگریزوں پر حملے ہونے لگے' ریلوے لائنیں اکھاڑی جانے لگیں اور ٹیلی گراف کی لائنوں کو کاٹا جانے لگا۔ 1922ء میں برطانیہ نے مصر کو کسی حد تک آزادی عطا کر دی۔ خدیو فواد نیا بادشاہ بن گیا۔ مصر کو ایک لبرل آئین اور ایک نمائندہ' پارلیمنٹری ادارہ دیا گیا۔ لیکن یہ حقیقی جمہوریت نہیں تھی۔ برطانیہ نے دفاع اور خارجہ پالیسی پر گرفت قائم رکھی' لہٰذا حقیقی آزادی موجود نہیں تھی۔ 1923ء سے 1930ء کے درمیانی عرصے میں برطانیہ سے نکل جانے کا مطالبہ کرنے والی ایک مقبول عام جماعت ''وفد پارٹی'' نے لبرل آئین کے تحت تین بڑی انتخابی فتوحات حاصل کیں لیکن ہر مرتبہ اسے یا تو برطانیہ یا پھر بادشاہ نے دباؤ ڈال کر استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ نیا جمہوری نظام محض نمائشی (Cosmetic) تھا اور یہ دست نگری مصریوں کو وہ خودمختاری حاصل نہیں کرنے دیتی تھی جو کہ جدید روح میں جوہری حیثیت رکھتی ہے۔ مزید برآں برطانوی جتنا زیادہ انتخابی عمل میں گڑبڑ کرتے جمہوری آدرش اتنا ہی داغدار ہوتا تھا۔

اس کے باوجود بیسویں صدی کے پہلے تین عشروں کے دوران ایسا لگتا تھا کہ ممتاز مصری مفکرین ایک سیکولر آدرش کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اسلام نے لطفی السید (1963ء-1872ء) کی فکر میں بہت کم کردار ادا کیا' جو کہ محمد عبدہٗ کے ایک شاگرد تھے۔ انہیں یقین تھا کہ مغرب کی کامیابی کا راز قوم پرستی کا آدرش تھا اور وہ اسلامی بنیادوں پر جدید اداروں کے تشکیل دیئے جانے کے لئے اسے نہایت ضروری محسوس کرتے تھے۔ لطفی اسلام کو صرف ایک وسیلہ تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب نے یقیناً جدید قوم پرستانہ شعور کی تخلیق میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا تاہم وہ بہت سے عوامل میں سے ایک عامل تھا۔ اسلام کوئی مختلف یا خاص شے پیش نہیں کرتا۔ اسے مصر کا ریاستی مذہب اس لیے ہونا چاہیے کیونکہ زیادہ تر مصری مسلمان ہیں' یہ انہیں شہری اوصاف اپنانے میں مدد دے گا لیکن کسی دوسرے معاشرے میں کوئی اور عقیدہ یہی کردار ادا کرے گا۔ علی عبدالرازق (1966ء-1888ء) کی کتاب ''الاسلام و اصول الحکم'' (1925ء) بہت زیادہ ریڈیکل تھی' جس میں کہا گیا تھا کہ جدید مصر کو اسلام کے ساتھ اپنے روابط کم کر لینے چاہئیں۔ انہوں نے لکھا کہ خلافت کا ادارہ اسلامی حوالے سے لازمی نہیں ہے لہٰذا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصریوں کو ایک مکمل طور پر سیکولر یورپی طرز کا سیاسی نظام قائم کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

عبدالرازق کی کتاب کے خلاف زبردست احتجاج برپا ہو گیا' بالخصوص صحافی رشید رضا (1935ء-1865ء) نے اعلان کیا کہ اس قسم کی سوچ مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کر دے گی اور انہیں مغربی استعماریت کا آسان شکار بنا دے گی۔ رشید رضا ایسے پہلے مسلمان تھے جنہوں نے سیکولرازم کو رد کر کے شریعت کی بنیاد پر ایک مکمل طور پر جدید اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اپنی یادگار کتاب ''الخلافت'' (1922-23ء) میں انہوں نے خلافت کی بحالی کے لیے دلائل پیش کیے۔ رشید رضا محمد عبدہٗ کے سوانح نگار اور ان کے سرگرم ستائش گر تھے' انہوں نے مغربی فکر سے خوب آشنا ہونے کے باوجود محمد عبدہٗ کی طرح یورپیوں کے ساتھ کبھی انس محسوس نہیں کیا۔ انہوں نے لکھا کہ خلافت اس لیے ضروری ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کو مغرب کے خلاف موثر انداز میں متحد ہونے کے قابل بنا دے گی تاہم یہ ایک طویل المیعاد حل تھا۔ حقیقی جدید خلافت کے قیام سے پہلے تیاری کے ایک طویل عمل سے گزرنا ہوگا۔ رضا مستقبل کے خلیفہ کو ایک عظیم مجتہد تصور کرتے تھے' جو کہ اسلامی قانون کا اتنا ماہر ہوگا کہ وہ شریعت کو تحلیل کیے بغیر اسے جدید بنانے پر قادر ہوگا۔ یوں وہ ایسے قوانین تخلیق کرے گا جن پر جدید مسلمان مخلصانہ طور پر عمل پیرا ہو سکیں گے کیونکہ وہ غیر ملک سے درآمد کی ہوئی روایات کی بجائے ان کی اپنی روایتوں پر استوار ہوں گے۔

رشید رضا ابن تیمیہؒ اور عبدالوہاب کی روایت کے ایک مخصوص مسلمان مصلح تھے۔ وہ سرچشموں کی طرف مراجعت کے ذریعے غیر ملکی خطرے کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جدید مسلمان صرف ''سلف'' کے مثالیوں (Ideals) کی طرف مراجعت کے ذریعے اس کو نیا اور تحرک آمیز بنا سکتے ہیں۔ تاہم رشید رضا کی سلفیہ تحریک ماضی کی طرف غلامانہ واپسی نہیں تھی۔ جدیدیت پذیری کے عمل کے ابتدائی مراحل میں سامنے آنے والے دیگر مصلحین کے مانند وہ بھی مغرب کی تعلیمات اور اقدار کو اسلامی تناظر میں قبول کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کے خواہش مند تھے جہاں طلباء اسلامی فقہ کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قانون کے اصول' عمرانیات' عالمی تاریخ' مذہبی اداروں کے قیام اور مغربی سائنسوں کا مطالعہ بھی کریں۔ اس طرح سے علماء کا ایک نیا طبقہ وجود پذیر ہوگا' جو جامعہ الازہر (جسے رشید رضا مایوس کن حد تک وقت سے پیچھے تصور کرتے تھے) کے عالموں کے برخلاف' حقیقتاً اپنے دور کے انسان ہوں گے اور روایت سے ہم آہنگ اجتہاد کرنے پر قادر ہوں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک روز ان نئے عالموں میں سے کوئی عالم جدید خلیفہ بنے گا۔ رشید رضا بنیاد پرست نہیں تھے' وہ کوئی جوابی نظام تخلیق کرنے کی بجائے اسلام اور جدید مغربی کلچر میں ربط قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاہم ان کی فکر نے مستقبل کے بنیاد پرستوں کو متاثر ضرور کیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ رشید رضا مصری قوم پرستوں سے دور ہوتے گئے۔ وہ سیکولرازم کو مسائل کا حل نہیں مانتے تھے۔ وہ اتاترک کے مظالم سے بہت نفرت کرتے تھے۔ کیا یہ وہی کچھ تھا جو اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے کہ جب ریاست اعلیٰ ترین قدر بن جاتی ہے اور حکمران کو قوم کے مفادات کو فروغ دینے والی عملیت پسندانہ مگر ظالمانہ پالیسیوں کے نفاذ سے کوئی شے روک نہیں سکتی؟ رشید رضا کو یقین تھا کہ ــــ اگر عیسائی مغرب میں نہیں تو ــــ مشرق وسطیٰ میں ظلم وستم اور عدم رواداری مذہب کے زوال کا نتیجہ تھی۔ ایک ایسے زمانے میں کہ جب مصر کے بہت سے ممتاز مفکر اسلام سے منہ موڑ رہے تھے' رشید رضا کا ایقان تھا کہ جدید مسلمان ریاستوں کو اگر زیادہ نہیں تو پہلے جتنی ہی مذہبی حدود کی ضرورت ہے۔

اگر مصر کے لوگوں کو یہ یقین تھا کہ یورپ کی کامیابی کا ''راز'' قوم پرستی تھی تو بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ایرانیوں کو یقین تھا کہ یہ ''راز'' آئینی حکومت تھی۔ اس حوالے سے ایرانی بھی بہت سے مصریوں کی طرح مغرب جیسا ہونا چاہتے تھے۔ 1904ء میں جاپان نے' جس نے حال ہی میں آئینی حکمرانی کو اپنایا تھا' روس کو حیران کن شکست سے دوچار کیا۔ مصلحین کہتے تھے کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جاپان بھی ایران کی طرح پسماندہ ہوتا تھا مگر اب آئین کی وجہ سے وہ یورپیوں کا ہم رتبہ بن گیا تھا اور ان کو انہیں کے کھیل میں شکست دے سکتا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ علماء بھی شاہوں کی جابرانہ حکمرانی کا قلع قمع کرنے کے لیے نمائندہ حکومت کے قائل ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ایک لبرل مجتہد سید محمد طباطبائی نے توضیح کی:

> ''ہم نے خود تو آئینی حکومت کو نہیں دیکھا' لیکن ہم نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے اور جن لوگوں نے آئینی ملکوں کو دیکھا ہوا ہے' انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ آئینی حکمرانی ملک کی سلامتی اور خوشحالی کا باعث بنتی ہے۔ اس سے ہمارے اندر خواہش اور جوش پیدا ہو گیا ہے۔''

مصری علماء کے برخلاف' جو مدافعتی انداز میں مدرسوں کی دنیا میں پسپا ہو گئے تھے' ایرانی علماء اکثر و بیشتر تبدیلی کے پیشرو رہے تھے اور آئندہ واقعات میں بھی انہوں نے فیصلہ کن کردار ادا کرنا جاری رکھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دسمبر 1905ء میں تہران حکومت نے احکامات جاری کیے کہ چینی کے کئی تاجروں کے پیروں پر بید مارے جائیں کیونکہ انہوں نے حکومت کے احکامات کے باوجود چینی کی قیمتوں میں کمی نہیں کی تھی۔ ان تاجروں کا کہنا تھا کہ زیادہ درآمدی محصولات کی وجہ سے وہ اپنی قیمتوں میں اضافے پر مجبور ہیں۔ علماء اور دکانداروں (Bazaaris) کے ایک بڑے گروپ نے تہران کی شاہی مسجد میں دھرنا دے دیا' تاوقتیکہ وزیراعظم عین الدولہ کے گماشتوں نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اچانک بہت بڑی تعداد میں مذہبی پیشوا طباطبائی کی قیادت میں ایک اہم مزار میں گئے اور وہاں انہوں نے مطالبہ کیا کہ شاہ ایک نمائندہ دارالعدل قائم کرے۔ شاہ مان گیا اور علماء تہران واپس آ گئے لیکن جب وزیراعظم نے اس وعدے کو پورا کرنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا تو تہران اور دوسرے صوبوں میں فسادات شروع ہو گئے اور مقبولِ عام مبلغوں نے منبروں سے عام لوگوں کو ہیجان دلاتے ہوئے حکومت کی مذمت کی۔ آخرکار جولائی 1906ء میں تہران کے مذہبی پیشوا بڑی تعداد میں قم کی طرف روانہ ہو گئے جہاں چودہ ہزار کے قریب تاجروں نے برطانوی سفارتخانے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ کاروبار معطل ہو کے رہ گیا' جبکہ احتجاج کرنے والے عین الدولہ کی سبکدوشی اور ''مجلس'' (نمائندہ اسمبلی) کے قیام کا مطالبہ کرنے لگے اور زیادہ اہل علم مصلحین نے ''مشروطہ'' (آئین) پر گفتگو شروع کر دی۔

آئینی انقلاب ابتداء میں کامیاب رہا۔ جولائی کے آخر میں وزیراعظم کو منصب سے ہٹا دیا گیا اور اکتوبر میں تہران میں پہلی ''مجلس'' قائم کر دی گئی' جس میں منتخب علماء خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ایک سال بعد نئے شاہ محمد علی نے اساسی قانون پر دستخط کیے' جو کہ بلجیئن آئین کے نمونے پر تشکیل دیا گیا تھا۔ اس میں شاہ کو ہر اہم معاملے میں مجلس سے منظوری حاصل کرنے کا پابند کیا گیا تھا' تمام شہری (بشمول ان کے جو کسی دوسرے عقیدے سے تعلق رکھتے ہوں) قانون کے سامنے مساوی تھے اور آئین شخصی حقوق اور آزادی کی ضمانت دیتا تھا۔ پورے ایران میں لبرل سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ پہلی مجلس نے اخبارات کو نئی آزادی عطا کی اور جلد ہی طنزیہ اور تنقیدی مضامین شائع ہونے لگے۔ نئی سوسائٹیاں (Societies) تشکیل دی گئیں' ایک قومی بینک کے لیے منصوبے تیار ہونے لگے اور نئی میونسپل کونسلیں انتخابات کے ذریعے تشکیل پائیں۔ تبریز کے ذہین نوجوان ڈپٹی سید حسن تقی زادہ مجلس میں ایک بائیں بازو کی جمہوری جماعت کی قیادت کرتے تھے جبکہ مجتہدین آیت اللہ طباطبائی اور سید عبداللہ بیہبہانی قدامت پسند جماعت کے قائد تھے' جو شریعت کے مقام کے تحفظ کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے آئین میں چند دفعات شامل کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

تاہم لبرل مذہبی پیشواؤں اور مصلحین کے مابین تعاون کے اس مظاہرے کے باوجود پہلی مجلس میں عمیق تقسیم عیاں ہوئی۔ بہت سے ڈپٹی مخالف حلقوں سے تعلق رکھتے تھے' جو ملکوم خان اور کرمانی سے وابستہ تھے اور وہ علماء کے حوالے سے صرف تحقیر ہی محسوس کرتے تھے۔ وہ انقلابی تصورات پھیلانے والی ''انجمنوں'' (خفیہ تنظیموں) کے اراکین تھے اور حد تو یہ ہے کہ بعض زیادہ ریڈیکل مذہبی پیشوا بھی ایسے گروپوں سے روابط رکھتے تھے' جبکہ مصلحین عمومی طور پر مذہبی پیشوائیت کے مخالف تھے اور علماء کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتے تھے۔ اگر مصلحین کے ساتھ شامل ہونے والے علماء یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ شریعت کو ملک کا قانون بنوائیں گے' تو انہیں مایوسی ہوئی۔ پہلی مجلس نے فوری طور پر تعلیم جیسے معاملات میں مذہبی پیشواؤں کے اختیارات ختم کرنے کے اقدامات اٹھائے اور جس آئینی انقلاب کی حمایت بہت زیادہ مذہبی پیشواؤں نے کی تھی وہ ملک میں ان کے بے پناہ اختیارات کے خاتمے کا آغاز ثابت ہوا۔

شیعی علماء نے اس سے پہلے سیاست میں کبھی اس طرح عملی حصہ نہیں لیا تھا۔ کچھ سکالروں کو یقین تھا کہ وہ اپنی مراعات اور مفادات کے تحفظ کی خواہش کے تحت عمل کرتے ہیں نیز کافر مغرب کے تجاوز کو روکنے کے لیے۔ دوسروں نے اس امر کی نشاندہی کی کہ زیادہ لبرل علماء نے شاہوں کے جابرانہ اقتدار کو محدود کرنے کے لیے ایک آئین کی تخلیق میں حصہ لے کر جبر واستبداد کی مخالفت کا قدیم شیعی فرض ادا کیا ہے۔ عام مصلحین' جو علماء کی عظیم قوت کے بارے میں سوچتے تھے محتاط رہے تھے کہ انقلاب کے دوران مسلمانوں کے حساس معاملات کو نہ چھیڑیں تاہم وہ مذہبی پیشوائیت سے طویل عرصے سے متنفر چلے آ رہے تھے' اس لیے جب ایک مرتبہ وہ اقتدار میں آ گئے تو انہوں نے قانونی نظام اور تعلیم کو سیکولر کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس سیکولرائزیشن کے خطروں کی نشاندہی کرنے والے اولین افراد میں سے ایک شیخ فضل اللہ نوری (1909ء۔1843ء) تھا۔ وہ تہران کے تین ممتاز مذہبی پیشواؤں میں سے ایک تھا' جس نے 1907ء میں آئین کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا: اس نے کہا چونکہ امام غائب کی غیر موجودگی میں ہر حکومت غیر قانونی ہوتی ہے اس لیے نئی پارلیمنٹ غیر اسلامی ہے۔ مجلس کی بجائے مجتہد امام کے نائبین ہوتے ہیں اور قانون سازی نیز لوگوں کے حقوق کا تحفظ انہی کو کرنا چاہیے۔ تاہم اس نئے نظام کے تحت مذہبی پیشوا دوسرے اداروں کے درمیان محض ایک ادارہ ہی بن گئے ہیں۔ وہ لوگوں کے روحانی رہنما نہیں رہے اور مذہب خطرے میں پڑ گیا ہے۔ فضل اللہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نوری نے مطالبہ کیا کہ مجلس کو کم سے کم اپنے فیصلے شریعت کی بنیاد پر کرنے چاہئیں۔ اس کے اعتراضات کی وجہ سے آئین میں ترمیم کی گئی' مجلس کے منتخب کردہ پانچ علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی' جو اسلام کے مقدس قانون سے متصادم ہر قانون سازی کو ویٹو کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔

تاہم نوری نے ایک اقلیت کی سوچ کا اظہار کیا تھا۔ نجف کے بیشتر مجتہدوں نے آئین کی حمایت کی تھی اور انہوں نے حمایت جاری رکھی۔ انہوں نے نوری کے اس مؤقف کو رد کر دیا کہ امام غائب کی براہ راست رہنمائی کے بغیر قانون کا درست طور پر نفاذ ممکن نہیں اس لیے ایک شرعی ریاست قائم کی جانی چاہیے۔ ایک بار پھر شیعوں کی روحانی بصیرتوں نے سیاسی نظام کی سیکولرائزیشن کو بڑھاوا دیا تھا اور ریاستی اقتدار کو ہنوز مذہب سے متضاد تصور کیا تھا۔ بہت سے مذہبی پیشوا دربار کی بڑھتی ہوئی بدعنوانی اور حکومت کے معاشی عدم تحفظ سے نفرت کرتے تھے جس کی وجہ سے قاچار غیر ملکیوں کو ناقابل قبول مالی رعایتیں دیتے اور بھاری قرض لیتے تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ ایسا تنگ نظری پر مبنی رویہ مصر میں فوجی تسلط کا باعث بنا تھا۔ اس لیے قاچار ریاست کی جابرانہ پالیسیوں کو آئین کے ذریعے محدود کرنا واضح طور پر قابل ترجیح دکھائی دیتا تھا۔ اس نکتہ نظر کو شیخ محمد حسین نائینی (1936ء۔1850ء) نے اپنی کتاب ''قوم کو نصیحت اور عوام کو بشارت'' میں' جو کہ نجف میں 1909ء کو شائع ہوئی تھی' بیان کیا تھا۔ نائینی نے لکھا کہ امام غائب کے بعد نمائندہ حکومت دوسرا بہترین متبادل ہے' کسی جابر حکمران کو محدود کرنے والی اسمبلی قائم کرنا واضح طور پر شیعیت کے حوالے سے قابل قدر عمل ہے۔ ایک جابر حکمران اسلام میں سب سے بڑے گناہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو الوہی اقتدار کا مالک تصور کر کے رعایا سے ایسا برتاؤ کرتا ہے گویا وہ خود خدا ہو۔ حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی بربادی کے لیے بھیجا گیا تھا کیونکہ وہ اپنی رعایا پر جبر و استبداد کرتا تھا اور انہیں غلام بنائے ہوئے تھا۔ آپؑ نے اسے اللہ کے احکامات ماننے کی ہدایت کی تھی۔ اسی طرح مجلس کو مذہبی ماہرین کے پینل کے ساتھ لازماً اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ شاہ خدا کے قوانین کی اطاعت کریں۔

تاہم نئے آئین کی انتہائی ظالمانہ مخالفت علماء نے نہیں بلکہ نئے شاہ نے کی' جس نے روس کے کوزاک بریگیڈ کے تعاون سے جون 1908ء میں کامیاب انقلاب (Coup) برپا کیا اور مجلس کو ختم کر دیا' انقلابی مصلحین اور علماء کو قتل کروا دیا گیا۔ تاہم تبریز کے عوامی گارڈ شاہ کی افواج کے خلاف میدان میں نکل آئے اور انہوں نے اگلے مہینے بختیاری قبیلے کی مدد سے رد انقلاب (Countercoup) برپا کیا اور شاہ کو تخت سے اتار دیا۔ انہوں نے اس کے چھوٹے

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیٹے احمد کو ایک لبرل قائم مقام شاہ کے ساتھ تخت پر بٹھا دیا۔ دوسری مجلس منتخب ہوئی تاہم مصر کی طرح یورپی طاقتوں نے اس نوآموز جمہوریت کے پر کتر دیئے۔ جب مجلس نے ایران کی بیمار معیشت کی اصلاح کے لیے ایک نوجوان امریکی ماہر مالیات مورگن شستر کا تقرر کر کے ایرانی معاملات پر برطانیہ اور روس کے طویل مدت سے قائم غلبے کو توڑنے کی کوشش کی تو روسی دستوں نے تہران پر چڑھائی کر دی اور دسمبر 1911ء میں مجلس کو ختم کر دیا۔ مجلس کو تین سال بعد اجلاس بلانے کی اجازت دی گئی اور اس عرصے کے دوران بہت سے لوگ تلخ اور مایوس ہو گئے۔ آئین وہ اکسیر ثابت نہیں ہوا تھا' جس کی کہ انہیں امید تھی تاہم اس نے ایران کے بنیادی بانجھ پن کا سفاکانہ اور واضح علاج کر دیا تھا۔

پہلی عالمی جنگ ایران کے لیے بہت انتشار انگیز تھی اور بہت سے ایرانیوں کو مضبوط حکومت کا آرزومند چھوڑ گئی۔ 1917ء میں برطانوی اور روسی دستے ملک پر چڑھ دوڑے۔ بالشویک انقلاب کے بعد روسی تو نکل گئے لیکن برطانوی ملک کے شمال میں ان کے خالی کیے ہوئے علاقوں میں داخل ہو گئے' جبکہ انہوں نے جنوب میں اپنے مراکز بھی برقرار رکھے۔ اب برطانیہ ایران کو محروسہ ملک (Protectorate) بنانے کا مشتاق تھا۔ ملک میں 1908ء میں تیل دریافت ہو چکا تھا اور ایک برطانوی ولیم ناکس ڈی آرکی کو رعایت حاصل ہو گئی تھی' 1909ء میں اینگلو پرشین آئل کمپنی قائم کی گئی اور ایرانی تیل برطانوی بحریہ کو چلانے میں کام آنے لگا۔ اب ایران ایک سونے کی چڑیا بن گیا تھا۔ تاہم مجلس نے برطانوی کنٹرول کی مخالفت کی۔ 1920ء میں پورے ملک میں برطانیہ کے خلاف مظاہرے ہوئے' مجلس نے سوویت روس اور امریکہ سے مدد کی درخواست کی اور برطانیہ کو اپنا یہ منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ تاہم ایرانیوں کو اس المناک حقیقت کا ادراک ہوا کہ انہیں اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے دوسری عظیم طاقتوں سے درخواست کرنی پڑی تھی' جو ایرانی تیل کے حوالے سے اپنے ہی منصوبے بنائے ہوئے تھیں۔ اب ایران ایک آئین اور نمائندہ حکومت کا حامل تھا لیکن یہ سب بے فائدہ تھا کیونکہ مجلس کے پاس کوئی حقیقی اختیار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ امریکیوں نے محسوس کیا کہ برطانوی مستقل طور پر انتخابات میں دھاندلی کرتے ہیں اور یہ کہ ایرانیوں کو ''کھلم کھلا اظہار رائے نہیں کرنے دیا جاتا اور موجودہ مارشل لا اور پابند اخبارات کی وجہ سے وہ کسی طور اپنے محسوسات ظاہر نہیں کر سکتے۔''

عدم اطمینان کی غالب کیفیت کی وجہ سے ایک عام شہری (Civilian) سید ضیاء الدین طباطبائی اور شاہ کے کوزاک بریگیڈ کے کمانڈر رضاخان (1944ء۔ 1877ء) کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیادت میں ایک چھوٹے سے گروپ نے نسبتاً آسانی سے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ فروری 1921ء میں ضیاء الدین وزیراعظم بن گیا جبکہ رضا خان وزیر جنگ (Minsiter For War) بن گیا۔ برطانوی خاموشی سے رضامند ہوگئے کیونکہ ضیاء الدین برطانیہ کا حامی مشہور تھا اور انہیں امید تھی کہ اس کے انتخاب سے ان کے محروسہ ملک والے منصوبوں کو تقویت ملے گی' جنہیں پوری طرح ترک نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم رضا خان ضیاء الدین سے زیادہ مضبوط قائد تھا اور اس نے جلد ہی ضیاء الدین کو وطن بدر کر دیا' نئی کابینہ تشکیل دی اور خود حکمران بن گیا۔ رضا نے فوری طور پر ملک کو ترقی دینا شروع کر دیا اور چونکہ لوگ بہت بے چین اور کسی تبدیلی کے لیے تیار تھے' اس لیے جہاں اس کے پیشرو ناکام ہوئے تھے' وہ کامیاب ہوگیا۔ رضا کو سماجی اصلاح سے کوئی دلچسپی اور غریبوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اس کا مقصد تو بس ملک کو مرکزیت عطا کرنا' فوج اور بیوروکریسی کو مضبوط بنانا اور ایران کو عملاً مؤثر بنانا تھا۔ اس نے ہر مخالفت کو سفاکی کے ساتھ کچل دیا۔ عین ابتداء ہی سے برطانوی تسلط ختم کرنے کی غرض سے سوویت روس اور امریکہ سے قریبی تعلقات قائم کیے اور امریکہ کے تیکنیکی مشوروں نیز سرمایہ کاری کے بدلے میں نیوجرسی کی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کو تیل کے لیے رعایت دی۔ 1925ء میں رضا اتنا طاقتور ہوگیا تھا کہ اس نے آخری قاچار شاہ کو تخت و تاج سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کا اصل ارادہ تو ایک ری پبلک قائم کرنے کا تھا لیکن علماء نے اعتراض کر دیا۔ مجلس میں آیت اللہ مدرسی نے اعلان کیا کہ ری پبلک غیر اسلامی ہے۔ ری پبلک اتاترک سے نسبت کی وجہ سے بدنام تھی اور مذہبی پیشوا ایران کو ترکی والے راستے پر گامزن دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ رضا کا ارادہ شاہ بننے کا نہیں تھا جبکہ وہ مذہبی پیشواؤں سے قریبی روابط قائم رکھنے کے لیے مضطرب تھا۔ اس نے ان سے وعدہ کیا کہ اس کی حکومت اسلام کا احترام کرے گی اور یہ کہ شریعت سے متصادم قانون سازی نہیں کی جائے گی۔ ایسا ہی طے پا گیا؛ پوری مجلس نے پہلوی خاندان کے قیام کو تسلیم کر لیا۔ تاہم اسکے تھوڑے ہی عرصے بعد رضا شاہ پہلوی نے علماء سے کیا گیا وعدہ توڑ ڈالا اور نہ صرف اتاترک کے مساوی بلکہ اس سے زیادہ سفاکانہ سیکولرائزیشن کی۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے اختتام تک ایسا لگتا تھا کہ سیکولرازم بازی لے گیا ہے۔ اگرچہ مذہبی سرگرمی زوروں پر تھی' تاہم زیادہ ریڈیکل تحریکوں کو محدود کر دیا گیا تھا اور وہ سیکولر قیادت کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھیں۔ تاہم ان برسوں کے دوران جو بیج بوئے گئے وہ اس وقت جڑیں پکڑ گئے جب اس جدید سیکولر تجربے کی محدودیت عیاں ہوگئی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب ہفتم

ردِ ثقافت

(1925-60ء)

نئی سیکولر روحانیت:

جب سے نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا تھا۔ جدید لوگوں کو مختلف انداز سے اپنے کلچر کے قلب میں ایک خلا کا ادراک ہو رہا تھا۔ سائنسی عقلیت پسندی کے حیران کن کارناموں نے خدا کے تصور ہی کو بہت سے مغربی لوگوں کے لیے ناقابل یقین اور ناممکن بنا دیا تھا' کیونکہ وہ پرانے اساطیری شعور کے ساتھ مٹ گیا تھا۔ تاہم بیشتر جدید لوگ دلگیر نہیں تھے۔ دنیا کئی اعتبار سے بہت اچھی ہوگئی تھی اور وہ ادب' فن' تحلیل نفسی' نفسیات یا حتیٰ کہ کھیلوں میں نئی سیکولر روحانیت تشکیل دے رہے تھے' ماورائی معنی کا ایک احساس' جو ان کی زندگیوں کو قدر عطا کرتا اور انہیں ہستی کے عمیق دھاروں سے مربوط کرتا۔ بیسویں صدی کے وسط تک بیشتر مغربی لوگ سوچتے تھے کہ مذہب عالمی معاملات میں دوبارہ کبھی کوئی بڑا کردار ادا نہیں کرے گا۔ اسے نجی دائرے میں محدود کر دیا گیا تھا اور بہت سے سیکولر لوگ' جو اقتدار میں تھے یا جو ذرائع ابلاغ اور عوامی مباحثے پر تسلط رکھتے تھے' اسے درست تصور کرتے تھے۔ مغربی عیسائی دنیا میں مذہب اکثر و بیشتر سفاک اور جابر رہا تھا جبکہ جدید ریاست کی ضروریات ایک روادارانہ معاشرے کا مطالبہ کرتی تھیں۔ صلیبی جنگوں (Crusades) اور مذہبی احتساب کے عہد میں واپسی ناممکن تھی۔ سیکولرازم مستقل طور پر رائج ہوا تھا۔ تاہم اسی زمانے میں' بیسویں صدی کے وسط تک' دنیا اس حقیقت سے دوچار ہوئی کہ "خلا" محض ایک نفسیاتی کھوکھلا پن نہیں رہا بلکہ ایک خوفناک روپ اختیار کرتا جا رہا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1914ء سے لے کر 1945ء کے درمیانی عرصے میں یورپ اور سوویت یونین میں سات کروڑ افراد متشددانہ موت کی نذر ہوئے۔ جرمنوں نے نہایت ہولناک مظالم ڈھائے' حالانکہ وہ یورپ کے ایک انتہائی مہذب معاشرے میں رہتے تھے۔ مزید یہ تصور کرنا ممکن نہیں رہا تھا کہ عقلی تعلیم بربریت کو مٹا دیتی ہے' کیونکہ نازی ہولوکاسٹ (Nazi Holocaust) نے اس امر کو عیاں کر دیا تھا کہ ایک عقوبت کدہ اسی علاقے میں ہوسکتا ہے جہاں ایک یونیورسٹی واقع ہو۔ نازی نسل کشی یا سوویت گولاگ (Gulag) کی شدت ان کے جدید ماخذ کو عیاں کرتی تھی۔ کوئی سابقہ معاشرہ فنا کاری کے ایسے منصوبوں کو بروئے عمل لانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ (45-1939ء) کی دہشتوں کا خاتمہ فقط دو جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر پہلے ایٹم بموں کے گرانے سے ہوا۔ یہ جدید سائنس کی قوت اور جدید کلچر میں فنا پرستی کے جرثومے کا ایک اور دہشت انگیز نظارہ تھا۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں دنیا کو تباہ کرنے چلے تھے۔ انہوں نے ایسا کرنے کے لیے اپنے عظیم ہنر اور علم کو استعمال کیا تھا۔ جب لوگوں نے زندگی کے ان نئے حقائق پر غور کیا تو انہیں عقلیت پسندی کی محدودیتوں کا پہلی مرتبہ ادراک ہوا۔ اتنے بڑے پیمانے پر المیے کا سامنا ہونے پر عقل دم بخود تھی۔

ہولوکاسٹ:

ہولوکاسٹ جدید زمانے کے لیے بدی کی ایک علامت بن گیا۔ وہ اپنے آغاز ہی سے نسلی صفائی (Ethnic Cleansing) میں ملوث رہنے والی جدیدیت کی ضمنی پیداوار (By-Product) تھا۔ نازیوں نے صنعتی دور کے بہت سے آلات اور مصنوعات کو ہلاکت انگیز انداز میں استعمال کیا۔ کارخانوں کی بھٹیوں کو قتل گاہوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔ انہوں نے ریلوے' ترقی یافتہ کیمیائی صنعت اور فعال بیوروکریسی اور مینجمنٹ کا بھرپور استعمال کیا۔ ہولوکاسٹ سائنسی اور عقلی منصوبہ بندی کا ثمر تھا' جس میں ہر کام ایک متعینہ مقصد کے تحت عمل میں لایا جاتا ہے۔ جدید سائنسی نسل پرستی سے پیدا ہونے والا ہولوکاسٹ بیسویں صدی کے نام نہاد ''گارڈن'' کلچر کا انت تھا۔ مقتلوں میں سائنس کا بھرپور استعمال ہوا اور نوعِ انسان کی اصلاح کے علم (Eugenics) کے تجربے کیے گئے۔ ہولوکاسٹ نے کم سے کم یہ ظاہر کر دیا کہ کوئی سیکولر نظریہ صلیبی جنگ جتنا ہی ہلاکت انگیز ہوسکتا ہے۔

ہولوکاسٹ ان خطرات سے بھی خبردار کروا گیا' جو انسانی شعور میں خدا کی موت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے بعد ابھر سکتے تھے۔ عیسائی الٰہیات میں جہنم کو خدا کی عدم موجودگی سے تعبیر کیا گیا تھا۔ ہولوکاسٹ کے مقتل صدیوں سے یورپیوں کے ذہنوں پر طاری انفرنو (جہنم) کی تمثالوں کا عکس تھے۔ کھال کھینچنا، شکنجوں میں کسنا، کوڑے مارنا، چیخیں، بے ہیئت، مسخ شدہ اجسام، شعلے اور متعفن فضا سب کے سب یورپ کے شاعروں، مصوروں، مجسمہ سازوں اور ڈراما نگاروں کی بیان کردہ عیسائی دوزخ کی یاد دلاتے تھے۔ آکوز ایک تاریک مثال تھی، جو انسانوں کو تقدس کا احساس کھو جانے کے بعد رونما ہونے والی زندگی کی صورت حال کی ایک جھلک دکھاتی تھی، مذہب نے اپنی بہترین صورت میں (اور صرف بہترین صورت میں) اپنی اساطیر، رسوم اور مسلکی اور اخلاقی سرگرمیوں کے ذریعے لوگوں میں انسانیت کا احترام پیدا کیا تھا۔ بیسویں صدی کے وسط تک ایسا لگتا تھا کہ بے لگام عقلیت پسندی کرۂ ارض پر دوزخ تخلیق کر سکتی ہے۔ ادھر ایک ایسا فنا پرستانہ محرک موجود تھا جو ہمیشہ سے کہیں زیادہ قوت کے مالک انسان کو وسیع پیمانے پر ہلاکت و بربادی پر اکسا سکتا تھا۔ خدا کا تصور انسان کی محدودیت کا آئینہ دار تھا۔ قانون کے احکامات انہیں یاد دلاتے تھے کہ یہ دنیا ان کی نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ جدید انسان اب اس قدر خود مختاری اور آزادی کا حامل ہے مگر ہولوکاسٹ اور گولاگ ظاہر کرتے ہیں کہ جب انسان خدا کو ترک کر دیتا ہے تو کیا انجام ہوتا ہے یا جب قوم یا کسی نظریے کو اعلیٰ ترین قدر تسلیم کر لیا جاتا ہے تو کیا کچھ وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ انسانوں کو زندگی کے تقدس اور احترام کا درس دینے کے نئے انداز ڈھونڈنا ہوں گے۔

مقتل (Death Camp) اور کھمبی بادل (Mushroom Cloud) * ایسی علامتیں ہیں جن پر ہمیں ضرور غور کرنا چاہیے اور دل پر نقش کر لینی چاہئیں تاکہ ہم اس جدید کلچر کے حوالے سے شاونیت زدہ نہ ہو جائیں، جس سے ہم میں سے بہت سے لوگ ترقی یافتہ دنیا میں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بعض بنیاد پرست جدیدیت کو برا اور ابلیسی تصور کرتے ہیں، جدید شہر یا سیکولر نظریے کے ان کے وژن سے اسی طرح خوف اور بے بسی آمیز اشتعال ان پر غلبہ پا لیتا ہے جس طرح لبرل سیکولر لوگوں پر آکوز کی تاریکی کا نظارہ۔ بیسویں صدی کے وسطی برسوں کے دوران تینوں توحیدی مذاہب کے بنیاد پرستوں نے یہ دکھانے کے لیے کہ معاملات کو کیسا ہونا چاہیے، مرکزی دھارے کے معاشرے سے الگ ہو کر ردثقافت تخلیق کرنا شروع کر دی۔ وہ

* یہ الفاظ ایٹم بم کے پھٹنے کے لیے بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں، کیونکہ جب ایٹم بم پھٹتا ہے تو دھوئیں اور آگ کا ایک کھمبی نما بادل تن جاتا ہے۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف غصے کی وجہ سے ہی الگ تھلگ نہیں ہو رہے تھے بلکہ دہشت اور خوف انہیں دھکیل رہا تھا۔ یہ امر اہمیت کا حامل ہے کہ ہم بنیاد پرستی کے قلب میں نہاں دہشت اور اندیشگی (Anxiety) کو سمجھیں کیونکہ صرف تبھی ہم اس کے ہیجانی اشتعال' خلا کو تیقن سے بھرنے کی اس کی بے قابو خواہش اور ہمیشہ تجاوز کرنے والے شر کے اس کے تصور کو سمجھ پائیں گے۔

قدامت پسند یہودی اور جدیدیت:

بعض یہودیوں نے ہولوکاسٹ سے بہت پہلے ہی جدیدیت کو شیطانی تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ بلاشبہ نازی سفاکی نے ان کے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ نہ صرف غیر یہودی دنیا شر ہے بلکہ بیشتر جدید یہودی بھی خوفناک حد تک قصور وار ہیں۔ 1930ء کی دہائی تک بیشتر آرتھوڈوکس یہودی' جو جدید کلچر سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتے تھے' Yeshiva یا ہیسیڈی (Hasidic) احاطے میں اپنی زندگیاں کھپا سکتے تھے۔ انہیں امریکہ یا فلسطین منتقل ہونے کی نہ تو خواہش تھی اور نہ ہی ضرورت۔ تاہم 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں کے تشدد آمیز واقعات کا مطلب یہی تھا کہ وہ یورپ اور سوویت یونین سے فرار ہو جائیں۔ بعض ہیریڈم فلسطین چلے گئے جہاں وہ یہودیوں کو آئندہ المیوں سے بچانے کے لیے ایک ریاست کو تخلیق کرنے کی مایوسانہ کوشش کرنے والے صیہونیوں کے روبرو تھے۔

ایڈاہ ہیریڈس' جو کہ یروشلم کی ایک کٹڑ آرتھوڈوکس کمیونٹی تھی' اعلانِ بالفور سے بھی کافی عرصے پہلے سے صیہونیوں کی شدید ترین مخالف تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا گروپ تھا' جس نے 1920ء کی دہائی تک فلسطین میں رہنے والے ایک لاکھ 75 ہزار یہودیوں میں سے صرف نو ہزار کو اپنی طرف مائل کیا۔ اپنی مقدس کتابوں میں غرق اس کمیونٹی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اپنے آپ کو سیاسی اعتبار سے کس طرح منظم کرے' تاہم انہوں نے جلد ہی ایگودات اسرائیل کی رکنیت اختیار کر لی' جو کہ جدید سیاسی کھیل کھیلنا سیکھ چکی تھی۔ ایگودات ابھی تک نظریاتی اعتبار سے صیہونیوں کی مخالف تھی تاہم اس کے اراکین ارضِ مقدس میں اپنے مذہبی ادارے قائم کر کے سیکولر لوگوں کے اثرات کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے' جہاں نوجوانوں کو توریت اور تالمود کے ساتھ ساتھ جدید مضامین بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اس اقدام نے کٹڑ آرتھوڈوکسوں کو مشتعل کر دیا تھا' جو یقین رکھتے تھے کہ ایگودات ''دوسری طرف'' چلی گئی تھی۔ آرتھوڈوکسوں کے اس داخلی تنازعے سے ایک بنیاد پرستانہ تحریک نے جنم لیا' جیسا کہ اکثر ہوتا ہے وہ ہم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہبوں کے درمیان جھگڑے سے متاثر تھی۔

اس استرداد ی آرتھوڈوکسی کا بڑا ترجمان منکیس کاربی ہائیم ایلیازر شپیرا (1937ء۔1872ء) تھا' جو کہ ہنگری کے ان یہودیوں کے انتہائی ممتاز ہیڈی قائدین میں سے ایک تھا' جنہوں نے 1922ء میں ایگودات کے خلاف ایک بھرپور مہم شروع کی تھی۔ اس کے خیال میں ایگودات کے اراکین صیہونیوں کے شریک کار تھے اور وہ Goyische روشن خیالی کی ''زہریلی جڑی بوٹیوں اور افسنتین'' سے نیز ''صیہونیوں کے شاعروں کی طرح — وطن کی آبادکاری اور ارتز اسرائیل (Eretz Israel) کے کھیتوں اور تاکستانوں کے گیت گا گا کر' سکول پڑھنے والے معصوم بچوں کے ذہنوں کو مسموم کر رہے تھے۔'' وہ ارضِ مقدس کو ناپاک کر رہے تھے جو کہ اس کی زمین میں کاشت کرتے ہوئے صرف عبادت اور مقدس مطالعے کے لیے مختص تھی۔ سلوواکیہ میں منعقدہ ایک اجلاس میں شریک انتہائی ریڈیکل ہیریڈم منکیکزر ربی (Rebbe) سے متفق ہوگئے اور انہوں نے ایگودات سے کسی قسم کا تعلق قائم کرنے پر پابندی کے اعلامیے پر دستخط کیے۔ صیہونیت کی مخالفت کرنے کے لیے وجود میں آنے والی ایگودات ان کے خیال میں نادرست تھی۔ اس گروپ کو یہ بھی آگاہی تھی کہ وہ مشرقی اور مغربی یورپ کے اکثریتی آرتھوڈوکسوں کے برعکس چل رہے ہیں' جو کہ صیہونیت کو غلط تصور تو کرتے ہیں لیکن ایگودات پر شپیرا کی پابندی کو انتہائی اقدام قرار دیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ صیہونیت سے اپنی جبلی دہشت کی وجہ سے اپنی اس علیحدگی پسندانہ پالیسی کو جائز محسوس کرتے تھے۔ اس پابندی پر دستخط کرنے والے اولین ہیریڈم میں سے ایک نوجوان ربی جوئیل موشے ٹائٹلبام (1979ء۔1888ء) تھا' جو بعد میں سٹمر' ہنگری کے ہیسیڈم کا قائد بن گیا اور صیہونیت اور ریاست اسرائیل کے تمام ہیریڈی (Haredi) مخالفین سے زیادہ سرگرم مخالف۔

جب شپیرا اور ٹائٹلبام نے فلسطین میں صیہونی کبوتزم (Kibutzim) پر غور کیا تو انہیں ویسا ہی اشتعال اور خوف محسوس ہوا جیسا کہ بعدازاں لوگوں کو نازی مقتلوں کے بارے میں سن کر ہوا تھا۔ اپنے پیروکاروں کے ساتھ امریکہ نقل مکانی کر کے فنا ہونے سے بچ جانے والے ٹائٹلبام نے ہولوکاسٹ کا سارا الزام صیہونیت کے عظیم گناہ پر دھرا جس نے ''یہودیوں کی اکثریت کو ایک ایسے کفر کی طرف ورغلا لیا تھا جو دنیا کی تخلیق سے لے کر اب تک دیکھا نہیں گیا تھا.....اور اسی لیے اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ لارڈ (Lord) نے غصے میں آ کر سزا دی تھی۔ یہ استرداد پسند صیہونیوں کے زرعی کارناموں کو مثبت انداز سے نہیں دیکھ سکتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے' جنہوں نے صحرا کو باغ بنا دیا تھا' یا ان کے قائدین کی سیاسی زیرکی کا مثبت مشاہدہ کرنے سے قاصر تھے' جو یہودیوں کو بچانے کے لیے کوشاں تھے۔ ان کے نزدیک یہ تو ایک ''زیادتی'' ایک ''نجس کاری'' اور شر کی قوتوں کا آخری ظہور تھا۔ صیہونی تو دہریے اور بے عقیدہ تھے' حالانکہ وہ انتہائی سخت گیر باعمل یہودی تھے' ان کی مہم ہنوز شر تھی کیونکہ یہ خداوند کے خلاف بغاوت تھی' جس کا فرمان تھا کہ یہودی جلاوطنی کا عذاب ضرور بھگتیں گے اور ان کو اپنے تحفظ کے لیے کوئی قدم بالکل نہیں اٹھانا چاہیے۔

شپیرا کے لیے وطن اتنا مقدس تھا کہ یہاں کوئی عام یہودی آباد نہیں ہوسکتا تھا۔ صرف ایسے مذہبی یہودی' جو اپنی پوری زندگی مطالعے اور عبادت کے لیے وقف کر دیں' وہاں رہ سکتے تھے۔ جہاں کہیں ارتز اسرائیل (سرزمین اسرائیل) جیسا کوئی مقام ہوتا ہے' شر کی قوتیں اس پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہوجاتی ہیں۔ شپیرا نے توضیح کی کہ صیہونی ایسے ہی شیطانی اثرات کا خارجی ظہور ہیں۔ چنانچہ ارض مقدس بذاتِ خود بری قوتوں سے بھر رہی تھی' جس نے خداوند کے غصے کو بھڑکا دیا۔'' اب خداوند کی بجائے شیطان یروشلم میں رہتا ہے۔ صیہونی جو ''وطن کی طرف رفعت'' کا دکھاوا کرتے ہیں' دراصل وہ تو جہنم کی گہرائیوں میں گر رہے ہیں۔'' ارضِ مقدس خداوند سے خالی ہوگئی تھی اور ایک انفرنو (Inferno) بن گئی تھی۔ ارتز اسرائیل کوئی وطن نہیں تھی' جیسا کہ صیہونی کہتے تھے' بلکہ ایک میدانِ جنگ تھی۔ ان خوفناک زمانوں میں صرف وہ لوگ یہاں آباد ہوسکتے تھے جو گھریلو لوگ یا کاشتکار نہیں بلکہ مقدس جنگجو' ''خداوند سے خوف کھانے والے'' ''جری لڑاکے'' جو ''یروشلم میں خداوند کے باقی ماندہ ورثے کے لیے جنگ'' پر روانہ ہوتے۔ صیہونیوں کی پوری مہم نے شپیرا کو وجودی (Existential) دہشت سے بھر دیا۔ ٹائلبام صیہونیوں کو شر کا تازہ ترین ظہور تصور کرتا تھا' جو کہ یہودیوں پر مستقلاً تباہی لاتا رہا تھا: مینار بابل' سونے کے بچھڑے کی پوجا' ہزاروں یہودیوں کے جانی زیاں کا باعث بننے والی دوسری صدی عیسوی کی بار کوچبا (Bar Kochba) بغاوت اور شبتائی زیوی معاملہ۔ تاہم صیہونیت سراسر کفر تھی' یہ سنگلاخ تکبر تھا جس نے دنیا کی بنیادوں ہی کو ہلا دیا تھا۔ چنانچہ اس میں حیرت کی کیا بات کہ خداوند نے ہولوکاسٹ نازل کیا تھا!

اس لیے سچے یہودیوں کو شر سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔ یروشلم کے ایک انتہائی پرجوش ہیسیڈم ربی یشایا ہومارگولس' شپیرا اور ٹائلبام دونوں کا زبردست مداح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا اور چاہتا تھا کہ ٹائٹلبام ''ایداہ ہیریڈس'' کا قائد بن جائے۔

اسرائیل شیطان کی تخلیق:

مارگولس نے اسرائیل کی ایک ردِ تاریخ (Counterhistory) تحریر کی' جس میں ایک جنگجو اقلیت کے وجود پر زور دیا گیا تھا' جو کہ صدیوں سے خداوند کے نام پر دوسرے یہودیوں کے ساتھ مستقل طور پر مصروفِ جنگ چلی آ رہی تھی۔ لیوائٹوں (Levites) نے سونے کے بچھڑے کی پوجا کرنے پر تین ہزار اسرائیلیوں کو قتل کر دیا تھا' اسی لیے خداوند نے انہیں دوسرے قبیلوں سے زیادہ عزت عطا کی تھی' یہ عزت ان کی معبد میں خدمت انجام دینے کا صلہ نہیں تھی۔ یہ لوگ' جن کا خداوند کے لیے جذبہ اکثر و بیشتر قابو میں نہ آ سکنے والے اشتعال کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا' حقیقی یہودی تھے۔ بعض اوقات انہیں غیر یہودیوں سے لڑنا پڑا اور بعض اوقات انہوں نے یہودیوں سے لڑائی کی' تاہم جنگ ہمیشہ ایک ہی رہی۔ سچے یہودی کو لازماً ایسے یہودیوں سے قطع تعلق کرنا چاہیے' جو خداوند کو چھوڑ کر شر کی طرف چلے جانے والی ایگودات کے اراکین ہیں۔ ایگودات نے صیہونیوں سے تعاون کر کے یہودیوں کو ''کرۂ ارض کے سب بُرے لوگوں سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔'' ان سے میل جول اتنا ہی بڑا گناہ ہے جتنا شیطان سے معاہدہ کرنا۔''

لہٰذا الگ ہونا فرض ہے۔ اس نے کہا کہ جیسے توریت حلال کو حرام سے' روشنی کو تاریکی سے' دودھ کو گوشت سے اور سبت کو ہفتے کے دوسرے دنوں سے الگ کرتی ہے' اسی طرح نیک یہودیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو لازماً الگ تھلگ رکھیں۔ غدار کبھی واپس نہیں آئیں گے' سچے ہیریڈم ان برے یہودیوں سے الگ زندگی بسر کر کے اور عبادت کرتے ہوئے اس وجودیاتی (Ontological) خلیج کو طبیعی طور پر نمایاں کریں گے جو مابعدالطبیعیاتی سطح پر ان کے مابین حائل ہے۔ تاہم اس خوف سے لبریزوژن سے مراد تھی کہ شیطانوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہوئے سچے یہودیوں کی زندگی کی تمام تر تفاصیل کائناتی اہمیت کی حامل ہیں۔ لباس کی وضع' مطالعے کے طریقے اور حد تو یہ ہے کہ ڈاڑھی کی تراش بھی لازماً مطلق طور پر درست ہونی چاہیے تھی۔ یہودیوں کی زندگی کو سنگین خطرات لاحق تھے اور ہر اختراع ممنوع تھی: ''احتیاط کرنی چاہیے کہ دایاں کا لربائیں سے اوپر ہو' کیونکہ دایاں ہاتھ اعلیٰ ترین ہوتا ہے' لارڈ نے اپنا دایاں ہاتھ' اپنی اعلیٰ ترین محبت (ہیسیڈ) میں' بائیں سے اوپر رکھا'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جوکہ طاقت (Din)' شیطانی محرک کی قوت کی نمائندگی کرتا ہے۔'' جہاں پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے سخت گیر اعتقادی درستی میں مطلق تیقن کے ذریعے خلا کو بھرنے کی کوشش کی تھی' وہاں صیہونیوں کے مخالف یہ کٹڑ آرتھوڈوکس الوہی قانون کی جزئیات پر عمل کرنے اور رسوماتی اعمال پر زور دیتے تھے۔ یہ ایک ایسی روحانیت ہے جو تقریباً لادوا خوف کو عیاں کرتی ہے' جسے صرف پرانی حدود کو برقرار رکھنے' نئی سرحدیں قائم کرنے' ایک سخت گیر علیحدگی اور روایتی اقدار سے ایک جنونی وابستگی کے ذریعے دھیما کیا جا سکتا ہے۔

صیہونیوں کے کارناموں کو حیران کن اور تسکین بخش تصور کرنے والے یہودیوں کے لیے اس استرداد پسندانہ (Rejectionist) وژن کو سمجھنا سراسر ناممکن تھا۔ یہ وہ مخمصہ ہے جس کا سامنا بیسویں صدی میں یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں سبھی کو کرنا پڑا یعنی بنیاد پرستوں اور جدید سیکولر دنیا کو زیادہ مثبت انداز میں قبول کرنے والوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہوتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ مختلف گروپ معاملات کو ایک ہی زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ عقلی دلائل کارآمد ثابت نہیں ہوتے کیونکہ اختلاف ذہن کی انتہائی گہری اور جبلی سطح سے ابھرتا ہے۔ جب شپیرا' ٹائٹلبام اور مارگولس نے سیکولر صیہونیوں کی بامقصد عملیت پسندانہ اور عقل سے فیضان یافتہ سرگرمیوں پر غور کیا تو وہ انہیں صرف بے خدا اور اسی لیے شیطانی ہی تصور کر سکتے تھے۔ جب انہوں نے نازی مقتلوں کی عقلی' عملی اور سفاکانہ سرگرمیوں کے بارے میں سنا تو انہوں نے ان کو صیہونی مہم سے مماثل تصور کیا۔ ان کے خیال میں دونوں ہی خداوند کی عدم موجودگی کو عیاں کرتے تھے اور اسی لیے ہیریڈم کو عزیز ہر مقدس قدر کو روندنے والے شیطان اور فنا پرست تھے۔ آج بھی یروشلم کے ایک صیہونیت مخالف علاقے میں پلے کارڈوں (Placards) اور دیواروں پر بنی شبیہوں کے ذریعے ریاست اسرائیل کے سیاسی قائدین کو ہٹلر سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ کسی پردیسی (Outsider) کے لیے اس قسم کا رویہ ہلا کر رکھ دینے والا' کاذب اور انحرافی ہے تاہم اس سے ہمیں اس عمیق دہشت کا پتا چلتا ہے جو سیکولرازم بنیاد پرستوں کے دلوں میں پیدا کر سکتا ہے۔

ارتز اسرائیل میں ایک سیکولر ریاست قائم کرنے' مذہب سے روگردانی کرنے والے یہودیوں کے تصور ہی نے ایک ٹیبو (Taboo) کو پامال کیا تھا۔ صدیوں سے کھوئے ہوئے وطن نے ایک علامتی اور صوفیانہ قدر حاصل کر لی تھی جو اسے خداوند اور توریت کے ساتھ ایک قسم کی مقدس مثلث کا زاویہ بناتی تھی۔ مذہب کو کھلم کھلا الگ کرنے والے لوگوں کو اس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بے حرمتی کرتے دیکھ کر یہودی اسی طرح ملے جلے غصے اور خوف کا شکار ہوگئے جس طرح کسی مقدس مقام کی توہین پر ہوتے' جسے بالخصوص یہودی دنیا میں زنا کے مساوی گردانا جاتا تھا۔ صیہونی جس قدر اپنے مقصد کو پانے میں کامیابی کے نزدیک آتے گئے' اتنا ہی زیادہ ریڈیکل ہیریڈم مایوس ہوتے گئے' یہاں تک کہ 1938ء میں ایگودات کے صیہونیوں سے مبینہ ''تعاون'' کی وجہ سے اسے چھوڑ دینے والے امرام بلا اور اہارون کیٹزنلبوگن ایڈاہ ہیریڈس سے بھی الگ ہوگئے۔

عربوں کے حملوں کا منظم دفاع کرنے کے مصارف پورا کرنے کے لیے یہودی کمیونٹی پر حال ہی میں ٹیکس لگایا گیا تھا اور ان استرداد پسندوں نے اس کی ادائیگی سے انکار کردیا۔ اپنے انکار کا جواز مہیا کرنے کے لیے بلا اور کیٹزنلبوگن نے تالمود کی ایک کہانی کا حوالہ دیا۔ جب تیسری صدی عیسوی میں مسلح محافظ رومن فلسطین میں یہودیوں کی ایک شہری کمیونٹی کے دفاع کے لیے منظم ہو رہے تھے تو دو یہودی داناؤں نے انہیں کہا تھا: ''تم شہر کے محافظ نہیں بلکہ اسے تباہ کرنے والے ہو۔ جن عالموں نے توریت کا حقیقی مطالعہ کر رکھا ہے وہی شہر کے حقیقی محافظ ہیں۔'' بلا اور کیٹزنلبوگن نے جو گروپ بنایا' انہوں نے اسے آرامی (Aramaic) نام دیا: Neturie Karta (شہر کے محافظ)۔ ان کا کہنا تھا کہ صیہونیوں کی عسکریت پسندانہ سرگرمیاں یہودیوں کا تحفظ نہیں کرسکتیں بلکہ آرتھوڈوکس لوگوں کے مذہبی ضابطوں پر عمل کرنے سے سلامتی یقینی ہو جائے گی۔ انہوں نے صیہونیوں کے نقطۂ نظر کو چیلنج کیا۔ ان کی رائے میں جب یہودیوں کو توریت دے دی گئی تھی تو وہ دوسری قوموں سے مختلف اقلیم میں داخل ہوگئے تھے۔ انہیں سیاسی یا مسلح سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہونا ہے' بلکہ انہیں تو اپنے آپ کو روحانی معاملات کے لیے وقف کرنا ہے۔ یہودیوں کو ماضی کی دنیا کی طرف واپسی کا بلاوا دے کر صیہونیوں نے درحقیقت خداوند کی بادشاہت کا انکار کیا تھا اور ایک ایسی ریاست میں چلے گئے تھے جو یہودیوں کو کوئی وجودی معنویت نہیں عطا کرسکتی تھی۔ انہوں نے اپنی فطرت ہی کا انکار کیا تھا اور یہودیوں کو ایک تباہ کن راستے پر ڈال دیا تھا۔

صیہونی جتنا زیادہ کامیاب ہوئے' نیچری کارٹا (Neturie Karta) اتنا زیادہ حیران پریشان ہوگئے کہ برے لوگ کیوں خوش حال ہوگئے تھے؟ جب 1948ء میں ہولوکاسٹ کے فوری بعد ریاست اسرائیل قائم ہوگئی تو ٹائٹلبام اور بلا صرف یہی نتیجہ اخذ کرسکتے تھے کہ شیطان نے یہودیوں کو ایک معنویت سے عاری شر اور بے حرمتی کی اقلیم میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ
www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

لے جانے کے لیے تاریخ میں براہ راست مداخلت کی تھی۔ بیشتر آرتھوڈوکس اور الٹرا آرتھوڈوکس نئی ریاست کو قبول کرنے پر تیار تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اسرائیل کسی مذہبی قدر کا حامل نہیں اور جو یہودی یہاں آباد ہیں' وہ اب بھی جلاوطنی میں زندگی بسر کر رہے ہیں' جیسا کہ وہ ڈایا سپورا (Diaspora) میں بسر کرتے رہے ہیں۔ کچھ بھی تو تبدیل نہیں ہوا۔

ایگودات اسرائیل Shtadlanut یعنی یورپ کی غیر یہودی حکومتوں کی طرح اسرائیلی حکومت کے ساتھ' یہودیوں کے مذہبی مفادات کے لیے مکالمہ اور مذاکرات کرنے پر تیار تھی۔ تاہم نیچری کارٹا اس پر آمادہ نہیں تھے۔ 14 مئی 1948ء کو ریاست کے قیام کا اعلان ہونے کے فوری بعد انہوں نے انتخابات میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی' اپنے Yeshivot کے لیے حکومتی رقوم لینے سے انکار کر دیا اور حکومتی اداروں میں کبھی شمولیت نہ کرنے کا بھی عہد کیا۔ انہوں نے ایگودات پر بھی تنقید میں اضافہ کر دیا' جس کی ریاست کی عملیت پسندانہ قبولیت کو وہ برے نتائج پیدا کرنے والا حقیر عمل تصور کرتے تھے۔ بلا نے کہا "اگر (ہم) نے شر سے' ورغلانے والوں' بدعنوان کرنے والوں سے اپنی نفرت میں معمولی سی بھی کمی کی' اگر ہم اپنی مقدس توریت کی ہدایت کے مطابق علیحدگی کو برقرار نہیں رکھتے..... تو پھر ہر ممنوعہ شے کا راستہ کھلا ہے' کیونکہ ہم سیدھا راستہ چھوڑ کر ٹیڑھے راستے پر گامزن ہو جائیں گے۔" صیہونی' جنہوں نے تقریباً تمام یہودیوں کو خداوند سے دور کر دیا ہے' تمام شائستہ اور مقدس اقدار کے فنا پرستانہ انکار پر تلے ہوئے ہیں۔

صیہونیت جتنا زیادہ یہودی دنیا میں جڑیں مضبوط کرتی گئی اور نئی ریاست جتنا زیادہ کامیاب ہوتی گئی دونوں کے لیے نیچری کارٹا کی نفرت اتنی زیادہ ہوتی گئی۔ مصالحت کا کوئی امکان نہیں تھا' کیونکہ ریاست اسرائیل شیطان کی تخلیق جو تھی۔ جیسا کہ ٹائلبام نے وضاحت کی تھی کہ کسی یہودی کے لیے "ریاست اور توریت پر ایقان رکھنا ممکن نہیں ہے' کیونکہ دونوں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔" حالانکہ سیاستدان اور وزراء تالمود کے عالم تھے اور احکامات (Commandments) پر عمل کرتے تھے پھر بھی ریاست شیطانی ہی رہی کیونکہ اس نے خدا کے خلاف بغاوت جو کی تھی۔ نیچری کارٹا کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ اسرائیلی پارلیمنٹ "نیسٹ" (Knesset) میں ایگودات کی مذہبی قوانین بنوانے کی کوششوں پر توجہ دیتی۔ ان کے نزدیک یہ کوئی نیک کام نہیں تھا کہ قانون کے ذریعے سبت کے دن گاڑیوں کی آمد و رفت پر پابندی لگانے کی کوشش کی جائے یا اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ Yeshiva کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طلباء فوجی بھرتی سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ تو الوہی قانون کو انسانی قانون بنانا ہوا۔ نیویارک میں سٹمر ہیسیڈم (Satmar Hasidim) کی کمیونٹی کے ایک ممتاز عالم ربی شیمون اسرائیل پوزن نے نیسٹ میں ایگودات کے اراکین کی ان کوششوں پر شدید تنقید کی' جو وہ مذہبی قوانین بنوانے کے لیے کر رہے تھے۔

تاہم نیچری کارٹا بھی صیہونیت کی کشش محسوس کرتی تھی۔ بلا نے صیہونیوں کو ''ورغلانے والے'' جو کہا تھا تو اس خطاب کی بڑی اہمیت ہے۔ یہودی سرزمین پر ایک یہودی ریاست ایک ایسی ترغیب تھی جو یہودیوں کی روح پر اثرانداز ہوتی تھی۔ یہ بنیاد پرستوں کے مخمصے کا ایک جزو ہے۔ وہ جن جدید کارناموں سے دہشت زدہ ہوتے ہیں انہی سے مسحور ہو جاتے ہیں اور ان کی طرف اکثر و بیشتر کھنچے چلے جاتے ہیں۔ پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں کا اینٹی کرائسٹ کی تصویر کشی پر کشش دھوکا دینے والے کے طور پر کرنا ایسی ہی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔ جدیدیت کے بنیاد پرستانہ وژن میں ایک کھنچاؤ ہے جو دھماکہ خیز ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بلا نے نشاندہی کی تھی کہ صیہونیوں کے مخالف ان سے ایک اصولی ''نفرت'' کرتے ہیں اور نفرت کے ساتھ ساتھ اکثر و بیشتر ایک غیر تسلیم شدہ محبت ہوا کرتی ہے۔ جب ہیریڈم ریاست اسرائیل کے بارے میں غور کرتے ہیں تو انہیں بہت غصہ آتا ہے۔ وہ قتل تو نہیں کرتے تاہم آج بھی وہ سبت کے دن چلنے والی کاروں کو پتھر مارتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے کسی ساتھی ہیریڈی کے گھر پر حملہ کر سکتے ہیں' کہ اس کے گھر میں ٹیلی وژن ہے یا اس کی بیوی غیر حیادارانہ لباس پہنتی ہے۔ تشدد کے ایسے واقعات کو ''خداوند کے نام کی تقدیس'' (Kiddush Hashem) اور ہیریڈم کو ہر طرف سے گھیر لینے اور انہیں تباہ کرنے سے ڈرانے والی شر کی قوتوں کے خلاف ایک ضرب کاری تصور کرتے ہیں۔ تاہم یہ ناممکن نہیں ہے کہ یہ تشدد آمیز اقدامات ان کے اپنے دل میں دفن آرزو اور کشش کو مارنے کی ایک کوشش ہو۔

یہ صیہونیت دشمن ہیریڈم اقلیت میں ہیں۔ اسرائیل کی ان کی تعداد تقریباً دس ہزار ہے اور امریکہ میں بھی وہ ہزاروں میں ہیں۔ تاہم ان کا اثر و رسوخ قابل لحاظ ہے۔ حتیٰ کہ کٹر آرتھوڈوکس بھی صیہونیت دشمن نہیں بلکہ تارکِ صیہونیت (A-Zionist) ہیں' نیچری کارٹا اور سٹمر ہیسیڈم جیسے دوسرے ریڈیکل ریاست سے تعاون کرتے ہوئے بھی ان سے متصادم رہتے ہیں۔ ریاستِ اسرائیل سے ان کا دور رہنے کا عزم کم پر جوش ہیریڈم کی یاد دلاتا ہے' جو یہودی ریاست کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے مصدقہ پن اور ربط کا فقدان محسوس کرتے ہیں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ کہ اسرائیل دنیاوی اعتبار سے خواہ کتنا ہی طاقتور اور کامیاب ہو یہودی اب بھی وجودی جلاوطنی کی حالت میں ہیں اور جدید دنیا کی سیاسی اور ثقافتی حیات میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔

اسرائیل کو شیطان کی تخلیق قرار دے کر ہیریڈم کا اسے رد کر دینا ایک ایسی ریاست کے خلاف مستقل بغاوت ہے' جہاں ان میں سے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ جب وہ سبت کے دن کاروں کو پتھر مارتے ہیں یا نہانے کے لباس کی مشہوری کرنے والی بہت تھوڑا لباس پہننے والی عورتوں کے پوسٹروں کو پھاڑ دیتے ہیں تو وہ یہودی ریاست کے سیکولر نظام کے خلاف بغاوت کر رہے ہوتے ہیں' جس میں کہ ہر عمل کی کسوٹی اس کا صرف عملی' عقلی فائدہ ہے۔ تینوں توحیدی مذاہب کے بنیاد پرست روحانیت کو بے دخل کر کے غالب آ جانے والے عملیت پسند لوگوس کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں۔ لیکن چونکہ سیکولر ایسٹیبلشمنٹ بہت طاقتور ہے اس لیے بیشتر بنیاد پرستوں کو اپنی بغاوت چھوٹے چھوٹے علامتی اعمال تک محدود رکھنا پڑتی ہے۔ بنیاد پرستوں کا اپنی کمزوری کا احساس اور مثلاً جنگ کے زمانے میں ریاست پر انحصار ان کے غصے میں اضافہ ہی کر سکتا ہے۔ ہیریڈم کی اکثریت اپنا احتجاج سیکولر ریاست اور روِ ثقافت کی ایسٹیبلشمنٹ سے لاتعلقی تک ہی محدود رکھتی ہے' جو ہر موڑ پر ان کی قدروں کو چیلنج کرتی ہے۔

ہیریڈم کے متبادل معاشرے کا محرک جدیدیت کے پیدا کردہ خلا کو بھرنے کی خواہش ہے۔ یہودیوں کے لیے ہولوکاسٹ کے بعد یہ خلا بہت بھیانک انداز میں وسیع ہو گیا تھا۔ ہولوکاسٹ سے بچ نکلنے والوں نے محسوس کیا کہ اسرائیل اور امریکہ میں ہیسیڈی کورٹس اور مسنیگڈی یشیووت (Yeshivot) قائم کیے جائیں۔ یہ ہٹلر کے کیمپوں میں ہلاک ہو جانے والے لاکھوں ہیریڈم کے لیے ایک نیکی کا کام اور شر کی قوتوں کے خلاف ایک باغیانہ اقدام ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ اپنے ہیریڈی اداروں کو نئی زندگی عطا کر کے اور مردہ دنیا کو نہ صرف زندہ بلکہ ہمیشہ سے زیادہ طاقتور بنا کر وہ خداوند کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اسرائیل اور امریکہ میں نئے Yeshivot تعمیر کیے گئے۔ 1943ء میں ربی ایرون کوٹلر (1962ء۔1891ء) نے جب نیوجرسی میں وولوژن' میر اور سلوبود کا کے یشیووت کی طرز پر بائس مڈراش گیڈولاہ (Bais Midrash Gedolah) قائم کیا تو اس نے امریکہ میں پہلا لتھوانیائی یشیوا (Yeshiva) کھولا تھا۔ 1948ء کے بعد تل ابیب کے نزدیک بنی براک (Bnei Brak) ''توریت کا شہر'' بن گیا' اس کے نئے یشیووت میں سارے اسرائیل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ڈایا سپورا سے طلباء آنے لگے۔ یہاں رہنما شخصیت ربی ابراہام یشایاہو کارلنز (1943ء-1878ء) تھا' جو ہیزن اِش کے نام سے مشہور تھا (یہ اس کی ایک کتاب کا عنوان تھا)۔ ان نئے اداروں نے یشیوا کو ہیریڈی حیات میں ہمیشہ سے زیادہ مرکزی حیثیت عطا کردی۔ توریت کا مطالعہ پوری زندگی پر محیط' ہمہ وقتی جستجو بن گئی' مردوں کو شادی کے بعد بھی اپنی پڑھائی جاری رکھنا ہوتی تھی اور ان کی بیویاں مالی حوالے سے ان کو سہارا دیتی تھیں۔ جدیدیت کی نئی خطرناک دنیا میں' جس نے یورپ کی تقریباً تمام یہودیت کو مٹا دیا تھا' یشیوا میں رہنے' باہر کی دنیا سے بہت کم ربط رکھنے والے اور خود کو مکمل طور پر مقدس متنوں کے مطالعے میں غرق کر دینے والے علماء کا کیڈر یہودیت کا نیا سرپرست بن گیا۔

کوٹلر کو یقین تھا کہ اس کے شاگردوں نے ساری دنیا کو باقی رکھا ہوا ہے۔ خداوند نے آسمانوں اور زمین کو صرف اس لیے تخلیق کیا تھا تاکہ مرد توریت کا مطالعہ کرسکیں۔ یہودیوں کو دن رات ''مقدس قانون'' کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے' اگر وہ رک گئے تو ''کائنات فوری طور پر تباہ ہوجائے گی۔'' یہ وہ مذہب تھا جو فنائے کامل سے ابھرا تھا۔ کوئی سیکولر مطالعہ نہ صرف وقت کا ضیاع ہوتا بلکہ ہلاکت انگیز غیر یہودی کلچر سے مماثلت کے مترادف ہوتا۔ جدید کلچر کی خصوصیات کو اپنانے والی یہودیت کی کوئی بھی شکل — صیہونیت' اصلاح' قدامت پسندی اور نیو آرتھوڈوکسی — سب بے جواز ہیں۔ ایک ایسی دنیا میں جس نے حال ہی میں خود کو یہودیت کی تباہی کے لیے وقف کردیا تھا' مصالحت نہیں کی جاسکتی۔ سچے یہودی کو دنیا سے الگ تھلگ ہوجانا چاہیے اور اپنے آپ کو کتابوں کے لیے وقف کردینا چاہیے۔ جنگ کے بعد قائم ہونے والے نئے یشیووت بنیاد پرستانہ یہودیت کی مایوسی کی عکاسی کرتے تھے۔ سب مقدس متن وہ تھے جو بیسویں صدی کے دوران جدیدیت سے یہودیوں کے شدید تصادم کے بعد بچ رہے تھے۔ ساٹھ لاکھ یہودی قتل کردیئے گئے تھے' یشیووت اور ہیسیڈی کورٹس سب کے سب تباہ کردیئے گئے' مع یہودی علم کے ان گنت کلاسیک' گیٹو کا طرز حیات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ گیا اور اس کے ساتھ صدیوں کے روایتی عمل کا خاص علم بھی' ارض مقدس کو صیہونیت نے ناپاک کردیا۔ اس خلا کو بھرنے کے لیے ایک سرگرم یہودی یہی کرسکتا تھا کہ متنوں (Texts) سے چمٹ جائے' جو کہ الوہیت سے اس کا آخری ربط برقرار رکھتے۔

ہولوکاسٹ کی تباہ کاری نے توریت کے مطالعے کی نوعیت کو تبدیل کردیا۔ گیٹو کے جہان میں بہت سی روایتی رسوم اور اعمال کو ''فرض'' کے طور پر قبول کرنا پڑتا تھا' وہاں توریت پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل کرنے یا زندگی بسر کرنے کا کوئی متبادل طریق نہیں ہوتا تھا۔ پناہ گزینوں کی پہلی نسل تو رسوم کو ادا کرنے کا درست علم رکھتی تھی' تاہم ان کے بچے اور پوتے پوتیاں' جو اپنے آباؤ اجداد کی کھوئی ہوئی دنیا کو دوبارہ تخلیق کرنے کے لیے بہت بیتاب تھے' اس روایتی عمل سے آگاہ نہیں تھے' جس کو باقاعدہ طور پر کبھی لکھا نہیں گیا تھا۔ توریت کی اس معدوم ہوتی ہوئی دنیا کو بحال کرنے کا واحد طریقہ متنوں میں معلومات کے ڈھیر کو کھنگالنا تھا۔ 1950ء کی دہائی سے یشیوا میں مونوگرافوں (Monographs) کا سیلاب آ گیا جو اعمال کی پیچیدہ جزئیات کو بیان کرتے تھے' جنہیں ہولوکاسٹ سے پہلے کے یورپ میں فطری تصور کیا جاتا تھا۔ ہر نسل اپنے پیشروؤں سے زیادہ ایسے سکالروں پر انحصار کرنے لگی۔ تباہی کے نتیجے میں یہودی زندگی زیادہ متن محدود (Text-Bound) اور ہمیشہ سے زیادہ لکھے ہوئے لفظ پر منحصر ہوگئی۔

بنیاد پرستانہ یہودیت میں نئی سخت گیری پیدا ہوگئی۔ اس زمانے میں بنی براک کا دورہ کرنے والے ربی سملا ایلبرگ نے لکھا کہ 1960ء کی دہائی تک ''پوری مذہبی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب'' برپا ہو رہا تھا۔ یہودی ''توریت کے شہر'' میں ہمیشہ سے زیادہ جوش کے ساتھ احکامات (Commandments) پر عمل کر رہے تھے۔ گزشتہ ادوار کی طرح قانون کی مکمل طور پر اطاعت شاندار عمل تھی: یہ خداوند سے سفاکانہ طور پر خالی دنیا میں الوہیت کی تجسیم کا ایک انداز تھا۔ بنی براک کے ہیریڈم غذا اور صفائی جیسے مسائل کے حوالے سے بالکل درست عمل کرنے کے طریقے تلاش کر رہے تھے' حالانکہ اس سے ان کی زندگیاں زیادہ دشوار ہوگئیں۔

ہیزن اِش جب 1930ء کی دہائی میں فلسطین پہنچا تو اس نے اپنی ساکھ قائم کر لی۔ صیہونیوں کا ایک گروپ اس کے پاس ایک مسئلہ لے کر آیا۔ وہ اپنی آبادی میں یہودی زرعی قانون پر عمل اور ارضِ مقدس میں توریت کے مطابق کھیتی باڑی کرنا چاہتے تھے۔ کیا وہ قانون کے مطابق اپنے کھیتوں کو سات سال تک غیر مزروعہ رہنے دیں؟ اس ''سبتی سال'' پر عمل کرنے سے واضح طور پر انہیں زبردست مشکلات سہنا پڑتیں نیز یہ عمل زیادہ سے زیادہ کارکردگی کے لیے بنائی گئیں جدید زرعی تیکنیکوں کے بھی سراسر خلاف تھا۔ ربی کک نے آباد کاروں کے لیے ایک قانونی راستہ ڈھونڈ نکالا تھا لیکن ہیزن اِش اس قسم کی نرمی (Kula) کا سخت مخالف تھا۔ قانون کا تقاضا تھا کہ کاشت کار ایک اعلیٰ تر خیر کے لیے اپنی خوشحالی کو قربان کر دیں۔ سبتی سال وطن کے تقدس کے اظہار کے لیے متعین کیے گئے تھے' یہودیوں کو اس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حرمت برقرار رکھنے سے آگاہ کرنے کے لیے اور یہ آگاہ کرنے کے لیے کہ ہر مقدس شے کی طرح یہ افراد کی ضرورتوں اور خواہشات سے جوہری طور پر الگ ہے۔ وطن اس لیے نہیں ہے کہ یہودی اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں' زیادہ پیداوار کے لیے اسے نچوڑ ہی ڈالیں یا کفایتی منصوبوں کی بھینٹ چڑھا دیں۔ سچے مذہبی کاشتکار کو چاہیے کہ وہ ان سیکولر رائدین کی عقلی مادیت پرستی کو چیلنج کرے' جو ''صیہونی'' تو ہو سکتے ہیں ''یہودی'' نہیں۔

بنی براک میں ہیزن اِش بقول ربی ایلبرگ ''سخت گیری (Humrot) کی دنیا'' کا سربراہ تھا اور اپنے شاگردوں کو ''احکامات'' پر عمل کرنے کا ''سب سے زیادہ محدود' سخت اور پابند قواعد'' طریقہ ڈھونڈنے کا درس دیتا تھا۔ یہ نظم وضبط انہیں جدیدیت کے عملیت پسندانہ نظام سے بالکل الگ تھلگ کر دیتا۔ یورپ کی روایتی یہودی کمیونٹیوں میں ربیائی (Rabbinic) ایسٹیبلشمنٹ اس قسم کی سختی کو گوارا نہیں کرتی تھی۔ ربی ایسے محتاط لوگوں کا احترام کرتے تھے' جو قانون کے باریک نکات کے بارے میں غور وفکر کرتے تھے تاہم وہ اس سختی (Humra) کو پوری کمیونٹی پر عائد کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ یہ تقسیم پیدا کر دیتی۔ ایسی کمیونٹیوں سے آنے والے یہودی' جو جانوروں کو ذبح کرنے کے حوالے سے زیادہ سخت معیارات کی حامل ہوتی تھیں' ایسے یہودیوں کے ساتھ گوشت نہیں کھا سکتے تھے جو قوانین کی زیادہ نرم تعبیر کرتے تھے۔ بہت زیادہ سختی ماضی کے عظیم داناؤں کی توہین بھی ہو سکتی تھی' جو ایسے معاملات میں اس قدر سخت گیر نہیں ہوتے تھے۔ ربی توریت کی تعبیر کرتے ہوئے نرمی کی طرف مائل تھے: ایک روحانی اشرافیہ عام یہودیوں کے لیے مذہبی عمل کو ناممکن بنانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

بنی براک کی انقلابی سختی اس نئی ردِثقافت کا حصہ تھی' جیسے ہیریڈم تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے ایک ایسا مذہبی معیار متعین کیا جو کہ فعالیت اور عملیت پسندی کو بنیادی اصول قرار دینے والی جدیدیت کی عقلیت پسندانہ روح سے یکسر متضاد تھا۔ ایک ایسے وقت کہ جب اصلاح پسند' قدامت پسند اور نیو آرتھوڈوکس یہودی قانون کے بعض حصوں کو رد کر رہے تھے یا ایک زیادہ سہل اور عقلی مذہبی زندگی کو پانے کی کوشش کر رہے تھے' زیادہ سخت ہیریڈم نے مرکزی دھارے والے معاشرے کے اصولوں کے ساتھ مصالحت سے انکار کر دیا۔ ربی ایلبرگ نے اپنے بنی براک کے دورے میں محسوس کیا کہ وہ ''اپنے اندر ایک دنیا'' بن چکا ہے۔ ہیریڈی یہودی نہ صرف جدید معاشرے سے لاتعلقی اختیار کر رہے تھے بلکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے کم پابند یہودیوں سے بھی۔ انہیں کوشر (Kosher) * غذا کے لیے زیادہ محتاط قصابوں اور دکانوں نیز اپنے رسوماتی حمام مطلوب تھے۔ وہ وقت کے تقاضوں کے برخلاف ایک مختلف تشخص وضع کر رہے تھے۔

اسی طرح یشیوا کے طلباء سیکولر کالجوں کے طلباء جیسی تعلیم حاصل نہیں کر رہے تھے کہ جو بعدازاں عملاً کام آ سکے۔ توریت کے بہت سے قوانین کا اب اطلاق نہیں کیا جا سکتا تھا' مثلاً معبد میں عبادت کی رسوم اور جانوروں کی قربانی سے متعلق قوانین' حق تلفی اور ہرجانے کے قوانین تبھی بحال ہو سکتے تھے کہ جب مسیح بادشاہت قائم کر دے۔ تاہم طلباء اپنے اساتذہ کے ساتھ ان بظاہر متروک قوانین پر مباحثے میں گھنٹے' دن اور حد تو یہ ہے کہ سال گزار دیتے' کیونکہ وہ خداوند کے قوانین تھے۔ عبرانی الفاظ کو دہرانا خداوند سے رابطے کی ایک صورت تھی۔ ایک ایسے دور میں کہ جس نے الوہی قانون کو نظرانداز کر دیا تھا' یہودی اس پر ہمیشہ سے زیادہ درستی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ طلباء ماضی کے عظیم ربیوں کی قانونی آراء سے خود کو شناسا کرواتے ہوئے روایت کو اپنے قلب و ذہن میں بٹھا لیتے اور داناؤں سے مربوط ہو جاتے۔ یشیوت میں تعلیم کے طریقے بھی اتنے اہم تھے جتنا کہ خود مضمون اہم تھا اور یشیوا تعلیم کا مقصد اس دنیا میں زیادہ سہولت کا حصول نہیں بلکہ خداوند کو خارج کر دینے والے معاشرے میں الوہیت کی جستجو تھا۔ یشیوا کی دنیا کی ہر شے باہر والی سیکولر دنیا سے مختلف تھی۔ مرکزی دھارے والے معاشرے میں مرد (1950ء کی دہائی میں مردوں کو ہنوز برتر صنف تصور کیا جاتا تھا) باہر کاروبار کرتے جبکہ عورتیں گھروں کی خلوت میں رہتی تھیں۔ لیکن ہیریڈم کے ہاں کمتر صنف گویم (Goyim) کے بقول ''حقیقی'' دنیا میں جاتی تھی جبکہ مرد یشیوا میں سچی ''حقیقت'' کے ساتھ ایک محصور' محفوظ زندگی بسر کرتے تھے۔ سیکولر اسرائیل میں فوج ایک تقریباً مقدس ادارہ بن گئی تھی' دونوں اصناف کے لیے قومی خدمت لازمی تھی اور مرد ساری زندگی اپنی فوجی یونٹ میں ریزرو میں رہتا تھا۔ تاہم یشیوا کا طالب علم فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہوتا تھا' اسرائیل کی دفاعی افواج (IDF) سے منہ موڑے' اعلان کرتا کہ وہ یہودیوں کا حقیقی ''سرپرست'' تھا اور ہر طرف یشیوا کو دبانے والی شر کی قوتوں کے خلاف مقدس جنگ میں پہلی صف میں تھا۔

ہیریڈم کے خیال میں جدیدیت — حد تو یہ ہے کہ ریاست اسرائیل میں بھی —

* مذبوحہ گوشت یا اس سے بنی ہوئی اشیاء۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جلاوطنی' بیگانگی اور خداوند سے دوری کی حالت (Galut) کی تازہ ترین شکل تھی۔ ہولوکاسٹ نے اس کی وجودی ضرر رسانی کو عیاں کر دیا تھا۔ تصور یہ تھا کہ یہودی اس قسم کی دنیا میں مانوسیت محسوس نہیں کرتا' حالانکہ اس کے برعکس اسرائیل اور امریکہ میں توریت کی تعلیم کے لئے بہت زیادہ رقوم ملی تھیں اور یہ ہمیشہ سے زیادہ ترقی پر تھی۔ تاہم طلباء کو سیکولر دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا درس دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ایک ہیریڈی ماہر تعلیم نے صراحت کی کہ یشیوا نہ صرف ایک نوجوان کو ''توریت سے کامل وابستگی'' کا درس دیتا ہے بلکہ یہ بھی کہ اسے کس طرح ''اس دنیا کے تجربوں سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہے''۔ یشیوا کی دیواریں ایک مستقل یاددہندہ تھیں کہ توریت گیلٹ (Galut) میں کبھی رس بس نہیں سکتی۔ طلبا کی مرکزی دھارے سے علیحدگی میں اضافے کے لیے روثقافت وضع کی گئی۔ جیسا کہ اوراہام ولف نے اپنی کتاب Education In The Face of The Generation (1954ء) میں تبصرہ کیا ہے کہ یشیوا کے یہودی اپنے باپ دادا کی دنیا کے احیاء کے کام کے لئے وقف ہوتے تھے' سیکولر دنیا کی بے اعتنائی کے باوجود ''ہم اس میں تنہا کھڑے ہیں۔ ہم اپنے اطراف کی ہر شے سے مختلف ہیں۔ اصلاح پسندوں .....شاعروں کو دوسرے لوگ عظیم انسان تصور کرتے ہیں۔'' حد تو یہ تھی کہ یہودی ریاست میں بھی ہیریڈم الگ تھلگ تھے۔ ''گلیوں کو تاریخی شخصیات کے نام دیئے گئے ہیں جنہیں ہم بالکل منفی انداز سے دیکھتے ہیں۔ ہم تنہا کھڑے ہیں''۔

عقلی جدیدیت کے خلاف ہیریڈی بغاوت زیادہ تر لاتعلقی پر مبنی ہے۔ لیکن اس عرصے میں روس کے ہیبیڈ جو یشیوا میں طویل عرصے تک ایک عسکریت پسندی کو پروان چڑھاتے رہے تھے' جارحیت پر اتر آئے۔ بالشویکوں نے حقیقتاً ہیبیڈ کو روس سے مٹا دیا تھا۔ یہودی سکول اور یشیووت بند کروائے گئے۔ توریت کی تعلیم کو رد انقلابی قرار دے دیا گیا اور اس پابندی کو توڑنے کا مطلب فاقہ کشی' قید یا موت تھا۔ چھٹا ربی (Rebbe) (جوزف آئزک شنیئرسن' 1950ء-1880ء) ان اقدامات کو صرف ''مسیح کی آمد سے قبل کی تکالیف'' تصور کر سکتا تھا۔ مذہبی لوگوں کو دنیا سے لاتعلق ہو جانا ہی کافی نہیں تھا بلکہ ہیبیڈم کو خداوند کے لئے جدید دنیا کو فتح کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ روس میں ربی نے یہودیوں کی ایک زیرزمین تنظیم بنائی' جہاں یشیوا کے گریجویٹ توریت اور تالمود کی تعلیم دیتے اور نوجوان یہودیوں کو ''احکامات'' پر عمل کا درس دیتے تھے۔ اسے ملک بدر کر دیا گیا تاہم اس نے پولینڈ میں اپنا کام جاری رکھا۔ جب ہٹلر کے ڈر سے ربی بھاگنے پر مجبور ہوا اور امریکہ پہنچا تو اس نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنا مشن جاری رکھا اور ان یہودیوں کی واپسی کے لئے پروپیگنڈا شروع کیا جو نئی دنیا میں گھل مل گئے تھے۔ 1949ء میں ربی نے کفر ہیبیڈ (Kafrhabad) کو قائم کرتے ہوئے غیر معمولی قدم اٹھایا' اسرائیل میں وہ پہلی ہیسیڈک تعمیر تھی۔

1950ء میں ربی مر گیا اور اس کا داماد ربی مینا کن مینڈل شنیئرسن (1904-94ء) اس کا جانشین بنا۔ یہ ایک حیران کن پیشرفت تھی' جس سے سیکولر دنیا کو تبدیل کرنے کی خواہش میں اسے قبول کرنے پر آمادگی جھلکتی تھی۔ ساتویں ربی نے کسی یشیوا میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے جدید تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ اس نے برلن میں یہودی فلسفے اور سوربون سے میرین انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جب وہ 1941ء میں امریکہ وارد ہوا تو اس نے بحریہ میں ملازمت کی' لیکن وہ اپنے سسر کے مشن میں اس کی معاونت بھی کرتا تھا۔ یوں ایک ربی ایسا ہو گیا تھا جو جدید دنیا کی پیداوار تھا اور ایک بھرپور میڈیا مہم کے ذریعے اپنے ہیسیڈم کو متحرک کر سکتا تھا تاکہ ساری دنیا کے یہودیوں کو نجات دلائی جائے۔ اب نہ صرف یشیوا کے طالب علم ربی کی فوج کے سپاہی تھے بلکہ ہر ہیسیڈ یہودی اس کا سپاہی تھا۔ ربی نے اپنی مہم کے لئے بڑی احتیاط کے ساتھ تیاری کی اور 1970ء کی دہائی میں سیکولرائزیشن اور مطابقت کے خلاف ہمہ گیر جوابی حملہ شروع کیا۔ ہزاروں نوجوان مرد و زن لیوبیوچ کو دور دراز شہروں کو روانہ کیا گیا کہ وہ ایسے یہودیوں کے گھر تلاش کریں جو یا تو سیکولر ہو چکے ہوں یا اقلیت میں ہوں۔ ایسے گھروں میں یہودیت کے بارے میں معلومات بھیجی جاتیں' سبت اور دوسرے تہوار منائے جاتے' خطاب ہوتے اور کلاسیں منعقد ہوتیں۔ دیگر نوجوان ہیسیڈم کو امریکہ کی یونیورسٹیوں اور گلیوں میں بھیجا گیا' جہاں وہ گزرنے والے یہودیوں کو یہودیت کے بارے میں معلومات دیتے اور انہیں ہدایت کرتے کہ ''احکامات'' میں سے کسی ایک پر عمل کریں مثلاً ٹیفلن (Teffilin) پہنیں۔ خیال یہ تھا کہ اس عمل سے ہر یہودی کی روح میں الوہی ''روشنی'' پیدا ہو گی اور اس آدمی یا عورت کا جوہری تقدس بیدار ہو جائے گا۔

ربی دنیا سے بیگانگی محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ہیبیڈ ہیسیڈم کی پرانی اسطورہ کے ساتھ ساتھ سائنسی علم کا بھی حامل تھا۔ بحری حیاتیات کی تعلیم نے الوہی روشنی کا اس کا وژن ختم نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک بھرپور مسیح ازم (Messianism) وضع کیا اور چھٹے مرحوم ربی سے صوفیانہ ربط کا دعویٰ کر کے ہیبیڈ کی قیادت کا انتخاب جیت لیا۔ اس کی روحانیت میں لوگوس اور مقدس بصیرت کے ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے سرچشمے تھے۔ وہ پروٹسٹنٹ بنیاد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پرستوں ہی کی طرح بائبل کی لفظی تعبیر کرتا تھا۔ تاہم وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ جدید سائنس روح اور جسم یا مادے اور توانائی میں جو ربط دریافت کر رہی ہے' وہ انسانوں کو حقیقت کی نامیاتی وحدت سے آشنا کرواتے ہوئے انہیں توحید کی طرف لے جائے گا۔ اس کی ہمہ گیر مہم جدید خطوط پر استوار تھی اور وہ خوب جانتا تھا کہ اپنے وسائل کو کس طرح استعمال کرنا ہے اور کس طرح سیکولر ہو جانے والے مردوزن سے بات کرنی ہے۔ تاہم ایسا لگتا ہے کہ ہیبیڈ کی اساطیر اور تصوف لیوبیوچ کو دنیا سے لاتعلق ہو جانے کی بجائے اس میں شمولیت کا اعتماد عطا کرتے تھے۔ سابقہ ربی روشن خیالی کی روح سے برگشتہ تھے لیکن ربی شنیور زیلمین نے' ہیبیڈ کا بانی اور پہلا ربی' اپنے ہیبیڈم کو اپنے زمانے کی دنیا کے حوالے سے مثبت سوچ پیدا کرنے میں مدد دی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ساتواں ربی اسی کے اصل جذبے کی طرف مراجعت کر رہا تھا اور زیلمین کی طرح اپنی عقلی قوتوں کو اساطیری تناظر میں استعمال کر رہا تھا۔ ہیبیڈ نے حلال و حرام کے جدید فرق کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر شے خواہ وہ کتنی ہی کمتر اور معمولی ہو الوہیت کی روشنی کی حامل ہوتی ہے۔ کوئی یہودی ''سیکولر'' نہیں ہوتا اور حد تو یہ ہے کہ گویم (Goyim) بھی تقدس کے امکان سے متصف ہوتے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں ربی نے ''آخری زمانے'' کے جلد ظہور پذیر ہونے کے یقین کے ساتھ غیر یہودی امریکہ کے لیے ایک مشن شروع کیا' جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ یہودیوں کے لئے اچھا ہے۔ لیوبیوچ جدید دور میں کڑی مشکلات سے گزر چکے تھے اور فنا کے خطرے سے دوچار ہو چکے تھے تاہم ربی نے انہیں تربیت دی تھی کہ گیلٹ (Galut) کو مکمل طور پر شیطانی تصور نہیں کریں' نفرت اور انتقام کے جذبات کو پروان نہ چڑھائیں بلکہ دنیا کو ایک ایسا مقام تصور کریں جہاں وہ الوہیت کو دوبارہ متعارف کروا سکتے ہیں۔

امریکی پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں کا جدیدیت پر جوابی حملہ:

امریکہ کے پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے انہیں کو شکست دینے والی جدیدیت کے خلاف بالآخر ایک جوابی حملہ شروع کرنا تھا تاہم جس دور کے حوالے سے ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں' اس دور میں انہوں نے بھی ہیریڈی یہودیوں کی طرح اپنی مدافعتی ردثقافت تخلیق کرنے پر اپنی توانائیاں مرکوز کر رکھی تھیں۔ سکوپس مقدمے کے بعد پروٹسٹنٹ بنیاد پرست کھلے میدان سے پسپا ہو گئے اور اپنے چرچوں اور کالجوں تک محدود ہو گئے۔ لبرل عیسائی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوچتے تھے کہ بنیاد پرستی کا بحران ختم ہو گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک ایسا لگتا تھا کہ بنیاد پرست گروپ غیر اہم اور الگ تھلگ ہو گئے تھے اور زیادہ تر عیسائی مرکزی دھارے والے فرقوں میں شامل ہو رہے تھے۔ تاہم معدوم ہونے کی بجائے بنیاد پرست تو مقامی سطح پر جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔ مرکزی دھارے کے فرقوں میں ہنوز قابل لحاظ تعداد میں قدامت پسند شامل تھے' وہ لبرل عیسائیوں کو بیدخل کرنے کی امید تو کھو چکے تھے تاہم ''بنیادوں'' پر ان کا ایقان ختم نہیں ہوا تھا۔ زیادہ ریڈیکل قدامت پسندوں نے اپنے الگ چرچ بنا لئے تھے' بالخصوص پری ملینیلسٹوں نے' جو اسے ایک مقدس فریضہ مانتے تھے کہ ''خوشی'' کا انتظار کرتے ہوئے انہیں بے خدا لبرل عیسائیوں سے خود کو الگ کر لینا چاہیے۔ ایوانجلسٹوں کی نئی نسل نے نئی تنظیمیں اور نیٹ ورک بنانے شروع کر دیئے۔ 1930ء تک امریکہ میں کم از کم پچاس بنیاد پرستانہ بائبل کالج تھے۔ معاشی مندے کے زمانے میں مزید چھبیس ایسے کالج قائم کئے گئے جبکہ الی نائے کا بنیاد پرستانہ ویٹن کالج امریکہ کا تیزی سے ترقی کرنے والا لبرل آرٹس کالج بن گیا تھا۔ بنیاد پرست اپنی اشاعتی اور نشریاتی سلطنتیں قائم کر رہے تھے۔ جب 1950ء کے عشرے میں ٹیلی ویژن آیا تو احیاء پسند سفری مبلغوں کی جگہ نوجوان بلی گراہم' ریکس ہمبرڈ اور اورل رابرٹس جیسے ''ٹیلی ایوانجلسٹ'' سامنے آئے۔ پورے ملک میں دکھائی نہ دینے والے ایک نشریاتی جال (Network) نے بنیاد پرستوں کو آپس میں ملا دیا۔ وہ خود کو اجنبی' معاشرے کے محیط پر دھکیل دیئے گئے محسوس کرتے تھے تاہم ان کے نئے کالجوں اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشنوں نے انہیں دشمن دنیا میں ایک گھر دے دیا تھا۔

اس روثقافت میں' جسے بنیاد پرست پروٹسٹنٹ تخلیق کر رہے تھے' ناپاکی کے بیچوں بیچ ان کے کالج محفوظ' مقدس قلعے تھے۔ وہ الگ ہو کر تقدیس کو تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فلوریڈا میں 1927ء میں قائم ہونے والی باب جونز یونیورسٹی پہلے ٹمپی سی منتقل ہوئی اور آخر کار گرین وائل' ساؤتھ کیرولینا میں مستقلاً قائم کر دی گئی۔ وہ نئے بنیاد پرستانہ ادارے کا ایک نمونہ تھی۔ اس کا بانی بیسویں صدی کے اوائل کا ایک ایوانجلسٹ کوئی دانشور نہیں تھا' تاہم وہ اپنے بقول ایک ''محفوظ'' سکول قائم کرنا چاہتا تھا' جہاں وہ اپنے عقیدے کو محفوظ رکھیں گے اور اس کے ایقان کے مطابق سیکولر یونیورسٹیوں میں غالب دہریت سے لڑیں گے۔ طالب علموں کو ''کامن سینس عیسائیت (Common Sense Christianity) کے ساتھ ساتھ لبرل فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہر طالب علم کو ہر سیمسٹر میں ایک بائبل کورس اختیار کرنے' چیپل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانے اور ''عیسائی'' طرز حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی جبکہ لباس' معاشرتی میل جول (Social Interaction) اور لڑکیوں سے میل ملاقات کے حوالے سے سخت قوانین رائج تھے' باب جونز نے زور دے کر کہا تھا کہ بددیانتی اور بے وفائی ''ناقابل معافی گناہ'' ہیں اور انہیں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اساتذہ اور طلباء کو یکساں طور پر ان قوانین کی اطاعت کرنا ہوتی تھی۔ باب جونز یونیورسٹی اپنے اندر ایک دنیا تھی: اس نے تعلیمی منظوری (Academic Accredition) نہ لینے کا مشکل فیصلہ کیا کیونکہ سیکولر انتظامیہ سے ایسی کوئی مصالحت گناہ ہوتی۔ اس قربانی کے نتیجے میں یونیورسٹی داخلوں' نصاب اور لائبریری ماخذات پر سخت ترین گرفت رکھنے کے قابل ہوگئی تھی۔

یہ نظم وضبط نہایت ضروری تھا کیونکہ بی جے یو (BJU) کے طالب علم جانتے تھے کہ وہ حالتِ جنگ میں ہیں۔ جیسا کہ ایک حالیہ انڈر گریجویٹ کیٹالاگ واضح کرتی ہے کہ سکول ''صحیفوں'' پر تمام دہریہ' لاادریہ (Agnostic) اور تمام انسانی حملوں کے خلاف ہے' نیز تمام ''نام نہاد جدید''، ''لبرل'' اور ''نیوآرتھوڈوکس مواقف'' اور ''نیوایوان جلسٹوں'' کی غیر مذہبی مصالحت اور ''کرشماتیوں'' (Charismatics) کی غیر مذہبی سرگرمیوں'' کے بھی خلاف ہے۔ طالب علم اور اساتذہ اپنے عقیدے کو ان دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے دنیا سے کنارہ کش ہوگئے۔ باب جونز کے بیٹے (باب جونز دوم) کے بقول یہ ''کنارہ کشی بنیاد پرستانہ شہادت اور تصدیق کی عین اساس ہے۔'' اس اعتقادی قلعے سے طالب علم ''عقیدے کے دشمنوں'' پر حملہ آور ہوکر ''انجیلی اتھارٹی اور پاکیزگی'' کا عسکری دفاع کریں گے۔ بی جے یو امریکی تعلیمی نظام پر کم اثرات رکھتی تھی تاہم عیسائی قوم پر اس کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ باب جونز یونیورسٹی ملک میں بنیاد پرست استاد فراہم کرنے والا سب سے بڑا ادارہ بن گئی' اس کے گریجویٹ اپنے نظم وضبط کے حوالے سے مشہور تھے' وسیع علم کی وجہ سے نہیں۔

ان برسوں کے دوران قائم ہونے والے بائبل کالج اور بنیاد پرستانہ یونیورسٹیاں' ہیریڈی یشیووت کی طرح علیحدگی پسندانہ قلعے تھے۔ بنیاد پرست محسوس کرتے تھے کہ ان کا عقیدہ خطرے میں ہے' وہ امریکی زندگی کے مرکز سے ہٹ چکے تھے اور انہیں پڑھایا جاتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ''دروازے سے باہر'' تصور کریں۔ عسکریت پسندی گہرے غصے کو ظاہر کرتی تھی۔ یہ غصہ اسی زمانے کے زیادہ انتہاپسند عیسائیوں کی طرف سے آبادی کے انتہائی الگ تھلگ کر دیئے گئے طبقوں کے خوف' نفرت اور تعصبات کو بیان کرنے سے عیاں ہوا۔ 1920ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی دہائی میں نظریۂ ارتقاء کی تعلیم کے خلاف لڑنے کے لیے ''عیسائی عقیدے کے محافظین'' (Defenders Of The Christian Faith) نامی تنظیم بنانے والے بپٹسٹ گیرالڈ ونروڈ نے 1930ء کی دہائی میں نازی جرمنی کا دورہ کیا اور امریکی لوگوں کے سامنے ''یہودی خطرے'' کو عیاں کرنے کا تہیہ کر کے واپس آیا۔ اسی زمانے میں اس نے روز ویلٹ کی ''جیوش نیو ڈیل'' (Jewish New Deal) کو شیطانی قرار دے کر مسترد کر دیا۔ ونروڈ نے کارل میکنٹری اور بلی جیمز ہرگس کے ہمراہ امریکہ کے ہر ''لبرل'' رجحان کی مذمت کی۔ بنیاد پرست ہر رنگ کے' سیکولر یا عیسائی' لبرل لوگوں پر الزام دھرتے تھے کہ وہی سچے عیسائیوں کے پست درجے کے ذمہ دار ہیں۔ وہ سیاسی اعتبار سے دائیں بازو کی طرف جانا شروع ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی میں ایوانجلسٹوں نے حب الوطنی کا مظاہرہ شرک کی حد تک کیا تھا۔ اب امریکی طرز حیات کا دفاع ایک مقدس فرض بن گیا تھا۔ ''کرسچین کروسیڈ'' (Christian Crusade) کے بانی ہرگس نے' جو ایک کمیونسٹ دشمن پادری تھا' سوویت یونین کو شیطان تصور کیا اور اپنے تصور کے مطابق کمیونسٹ یلغار کے خلاف صف آرا ہو گیا' اس کے خیال میں لبرل اخبارات' بائیں بازو کے اساتذہ اور سپریم کورٹ سب کے سب امریکہ کو ''سرخ'' بنانے کی سازش کا حصہ تھے۔ کارل میکنٹری کو' جس نے پریسبائٹیرین چرچ سے الگ ہو کر اپنا ''بائبل پریسبائٹیرین چرچ'' اور ''فیتھ تھیولوجیکل سیمینیری'' (Faith Theological Seminary) قائم کیے تھے' ہر طرف دشمن چھپے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ مرکزی دھارے والے فرقے بھی امریکہ میں عیسائیت کو تباہ کر دینے والی سازش کا حصہ تھے۔ 1950ء کی دہائی میں میکنٹری جوزف میکارتھی کے کمیونسٹ دشمن کروسیڈ میں شامل ہو گیا۔ یہ انتہا پسند بہت بااثر تھے۔ 1934ء تک کوئی چھ لاکھ افراد ونروڈ کے ''ڈیفنس میگزین'' کے خریدار بن گئے تھے' جبکہ میکنٹری کے ''کرسچین بیکن'' کے خریداروں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہو گئی تھی۔ میکنٹری نے اپنے نفرت کے مذہب کو نہ خریدنے والے تمام عیسائیوں اور بظاہر دلکش اور عیسائیت سے یگانگت رکھنے والے لیکن حقیقتاً ''دہریے' کمیونسٹ' بائبل کا مضحکہ اڑانے والے' خون خوار درندے' بدکلام' سبز آنکھوں والے عفریتوں کے جنسی جنونی بیٹے'' مذہبی پیشواؤں کے خلاف نشر ہونے والے ریڈیو پروگرام Twentieth Century Christian Hours میں ہزاروں مزید لوگوں تک اپنا پیغام پہنچایا۔

بنیاد پرستی غصے کا مذہب بنتی جا رہی تھی تاہم ہیریڈی یہودیت کی طرح اس غصے کی جڑیں گہرے خوف میں تھیں۔ یہ خوف پری ملینیئل ازم میں عیاں ہوا' جو اس عرصے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوران اس تحریک کا امتیازی نشان بن گیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ تک صرف پری ملینیلیسٹ خود کو ''بنیاد پرست'' کہلواتے تھے' بلی گراہم جیسے دوسرے قدامت پسند عیسائی خود کو ''ایوانجلیکل'' کہلوانے کو ترجیح دیتے تھے یعنی اس متعفن تہذیب میں روحوں کو بچانے کا فریضہ دوسرے عیسائیوں سے' ان کے اعتقادات سے قطع نظر' کسی حد تک تعاون کا متقاضی تھا۔ تاہم بنیاد پرست علیحدگی پر زور دیتے تھے۔ جنگ کے برسوں نے ایسا لگتا تھا کہ لبرل لوگوں کی پری ملینیل امید پرستی کو بے بنیاد ثابت کر دیا تھا' بنیاد پرست نئی اقوام متحدہ کو اسی روشنی میں دیکھ رہے تھے جس میں وہ پرانی لیگ آف نیشنز کو دیکھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اقوام متحدہ دنیا کو اینٹی کرائسٹ کی آمریت کے لیے تیار کرے گی اور فتنہ وفساد کا باعث بنے گی۔ اسکے ہوتے ہوئے امن نہیں ہوسکتا۔ ہربرٹ لاک ایئر نے 1942ء میں لکھا: ''بائبل اس قسم کے یوٹوپیائی خواب کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ آخری جنگ نہیں ہے۔ موجودہ دہشتیں تو مزید خوفناک اذیت کو جنم دیں گی۔ یہ نقطۂ نظر لبرل ایسٹیبلشمنٹ کے نقطۂ نظر سے بالکل متضاد تھا۔ امریکہ میں ''دو قومیں'' تھیں' جو کہ جدید دنیا کے حوالے سے یکساں وژن کی حامل ہونے سے قاصر تھیں۔ پری ملینیل وژن بنیاد پرستوں کے شدید بے بسی کے احساس کی توثیق کرتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایٹم بم کے بارے میں سینٹ پیٹر پیش گوئی کر چکا تھا' جس نے کہا تھا کہ آخری دن ''آسمان ایک دھماکے سے غائب ہوجائے گا' عناصر میں آگ بھڑک اٹھے گی' زمین اور زمین پر جو کچھ ہے' وہ مل جل کر راکھ ہوجائیں گے۔'' ڈیوڈ گرے بار نہاؤس نے 1945ء میں رسالے اٹرنٹی (Eternity) میں لکھا کہ آخری ہولوکاسٹ سے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے: ''الوہی منصوبہ اپنی ناگزیر تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے۔'' بنیاد پرست ادیب ولبر سمتھ نے اپنی بیسٹ سیلر کتاب (1948ء) The Atomic Age And The World Of God میں لکھا: بم نے ثابت کر دیا ہے کہ لفظ پرست درست کہتے تھے۔ بائبل میں ایٹمی دھماکے کی ٹھیک ٹھیک پیشگوئی ظاہر کرتی تھی کہ بائبل منزہ عن الخطا ہے اور اسے سادہ مفہوم میں پڑھا جانا چاہیے۔

تاہم مرکزی دھارے والے کلچر سے اپنے آپ کو محرومیت زدہ اور الگ تھلگ محسوس کرنے والے بنیاد پرستوں کو اس ہولناک منظر نامے نے اعتماد اور برتری کا احساس عطا کیا۔ وہ سیکولر یا لبرل عیسائیوں کو رد کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ حقیقتاً کیا ہو رہا ہے۔ ان کے خیال میں بیسویں صدی کے المناک واقعات حقیقت میں عیسیٰؑ کی آخری فتح کی طرف لے جا رہے تھے۔ مزید یہ کہ ایٹمی ہولوکاسٹ سچے عیسائیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکے گا' کیونکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں انہیں یقین تھا کہ انہیں "اختتام" سے پہلے آسمان پر اٹھا لیا جائے گا۔ آخری عذابوں کا شکار تو صرف کافر اور بے عقیدہ لوگ ہی ہوں گے۔ چنانچہ پری ملینیل ازم بنیاد پرستوں میں بائبل کے احکامات سے متضاد انتقام کی سوچیں پیدا کر کے ان کی آزردگی میں اضافہ کر رہا تھا۔ نئی ریاست اسرائیل کے حوالے سے ان کے بظاہر مثبت وژن میں بھی تضاد تھا۔

پری ملینیل ازم کے بانی جان ڈربی کے وژن میں یہودی لوگ مرکزی حیثیت کے حامل رہے تھے۔ بنیاد پرستوں میں 1917ء کے اعلانِ بالفور نے جوش پیدا کر دیا تھا اور 1948ء میں ریاستِ اسرائیل کی واقعتاً تخلیق کو بنیاد پرست مبلغ جیری فالویل نے "عیسیٰؑ کی متوقع واپسی کی نشاندہی کرنے والا واحد ..... عظیم ترین" واقعہ قرار دیا تھا۔ جب 14 مئی 1948ء کو بین گوریان نے ریاستِ اسرائیل کے وجود میں آنے کا اعلان کیا تو اس نے عیسیٰؑ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد اس دن کو تاریخ کا سب سے زیادہ اہم دن قرار دیا۔ اسرائیل کے لیے حمایت انتدابی ہوگئی' اسرائیل کی تاریخ انسانی اثر اور کنٹرول سے ماورا تھی' خدا نے اسے ازل ہی سے طے کر دیا تھا۔ جب تک یہودی ارضِ مقدس میں آباد نہیں ہوتے عیسیٰؑ واپس نہیں آ سکتے' آخری زمانہ شروع نہیں ہو سکتا۔

آخری نسل کشی:

پروٹسٹنٹ بنیاد پرست پرجوش صیہونی تھے' تاہم ان کے وژن کا ایک تاریک تر پہلو بھی تھا۔ جان ڈربی کہہ چکا تھا کہ اینٹی کرائسٹ آخری زمانے میں فلسطین میں رہنے والے دو تہائی یہودیوں کو قتل کر دے گا: ایسی تمام پیشگوئیوں کی طرح اس پیشگوئی کی بھی لفظی تعبیر کی جانی چاہیے تھی۔ بعض بنیاد پرستوں نے ہولوکاسٹ کو یہودیوں کو بدلنے کی خدا کی آخری کوشش اور آنے والے بدترین حالات کی پیشگی اطلاع تصور کیا۔ بنیاد پرست ادیب جان ویلوورڈ نے اپنی کتاب Israel And Prophecy میں پیشگوئیوں کی بنیاد پر یہودیوں کی آخری مصیبتوں کا تفصیلی اوقات نامہ (Time Table) پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ اینٹی کرائسٹ یہودیوں کو معبد دوبارہ تعمیر کرنے میں مدد دے گا اور ان میں سے بہت سوں کو قائل کر لے گا کہ وہ مسیح ہے' لیکن پھر وہ نئے معبد میں اپنی شبیہہ کی پرستش کروائے گا۔ ارتداد کے بعد ایک لاکھ چوالیس ہزار یہودی اینٹی کرائسٹ کو رد کر کے عیسائی ہو جائیں گے۔ تب اینٹی کرائسٹ ہولناک عذابوں کا سلسلہ شروع کرے گا اور بے حساب یہودی مر جائیں گے۔ بہت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھوڑے یہودی فرار ہو پائیں گے اور عیسیٰؑ کی ''دوبارہ آمد'' پر ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ جب پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے نئے اسرائیل کی تخلیق کی خوشی منائی تو اس کے ساتھ ہی وہ دنیا کے خاتمے پر ایک آخری نسل کشی (Genocide) کے تصورات کو پروان چڑھا رہے تھے۔ یہودی ریاست کے وجود میں آنے سے عیسائیوں کو تسکین ہوئی تھی۔ آخری زمانے میں یہودیوں کی قسمت خراب ہی تھی کیونکہ وہ عیسیٰ ؑ کو تسلیم کریں یا نہ کریں انہیں مصیبت تو بھوگنا ہی تھی۔ امریکی پروٹسٹنٹوں نے یہودیوں کی طرح مصائب نہیں جھیلے تھے' تاہم جدیدیت کے حوالے سے ان کا وژن تاریک تھا۔ وہ جدید دنیا کی عقلیت پسندانہ روح کے جواب میں بائبل کو پڑھنے کا اپنا لفظی اور ''سائنسی'' طریقہ وضع کر چکے تھے' تاہم اگر کسی مذہبی وژن کا حقیقی امتحان یہ تھا کہ وہ اپنے ماننے والوں میں ہمدردی کی اہم ترین خوبی پیدا کر دیتا ہے تو پروٹسٹنٹ بنیاد پرستی اس میں ناکام ہوتی دکھائی دے رہی تھی' جیسا کہ سکوپس مقدمے میں اس کی سائنس غلط ثابت ہوگئی تھی۔ بائبل کے بعض چنیدہ حصوں کے لفظی مطالعے نے انہیں جدیدیت کے نسل کشی کے بے خدار جحانات کو قبول کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔

حسن البنا کی عوامی تحریک:

مسلمانوں نے اس وقت تک کوئی بنیاد پرستانہ تحریک شروع نہیں کی تھی' کیونکہ ان کا ماڈرنائزیشن کا عمل ابھی تک زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہ جدیدیت کے نئے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی مذہبی روایتوں کو نئے سرے سے ڈھال رہے تھے اور لوگوں کو نئی دنیا کی روح کو سمجھنے میں مدد دینے کے لیے اسلام کو استعمال کر رہے تھے۔ مصر میں ایک نوجوان استاد جمال الدین افغانی' محمد عبدہ' اور رشید رضا کے افکار کو' جو کہ دانشوروں کے حلقوں تک محدود تھے' عام لوگوں تک لے آیا۔ یہ بذاتِ خود ایک جدید عمل تھا۔ بڑی عمر کے مصلحین ابھی تک قدامت پسندی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور ماقبل جدید فلسفیوں کی طرح وہ اشرافیہ پسند ہی رہتے تھے اور عوام کو دقیق خیالات سمجھنے کے لیے نااہل تصور کرتے تھے۔ حسن البنا (1906-49ء) نے ان کے اصلاحی تصورات کو ایک عوامی تحریک میں ڈھالنے کا طریقہ ڈھونڈا۔ انہوں نے روایتاً مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ جدید تعلیم بھی حاصل کی ہوئی تھی۔ وہ قاہرہ کے دارالعلوم میں پڑھاتے رہے تھے' جو سائنس کی اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے والا اساتذہ کی تربیت کا پہلا کالج تھا' لیکن حسن البنا ایک صوفی بھی تھے اور ساری زندگی تصوف کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ریاضتیں اور رسوم ان کے لیے اہم رہیں۔ حسن البنا مذہب کو محض نظریاتی معاملہ تصور نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ اسے صرف تبھی سمجھا جا سکتا ہے جب اس کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور اس کی رسوم پر احتیاط کے ساتھ عمل کیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ مصریوں کو مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے' انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ ان کے معاشرے کو سیاسی' سماجی اور معاشی اعتبار سے ضرور جدید ہونا چاہیے۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ ان عملی اور عقلی معاملات کو روحانی اور نفسیاتی اصلاح کے دوش بدوش چلنا ہوگا۔

حسن البنا اور ان کے دوست قاہرہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں شہر کی سیاسی اور سماجی ابتری پر اشک بہاتے تھے۔ وہاں ایک سیاسی جمود طاری تھا: سیاسی پارٹیاں لاحاصل اور پرشور مباحثوں میں محو تھیں اور برطانوی ہنوز ان کا استحصال کر رہے تھے' جو کہ مصر کی ''آزادی'' کے بعد بھی ملک پر کافی حد تک گرفت رکھتے تھے۔ جب حسن البنا نے برطانوی آبادی والے نہر سویز کے علاقے میں اسمٰعیلیہ میں اپنا پہلا تدریسی منصب سنبھالا تو اپنے ہم وطنوں کی تحقیر و ذلت نے ان کی روح تک اثر ڈالا۔ برطانویوں اور دوسرے غیر ملکیوں کو مقامی آبادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' تاہم معیشت اور عوامی فائدے کی چیزوں پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ انہیں برطانویوں کے پرتعیش مکانات اور مصری محنت کشوں کے خستہ جھونپڑے دیکھ کر شرم آئی۔ حسن البنا کے لیے' جو ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے' یہ محض ایک سیاسی معاملہ نہیں تھا۔ اسلام میں امت کی صورتحال اتنی ہی اہم مذہبی قدر تھی جتنی کہ عیسائیت میں کوئی خاص اعتقادی معاملہ۔

حسن البنا لوگوں کو مسجدوں سے دوری اختیار کرتے دیکھ کر بالخصوص متفکر تھے۔ مصریوں کی اکثریت جدیدیت پذیری کے عمل میں شامل نہیں تھی اور وہ لوگ قاہرہ سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل و جرائد کے ذریعے اسلام سے نہ تو اشتراک اور نہ ہی اختلاف رکھنے والے مغربی تصورات سے آگاہ ہو کر الجھن کا شکار تھے۔ علماء نے تو جدید منظر سے رخ پھیر لیا تھا اور لوگوں کو مؤثر رہنمائی فراہم کرنے سے قاصر تھے جبکہ سیاستدانوں نے عوام کے سماجی' معاشی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کی کوئی دیرپا کوشش نہیں کی تھی۔ حسن البنا نے فیصلہ کیا کہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ جب عوام کی اکثریت الجھی ہوئی اور بے حوصلہ ہو تو قوم پرستی اور مصر کے یورپ سے تعلقات کے بارے میں بحثیں کرنا بھلا نہیں تھا۔ ان کے خیال کے مطابق لوگوں کی روحانی بہتری کا واحد طریقہ تھا ہے کہ قرآن و سنت کے اولین اصولوں کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرف رجوع کیا جائے۔

اخوان المسلمون کا قیام:

حسن البنا نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مسجدوں اور قہوہ خانوں میں لوگوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے سامعین سے کہا کہ مغرب کے اثرات اور حالیہ سیاسی تبدیلیوں نے لوگوں کو غیر متوازن کر دیا ہے اور وہ مذہب سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ اسلام مغربی طرز کا کوئی نظریہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک کامل طرز حیات ہے' اگر اس کے مطابق صدق دلی سے زندگی بسر کی جائے تو انہیں غیر ملکیوں کی نوآبادی بننے سے پہلے والی طاقت حاصل ہو جائے گی۔ امت کو مضبوط بنانے کے لیے انہیں اپنی اسلامی روح کو لازماً دوبارہ پانا ہوگا۔ حالانکہ حسن البنا عمر کے اعتبار سے ابھی صرف بیس کے پیٹے کے شروع میں ہی تھے' تاہم انہوں نے اپنا اثر قائم کر لیا۔ وہ پختہ فکر اور کرشماتی انسان تھے اور لوگوں کو اپنی پیروی کرنے پر راضی کر سکتے تھے۔ مارچ 1928ء میں ایک شام اسمٰعیلیہ میں چھ محنت کش ان کے پاس آئے اور ان سے عملی اقدام کرنے کا کہا:

> ''ہم اسلام کی عظمت تک رسائی پانے اور مسلمانوں کی فلاح کے لیے خدمت انجام دینے کا عملی طریقہ نہیں جانتے۔ ہم اس ذلت اور پابندی والی زندگی سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں اور مسلمانوں کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں ہے۔ غیر ملکیوں کے نزدیک ان کی حیثیت محض بکاؤ مال کی سی ہے۔ ہم اپنا خون .....اور اپنی جان.....اور ان تھوڑے سے سکوں کے علاوہ کچھ نہیں رکھتے۔ ہم آپ کی طرح عمل کا طریقہ سوچنے یا اپنی مادر وطن' مذہب اور امت کی خدمت کا کوئی راستہ جاننے کی اہلیت نہیں رکھتے۔''

حسن البنا کو اس درخواست نے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے اپنے ملاقاتیوں کے ساتھ مل کر ''اسلام کے پیغام کو پھیلانے کے لیے متحد'' ہونے کا عہد کیا۔ اسی رات ''اخوان المسلمون'' وجود میں آئی۔ وہ اس چھوٹے سے آغاز سے وسعت پا گئی۔ 1949ء میں حسن البنا کی وفات کے وقت پورے مصر میں اس کی دو ہزار شاخیں موجود تھیں اور ہر شاخ تین سے چھ لاکھ بھائیوں اور بہنوں کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ مصر کی ایسی واحد تنظیم تھی جو معاشرے کے ہر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گروپ بشمول سول ملازمین' طلباء' شہری محنت کشوں اور کاشتکاروں کی نمائندگی کرتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ تک ''اخوان المسلمون'' مصری سیاسی میدان کے انتہائی طاقتور کھلاڑیوں میں سے ایک بن چکی تھی۔

حسن البنا کے چھ نکات:

اخوان المسلمون کے وجود میں آنے کی رات سے ہی عسکریت پسندانہ تصورات کے باوجود حسن البنا نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ ان کا انقلاب برپا کرنے یا اقتدار پر قبضہ جمانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ان کا مقصد تو تعلیم تھی۔ انہیں یقین تھا کہ جب لوگ اسلام کے پیغام کو اپنے اندر بسالیں گے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو مکمل طور پر تبدیل کرلیں گے' تب بغیر کسی تشدد آمیز انقلاب کے قوم مسلمان ہوجائے گی۔ عین آغاز ہی میں حسن البنا نے ایک چھ نکاتی پروگرام تشکیل دیا تھا' جس سے ان کے جمال الدین افغانی' محمد عبدہ' اور رشید رضا کی سلفیہ اصلاحی تحریکوں سے متاثر ہونے کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ چھ نکات ہیں: (1) عصری تقاضوں کے مطابق قرآن کی تعبیر (2) مسلمان قوموں کا اتحاد (3) معیار زیست بلند کرنا اور سماجی انصاف اور نظم کا حصول (4) جہالت اور غربت کے خلاف جدوجہد (5) مسلمان ملکوں کو غیر ملکی تسلط سے نکالنا (6) دنیا بھر میں مسلمانوں میں اخوت اور امن کا فروغ۔ حسن البنا اخوان المسلمون کو متشددانہ یا ریڈیکل نہیں بنانا چاہتے تھے تاہم وہ مسلمان معاشرے کی بنیادی اصلاح کے لیے فکرمند تھے' جسے نوآبادیاتی تجربے نے کھوکھلا اور اس کی جڑوں سے کاٹ دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مصری اپنے آپ کو یورپیوں سے کمتر سمجھنے کے عادی ہوگئے ہیں' لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بھی اعلیٰ ثقافتی روایات کے حامل ہیں جو کسی بھی درآمدی نظریے سے زیادہ بہتر ان کے کام آسکتی ہیں۔ انہیں فرانسیسی یا روسی انقلاب کی نقل نہیں کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 1300 برس پہلے ہی امت کو آزادی' مساوات' اخوت اور سماجی عدل کی اقدار عطا کردی تھیں۔ مشرقِ وسطیٰ کی فضا میں شریعت جتنی موزوں ہے' اتنا کوئی غیر ملکی قانون نہیں ہوسکتا۔ جب تک مسلمان دوسروں کی نقل کرتے رہیں گے وہ ''ثقافتی دوغلے'' ہی رہیں گے۔

تاہم بہنوں اور بھائیوں کو پہلے اسلام سے دوبارہ واقف ہونا چاہیے۔ آزادی اور وقار کی کوئی راہِ مختصر نہیں ہوتی' مسلمانوں کو اپنے معاشرے اور خود اپنے آپ کو ازسرنو ڈھالنا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگا۔ حسن البنا نے مستقل طور پر نظر ثانی کرتے رہنے کے بعد ایک مؤثر جدید نظام وضع کیا۔ 1938ء میں اراکین کو ''بٹالینوں'' (Battalions) میں تقسیم کر دیا گیا' ہر ایک تین گروپوں پر مشتمل تھی..... ایک محنت کشوں کا' دوسرا طالب علموں کا اور تیسرا کاروباری لوگوں اور سول ملازمین کا۔ یہ گروپ ہفتے میں ایک مرتبہ اکٹھے ہوتے اور ساری رات عبادت اور روحانی تعلیم میں گزارتے۔ 1943ء تک ''بٹالینوں'' کی جگہ ''خاندانوں'' کو دے دی گئی' ہر خاندان دس اراکین پر مشتمل ہوتا اور اپنے اعمال کی ذمہ دار اکائی ہوتا تھا۔ خاندان کے افراد ہفتے میں ایک مرتبہ اکٹھے ہوتے اور ایک دوسرے کا محاسبہ کرتے' اس کا مقصد یہ تسلی کرنا ہوتا تھا کہ ہر شخص اسلام کے بنیادی عقائد پر عمل کرے اور جوئے' شراب' سود خوری اور زنا سے محفوظ رہے۔ جس زمانے میں جدیدیت پذیری کے دباؤ کے تحت مصری معاشرہ پارہ پارہ ہو رہا تھا' اس خاندانی نظام نے مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیا۔ ہر خاندان کا تعلق ایک بڑی ''بٹالین'' سے ہوتا تھا' جو اسے ہیڈ کوارٹر سے مربوط رکھتی تھی۔

اسی زمانے میں ایک عیسائی اصلاحی تحریک اعتقادات پر زور دے رہی تھی' جس کی کسی حد تک وجہ جدید مغربی کلچر کی عقلیت پسندی تھی' جس نے مذہب کو اعتقادات کے ایک مجموعے سے وابستگی کے طور پر پیش کیا تھا۔ تاہم اخوان المسلمون کو شریعت کے مطابق چلایا جاتا تھا تاکہ مسلمان ایک خاص انداز سے زندگی گزارتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت محمدؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھال لیں۔ تاہم اس نکتے کو ترویج دینے کے لیے جدید اسلوب اپنایا گیا تھا۔ حسن البنا کو یقین تھا کہ جدید ادارے اور اصلاحات صرف اس روحانی تناظر ہی میں مسلمانوں کے لیے کسی معنویت کی حامل ہو سکتی ہیں۔ 1945ء میں ایک پرہجوم اجلاس میں حسن البنا نے فیصلہ کیا کہ یہ ایک سماجی اور فلاحی پروگرام شروع کرنے کا وقت ہے' جس کی انتہائی شدید ضرورت ہے لیکن کسی حکومت نے مؤثر انداز میں اس پر توجہ نہیں دی۔ جب بھی ''اخوان'' کی کوئی نئی شاخ کھولی جاتی' مسجد کے پہلو میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ایک سکول بھی قائم کیا جاتا۔ انہوں نے ایک جدید سکاؤٹ تحریک بھی شروع کی تھی' جس کے تحت نوجوان ''اخوانوں'' کو جسمانی تربیت دی جاتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ تک یہ سکاؤٹ گروپ ملک میں نوجوانوں کا سب سے زیادہ طاقتور گروپ بن گیا تھا۔ اب ان اداروں کو مزید فعال اور متحرک ہو جانا تھا۔ ''اخوان'' محنت کشوں کے لیے شبینہ سکول چلاتے' جبکہ سول سروس کے امتحانات کے لیے کالج قائم کیے گئے تھے۔ انہوں نے دیہاتی علاقوں میں کلینک اور ہسپتال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھولے اور یہ سکاؤٹ غریب دیہاتی علاقوں میں بہتر صفائی اور صحت کی تعلیم (ہیلتھ ایجوکیشن) کے فروغ کے لیے سرگرم تھے۔ ''اخوان المسلمون'' نے جدید ٹریڈ یونینیں بھی قائم کیں اور محنت کشوں کو ان کے حقوق سے آگاہ کیا۔ انہوں نے محنت کشوں کے ساتھ ہونے والی بعض بدترین زیادتیوں کو عیاں کر ڈالا نیز وہ اپنے کارخانے اور پرنٹنگ' بُنائی' تعمیرات اور انجینئرنگ کی ہلکی صنعتیں لگا کر روزگار فراہم کرنے کے لیے بھی سرگرم تھے۔

ریاست کے اندر ریاست:

''اخوان'' کے دشمنوں نے ہمیشہ الزام لگایا کہ حسن البنا ''ریاست کے اندر ریاست'' بنا رہے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے ایک ایسی کامیاب روِثقافت تشکیل دے لی تھی جس نے حکومت کی خامیوں کو اس انداز سے عیاں کیا جو کہ واضح طور پر خطرناک تھا۔ اس نے تعلیم اور محنت کشوں کی حالت سے حکومت کی عدم توجہی کو بے نقاب کیا۔ یہ حقیقت بھی پریشان کن تھی کہ اخوان المسلمون تنہا ہی فلاحین کی توجہ حاصل کرسکتی ہے۔ تاہم زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اخوان المسلمون کے تمام ادارے ایک ممتاز اسلامی تشخص کے حامل تھے۔ اس کے کارخانوں میں مساجد ہوتی تھیں اور محنت کشوں کو نماز ادا کرنے کے لیے چھٹی دی جاتی تھی' قرآن کی ہدایات کے مطابق حالات کار اور تنخواہیں اچھی تھیں' محنت کشوں کی صحت کی انشورنس ہوتی تھی اور کافی چھٹیاں ملتی تھیں' تنازعات کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ اخوان المسلمون کی غیر معمولی کامیابی اس حقیقت کا ڈرامائی اظہار تھا کہ دانشور خواہ کچھ ہی کہتے ہوں' بیشتر مصری مذہبی ہونے کے خواہش مند تھے۔ اس نے یہ بھی ظاہر کردیا کہ اسلام ترقی پسند ہوسکتا ہے۔ اخوان لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ وہ سعودی عرب کی وہابی بادشاہت پر تنقید کرتے اور غلط اقدامات پر اس کی مذمت کرتے تھے۔ اخوان مستقبل کی اسلامی ریاست کے سیاسی نظام کے حوالے سے لگے بندھے تصورات نہیں رکھتے تھے' تاہم وہ کہتے تھے کہ اسلامی ریاست قرآن وسنت کے تابع ہوگی اور وہاں دولت کی تقسیم سعودی سلطنت سے زیادہ منصفانہ ہوگی۔ ان کے عمومی تصورات وقت سے ہم آہنگ تھے: حکمرانوں کو منتخب ہونا چاہیے (ابتدائی اسلامی دور کی طرح) اور جیسا کہ خلفائے راشدین نے تاکید کی تھی حاکم کو عوام کے سامنے لازماً جوابدہ ہونا چاہیے اور آمرانہ انداز میں حکومت نہیں کرنی چاہیے۔ تاہم حسن البنا ہمیشہ محسوس کرتے تھے کہ ممکنہ اسلامی ریاست کے حوالے سے بحث مباحثہ قبل از وقت ہے' کیونکہ ابھی تو بہت سا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادی کام کرنے کو باقی ہے۔ حسن البنا نے تو بس یہی کہا کہ مصر کو اسلامی ریاست بننے دیا جائے' سوویتوں نے کمیونزم کو چن لیا ہے اور مغرب نے جمہوریت کو' اس لیے جن ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے' وہ جب چاہیں انہیں اسلام کی بنیاد پر اپنا سیاسی نظام تشکیل دینے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

اخوان المسلمون مکمل نہیں تھی۔ عوام کی طرف رجحان ہونے کی وجہ سے وہ دانشور مخالف لگتی تھی۔ اس کے اعلانات اکثر و بیشتر مدافعتی اور اپنے آپ ہی کو نیک پاک ماننے کے احساس سے مملو ہوتے تھے۔ نوآبادیاتی تجربے کی وجہ سے اخوانوں کا مغرب کا تصور مسخ شدہ تھا' وہ اسے حریص' جابر اور روحانی طور پر دیوالیہ قرار دیتے تھے۔ اخوان کے ایک ترجمان کے بقول مغربی استعمار کا مقصد صرف ''ہمیں ذلیل کرنا' ہماری زمینوں پر قبضہ جما کر انہیں برباد کرنا'' ہی نہیں تھا۔

حسن البنا کامل اطاعت پر زور دیتے تھے اور کسی کو نیابت نہیں سونپتے تھے۔ نتیجتاً ان کی وفات کے بعد کوئی ان کی جگہ نہیں لے سکا اور اخوان المسلمون لاحاصل داخلی مناقشوں کی وجہ سے واقعتاً تباہ ہوگئی۔ تاہم اس کی سب سے زیادہ سنگین ناکامی 1943ء میں ایک دہشت گرد تنظیم کا ظہور تھا۔ وہ مجموعی طور پر اخوان المسلمون میں غیر اہم ہی رہی۔ چونکہ وہ بہت خفیہ تھی اس لیے ہمارے پاس اس کے حوالے سے بہت کم معلومات ہیں' تاہم رچرڈ پی۔ مچل نے اخوان المسلمون کے اپنے بھرپور مطالعے میں اپنے اس تیقن کا اظہار کیا ہے کہ 1948ء تک اس تنظیم کے اراکین کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی اور اس وقت تک بیشتر اخوانوں نے اس کے بارے میں سنا بھی نہیں تھا۔ اراکین کی اکثریت کے لیے اخوان المسلمون کا اولین مقصد سماجی اور روحانی اصلاح تھا اور وہ دہشت گردی سے نفرت کرتے تھے۔ تاہم جب کوئی تحریک ایک دفعہ خدا کے نام پر قتل و غارت شروع کر دیتی ہے تو وہ ایک ایسے فنا پرستانہ راستے پر گامزن ہو جاتی ہے جو بنیادی مذہبی اقدار کا انکار ہوتا ہے۔

''النقبہ'':

1940ء کی دہائی مصر میں شورشوں سے معمور تھی۔ یہ امر واضح ہو گیا تھا کہ لبرل جمہوریت ناکام ہو چکی ہے اور بیشتر مصری پارلیمانی نظام سے یکسر مایوس ہو چکے تھے۔ نہ تو برطانوی اور نہ ہی مصری قوم پرست اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ سطحی اور تیز رفتار جدیدیت پذیری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے باوجود بنیادی طور پر جاگیردارانہ (Feudal) اور زرعی ملک پر ایک جدید حکومت کو تھوپا نہیں جا سکتا۔ 1923ء سے لے کر 1950ء تک کے درمیانی عرصے میں تمام کے تمام سترہ عام انتخابات میں قوم پرست وفد پارٹی کامیاب ہوئی تاہم اسے صرف پانچ مرتبہ حکومت کرنے کی اجازت دی گئی۔ وفدیوں کو یا تو برطانویوں یا پھر بادشاہ نے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ 1942ء میں جب برطانویوں نے جرمنوں کے حامی وزیراعظم کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا اور دو برائیوں میں سے کمتر کو چنتے ہوئے اس کی جگہ وفدی حکومت قائم کر دی تو وفد پارٹی بھی لوگوں میں اپنی ساکھ گنوا بیٹھی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران قاہرہ میں تشدد اور مایوسی کی فضا چھائی رہی' جس میں اضافہ اس وقت ہو گیا جب 1948ء میں ریاستِ اسرائیل کی تخلیق کے بعد مصر سمیت پانچ عرب ملکوں نے حملہ کیا تو انہیں شکست اٹھانا پڑی۔ فلسطین کے کھو جانے اور 1948ء میں اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیے جانے والے سات لاکھ پچاس ہزار فلسطینیوں کے مسئلے سے دنیا کی ظاہری بے اعتنائی نے جدید دنیا میں عربوں کے بانجھ پن کو عیاں کر دیا۔ عرب آج بھی 1948ء کے واقعات کو ''النکبہ'' کہتے ہیں یعنی کائناتی سطح کی تباہی۔ اس تلخ فضا میں بعضوں کو یقین ہو گیا کہ دہشت (Terror) ہی ''واحد راستہ'' ہے۔ بعدازاں مصر کے صدر بن جانے والے انوارالسادات کا بھی یہی خیال تھا' جس نے 1940ء کی دہائی میں نہرسویز کے علاقے میں برطانویوں اور ان سے ''تعاون'' کرنے والے مصری سیاستدانوں کو نشانہ بنانے کے لیے ایک ''انجمن قتل'' (Murder Society) بنائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ایسے نیم عسکری گروپ تھے' جو تشدد کو واحد راستہ تصور کرتے تھے' ان میں شامل تھے سبز قمیضوں والے' جو کہ محل سے وابستہ تھے اور نیلی قمیضوں والے' جو کہ وفد پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔

اخوان المسلمون کا دہشت گرد یونٹ:

شاید یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ اب مصری سیاسی میدان کا بڑا کھلاڑی بن جانے والی اخوان المسلمون کا بھی ایک دہشت گرد شعبہ ہوتا' تاہم یہ ایک المناک پیشرفت تھی۔ یہ واضح نہیں ہے کہ خفیہ شعبے کی سرگرمیوں میں خود حسن البنا کا کس حد تک کردار تھا۔ انہوں نے ہمیشہ ان کی مذمت کی تاہم انہوں نے اسی زمانے میں حکومت پر بھی کڑی تنقید کی۔ حسن البنا دہشت گرد یونٹ کو قابو نہیں کر سکتے تھے' جس کی سرگرمیوں نے واقعات کا ایسا سلسلہ شروع کیا جو ان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی موت کا پیش خیمہ بنا' جس نے اخوان کی ساکھ کو داغدار کر دیا اور آخر کار اس کی بربادی پر منتج ہوا۔ مارچ 1948ء میں خفیہ یونٹ کے اراکین نے دہشت کی ایک مہم کا آغاز کیا' جو ایک قابل احترام جج کے قتل سے شروع ہوئی' قاہرہ کے یہودی علاقے پر سارے موسم گرما تشدد آمیز حملے اور بمباری کے ساتھ جاری رہی' جس میں بہت سے لوگ مرے' زخمی ہوئے اور کافی املاک تباہ ہوئیں' اور 28 دسمبر 1948ء میں عروج کو پہنچ گئی' کہ جب وزیراعظم محمد النقرشی کو قتل کر دیا گیا۔

حسن البنا کا قتل:

اخوان المسلمون نے اس قتل و غارت گری سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور حسن البنا نے النقرشی کے قتل پر دہشت زدہ ہونے کا اعتراف کیا۔ تاہم نئے وزیراعظم ابراہیم الہادی نے اخوان المسلمون کو مٹانے کے اس موقع کو ضائع نہیں کیا۔ اخوان المسلمون پر جبر کیا گیا' اس کے اراکین کو گرفتار کر لیا گیا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جولائی 1949ء کے اختتام تک' کہ جب الہادی نے آخر کار استعفیٰ دے دیا تھا' چار ہزار سے زیادہ اخوان جیلوں میں بند تھے۔ تاہم 12 فروری 1949ء کو حسن البنا کو نوجوان مسلمانوں کی ایسوسی ایشن (Young Men's Muslim Association) کے ہیڈکوارٹر کے باہر سڑک پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا' تقریباً یقینی طور پر وزیراعظم کے ایما پر۔

اخوان المسلمون 1950ء میں دوبارہ خفیہ طور پر منظم ہونا شروع ہوئی اور حسن اسمٰعیل الحدیبی کو نیا قائد منتخب کیا گیا' وہ ایک جج تھے اور اپنی اعتدال پسندی اور تشدد سے گریز کی وجہ سے مشہور تھے۔ توقع تھی کہ وہ اخوان المسلمون کو نہایت ضروری عزت و وقار عطا کریں گے۔ تاہم حدیبی اس ذمہ داری پر پورا نہیں اترے۔ حسن البنا کی مضبوط قیادت کی عدم موجودگی میں رہنماؤں میں پھوٹ پڑ گئی اور حدیبی خفیہ شعبے کو قابو کرنے سے قاصر ثابت ہوئے' جو 1954ء میں اخوان المسلمون کے دوبارہ زوال کا باعث بنا۔

جمال عبدالناصر کا دورِ حکومت:

اس وقت مصر پر نوجوان فوجی افسر جمال عبدالناصر (70-1918ء) کی حکومت تھی' جس نے ''نوجوان افسروں'' کی تنظیم کے ساتھ 22 جولائی 1952ء کو فوجی انقلاب کے ذریعے پرانی بے اعتبار حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور مصر میں ایک انقلابی ری پبلک کی بنیاد رکھی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناصر عسکریت پسندانہ قوم پرستی کو مانتا تھا' جو کہ پرانے لبرل مثالیے سے یکسر مختلف تھی۔ 1920ء اور 1930ء کی دہائی کے مصری دانشوروں کے برعکس نئے عرب قوم پرست مغرب کے گرویدہ نہیں تھے اور ان کے پاس پارلیمانی ''لبرل ازم'' کے لیے کوئی وقت نہیں تھا' جو کہ مشرق وسطیٰ میں بری طرح ناکام ہوگیا تھا۔ ناصر کی حکومت سوشلسٹ تھی اور اس نے سوویتوں سے دوستی قائم کرلی۔ اس نے برطانویوں کو مصر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکالنے کا تہیہ کررکھا تھا۔ اسرائیل اور مغرب کے ساتھ اس کا برتاؤ عوام کے لیے بہت تسکین بخش تھا۔ اس کی خارجہ پالیسی پان عرب (Pan-Arab) تھی اور اس نے یورپ کے غلبے سے آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے والے ایشیائی اور افریقی ملکوں کے ساتھ مصر کے مضبوط تعلق پر زور دیا۔ ناصر ایک پکا سیکولر بھی تھا۔ اس کا ایقان تھا کہ قومی مفاد میں مذہب سمیت کسی بھی شے کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے' نیز مذہب سمیت ہر شے کو ریاست کے تابع ہونا چاہیے۔ بالآخر ناصر پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ مقبول حکمران بن گیا اور ''ناصرازم'' غالب نظریہ۔ تاہم ان ابتدائی برسوں میں ناصر ابھی جدوجہد کررہا تھا: وہ ابھی بہت زیادہ مقبول نہیں تھا اور کسی بڑے رقیب کو برقرار نہیں رہنے دے سکتا تھا۔

ناصر نے ابتدا میں اخوان المسلمون کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اسے ان کی ضرورت تھی' اور چونکہ وہ اسلامی نعرے استعمال کرکے خوش ہوتا تھا' اس لیے اخوان المسلمون نے اس کی حمایت کی اور اس کے سکاؤٹوں نے جولائی انقلاب کے بعد نظم ونسق بحال کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ایک ابتدائی نوعیت کا تناؤ موجود تھا' تناؤ بالخصوص اس وقت پیدا ہوا جب ناصر کا یہ ارادہ واضح ہوگیا کہ وہ اسلامی ریاست قائم نہیں کرنا چاہتا۔ جب اسلامی اصول نافذ کرنے کا حدیبی کا اصرار زور پکڑ گیا تو ناصر کی کابینہ نے 15 جنوری 1954ء کو اخوان المسلمون دوبارہ تحلیل کردی' اس جواز کے تحت کہ وہ ردِانقلاب (Counter Revolution) کا منصوبہ بنارہی تھی۔ اخوان کا ایک مرکزی دھڑا زیرزمین چلا گیا اور حکومت نے ایک زہریلی مہم کا آغاز کیا جس میں اخوانوں پر ناجائز اسلحہ رکھنے اور برطانویوں کے ساتھ مل کر سازش کرنے کا الزام لگایا گیا۔ حکومت نے اپنے اسلامی تشخص پر زور دینا شروع کیا اور ناصر کی قائم کردہ نئی اسلامی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری انور سادات نے نیم سرکاری اخبار ''الجمہوریہ'' میں اپنی حکومت کے ''سچے'' اور ''لبرل'' اسلام پر مضمون لکھنے شروع کردیئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناصر پر قاتلانہ حملہ:

ادھر آخر کار 26 اکتوبر 1954ء کو اخوان المسلمون ناصر کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی' اس کے ایک رکن عبداللطیف نے ایک جلوس کے دوران ناصر کو گولی مار دی۔

ناصر اس حملے سے جانبر ہو گیا اور گولیوں کی بارش میں اس کی جرأتمندانہ ثابت قدمی نے اس کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ اب وہ اخوان المسلمون کو مکمل طور پر مٹا دینے کے لیے آزاد تھا۔ نومبر 1954ء کے اختتام تک ایک ہزار سے زیادہ اخوانوں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا جا چکا تھا۔ تاہم ایسے لاتعداد اخوان بھی تھے جنہوں نے پمفلٹ تقسیم کرنے سے زیادہ بڑا جرم نہیں کیا تھا' انہیں کبھی کسی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا اور بری طرح ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور وہ اگلے پندرہ برس تک ناصر کے قید خانوں اور عقوبت کدوں میں بند رہے۔ حدیبی کو عمر قید کی سزا دی گئی جبکہ چھ دیگر رہنماؤں کو سزائے موت سنائی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ ناصر اخوان المسلمون کو توڑ چکا ہے اور مصر کی واحد ترقی پسند اسلامی تحریک کو راستے ہی میں روک دیا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ سیکولرازم فتح پا گیا ہے۔ دو سال بعد ناصر عرب دنیا کا ہیرو بن گیا' جب اس نے نہر سویز کے مسئلے پر مغرب کو شکست دی اور برطانیہ کی بری طرح تذلیل کی۔ تاہم اخوان المسلمون پر اس کی فتح آخر میں بہت مہنگی پڑی۔ ناصر کا باقی ماندہ دور عقوبت کدوں میں گزارنے والے اخوانوں نے سیکولرازم کے حملے کو اس کی انتہائی شدت کے ساتھ سہا۔ ہم دیکھیں گے کہ ان ہی عقوبت کدوں میں بعض اخوانوں نے حسن البنا کے اصلاح پسندانہ وژن کو ترک کر کے ایک نئی اور امکانی طور پر تشدد آمیز سنّی بنیاد پرستی تخلیق کی۔

ایران پر سیکولرازم کا حملہ:

ایرانی بھی ایک نحس سیکولر حملے کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ رضا شاہ کا جدیدیت پذیری کا پروگرام مصر یا ترکی سے زیادہ تیز رفتار تھا کیونکہ جب اس نے اقتدار سنبھالا تو ایران میں جدیدیت پذیری کا بمشکل آغاز ہی ہوا تھا۔ رضا ایک بے رحم حکمراں تھا۔ اس نے مخالفوں کو فنا کروا دیا۔ رضا کی سفاکی کا نشانہ بننے والے اولین افراد میں سے ایک آیت اللہ مدرسی تھے' جنہوں نے مجلس میں شاہ کی مخالفت کی تھی' انہیں 1927ء میں جیل میں ڈالا گیا اور 1937ء میں قتل کروا دیا گیا۔ رضا نے پہلی مرتبہ ملک کو مرکزیت عطا کی' تاہم اس کے لیے اس نے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کیے' ہر عوامی ابھار کو کچل دیا گیا اور بدو قبیلوں کے اختیارات چھین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے گئے' جو کہ اب تک واقعتاً خودمختار رہے تھے۔ رضا نے عدلیہ میں اصلاح کی' شریعت کی جگہ تین نئے سیکولر قانونی ضابطے ــــ دیوانی' تجارتی اور فوجداری ــــ رائج کیے گئے۔ اس نے ملک کو صنعتی بنانے کی بھی کوشش کی اور ایران میں جدیدیت کی سہولیات و آسائشات لے کر آیا۔ 1930ء کی دہائی تک بیشتر شہروں میں بجلی آ گئی تھی اور پاور پلانٹس قائم ہو چکے تھے۔ تاہم حکومتی گرفت نے ایک حقیقی سرمایہ دارانہ معیشت کی راہ روک رکھی تھی' اجرتیں کم تھیں اور استحصال عروج پر تھا۔ یہ ڈریکولائی (Draconian) ہتھکنڈے بے ثمر ثابت ہوئے' ایران معاشی آزادی حاصل کرنے سے قاصر رہا۔ تیل کی صنعت پر اب بھی برطانویوں کا قبضہ تھا' جو معیشت میں تقریباً کچھ بھی حصہ نہیں ڈالتے تھے اور ایران غیرملکی قرضوں اور سرمایہ کاری کا محتاج تھا۔

رضا شاہ کا دورِ حکومت:

رضا کا پروگرام سطحی تھا۔ اس نے پرانے زرعی ڈھانچوں پر جدید ادارے قائم کرنے کی کوشش کی تھی' یہ وہ سوچ تھی جو مصر میں ناکامی سے دوچار ہو چکی تھی اور یہاں بھی اس کا نصیب ناکامی ہی تھا۔ ملک کی نوے فیصد آبادی جو زراعت سے وابستہ تھی' جاہل تھی' روایتی زراعتی طریقے مروج تھے اور پیداوار بڑھانے سے قاصر تھے۔ معاشرے میں کوئی بنیادی اصلاح نہیں کی گئی۔ رضا کو غریبوں کی حالت بہتر کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جبکہ فوج پر بجٹ کا پچاس فیصد خرچ کر دیا جاتا تھا' تعلیم پر صرف چار فیصد خرچ کیا جاتا تھا' جو کہ امیروں ہی کا استحقاق تھی۔ مصر کی طرح ایران میں بھی دو قومیں وجود پذیر ہو رہی تھیں' جو ایک دوسرے کو سمجھنے سے بتدریج زیادہ قاصر ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک ''قوم'' اونچے اور درمیانے طبقے کی مغرب زدہ چھوٹی سی اشرافیہ پر مشتمل تھی' جو رضا کے جدیدیت پذیری کے پروگرام سے فیضیاب ہوتی تھی' جبکہ دوسری ''قوم'' غریبوں کی اکثریت پر مشتمل تھی' جو اس حکومت کی نئی سیکولر قوم پرستی سے چکرائے ہوئے تھے اور ہمیشہ سے زیادہ علماء کی رہنمائی پر انحصار کرنے لگے تھے۔

تاہم علماء خود رضا کی سیکولرائزیشن کی پالیسی سے حواس باختہ تھے۔ شاہ مذہبی پیشوائیت سے نفرت کرتا تھا اور اس نے ایران میں ان کی قابل لحاظ قوت کو کچلنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اس کی ایرانی قوم پرستی نے اسلام کو بھی مٹانے کی کوشش کی اور اس کی بنیاد خطے کا قدیم فارسی (Persian) کلچر تھا۔ رضا نے حضرت حسینؓ کے سوگ میں برپا کی جانے والی مجالس (کے انقلابی امکان کو بھانپتے ہوئے) ان پر پابندی لگانے کی کوشش کی اور حج پر تو پابندی لگا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی دی۔ 1931ء میں شرعی عدالتوں کے دائرہ کار میں بہت زیادہ کمی کر دی گئی۔ مذہبی پیشواؤں کو صرف نجی نوعیت کے مسائل نمٹانے کی اجازت تھی' دیگر تمام مقدمات نئی سول عدالتوں کو بھجوا دیئے گئے۔ علماء ایک صدی سے زیادہ عرصے سے ایران میں بھرپور قوت و اختیار کے حامل رہے تھے۔ اب انہوں نے اپنی طاقت کو اسی تناسب سے کم ہوتے دیکھا' بلکہ آیت اللہ مدرسی کے قتل کے بعد تو بیشتر مذہبی پیشوا احتجاج کرنے سے بھی خوف زدہ ہو گئے تھے۔

رضا کا ''لباس میں یکسانیت'' (1928ء) کا قانون جدیدیت پذیری کے عمل کی سطحیت اور تشدد کو ظاہر کرتا ہے۔ تمام مردوں کے لیے مغربی لباس لازم قرار دے دیا گیا (سوائے علماء کے جنہیں اجازت تھی کہ وہ اپنے جبے اور دستاریں استعمال کر سکتے ہیں' بشرطیکہ مذہبی پیشوا کے سرکاری امتحان میں کامیاب ہو جائیں) اور بعدازاں عورتوں کے پردہ کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے سپاہی سنگینوں سے عورتوں کے پردے کاٹ دیتے تھے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گلیوں میں بکھیر دیتے تھے۔ رضا چاہتا تھا کہ ایران داخلی قدامت پسندی کے باوجود جدید دکھائی دے اور وہ ایسا ممکن بنانے کے لیے ہر انتہا تک جانے کو تیار تھا۔ 1929ء میں عاشورہ کے دوران پولیس نے قم میں فیضیہ مدرسہ کا محاصرہ کر لیا اور جب طالب علم گلیوں میں بکھر گئے تو پولیس نے ان کے روایتی لباس تار تار کر دیئے اور مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا۔ مرد بالخصوص چوڑے کنارے والے مغربی ہیٹ پہننے سے نفرت کرتے تھے' کیونکہ ان سے نماز ادا کرنے میں دقت ہوتی تھی۔ 1935ء میں مشہد میں آٹھویں امام کے مزار پر ایک ہولناک واقعہ رونما ہوا' پولیس نے لباس کے قوانین کے خلاف مظاہرہ کرنے والے ہجوم پر گولی چلا دی۔ سینکڑوں غیر مسلح مظاہرین اس مزار کے اندر ہلاک یا زخمی ہو گئے۔ اس لیے اس امر پر حیرت نہیں کرنی چاہیے کہ بیشتر ایرانی سیکولرائزیشن کو سفاکانہ پالیسی تصور کرتے ہوئے اس سے خوفزدہ تھے' جس کو کہ (مغرب کی طرح) جابر ریاست کے چنگل سے آزاد کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسلام کو فنا کرنے کی غرض سے وضع کیا گیا تھا۔

قم کا احیاء:

یہ عین ویسی ہی صورتحال تھی جس میں کسی بنیاد پرستانہ تحریک کا ابھرنا یقینی ہوتا ہے۔ ایسا اس دور میں تو نہیں ہوا تاہم چار ایسے اقدامات عمل میں آئے جنہوں نے آئندہ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیشرفتوں کی جھلک دکھا دی۔ اول' ایک ردِ ثقافت کی تخلیق کی گئی۔ ایک ممتاز مجتہد شیخ عبدالکریم ہائری یزدی (1936ء۔ 1860ء) کو 1920ء میں قم کے مذہبی پیشواؤں نے وہاں آباد ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے قم کو شیعی نقشے میں واپس لانے کا عزم کر رکھا تھا' کیونکہ انہیں عراق میں کربلا اور نجف کے مقدس شہروں کے مستقبل کا خوف لاحق تھا۔ عراق اٹھارہویں صدی کے دوران ایرانی شیعیت کا دانشورانہ مرکز بن گیا تھا۔ شیخ ہائری کی قم میں آمد کے تھوڑے ہی عرصے بعد برطانویوں نے چند ممتاز علماء کو عراق سے نکال دیا۔ اس کے علاوہ دو انتہائی فاضل افراد کو بھی' جن میں سے ایک ''آئینی'' مجتہد نائینی تھے' ملک بدر کر دیا گیا' جو قم میں آ کر آباد ہو گئے۔ شہر کا احیاء شروع ہو گیا۔ مدرسوں کی رونقیں بحال ہونے لگیں اور ممتاز علماء تدریس کے فرائض ادا کرنے لگے' جس کی وجہ سے بہتر طالب علم آنا شروع ہوئے۔ نو واردوں میں عالم اور غیر دنیا دار انسان آیت اللہ سید آقا حسین بروجردی (1961ء۔ 1875ء) بھی تھے' جو ''مرجع تقلید'' بن گئے تھے اور ان کی وجہ سے مزید علماء قم آ گئے۔ قم بتدریج نجف کی جگہ لینے لگا اور 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں ایران کا مذہبی ''دارالحکومت'' اور تہران کے شاہی دارالحکومت کی مخالفت کا مرکز بن گیا۔ تاہم ان ابتدائی برسوں میں قم کے مذہبی پیشوا شیعی روایت کے مطابق سیاست سے دور ہی رہے' کسی بھی قسم کی سیاسی فعالیت شاہ کے اشتعال کو ہوا دے سکتی تھی اور قم میں ہونے والا احیاء ابتدا ہی میں کچلا جاتا۔

آیت اللہ خمینی کی قم میں آمد:

دوسرا واقعہ 1920ء میں قم میں اس انسان کی آمد تھا' جو ایران کا سب سے زیادہ مشہور مذہبی پیشوا بن گیا۔ جب شیخ ہائری یزدی مغربی ایران سے قم منتقل ہوئے تھے تو وہ اپنے کچھ شاگردوں کا بھی ساتھ ہی لائے تھے اور انہیں میں سے ایک تھے نوجوان روح اللہ موسوی خمینی (89-1902ء)۔ تاہم پہلے پہل خمینی ایک غیر اہم شخصیت دکھائی دیتے تھے۔ وہ فیضیہ مدرسہ میں فقہ کی تعلیم دیتے تھے تاہم بعد ازاں انہوں نے اخلاقیات اور عرفان میں تخصص حاصل کر لیا' جو کہ فقہ کے مقابلے میں زیادہ ''دقیق'' مضامین تھے۔ مزید برآں خمینی ملا صدرا کے تصوف پر عمل پیرا تھے' جسے ایسٹیبلشمنٹ طویل عرصے سے شک و شبہے کی نظر سے دیکھتی آئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سیاسی مسائل میں دلچسپی رکھتے تھے اور یہ امر بھی ان کے مذہبی منصب میں ترقی کے لیے مددگار نہیں تھا' بالخصوص پرانی شیعی غیر جانبداری سے وابستہ اور علماء کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیاست میں حصہ لینے سے روکنے والے آیت اللہ بروجردی کے مرجع تقلید بننے کے بعد۔ وہ ایران میں بحرانوں کا زمانہ تھا' تاہم اپنی واضح سیاسی دلچسپی کے باوجود خمینی نے عملاً سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ تاہم 1944ء میں انہوں نے ''کشف الاسرار'' شائع کروائی' جس کو اس زمانے میں کم توجہ حاصل ہوئی لیکن پہلوی پالیسی کو شیعی تناظر میں چیلنج کرنے کی یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی۔ اس مرحلے پر خمینی ہنوز ایک مصلح ہی تھے اور کسی اعتبار سے بھی بنیاد پرست نہیں تھے۔ ان کا مؤقف 1906ء کی پہلی مجلس والا ہی تھا' جس نے ہر ایسی قانون سازی کو ویٹو کرنے کے لیے' جو کہ شریعت سے متصادم ہو' مجتہدوں کے ایک پینل کا تصور قبول کرلیا تھا۔ خمینی ہنوز پرانے آئین کے حامی تھے اور اس جدید ادارے کو ایک اسلامی تناظر میں مقام دینے کے لیے کوشاں تھے۔ انہوں نے کہا کہ قانون بنانے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے اور شیعوں کے لیے اتاترک یا رضا شاہ جیسے اسلام کو تباہ کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کرنے والے حکمرانوں کی اطاعت کرنا درست نہیں ہے۔ تاہم خمینی ایک مذہبی پیشوا کے ملک پر براہ راست حکومت کرنے کے تصور کے حوالے سے بہت زیادہ روایت پسند تھے' ان کا خیال تھا کہ اس سے شیعوں کی صدیوں پرانی روایت میں خلل پڑے گا۔ ان کے نظریے کے مطابق خدا کے قانون کو جاننے والے مجتہدوں کو ایک ایسا سلطان منتخب کرنے کی اجازت ہے' جس کے متعلق انہیں علم ہو کہ وہ الوہی قانون کو پامال اور عوام پر جبر نہیں کرے گا۔

محمد رضا کی تخت نشینی:

جس زمانے میں خمینی کی مذکورہ کتاب شائع ہوئی' برطانویوں نے یہ دکھاتے ہوئے کہ رضا شاہ اپنی آزادی کے تمام تر دعوؤں کے باوجود' قاچاروں ہی کی طرح یورپی طاقتوں کا رہین منت ہے' اسے جرمنوں سے ہمدردی رکھنے کے الزام میں تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا۔ جب رضا 1944ء میں فوت ہوا تو اس کا بیٹا محمد رضا (80-1919ء) اس کا جانشین بنا' جو ایک بے حد چپ چاپ اور اس زمانے میں کمزور ترین کردار تھا۔ وہ ایک مشکل زمانے میں تخت نشین ہوا تھا۔ دوسری عالمی جنگ نے ایران میں بہت زیادہ خلل ڈالا تھا' صنعت تعطل کا شکار ہوگئی تھی' مشینری تباہ ہوچکی تھی اور قحط پڑا ہوا تھا۔ نئے درمیانے طبقے مواقع کے فقدان پر تلملانے لگے تھے' قوم پرست غیر ملکی تسلط سے نکلنا چاہتے تھے اور اس معاشی بحران میں ایرانی تیل پر برطانوی قبضے کے حوالے سے بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ تاہم علماء بہت خوش تھے۔ نیا شاہ اتنا طاقتور نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا کہ ان کے مطالبوں کی مخالفت کرسکتا: عاشورہ کی مجالس بحال کردی گئیں' ایرانیوں کو حج پر جانے کی اجازت مل گئی اور عورتوں کو پردہ نہ کرنے کا قانون ختم کردیا گیا۔ اس زمانے میں بہت سی نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں: سوویت حامی تودہ' محمد مصدق (1967ء۔ 1881ء) کا قومی محاذ' جس نے ایرانی تیل کو قومیانے کا مطالبہ کیا' اور ایک نیا پارلیمانی گروپ ''فدائیان اسلام'' جس نے سیکولر ایجنڈے کو فروغ دینے والے لوگوں کو دہشت زدہ کردیا۔

آیت اللہ سید مصطفیٰ کاشانی کی ایران واپسی:

1945ء میں آیت اللہ سید مصطفیٰ کاشانی (1962ء۔ 1882ء) کو ایران واپس آنے کی اجازت مل گئی' جو کہ جنگ کے دوران برطانویوں کی قید میں رہے تھے۔ بہت بڑا ہجوم ان کے استقبال کے لیے جمع ہوگیا اور ان کی کار کے تلے قالین بچھائے گئے۔ دور دراز کے علاقوں سے بیشتر ذہین فطین علماء ان کے گھر آئے' اور مدرسوں کے ہزاروں طلباء خوشی سے جھوم اٹھے۔ کاشانی اس دور میں مستقبل کے واقعات کے تیسرے غیر معمولی کردار تھے۔ ہوسکتا ہے ان کی غیر معمولی مقبولیت کسی صاحب ادراک مشاہدہ کرنے والے کو یہ ظاہر کرتی کہ ایرانی سیاسی معاملات میں کسی عام آدمی کی نسبت ایک مذہبی پیشوا کی زیادہ پرجوش پیروی کرنے پر مائل ہیں۔ کاشانی اور خمینی ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے' تاہم حقیقت میں دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ جہاں خمینی کسی مقصد کے حصول کی جدوجہد میں انتہائی نظم وضبط کے قائل اور مستقل مزاج تھے' وہاں کاشانی بہت زیادہ غلطیاں کرنے والے اور متلون مزاج تھے نیز ان کے بعض منصوبے اخلاقی اعتبار سے ناقابل دفاع تھے۔ انہیں برطانویوں نے جرمنوں سے ہمدردیاں رکھنے کے الزام میں 1943ء میں قید کردیا تھا: کاشانی کی نگاہ میں ایرانیوں کو برطانویوں کے تسلط سے نکالنے کے لیے نازیوں کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ کاشانی کے فدائیانِ اسلام سے بھی روابط تھے اور جب 1949ء میں ایک فدائی نے شاہ کو قتل کرنے کی کوشش کی تو انہیں ملک بدر کردیا گیا۔ وہ بیروت چلے گئے' جہاں سے انہوں نے تیل کو قومیانے کی حمایت میں جولائی 1949ء میں فتویٰ جاری کرکے اپنی قسمت قومی محاذ پارٹی سے وابستہ کرلی۔ 1950ء میں کاشانی کو ایران واپس آنے کی اجازت دے دی گئی اور ایک بار پھر کسی ہیرو کی طرح ان کا استقبال کیا گیا۔ لوگ ان کی آمد سے ایک دن پہلے سے مہرآباد ایئرپورٹ پر جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ تیل کے مسئلے پر انتخابات میں حال ہی میں بھرپور فتح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حاصل کرنے والے قومی محاذ کے رہنما مصدق بھی سینئر علماء کی استقبالی پارٹی میں شامل تھے' جب کاشانی اپنے جہاز سے اترے تو اس قدر شور وغوغا تھا کہ ان کے اعزاز میں سرکاری خطاب ملتوی کر دیا گیا اور جب وہ تہران میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو ہجوم امڈ پڑا اور بعض اوقات تو ان کی کار کو سڑک سے اٹھالیا گیا۔

تیل کا بحران:

اس زمانے کا چوتھا اہم واقعہ تیل کا بحران تھا' جو کہ 1953ء میں اس وقت پیدا ہوا جب اینگلو پرشین آئل کمپنی کے حامی وزیراعظم علی رزمرا کو ایک فدائی نے قتل کر دیا۔ اس کے دو دن بعد مجلس نے تجویز دی کہ تیل کی صنعت کو قومیا لیا جائے اور مصدق کو شاہ کے امیدوار کی جگہ وزیراعظم چن لیا گیا۔ ایرانی تیل کو قومیا لیا گیا اور اگرچہ ہیگ کی بین الاقوامی عدالت نے ایران کے اپنے وسائل کو قومیانے کے حق کو تسلیم کرلیا' تاہم برطانوی اور امریکی تیل کمپنیوں نے ایرانی تیل کا بائیکاٹ کر دیا۔ برطانیہ اور امریکہ میں ذرائع ابلاغ نے مصدق کو ایک خطرناک جنونی' چور (حالانکہ اس نے ہمیشہ مصالحت کے وعدے کیے تھے) اور کمیونسٹ قرار دیا' جو ایران کو سوویت روس کے حوالے کر دے گا (حالانکہ مصدق ایک قوم پرست تھا جو ایران کو ہر غیر ملکی تسلط سے آزاد کروانے کا خواہشمند تھا) تاہم ایران میں مصدق ایک ہیرو بن گیا تھا' نہر سویز کو قومیانے والے ناصر کی طرح۔ اس نے شاہ سے اختیارات لینا شروع کر دیئے۔ جب اس نے جولائی 1952ء میں مسلح افواج کا کنٹرول لینے کا مطالبہ کیا تو شاہ نے اسے منصب سے ہٹا دیا' لیکن مصدق کی حمایت میں زبردست عوامی مظاہرے شروع ہو گئے' جس سے شاہ پرست چوکنا ہو گئے کیونکہ اس سے پتا چلتا تھا کہ ایرانی ری پبلکن حکمرانی کا مطالبہ کرنے ہی والے ہیں۔ فسادات نے مصدق کو اقتدار سے باہر دیکھنے کے خواہاں لندن اور واشنگٹن کو بھی پریشان کر دیا۔ آیت اللہ کاشانی نے کفن اوڑھ کر جبر کے خلاف مقدس جنگ میں مرنے کی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے ان مظاہروں میں رہنما کردار ادا کیا۔ صرف دو دن بعد شاہ مصدق کو بحال کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس زمانے میں امریکہ' جسے اب تک ایک مہربان طاقت تصور کیا جاتا تھا' ایران میں اپنی سیاسی معصومیت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ 1953ء تک مصدق کی حمایت زوال پذیر ہو چکی تھی۔ وہ فوج پر کبھی پوری طرح حاوی نہیں ہو سکا تاہم اب تیل پر پابندیوں نے سنگین معاشی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحران پیدا کر دیا تھا اور ''بازاری'' اسے چھوڑنے لگے تھے۔ ایسا ہی کاشانی سمیت علماء نے بھی کیا: مصدق ایک سیکولر تھا اور اس نے مذہب کو شخصی دائرے تک محدود کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مجلس کو بھی برطرف کر دے گا' جس سے شیعی مذہبی پیشواؤں نے اسے جابر تصور کیا۔ لیکن جیسے ہی ان پرانے اتحادیوں نے مصدق کو چھوڑا سوشلسٹ پارٹی تو وہ اس کی حامی بن گئی۔ اس سے صدر ڈوائٹ آئزن ہاور کی امریکی حکومت چوکنا ہوگئی' جو کمیونسٹ انقلاب سے خوفزدہ تھی۔ اسی لیے اس نے مصدق کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے برطانوی انٹیلی جنس اور سی آئی اے کے لائے ہوئے انقلاب آپریشن اجیکس (Operation Ajex) میں امریکہ کی شمولیت کی منظوری دے دی۔ تاہم اگست 1953ء میں مصدق کو اس سازش کی سن گن مل گئی اور شاہ اور ملکہ کو ملک چھوڑنا پڑا' جو سی آئی اے کے ایجنٹوں کی معیت میں ہی واپس آ سکے' جنہوں نے ایرانی فوج کے کلیدی افراد اور غیر مطمئن ایرانیوں کے ساتھ مل کر تین دن بعد مصدق کو اقتدار سے ہٹا دیا تھا۔ بعدازاں اس پر ایک فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا' اس نے اپنا دفاع بڑی ذہانت کے ساتھ کیا اور سزائے موت سے بچ نکلا' گو کہ اسے باقی ساری زندگی اپنے گھر کے اندر نظر بندی میں گزارنا پڑی۔

اگر ملک میں بے اطمینانی نہ ہوتی تو 1953ء کا انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا تھا' تاہم یہ بھی درست ہے کہ غیر ملکی مداخلت نہ ہوتی تو انقلاب برپا ہی نہیں ہوتا۔ ایرانیوں کو امریکہ ایک غدار اور تذلیل کرنے والا محسوس ہوا' حالانکہ وہ اسے دوست تصور کرتے رہے تھے۔ امریکہ اب برطانویوں اور روسیوں کے نقش قدم پر چل رہا تھا' جنہوں نے اپنے مفادات کے لیے ایران میں غیر ضروری مداخلت کی تھی۔ یہ امر 1954ء میں واضح ہوگیا' جب ایک نیا تیل معاہدہ عمل میں آیا جس کے تحت عالمی کارٹیل کمپنیوں کو تیل کی پیداوار اور فروخت پر کنٹرول نیز منافعوں کا پچاس فیصد دے دیا گیا۔ انہوں نے بین الاقوامی عدالت کی پشت پناہی سے اپنی دولت کا قبضہ سنبھالنے کی کوشش کی تھی تاہم اس کو درست نہیں سمجھا گیا تھا۔ آیت اللہ کاشانی نفرت کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے احتجاج کیا کہ امریکی امداد کا فائدہ چند ہی لوگوں کو پہنچ رہا ہے اور امریکہ ایران کو پیٹرو ڈالروں میں سے سوواں حصہ بھی نہیں دے رہا۔ انہوں نے پیشگوئی کی ''چونکہ امریکی نوآبادیات کار سامراجی تیل سے لاکھوں ڈالر کمائیں گے اس لیے مجبور قوم جلد ہی آزادی کی امید کھو بیٹھے گی اور ساری مغربی دنیا کے بارے میں منفی رائے کی حامل ہو جائے گی۔''

آخر کار کاشانی کی پیشگوئی درست نکلی۔ جب ایرانیوں نے آپریشن اجیکس کو یاد کیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو وہ مصدق سے اپنے ہی لوگوں کی غداری کو بھول گئے اور انہیں یقین ہوگیا کہ صرف امریکہ ہی اپنے مفادات کے لیے شاہ کی آمریت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ جب 1960ء کی دہائی کے شروع میں شاہ کی حکومت مزید یک شخصی اور ظالمانہ ہوگئی تو تلخی میں اضافہ ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دہرا معیار برتا جارہا ہے۔ امریکہ اپنے آزادی اور جمہوریت کے ایقان کا فخریہ اعلان کرتا تھا لیکن ایک ایسے شاہ کی بھرپور حمایت کرتا تھا' جو اپنے اقتدار کی کسی مخالفت کو برداشت نہیں کرتا تھا اور اس نے ایرانیوں کے بنیادی انسانی حقوق کچل دیئے تھے۔ 1953ء کے بعد ایران امریکہ کا ایک مراعات یافتہ اتحادی بن گیا تھا۔ تیل پیدا کرنے والے ایک بڑے ملک کی حیثیت سے ایران امریکی خدمات اور ٹیکنالوجی کی فروخت کے لیے ایک زبردست منڈی تھا۔ امریکی ایران کو سونے کی چڑیا تصور کرتے تھے اور امریکہ نے برطانویوں کے استعمال کردہ سیاسی ہتھکنڈوں کو جاری رکھا: تیل کی منڈی میں زبردست فوجی چالیں' بادشاہوں پر غیرضروری اثرورسوخ' سفارتی تحفظ کے مطالبے' تجارتی اور کاروباری مراعات ورعایتیں اور ایرانیوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ۔ امریکی کاروباری افراد اور مشیر ملک میں امڈ آئے اور ڈھیروں دولت کمانے لگے۔ ان کے اور بیشتر ایرانیوں کے طرز زندگی میں خوفناک فرق موجود تھا۔ وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتے اور چونکہ بیشتر امریکی شاہ سے ہونے والے معاہدوں کے تحت کام کرتے تھے' اس لیے بادشاہت سے ان کا گہرا تعلق قائم ہوگیا تھا۔ یہ کوتاہ نظری اور خود غرضی پر مبنی پالیسی تھی جس نے بالآخر امریکہ کو شیطان قرار دلوا دیا۔

ایران دو حصوں میں منقسم ملک بنتا جارہا تھا: چند لوگ امریکی عروج سے مستفیض ہوئے لیکن اکثریت پسماندہ ہی رہی۔ بیسویں صدی کے وسط تک' ہم جتنے ممالک پر غور کررہے ہیں' ان کے معاشرے دو دھڑوں (Camps) میں بٹ چکے تھے۔ بعض لوگوں نے جدید دور کو آزادی اور قوت دینے والا تصور کیا۔ دیگر نے اس کا تجربہ شر کے حملے کے طور پر کیا۔ جلد ہی بنیاد پرستوں نے اس غصے کو گہرائی تک محسوس کیا اور معاشرے سے مزید الگ تھلگ نہ رہنے اور ایک ردِ ثقافت تشکیل دینے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں متحرک ہونا اور جوابی حملہ کرنا ہی ہوگا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب ہشتم:

سیکولر جدیدیت اور بنیاد پرستی کے مابین جنگ

(1960-74ء)

ہپی تحریک:

1960ء کی دہائی تک پورے مغرب اور مشرقِ وسطیٰ میں انقلابی فضا بن چکی تھی۔ یورپ اور امریکہ میں نوجوان سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے اپنے والدین کے جدید نظام کے خلاف بغاوت کردی۔ انہوں نے اپنی حکومتوں کی مادیت پرستی' سامراجیت اور شاونیت کے خلاف احتجاج کیا اور ایک زیادہ منصفانہ اور مساویانہ نظام کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اپنے اپنے ملکوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے اور ان کی طرف سے جنگیں لڑنے سے انکار کردیا۔ ساٹھ کی دہائی کے نوجوانوں نے وہ کام شروع کیا تھا' جو بنیاد پرست کئی عشروں سے کررہے تھے: انہوں نے مرکزی دھارے کی اقدار کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے ایک ''ردِ ثقافت'' ایک ''متبادل معاشرہ'' تخلیق کرنا شروع کیا۔ کئی اعتبار سے وہ زیادہ مذہبی طرزِ حیات کا مطالبہ کررہے تھے۔ بیشتر کے پاس ادارہ جاتی عقیدے کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہ کھٹمنڈو* جاتے یا مشرق کی مراقباتی یا صوفیانہ تیکنیکوں میں سکون تلاش کرتے تھے۔ دوسروں نے منشیات کے کیف' ماورائی مراقبوں یا ارہرڈ سیمینرز ٹریننگ (est) جیسی تیکنیکوں سے شخصی قلبِ ماہیئت میں ماورائیت کو تلاش کیا۔ مقدس کی تشنگی پیدا ہوگئی تھی اور نئی مغربی آرتھوڈوکسی بن جانے والی سائنسی عقلیت پسندی کو رد کیا جانے لگا تھا۔ یہ عقلیت کا نہیں بلکہ اس کی زیادہ انتہائی صورتوں کا استرداد تھا۔ بیسویں صدی کی سائنس تو اپنی حدود اور احاطۂ کار

* کیرن آرمسٹرانگ نے یہ استعارہ ''ہپی تحریک'' کے لیے استعمال کیا ہے' جو نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو کو حشیش کی فراوانی کے سبب نیز بدھ مت کی عبادت گاہوں کی وجہ سے لندن' پیرس' واشنگٹن اور دوسرے جدید ترقی یافتہ مغربی یورپی شہروں پر ترجیح دیتی تھی۔ (مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ایک اصولی اور منظم طریقۂ کار کے تحت متین اور انتہائی محتاط تھی۔ تاہم جدیدیت کے غالب روپ نے سائنس کو نظریاتی بنا دیا تھا اور صداقت تک رسائی کے کسی بھی دوسرے طریقے کو اہمیت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ساٹھ کی دہائی کے دوران نوجوانوں کا انقلاب ایک حد تک عقلی زبان کے بے جواز غلبے اور مقہوس پر لوگوس کے تسلط کے خلاف احتجاج تھا۔

لیکن چونکہ جدیدیت کے ظہور سے ہی زیادہ وجدانی علم تک رسائی کے ایسے منظم طریقوں کی تفہیم کو نظرانداز کیا گیا تھا' اس لیے ساٹھ کی دہائی میں ہونے والی روحانیت کی جستجو اکثر و بیشتر وحشیانہ' خود پسندانہ اور غیر متوازن تھی۔ جدید معاشرے کی سیکولرائزیشن اور عقلیت پسندی کے خلاف اپنے حملے کو منظم کرنا شروع کر رہے مذہبی ریڈیکلوں کی بصیرتوں اور پالیسیوں میں بھی خامیاں تھیں۔ بنیاد پرست متحرک ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے جدیدیت کو اکثر و بیشتر ایک جارحانہ حملے کے طور پر برتا تھا۔ جدید روح نے ماضی کے فرسودہ طرز ہائے فکر سے آزادی کا مطالبہ کیا تھا' ترقی کا جدید تصور ان اعتقادات' اعمال اور اداروں کو مٹا کر پیدا ہوا تھا' جنہیں غیر منطقی اور اسی لیے پسماندہ کرنے والے باور کیا جاتا تھا۔ مذہبی مقتدرہ اور اعتقادات اکثر بنیادی ہدف رہے تھے۔ بعض اوقات تضحیک کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا' جیسے سکوپس مقدمے میں۔ مشرقِ وسطیٰ میں' جہاں جدیدیت پذیری زیادہ پریشان کن تھی' طریقے زیادہ سفاکانہ تھے' جن میں قتلِ عام' لوٹ مار اور عقوبت شامل تھے۔ 1960ء اور 1970ء کے عشروں تک مذہبی لوگ مشتعل ہو چکے تھے اور انہوں نے اپنے ایقان کے مطابق جابر اور بالادست لبرلوں اور سیکولروں سے لڑنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ تاہم یہ مذہبی ریڈیکل بھی اپنے دور کی پیداوار تھے۔ انہیں جدید ہتھیاروں سے لڑنا اور ایک جدید نظریہ وضع کرنا تھا۔

امریکی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد سے مغربی سیاست نظریاتی رہی تھی' لوگوں نے عقل کے دور (Age Of Reason) کی روشن خیالی کے آدرشوں کے لیے بڑی بڑی جنگیں لڑی تھیں۔ وہ آدرش تھے: آزادی' مساوات' اخوت' انسانی مسرت اور سماجی انصاف۔ مغربی لبرل متفقہ طور پر یقین رکھتے تھے کہ تعلیم کے ذریعے معاشرہ اور سیاست زیادہ عقلی اور متحد ہو جائیں گے۔ سیکولر نظریہ یعنی لوگوں کو جنگ کے لیے متحرک کرنے کا ایک طریقہ' ایک جدید اعتقادی نظام تھا جو سیاسی اور سماجی جدوجہد کو جواز عطا کرتا تھا۔ جتنا زیادہ ممکن ہو اتنے لوگوں کو ترغیب دینے کے لیے کسی نظریے کو سادہ تصورات میں ظاہر کیا جاتا تھا' جسے اکثر و بیشتر ''اقتدار عوام کے لیے!'' یا ''غدار ہمارے اندر ہیں!'' جیسے نعروں میں سمویا جا سکتا ہو۔ تصور کیا جاتا تھا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ یہ انتہائی سادہ بنا دی گئیں صداقتیں ہر شے کی وضاحت کر سکتی ہیں۔ نظریہ سازوں کو یقین تھا کہ دنیا ایک خطرناک حالت میں ہے' وہ موجود بحران کی وجوہات ڈھونڈتے اور کوئی حل نکالنے کا وعدہ کرتے۔ وہ لوگوں کی توجہ کسی گروپ کی طرف مبذول کرواتے اور اسے دنیا کی تباہی کا الزام دیتے' نیز ایک اور گروپ کی طرف جو کہ معاملات کو درست کر دے گا۔ چونکہ جدید دنیا میں سیاست مکمل طور پر اشرافیہ کے لیے مخصوص نہیں رہ سکتی' اس لیے نظریے کو لازماً اتنا سادہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کی مجموعی طور پر حمایت حاصل کرنے کی غرض سے عام ذہنوں کو بھی متاثر کرے۔

اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ بعض گروپ نظریے کو کبھی نہیں سمجھ پاتے گے' کیونکہ وہ ایک ''جھوٹے شعور'' کے مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ نظریہ اکثر و بیشتر ایک بند نظام ہوتا ہے' جو متبادل تصورات کو سنجیدگی سے قبول نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داروں کو دنیا کے سارے مسائل کا سبب تصور کرنے والے مارکسی سرمایہ داری کی اقدار کو نہیں سمجھ سکتے اور دوسری طرف بھی یہی صورتحال ہے۔ نوآبادیات کار ابھرتی ہوئی قوم پرستی کی صداقتوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ صیہونی اور عرب ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تمام نظریات ایک غیر حقیقت پسندانہ اور' بعض لوگ کہیں گے' ناقابل ادراک یوٹوپیا کا تصور کرتے ہیں۔ وہ عین اپنی فطرت سے ہی انتخاب پسند ہوتے ہیں تاہم کسی خاص زمانے میں قوم پرستی' شخصی خودمختاری یا مساوات جیسے تصورات' جذبات اور ولولے ماحول میں موجود ہوتے ہیں جنہیں بہت سے مقابل نظریے اپنا لیتے ہیں' جو اکثر و بیشتر انہی تصورات ہی کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ وہ سب بھی تو اسی روح عصر سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

ایڈمنڈ برک کا ردِ انقلاب کا نظریہ:

تاریخ داں ایڈمنڈ برک (97-1929ء) ان اولین لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اس حقیقت کا ادراک کیا کہ اگر لوگوں کے کسی گروپ کو ایسٹیبلشمنٹ کے نظریے کو (جو ہوسکتا ہے کبھی خود انقلابی نظریہ رہا ہو) چیلنج کرنا ہو تو اسے اپنا ردِ انقلابی (Counter Revolutionary) نظریہ وضع کرنا ہوگا۔ 1960ء اور 1970ء کے عشروں میں بیشتر غیر مطمئن یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں میں سے کچھ کی کیفیت ایسی ہی تھی۔ اپنے تصور کے مطابق جدید ایسٹیبلشمنٹ کے عقلی تصورات (Fantasies) کو رد کرنے کے لیے انہیں ایسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصورات کو چیلنج کرنا تھا' جو کبھی ریڈیکل اور انقلابی رہ چکے تھے مگر اب اتنے آمرانہ اور بالادست ہو چکے تھے کہ وہ بدیہی لگتے تھے۔ وہ سب کمزور حالت میں تھے اور سب کو یقین تھا' بعض اوقات دلیل کے ساتھ' کہ سیکولر اور لبرل لوگ انہیں فنا کر دینے کے خواہاں ہیں۔ ایک مذہبی نظریہ تخلیق کرنے کی غرض سے انہیں اپنی روایت کی اساطیر اور علامتوں کو اس طرح دوبارہ تشکیل دینا تھا کہ وہ لوگوں کو ابھارنے اور ان کے عقیدے کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے ایک متاثر کن لائحۂ عمل بن جائے۔ ان مذہبی نظریہ سازوں میں سے بعض قدامت پسندانہ دور کی روحانیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ وہ صوفی تھے اور انہوں نے اساطیر اور رسوم سے گہری واقفیت حاصل کی ہوئی تھی' جس نے انہیں غیر مرئی حقیقت سے کامل آگاہ کر دیا تھا۔ تاہم ایک مشکل تھی۔ ماقبل جدید دور میں اسطورہ کو عملی طور پر نافذ کرنے کا کوئی رجحان نہیں ہوتا تھا۔ وہ کوئی ٹھوس لائحۂ عمل مہیا نہیں کرتی تھی' جب کبھی لوگوں نے اسطورہ کو سیاسی سرگرمی کے اچھال تختے (Spring Board) کے طور پر استعمال کیا' نتائج تباہ کن نکلے۔ اب جبکہ وہ سیکولر دنیا پر جوابی حملے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے تو ان مذہبی ریڈیکلوں کو اپنی اساطیر کو نظریے میں ڈھالنا تھا۔

مصر میں ناصر کا سائنسی سوشلزم:

مصر میں اسلام 1960ء کے عشرے کے دوران بھرپور نظریاتی حملے کی زد میں آ چکا تھا۔ ناصر اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا اور ایک ''ثقافتی انقلاب'' برپا کرنے اور اپنے بقول ''سائنسی سوشلزم'' کے نفاذ کا اعلان کر چکا تھا۔ مئی 1962ء کے ''نیشنل چارٹر'' میں اس نے تاریخ کی سوشلسٹ نقطۂ نظر سے تعبیر نو کی' یہ ایک ایسا نظریہ تھا جو'' ثابت کرتا تھا'' کہ سرمایہ داریت اور شہنشاہیت دونوں ناکام ہو چکی ہیں اور ''ترقی'' کا واحد قائد سوشلزم ہے' جس کا مطلب ہے حکومت خود اختیاری' پیداواریت اور صنعت پذیری۔ مذہب کو مردہ قرار دے دیا گیا۔ اخوان المسلمون کو مٹا دینے کے بعد ناصر اسلامی اصطلاحات کو استعمال کرنے کی ضرورت سے بے نیاز ہو گیا۔ 1961ء میں حکومت نے وسطی زمانے کی پرانی تعلیمات سے جڑے رہنے اور جامعہ الازہر کے ''مدافعتی' محدود اور تنگ نظری پر مبنی رجحان'' کے حوالے سے کہ جس نے اس کے لیے ''اپنے عہد کے مطابق ڈھلنا'' ناممکن بنا دیا تھا' علماء کی گوشمالی کی۔ بلاشبہ مصری علماء جدید دنیا سے الگ تھلگ تھے اور انہوں نے اصلاح کی مزاحمت جاری رکھی۔ وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے آپ کو سہو زمانی بنا رہے تھے اور مصری معاشرے کے جدیدیت پذیر حصوں پر اپنا سارا اثر کھو رہے تھے۔ اسی طرح اخوان المسلمون کے ایک چھوٹے سے گروپ کی دہشت گردی معاشرے کی تباہی کی بہت زیادہ ذمہ دار تھی۔ مسلمان ایسٹیبلشمنٹ اپنے آپ کو عمل سے باہر رکھتی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور جدید دنیا سے عدم مطابقت کا اظہار کر رہی تھی۔

1960ء کی دہائی میں مصر اور شام کے ''ناصری'' (Nasserist) مؤرخوں نے ایک نئے سیکولر نظریے کو ترویج دی۔ اسلام کو قومی مسائل کا ذمہ دار قرار دے دیا گیا۔ اسلام کو وہ ''خارجی گروپ'' بنا دیا گیا تھا' جسے عرب ملکوں کی ترقی کے لیے مٹا دینا لازمی تھا۔ شامی سکالر ذکی الارسوزی کو یقین تھا کہ مؤرخوں کو اس حقیقت کی بجائے کہ عربوں نے دنیا کو اسلام دیا' ان کے مادی کلچر سے متعلق کارناموں پر زور دینا چاہیے۔ (مثلاً ہائروغلیفی ابجد کو حرفوں میں ڈھالنا)۔ اس نے کہا کہ یورپ والوں کے مقابلے میں عربوں کی پسماندگی کی وجہ مذہب پر بہت زیادہ توجہ دینا ہے' یورپیوں نے روحانی کی بجائے طبیعی دنیا پر توجہ دی اور جدید سائنس' صنعت اور ٹیکنالوجی کو تخلیق کیا۔ شبلی الاعصامی نے کہا یہ امر شرمناک ہے کہ مسلمان مؤرخین نے اسلام سے پہلے کی تہذیب کو ''جاہلیت'' (عہد جہالت) قرار دے کر رد کر دیا' جبکہ قدیم یمن میں اس تہذیب کے کارنامے قابل لحاظ رہے ہیں۔ یاسین الحفیظ نے مقتدر طبقات کے تصورات کی نمائندگی کرنے والے اسلامی تاریخ ماخذات کے حوالے سے تشکیک کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا کہ ایک مردہ اور بعید ماضی کی نادرست یادوں پر ایک جدید نظریے کی تشکیل ناممکن اور بے سود ہے۔ مؤرخوں کو ایک زیادہ سائنسی اور جدلیاتی تاریخ نگاری کو لازماً ترویج دینا ہوگا' ''یہ ایک ایسا محاذ جنگ ہے' کہ انسان کو پرانے معاشرے کے پورے ڈھانچے کو تباہ کرنے کے لیے یہاں داد شجاعت دینی چاہیے۔'' مذہب اس ''جھوٹے شعور'' کا ذمہ دار ہے' جس نے کہ عربوں کو پسماندہ رکھا ہوا ہے' چنانچہ سائنسی اور عقلی ترقی کے لیے اس کو لازماً ترک کر دیا جانا چاہیے۔ ہر نظریے کے مانند اس نظریے کے دلائل بھی جانبدارانہ تھے' مذہب کی یہ تصویر کشی نادرست تھی۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ بھی تھی۔ جدید دنیا میں مذہب خواہ کوئی مقام رکھتا ہو (اور ابھی ہنوز اس کا فیصلہ ہونا تھا) ماضی کو مٹانا ہمیشہ ناممکن ہوتا ہے' جو کہ قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے ذہنوں میں زندہ رہتا ہے' خواہ پرانے ادارے اور ان سے منسلک افراد ختم ہی کیوں نہ کر دیئے گئے ہوں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابوالاعلیٰ مودودی اور مصر:

اس کے جواب میں نئے مذہبی نظریہ ساز بھی اتنے ہی جارحیت پسند تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ 1951ء میں پاکستانی صحافی اور سیاستدان ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں مصر میں شائع ہونا شروع ہوئیں۔ مودودی کو اندیشہ لاحق تھا کہ اسلام تباہ ہونے ہی کو ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ مغرب کی عظیم قوت اپنی افواج کو اکٹھا کر رہی ہے تاکہ اسلام کو روند دے اور اسے قصۂ پارینہ بنا دے۔ وہ ایک سنگین بحرانی زمانہ تھا اور مودودی کو یقین تھا کہ سچے مسلمان دنیا سے الگ رہ اور سیاست کو دوسروں پر چھوڑ نہیں سکتے۔ انہیں اس فروغ پاتے ہوئے لادینی سیکولرازم سے لڑنے کے لیے لازماً متحد ہو جانا چاہیے اور ایک انتہائی منظم گروپ تشکیل دینا چاہیے۔ مودودی نے لوگوں کو متحرک کرنے کے لیے اسلام کو ایک مدلل اور منظم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ اسے بھی زمانے کے دوسرے نمایاں نظریات کی طرح سنجیدگی سے لیا جائے۔ اسی لیے وہ ساری پیچیدہ متھوس کو لوگوں میں ڈھالنے کی کوشش کر رہے تھے یعنی عملیت پسندانہ فعالیت کے لیے لوگوں کو قائل کرنے اور انہیں قیادت فراہم کرنے کے لیے ایک عقلی نظام۔ پرانی قدامت پسندانہ دنیا میں ایسی کوئی کوشش غلط قرار دی جاتی لیکن اب مسلمان ماقبل جدید دور میں نہیں جی رہے تھے۔ اگر وہ خطرناک اور تشدد آمیز بیسویں صدی میں باقی رہنا چاہتے تھے تو کیا انہیں اپنے پرانے تصورات پر نظر ثانی کرنا تھی اور اپنے مذہب کو جدید بنانا تھا؟

مودودی کا نظریہ ان دوسرے جدید مسلمان مفکروں کی طرح، جن پر ہم آگے بحث کریں گے، خدا کی مطلق حاکمیت کے عقیدے پر استوار تھا۔

> ''کوئی انسان، خاندان، طبقہ یا افراد کا گروہ، حتیٰ کہ دنیا کی کوئی انسانی نسل مطلق حاکمیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ صرف خدا مطلق حاکم ہے۔''

حقیقت میں مودودی کسی بھی جدید فرد کی طرح آزادی کے گرویدہ تھے اور آزادی عطا کرنے والی ایک اسلامی الٰہیات پیش کر رہے تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ خدا مطلق حاکم ہے اس لیے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی اطاعت پر مجبور نہیں۔ رضائے الٰہی (جو قرآن و سنت میں عیاں کی گئی ہے) کے مطابق حکومت نہ کرنے والا حاکم اپنی رعایا کو اطاعت پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں انقلاب صرف ایک حق نہیں بلکہ فرض ہوتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی لیے اسلامی نظام اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ریاست حاکم کے من کی موج اور عزائم کی تابع نہیں۔ یہ مسلمانوں کو انسانی حکمرانی کے امکانی شر اور متلون مزاجی سے آزادی عطا کرتا ہے۔ اسلامی قانون کے اصول ''شوریٰ'' کے تحت خلیفہ عوامی رائے کا پابند ہے' تاہم اس سے جمہوری آدرش کے مانند یہ مراد نہیں کہ حکومت عوام سے اپنا جواز حاصل کرے۔ نہ تو خلیفہ اور نہ ہی عوام اپنے قانون خلق کر سکتے ہیں۔ وہ فقط شریعت کے تحت انتظام چلا سکتے ہیں۔ اسی لیے مسلمانوں کو نوآبادیاتی طاقتوں کی نافذ کردہ حکومت کی مغربی صورتوں کی مزاحمت لازماً کرنی چاہیے کیونکہ ایسی حکومتیں خدا سے بغاوت ہوتی ہیں۔ جب انسان حکومت کرتے ہیں تو شر اور جبر و استبداد کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ ایک نظریۂ آزادی ہے جو ایک پکے سیکولر کو عجیب و غریب لگتا ہے تاہم یہ تو ہر نظریے کے ساتھ ہوتا ہے کہ مخالف اس کی بصیرتوں کی تحسین سے قاصر ہوتے ہیں۔ مودودی روح عصر کی اقدار سے متصف تھے' وہ آزادی اور قانون کی حکمرانی میں یقین رکھتے تھے' جسے وہ بدعنوانی اور آمریت سے محفوظ رہنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے فقط ان مثالیوں (Ideals) کی تعریف مختلف انداز سے کی اور انہیں ایک اسلامی جہت عطا کی' تاہم سیکولرازم کا ''جھوٹا شعور'' رکھنے والے کسی شخص کے لیے اس کی تفہیم ناممکن تھی۔

مودودی نظریے کی قدر پر بھی یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ ہے۔ نازیوں اور مارکسیوں نے دوسرے انسانوں کو غلام بنایا جبکہ اسلام انسانوں کو خدا کے سوا ہر کسی سے آزادی عطا کرواتا ہے۔ ایک سچے نظریہ پسند کی حیثیت سے مودودی دوسرے تمام نظاموں کو نقائص سے معمور سمجھتے تھے۔ جمہوریت انتشار' حرص و ہوس اور ہجوم کی حکمرانی کا باعث بنی ہے' سرمایہ داریت نے طبقاتی جنگ برپا کی ہے اور ساری دنیا کو بیکاروں کی ایک قلیل سی تعداد کا غلام بنا دیا ہے' کمیونزم نے انسانی آزادی اور انفرادیت کو محدود کر دیا ہے۔ یہ عمومی نظریاتی تعمیم تھی۔ مودودی جزئیات اور مشکلات سے صرف نظر کر گئے تھے۔ اسلامی شوریٰ عملی اعتبار سے مغربی طرز کی جمہوریت سے کس طرح مختلف ہے؟ شریعت جدید صنعتی دنیا کی سیاسی اور معاشی دشواریوں سے کس طرح نمٹ سکتی ہے؟ مودودی نے کہا کہ اسلامی ریاست یک جماعتی (Totalitarian) ہو گی' کیونکہ یہ ہر شے کو خدا کی حکمرانی میں لے آئے گی' لیکن سوال یہ تھا کہ یہ عملاً آمریت سے کس طرح مختلف ہو گی؟ جس کے حوالے سے مودودی نے زور دے کر درست کہا تھا کہ قرآن نے اس کی مذمت کی ہے۔

ہر نظریہ ساز کی طرح مودودی بھی کوئی دقیق علمی نظریہ وضع نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو جنگ کی صدا دے رہے تھے۔ انہوں نے ایک آفاقی جہاد کا مطالبہ کیا' جسے انہوں نے اسلام کا بنیادی عقیدہ قرار دیا۔ اس سے پہلے کبھی کسی مسلمان مفکر نے ایسا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ مودودی کے خیال میں موجودہ ہنگامی حالات میں اس کی ضرورت تھی۔ جہاد کافروں کو مسلمان بنانے والی کوئی مقدس جنگ نہیں تھا' جیسا کہ مغرب کے لوگ یقین رکھتے تھے' اور نہ ہی یہ خالصتاً اپنے دفاع کا ذریعہ تھا' جیسا کہ محمد عبدہ' کا مؤقف تھا۔ مودودی نے جہاد کی تعریف ایک انقلابی جدوجہد کے طور پر کی' جس کے ذریعے ساری انسانیت کی بہتری کے لیے اقتدار حاصل کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے بھی مودودی' جنہوں نے 1939ء میں اپنا تصور وضع کیا تھا' مارکسزم جیسے عسکریت پسندانہ نظریوں سے مماثل نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ جس طرح رسول کریم ﷺ نے اسلام سے پہلے کی ''جاہلیت'' یعنی جہالت اور وحشت سے جنگ کی تھی' بالکل اسی طرح تمام مسلمانوں کو تمام میسر ذرائع سے مغرب کی جدید ''جاہلیت'' کی مزاحمت کرنا ہے۔ جہاد کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ کچھ لوگ مضامین لکھیں گے' دیگر تقریریں کریں گے' تاہم آخرالامر انہیں مسلح جدوجہد کے لیے لازماً تیار ہونا ہوگا۔

سید قطب: سُنّی بنیاد پرستی کے بانی:

مودودی کی عسکریت پسندی تقریباً عدیم النظیر تھی' تاہم صورتحال بھی زیادہ مایوس کن ہوچکی تھی' کیونکہ محمد عبدہ' اور حسن البنا پرامن انداز میں کوشش کر چکے تھے کہ جدید مغربی نظام کو قبول کرنے کے لیے اسلام میں اصلاح کی جائے۔ اب کچھ مسلمان جنگ کے لیے تیار تھے۔ مودودی کی تعلیمات سے گہرا اثر قبول کرنے والے افراد میں ایک سید قطب (1906-66ء) تھے' جو 1953ء میں اخوان المسلمون میں شامل ہوئے' 1954ء میں ناصر نے انہیں پندرہ سال قید بامشقت کی سزا دلوا کر جیل میں ڈال دیا' جہاں انہوں نے اسلام پسندوں (Islamists) کے ساتھ حکومت کے وحشیانہ برتاؤ کا مشاہدہ کیا۔ ناصر کے عقوبت کدوں میں ان کے تجربے نے انہیں مودودی سے کہیں زیادہ انقلابی بنا دیا۔ سید قطب کو سُنّی بنیاد پرستی کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ تقریباً تمام انقلابی اسلام پسندان کے نظریے پر عمل کرتے تھے' جسے انہوں نے جیل میں وضع کیا تھا۔ تاہم وہ مغربی کلچر سے ہمیشہ نفرت نہیں کرتے تھے اور انتہا پسند نہیں تھے۔ سید قطب نے قاہرہ کے دارالعلوم سے تعلیم حاصل کی تھی' جہاں وہ انگریزی ادب کے گرویدہ ہوگئے اور ادیب بن گئے۔ وہ قوم پرست بھی تھے اور وفد پارٹی کے رکن تھے۔ وہ چھوٹے قد والے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نرم گفتار ہونے نیز جسمانی اعتبار سے مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے شدت پسندوں کی طرح دکھائی نہیں دیتے تھے۔ تاہم سید قطب راسخ العقیدہ مذہبی انسان تھے۔ انہوں نے دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا اور قرآن ہی ان کی زندگی میں مرکزی حیثیت کا حامل رہا۔ تاہم نوجوانی میں ان کا عقیدہ اور مغربی کلچر اور سیکولر پالیسیوں کے حوالے سے ان کا ولولہ دوش بدوش چل سکتے تھے۔ لیکن 1940ء تک ان کی مغرب کی ستائش میں کمی آ گئی تھی۔ شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں برطانیہ اور فرانس کی نوآبادیاتی سرگرمیوں اور صیہونیت کے لیے مغرب کی حمایت سے وہ مایوس ہونے لگے تھے۔ امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گزارا ہوا زمانہ بھی آنکھیں کھول دینے والا تھا۔ انہوں نے امریکی کلچر کی عملیت پسندی کو پریشان کن پایا۔ انہوں نے بعد میں لکھا کہ ''فوری فائدے والے مقاصد کے علاوہ باقی ہر مقصد کو نظرانداز کردیا جاتا ہے اور انا کے علاوہ کسی انسانی وصف کو فوقیت نہیں دی جاتی۔ جہاں ساری زندگی پر مادیت پرستی کا غلبہ ہو وہاں انسانیت بے توقیر ہو جاتی ہے۔'' تاہم اس پر بھی وہ ایک اعتدال و اصلاح پسند ہی تھے اور ایک مکمل طور پر سیکولر نظریے کی افراط و تفریط سے بچتے ہوئے جمہوریت اور پارلیمنٹ جیسے مغربی اداروں کو ایک اسلامی جہت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

تاہم جیل میں سید قطب کے تجربے نے انہیں اس امر کا قائل کرلیا کہ مذہبی اور سیکولر لوگ ایک ہی معاشرے میں امن کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ جب وہ جیل میں اخوانوں پر ہونے والے مظالم کو یاد کرتے اور ناصر کے اسلام کو نظرانداز کرنے کے عزم پر غور کرتے تو انہیں ''جاہلیت'' کی تمام خصوصیات موجود نظر آ سکتی تھیں' جسے انہوں نے مودودی کی طرح عقیدے کا ہمیشہ کا دشمن قرار دیا اور جس سے تمام مسلمان مکہ کے جاہلی'' معاشرے سے لڑنے والے رسول کریم ﷺ کی پیروی میں تادم مرگ لڑنے کے پابند تھے۔ گویا سید قطب ابوالاعلیٰ مودودی سے آگے تھے' جنہوں نے صرف غیر مسلم دنیا ہی کو جاہلی تصور کیا تھا۔ 1960ء کی دہائی تک سید قطب اس امر کے قائل ہو گئے تھے کہ نام نہاد اسلامی دنیا بھی جاہلیت کے شر اور سفا کی سے بھری ہوئی ہے حالانکہ جیسا ناصر حکمران ظاہری طور پر مسلمان ہونے کا اعتراف تو کرتا ہے لیکن اس کے قول و فعل سے ثابت ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ مرتد ہے۔ ایسی حکومت کا تختہ الٹ دینا مسلمانوں پر فرض ہے۔

قطب جدید دنیا کے انسان تھے اور وہ ایک متاثر کن لوگوس تخلیق کر سکتے تھے' تاہم وہ اسطورہ کی دنیا سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ وہ عقل اور سائنس کا احترام تو کرتے تھے تاہم انہوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے ان کو صداقت کا واحد رہنما تصور نہیں کیا۔ قید کے دوران جہاں انہوں نے اپنا بنیاد پرستانہ نظریہ وضع کیا' وہاں قرآن مجید کی ایک یادگار تفسیر بھی لکھی' جس سے ان کی روحانی آگہی کا اظہار ہوا۔ انہوں نے لکھا انسانی ذہانت خواہ کتنی ہی عقلیت پسندانہ ہو جائے' وہ ہنوز ''لاعلمی کے سمندر میں'' تیر رہی ہے۔ تمام فلسفیانہ اور سائنسی پیشرفتیں ایک قسم کے ارتقاء میں یقیناً حصہ لیتی ہیں' تاہم وہ مستقل کائناتی قوانین کی جھلکیاں ہوتی ہیں' ''ایک وسیع و عریض سمندر'' کی لہروں کے مانند سطحی' ''جو مستقل فطری عوامل سے کنٹرول ہونے والے دھارے کو تبدیل نہیں کر سکتیں۔'' جہاں جدید عقلیت پسندی مادے پر توجہ مرکوز کر رہی تھی' وہاں سید قطب ارضی حقیقت کے ذریعے زمان و مکان سے ماورا حقیقت کو دیکھنے کی روایتی فکر کو ترویج دے رہے تھے۔ یہ اساطیری' جوہریت پسندانہ ذہنیت' جو دنیوی واقعات کو کم و بیش کاملاً ابدی' نخستمثالی حقیقتوں کو عیاں کرنے والے تصور کرتی ہے' ان کی فکر میں بہت اہم مقام رکھتی ہے۔ امریکہ میں اس کی واضح غیر موجودگی نے انہیں پریشان کر دیا۔ جب دیگر بنیاد پرستوں کی طرح سید قطب نے جدید سیکولر کلچر کو دیکھا تو انہیں ایک دوزخ نظر آئی' تقدس اور اخلاقی اہمیت سے خالی ایک مقام' جس نے انہیں دہشت سے بھر دیا۔

> ''دور حاضر میں انسانیت ایک بہت بڑے چکلے میں جی رہی ہے! اس کا ثبوت اخبارات' فلموں' فیشن' شوز' حسن کے مقابلوں' رقص گاہوں' مے خانوں اور نشریاتی سٹیشنوں پر صرف ایک نگاہ ڈال کر مل سکتا ہے! یا عریاں جسموں کی مجنونانہ نمائش' ہیجان انگیز ہیئتوں کے مشاہدے' نیز ادب' فنون اور ذرائع ابلاغ عامہ میں مریضانہ اشاروں سے اور اس سب پر مستزاد ہے سود کا نظام' جو انسان میں دولت کی ہوس کو فزوں تر کر دیتا ہے اور قانون کے لبادے میں دھوکا دہی' چالبازی اور بلیک میل سے زیادہ گھناؤنے طریقے اس میں اضافے اور سرمایہ کاری کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔''

وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس سیکولر معاشرے کے خلاف انقلاب برپا کریں۔ وہ جدید معاشرے میں روحانیت کے شعور کا احیاء چاہتے تھے۔

سید قطب تاریخ کو اساطیری انداز میں دیکھتے تھے۔ وہ ایک ناول نویس اور ادبی نقاد تھے اور جانتے تھے کہ صداقت تک مختلف ذرائع سے پہنچا جا سکتا ہے۔ سید قطب حضرت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد ﷺ کی حیات مبارکہ کو اپنے لیے نمونہ تصور کرتے تھے۔ آپؐ کی زندگی تاریخ' وقت' اور مقام کی قید سے آزاد مثالیہ (Ideal) پیش کرتی ہے۔ چنانچہ رسول کریم ﷺ کی زندگی کے مختلف مراحل وہ سنگ ہائے میل (Milestones) ہیں جو مرد وزن کو خدا کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی طرح ''جاہلیت'' کی اصطلاح صرف عرب کے اسلام سے پہلے کے دور کا حوالہ نہیں ہوسکتی' جیسا کہ روایتی مسلمان مؤرخین سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی انتہائی متنازعہ کتاب ''سنگ ہائے میل'' (Milestones) میں وضاحت کی کہ ''جاہلیت وقت کا کوئی دور نہیں ہوتا' یہ تو ایک صورتحال ہے' جو ماضی ہو یا حال یا مستقبل' جب بھی معاشرہ اسلامی راستے سے انحراف کرتا ہے' تب نمودار ہو جاتی ہے۔'' خدا کی حقیقت اور مطلق حاکمیت کو رد کرنے کی ہر کوشش ''جاہلی'' ہوتی ہے۔ قوم پرستی (جو ریاست کو اعلیٰ ترین قدر بنا دیتی ہے)' کمیونزم (جو دہریت ہے) اور جمہوریت سب کی سب ''جاہلیت کا ظہور ہیں' جو الوہیت کی بجائے انسانیت کی پرستش کرتی ہے۔ یہ بے خدائیت (Godlessness) اور ارتداد کی حالت ہوتی ہے۔ سید قطب نے نزدیک مصر اور مغرب کی جدید جاہلیت رسول کریم ﷺ کے دور کی جاہلیت سے بھی بدترین تھی کیونکہ اس کی بنیاد ''جہالت'' نہیں بلکہ خدا کے خلاف ایک منظم بغاوت تھی۔

عیسائیوں کے برخلاف مسلمانوں نے الوہیت کا تجربہ ہمیشہ عمل کے ذریعے کیا تھا۔ مسلمان بنیاد پرست ہمیشہ باعمل ہوتے ہیں اور امت کو مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ سید قطب نے حضرت محمد ﷺ کی زندگی کو چار مراحل میں تقسیم کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ بیسویں صدی میں خیر پر مبنی معاشرے کو قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو بھی اس چار مرحلوں والے عمل سے گزرنا ہوگا۔ دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح سید قطب ''مفاصلہ'' کی پالیسی کو بہت اہم تصور کرتے تھے۔ قطب نے زور دے کر کہا کہ دور حاضر کے مسلمانوں کو بھی اپنے دور کی جاہلیت کو لازماً رد کر دینا چاہیے اور ایک خالصتاً اسلامی معاشرہ تخلیق کرنے کے لیے اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔ وہ اپنے معاشرے کے بے عقیدہ لوگوں اور مرتدوں سے اچھا برتاؤ کر سکتے ہیں اور انہیں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا بھی چاہیے' تاہم ان سے تعلقات محدود رکھنے چاہئیں اور تعلیم جیسے اہم ترین معاملات میں عدم تعاون کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیے۔

قطب ہمیشہ زور دے کر کہتے تھے کہ خدا کے لیے مسلح جدوجہد اسلام کو بزور نافذ کرنے کی جابرانہ مہم نہیں ہوگی۔ ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح انہوں نے خدا کی مطلق حاکمیت کے اعلامئے کو اعلانِ آزادی کے طور پر دیکھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''وہ کرۂ ارض پر انسان کی دوسرے انسانوں یا انسانی خواہشات سے آزادی کا آفاقی اعلان تھا ..... خدا کی مطلق حاکمیت کے اعلان کا مطلب ہے' انسانی حکومت کی تمام صورتوں' نظاموں' تصورات اور صورتحال کے خلاف ایک جامع انقلاب نیز ہر ایسی صورتحال کے خلاف مکمل جنگ' جس میں انسان مطلق حاکم ہوتے ہیں۔''

قطب کا نظریہ جوہری اعتبار سے جدید تھا۔ اپنی فکر میں خدا کی مرکزیت سے قطع نظر وہ جدید نظام کے استرداد میں ساٹھ کی دہائی کے ایک انسان تھے۔ ان کا نظریہ سادہ تھا' اس میں دشمن کا واضح تعین کیا گیا تھا اور ایک ''جماعت'' کی نشاندہی کی گئی تھی جو معاشرے کو از سرنو تخلیق کرتی۔ اپنے معاشرے کی تقسیم اور تشکیل نو پر فکر مند مسلمانوں کے لیے سید قطب کے نظریے نے جدیدیت کے اہم پہلوؤں کو اسلامی محاورے میں منتقل کر دیا تھا' جو ان کے لیے قابل قبول تھا۔ انہوں نے برطانویوں کی عطا کردہ ''آزادی'' کو نجات دینے والی یا قوت و اختیار دینے والی آزادی نہیں پایا تھا۔ جولائی 1967ء کی ''چھ روزہ جنگ'' میں اسرائیل کے ہاتھوں ناصر کی شکست نے ناصرازم' سوشلزم اور قوم پرستی جیسے سیکولر نظریات کو بہت سے لوگوں کی نظر میں بے وقار بنا دیا تھا۔ پورے مشرق وسطیٰ میں ایک مذہبی احیاء برپا ہو گیا اور مسلمانوں نے بہت بڑی تعداد میں سید قطب کے نظریے سے فیضان پایا۔

تاہم سید قطب نے جہاد کو مسلم وژن کا مرکز بنا کر رسول کریم ﷺ کی تعلیمات سے انحراف کیا تھا۔ سیرت کی کتابوں سے واضح ہوتا ہے کہ امت کو اپنی بقا کے لیے جنگیں لڑنا پڑیں تاہم حضرت محمد ﷺ نے تلوار کے ذریعے نہیں بلکہ عدم تشدد کی ایک تخلیقی اور سادہ پالیسی کے ذریعے فتح حاصل کی تھی۔ قرآن جنگ و جدل کو مکروہ قرار دیتا ہے اور صرف اپنے دفاع کی جنگ لڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مذہبی معاملات میں قوت کے استعمال کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ قرآن تو تمام سابقہ انبیاء و رسل کی بہت تکریم کرتا ہے۔

رسول کریم ﷺ نے بھی اپنے آخری خطبے میں مذہب کے ذریعے افہام و تفہیم پیدا کرنے کی ہدایت کی تھی۔ سید قطب کا علیحدگی والا وژن اس رواداری کے خلاف تھا۔ قرآن نے وضاحت کے ساتھ اور تاکیداً کہا ہے کہ ''مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہوگا۔'' سید قطب نے اس کی تاویل یوں کی کہ رواداری صرف اس وقت برتی جائے گی جب اسلام سیاسی فتح حاصل کر لے گا اور ایک سچی اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ نیا کٹر پن اسی خوف سے پیدا ہوا تھا کہ جو بنیاد پرستانہ مذہب کی بنیاد ہوتا ہے۔ سید قطب نے جدید ''جاہلیت'' کی ہلاکت انگیز اور تباہ کن قوت کا تجربہ کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ناصر اسلام کو مٹانا چاہتا ہے اور وہ تنہا نہیں تھا۔ جب سید قطب نے تاریخ پر نظر ڈالی تو انہیں یکے بعد دیگرے ''جاہلی'' دشمن اسلام کو تاخت و تاراج کرتے نظر آئے: مشرک' یہودی' عیسائی' صلیبی جنگجو (Crusaders)' منگول' کمیونسٹ' سرمایہ دار' نوآبادیات کار اور صیہونی۔'' اب وہ ایک بار پھر مل کر ایک ہمہ گیر سازش کر رہے تھے۔ سید قطب ایک سچے بنیاد پرست کی سوچ کے تحت ہر جگہ یہودی عیسائی گٹھ جوڑ دیکھتے تھے۔ یہودی اور عیسائی سرمایہ داروں نے فلسطین کو عربوں سے چھین لیا' یہودیوں نے ہی سرمایہ داریت اور کمیونزم ہر دو کو تخلیق کیا تھا' یہودیوں اور مغربی سامراجیوں نے اسلام سے نجات حاصل کرنے کے لیے اتاترک کو اقتدار دلوایا تھا اور جب دوسری ریاستوں نے ترکی کی مثال پر عمل نہیں کیا تو انہوں نے ناصر کی حمایت کی تھی۔ اس قسم کے دیگر تصورات کی طرح سازش والا تصور بھی حقائق منظر عام پر آنے کے بعد نقش برآب ثابت ہوا تاہم جب انسان یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں تو یہ امر یقینی نہیں ہوتا کہ ان کے خیالات معقول ہوں۔

سید قطب زندہ نہیں رہ پائے۔ 1964ء میں' شاید عراق کے وزیراعظم کی درخواست پر' انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔ قید کے دوران ان کی بہنیں ان کی تحریریں جیل سے باہر لاتیں اور خفیہ طور پر تقسیم کر دیتی تھیں' تاہم رہائی کے بعد سید قطب نے ''سنگ ہائے میل'' (Milestones) شائع کروائی۔ اگلے برس حکومت نے دہشت گردوں کا ایک نیٹ ورک پکڑا' جن پر الزام تھا کہ وہ ناصر کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ سید قطب سمیت سینکڑوں اخوانوں کو گرفتار کر لیا گیا اور 1966ء میں ناصر کے حکم پر سید قطب کو سزائے موت دے دی گئی۔ تاہم اپنی موت تک سید قطب ایک احتجاجی (Agitator) نہیں بلکہ نظریہ ساز ہی رہے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ دلیل دی کہ اخوانوں کا اسلحہ جمع کرنا صرف 1954ء جیسے واقعات کے دوبارہ رونما ہونے سے بچنے کے لیے ہے۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ جہاد کا اعلان کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ مسلمانوں کو رسول کریم ﷺ کے پروگرام کے ابتدائی مرحلوں سے گزرنا ہوگا اس کے بعد وہ روحانی اور تزویراتی اعتبار سے جاہلیت پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ تمام اخوان ان کے پیروکار بھی نہیں تھے۔ بیشتر اخوان حدیبی کے زیادہ اعتدال پسندانہ اصلاحی وژن سے مخلص رہے تاہم جیلوں اور عقوبت کدوں میں لاتعداد مسلمانوں نے سید قطب کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریروں کا مطالعہ کیا' ان پر بحث مباحثہ کیا اور ''چھ روزہ جنگ'' کی زیادہ مذہبی فضا میں ایک کیڈر (Cadre) تخلیق کرنا شروع کیا۔

ایران کا سفید انقلاب:

جب 1962ء میں شاہ محمد رضا پہلوی نے ''سفید انقلاب'' کا اعلان کیا تو ایران کے شیعی مسلمانوں نے بھی سیکولر جارحیت کی ایک نئی لہر کا تجربہ کیا۔ سفید انقلاب میں شامل تھا ریاستی سرمایہ داریت کا نفاذ' محنت کشوں کے لیے منافعوں میں زیادہ حصہ اور زمین کی ملکیت کی نیم جاگیردارانہ صورتوں کا قلع قمع اور ایک تعلیمی کور (Corps) کا قیام۔ شاہ کے بعض منصوبے کامیاب رہے۔ صنعتی' زرعی اور سماجی منصوبے متاثر کن لگتے تھے اور 1960ء کی دہائی میں ایران کی خام قومی پیداوار (Gross National Product) میں زبردست اضافہ ہوا۔ حالانکہ شاہ ذاتی طور پر عورتوں کو کمتر صنف تصور کرتا تھا' تاہم اس نے ایسی اصلاحات کا آغاز کیا جن سے عورتوں کی حیثیت اور تعلیم بہتر ہوگئی' گو کہ اس سے صرف بالائی طبقے کی عورتوں ہی کو فائدہ ہوا۔ مغرب میں شاہ کے کارناموں کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا: ایسا لگتا تھا کہ ایران مشرق وسطیٰ میں ترقی اور ہوشمندی کا مینارۂ نور بن گیا ہے۔ مصدق بحران کے بعد شاہ نے امریکہ سے دوستی کی پینگیں بڑھائیں اور ریاست اسرائیل کی حمایت کی' اس کے صلے میں غیر ملکی سرمایہ کاری ہوئی اور معیشت مضبوط ہوگئی۔ تاہم اس زمانے ہی کے بعض دانشمند مشاہدین نے محسوس کیا کہ یہ اصلاحات دیرپا نہیں ہوں گی۔ اصلاحات امیروں کے حق میں تھیں' شہر میں رہنے والوں کو فوقیت دی گئی تھی اور کاشتکاروں کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ تیل اور گیس سے حاصل ہونے والے منافعوں کو مؤثر انداز سے استعمال نہیں کیا گیا بلکہ نمائشی منصوبوں اور جدید ترین عسکری ٹیکنالوجی پر خرچ کر دیا گیا۔ نتیجتاً معاشرے کے بنیادی ڈھانچے جوں کے توں رہے اور مغرب زدہ امیروں اور ان روایت پسند غریبوں کے درمیان خلیج مزید وسیع ہوگئی' جو کہ پرانے زرعی نظام ہی میں پھنسے ہوئے تھے۔

زراعت میں زوال کی وجہ سے لوگ بڑی تعداد میں شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے لگے: 1968ء سے لے کر 1978ء کے درمیانی عرصے میں شہری آبادی میں 38 سے 47 فیصد اضافہ ہوا۔ ان برسوں کے دوران تہران کی آبادی تقریباً دگنی ہوگئی۔ دیہاتوں سے آنے والے لوگ شہروں کے محیط پر جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ وہ قلیوں' ٹیکسی ڈرائیوروں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خوانچہ فروشوں کی حیثیت سے کام کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ تہران جدید اور روایتی علاقوں میں بٹ گیا تھا: مغرب زدہ بالائی اور متوسط طبقے کے لوگ پرانے شہر سے منتقل ہو کر شمال میں نئے رہائشی اور تجارتی علاقے میں رہنے لگے' جہاں بے کدے اور جوا خانے تھے اور جہاں عورتیں یورپی لباس پہنتی اور مردوں سے کھلم کھلا میل جول رکھتی تھیں۔ پرانے شہر اور اس سے متصل جنوبی علاقوں میں رہنے والے غریبوں اور ''بازاریوں'' کو تو وہ ایک غیر ملکی علاقہ لگتا تھا۔

بیگانگی کا شکار ایرانی:

یوں ایرانیوں کی اکثریت انتہائی بے چین کر دینے والے انسانی جذبات سے دوچار تھی۔ شناسا دنیا اجنبی ہو گئی تھی' وہ اپنی تھی اور اپنی نہیں بھی تھی' ایک پرانے دوست کی طرح جس کے خدوخال اور شخصیت بیماری سے مسخ ہو گئے ہوں۔ جب ہماری جانی پہچانی دنیا اس تیز رفتاری سے تبدیل ہو' جس سے 1960ء کی دہائی کے دوران ایران تبدیل ہوا تھا' تو مرد و زن اپنے ہی ملک میں اجنبیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایرانیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہر طرف بیگانگی محسوس کرنے لگی۔ 1953ء کے سنگین بحران کے بعد بہت سے لوگوں میں بین الاقوامی برادری کے ہاتھوں شکست اور ذلت کا احساس پیدا ہو گیا۔ ایسے لوگ جنہوں نے مغربی تعلیم حاصل کی تھی' وہ اپنے والدین اور خاندانوں سے اجنبیت محسوس کرنے لگے' وہ خود کو دو دنیاؤں میں پھنسا ہوا اور کسی میں بھی پرسکون نہیں پاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا زندگی معنویت سے عاری ہو گئی ہے۔ 1960ء کی دہائی کے ادب میں کثرت سے آنے والی علامتیں بڑھتی ہوئی بیگانگی کا اظہار تھیں: دیواریں' تنہائی' معدومیت' اکیلا پن اور منافقت۔ معاصر ایرانی نقاد فیضانہ میلانی نے 1960ء اور 1970ء کی دہائی میں ''تحفظ اور رازداری کی متنوع صورتوں'' کو بیان کرنے والی تمثالوں کے حاوی ہونے کا ذکر کیا ہے۔

> ''گھروں کے گرد دیواریں قائم ہوتی ہیں۔ عورتیں پردوں میں ہوتی ہیں۔ مذہبی تقیہ عقیدے کا تحفظ کرتا ہے۔ تعرف حقیقی خیالات اور جذبات کا روپ بدل دیتا ہے۔ گھر درونی اور بیرونی اور باطنی حصوں میں بٹ گئے ہیں۔''

ایرانی اپنے آپ سے اور ایک دوسرے سے چھپا رہے تھے۔ وہ پہلوی ریاست میں تحفظ کا احساس کھو چکے تھے' جو کہ ایک انتہائی ڈرا دینے والا مقام بنتی جا رہی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساواک کے مظالم:

شاہ نے اپنے سفید انقلاب کا آغاز ''مجلس'' کو ختم کر کے کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ صرف آمرانہ حکمرانی اور مخالفوں کو کچل کر ہی اپنی اصلاحات کو فروغ دے سکتا ہے۔ اسے اپنی خفیہ پولیس ساواک (SAVAK) کی مدد حاصل تھی۔ جسے 1957ء میں امریکی سی آئی اے اور اسرائیلی موساد کے تعاون سے قائم کیا گیا تھا۔ ساواک کے ظالمانہ ہتھکنڈوں اور تشدد اور ڈرانے دھمکانے کی پالیسی سے لوگ خود کو اپنے ہی ملک میں قیدی محسوس کرنے لگے اور امریکہ اور اسرائیل سے نفرت کرنے لگے۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائی کے دوران اس زمانے میں ترقی پذیر دنیا میں نمودار ہونے والے دوسرے گوریلا گروپوں جیسی دو پارلیمانی تنظیمیں قائم ہوئیں: فدائیانِ خلق' ایک مارکسی گروپ تھا جسے اس وقت ممنوع قرار دے دی گئیں تو وہ اور قومی محاذ پارٹی کے اراکین نے قائم کیا تھا اور ایک اسلامی کور (CORPS) مجاہدین خلق۔ تمام معمول کی مخالفت کو دبا دینے والی اور رائے کی بجائے جبر پر مبنی حکومت سے لڑنے کا واحد طریقہ صرف قوت ہی دکھائی دیتی ہے۔

''غرب زدگی'':

دانشوروں نے اس حکومت سے تصورات کے ذریعے لڑنے کی کوشش کی۔ وہ ملک میں بے چینی سے پریشان تھے اور دیکھ سکتے تھے کہ جدیدیت پذیری تیزی سے ہو رہی ہے اور اس کے نتیجے میں وسیع بیگانگی جنم لے رہی ہے۔ 1960ء کی دہائی کے اواخر میں تہران یونیورسٹی میں پروفیسر بن جانے والے ذہین فلسفی احمد فردید (94-1912ء) نے ایرانی مخمصے کو بیان کرنے کے لیے ''غرب زدگی'' کی اصطلاح وضع کی۔ انہوں نے لکھا کہ مغرب نے لوگوں کو مسموم اور آلودہ کر دیا ہے۔ انہیں اپنے لیے نیا تشخص لازماً تخلیق کرنا ہوگا۔ اس تصور کو سیکولر اور ایک زمانے میں سوشلسٹ رہنے والے جلال آل احمد (69-1923ء) نے بڑھایا جن کی کتاب ''غرب زدگی'' (1962ء) 1960ء کی دہائی میں ایرانیوں کی مذہبی کتاب بن گئی تھی۔ ''جڑوں سے محرومی'' اور ''غرب زدگی'' ایسی بیماریاں تھیں' جو اثر پذیر فضا میں تیزی سے نفوذ کر رہی تھیں۔ یہ ایسے لوگوں کی حالتِ زار تھی ''جو نہ تو کسی معاون روایت کے حامل تھے' نہ تاریخی تسلسل کے' اور نہ ہی قلبِ ماہیئت کے بتدریج عمل کے۔''

تاہم آل احمد خود منقسم انسان تھا: وہ سارتر اور ہائیڈگر جیسے مغربی ادیبوں سے متاثر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا اور جمہوریت اور آزادی جیسے مغربی آدرشوں کو پسند کرتا تھا' لیکن اسے یہ نہیں سوجھی کہ انہیں ایران کی اجنبی سرزمین میں کامیابی کے ساتھ کس طرح رائج کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مغربی تعلیم یافتہ ایرانیوں کے ''اذیت ناک شیزوفرینیا'' کو بیان کیا ہے' جو اپنے آپ کو دو دستوں میں کھنچتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اور اگرچہ وہ مسئلے کو تو یادگار انداز میں بیان کر سکتا تھا تاہم اس نے کوئی حل تجویز نہیں کیا..... گو کہ ایسا لگتا ہے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وہ شیعیت کو حقیقی ایرانی تشخص کی اساس اور مغربیت کی بیماری کا مداوا تصور کرنے لگا تھا۔

شاہ کے آمرانہ اقدامات پر ایرانی علماء کا ردعمل:

ایرانی علماء مصری مذہبی پیشواؤں سے بالکل مختلف تھے۔ بہت سوں کو آگاہی تھی کہ اگر انہیں اپنے لوگوں کی مدد کرنی ہے تو انہیں اپنے آپ کو اور اپنے اداروں کو جدید بنانا ہوگا۔ وہ شاہ کی آمرانہ حکمرانی سے مضطرب ہوتے جا رہے تھے' جس نے بنیادی شیعی اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی اور مذہب سے واضح طور پر بے اعتنائی روا رکھتا تھا۔ 1960ء میں مرجع اعلیٰ آیت اللہ بروجردی بھی' جنہوں نے مذہبی پیشواؤں کو سیاست میں کوئی بھی حصہ لینے سے روک رکھا تھا' شاہ کے قانون اصلاحِ اراضی کی مذمت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ بڑا افسوسناک امر ہے کہ انہوں نے اس مسئلے کو منتخب کیا' کیونکہ اس کی وجہ سے علماء' جن میں سے بہت سوں کے پاس بہت زمینیں تھیں' خود غرض ثابت ہوگئے۔ درحقیقت آیت اللہ بروجردی کی مداخلت کا محرک شاید یہ جبلی احساس ہو کہ یہ قانون تابوت میں آخری کیل بھی ہو سکتا ہے۔ اصلاحِ اراضی کا قانون شریعت کے قوانین ملکیت کے خلاف تھا اور بروجردی کو احتمال تھا کہ اگر یہ قانون نافذ ہوگیا تو اس سے شریعت کے دیگر قوانین سے متصادم قوانین کے نفاذ کی راہ کھل جائے گی۔ جب اگلے برس مارچ میں آیت اللہ بروجردی فوت ہوگئے تو ''مرجع'' کا منصب خالی ہی رہا۔ علماء کے ایک گروہ نے کہا کہ شیعیت کو زیادہ جمہوری بننا چاہیے اور اس نئی پیچیدہ دنیا میں یہ توقع کرنا حقیقت پسندی نہیں ہے کہ ایک انسان ''اعلیٰ ترین راہ نما'' ہو۔ نئی قیادت بہت سے ''مراجع'' پر مشتمل ہونی چاہیے' جن میں سے ہر ایک اپنے شعبے کا متخصص ہو۔ یہ واضح طور پر ایک جدید اقدام تھا اور اصلاح پسندوں کے اس گروپ میں ایسے بہت سے علماء شامل تھے جنہوں نے آگے چل کر اسلامی انقلاب میں کلیدی کردار ادا کیا: آیت اللہ سید محمد بہشتی' فاضل الٰہیات مرتضیٰ مطہری' علامہ محمد حسین طباطبائی اور ایران کے سیاسی اعتبار سے سب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے زیادہ انقلابی مذہبی پیشوا آیت اللہ محمود طالقانی۔ 1960ء کے موسم خزاں میں انہوں نے خطابات کا سلسلہ شروع کیا اور اگلے برس مضامین کا ایک مجموعہ چھپوایا' جس میں شیعوں کو جدید بنانے کے طریقوں پر بحث کی گئی تھی۔

اصلاح پسندوں کو یقین تھا کہ اسلام ایک مکمل طرز حیات ہے' اس لیے علماء کو سیاست میں حصہ لینے سے احتراز نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا تصور نہیں کیا' تاہم ان کا ایقان تھا کہ جب علماء محسوس کریں کہ ریاست جابرانہ اور عوام کی ضروریات پوری کرنے سے بے نیاز ہوتی جارہی ہے تو انہیں شاہوں کے خلاف کھڑے ہو جانا چاہیے جیسا کہ انہوں نے ''تمباکو بحران'' اور ''آئینی انقلاب'' کے وقت کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مدارس کے نصاب پر نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ مذہبی پیشواؤں کو اپنی مالیات کو بھی بہتر کرنا چاہیے: بحالات موجودہ وہ رضا کارانہ عطیات پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں اور چونکہ لوگ قدامت پسندی کی طرف مائل ہیں' اس لیے علماء بنیادی تبدیلیاں نہیں لا سکتے۔ اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اگر تجارت' سفارت کاری اور جنگ جیسی جدید حقیقتیں عوام کے سچے مفاد میں ہوں تو شیعوں کو انہیں ضرور قبول کر لینا چاہیے۔ سب سے بڑھ کر انہیں اپنے شاگردوں کو بولنے کا موقع دینا چاہیے۔ 1960ء کی دہائی کے نوجوان بہتر تعلیم یافتہ تھے اور پرانے پراپیگنڈے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مذہب سے دور ہوتے جارہے تھے کیونکہ انہیں شیعیت کے جو تصورات دیئے گئے تھے وہ زندگی سے عاری اور فرسودہ تھے۔ مغرب میں نوجوان کلچر کے پوری طرح پروان چڑھنے سے پہلے ہی مذہبی پیشوا نوجوانوں کے حوالے سے اپنی سوچ پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان کی تحریک اصلاح میں مٹھی بھر علماء ہی شامل تھے' وہ عوام تک وسیع نہیں تھی اور اس نے حکومت پر کوئی تنقید نہیں کی۔ وہ صرف شیعیت کے داخلی معاملات تک ہی محدود رہی۔ تاہم وہ مذہبی حلقوں میں کافی بحث مباحثے اور زیادہ علماء کے تبدیلی کی طرف راغب ہونے کا پیش خیمہ بنی۔ تاہم علماء اس وقت دفعتاً حیرت زدہ ہو کر رہ گئے جب اس وقت تک غیر اہم رہنے والے ایک مذہبی پیشوا اخباری سرخیوں کی زینت بن گئے اور انہوں نے ایک زیادہ انقلابی اقدام اٹھایا۔

خمینی کی انقلابی سرگرمیاں:

1960ء کی دہائی کے اوائل تک زیادہ سے زیادہ طلباء قم کے فیضیہ مدرسہ میں آیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ خمینی کے اسلامی اخلاقیات کے کورس کی طرف کھنچنے لگے تھے۔ وہ دوران تدریس اپنا منبر چھوڑ کر نیچے طلباء کے ساتھ آ بیٹھتے اور حکومت پر کھل کر تنقید کرتے۔ تاہم 1963ء میں خمینی نے اس احتیاط کو ترک کر دیا اور منبر سے ہی بات کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی سرکاری حیثیت میں ہی شاہ پر زبردست تنقید شروع کر دی' جسے انہوں نے اسلام کا دشمن قرار دیا تھا۔ ایک ایسے زمانے میں کہ جب کسی کو حکومت کے خلاف بات کرنے کی جرأت نہیں تھی' خمینی نے شاہ کی غیر منصفانہ حکمرانی' مجلس کی غیر آئینی تحلیل' تشدد' تمام مخالفین پر شرانگیز جبر' امریکہ کی چاپلوسی اور فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے محروم کر دینے والے اسرائیل کی حمایت جیسے معاملات پر احتجاج کیا۔ وہ غریبوں کے مسائل پر بالخصوص پریشان تھے۔ انہوں نے کہا کہ شاہ کو اپنے عظیم الشان محل سے نکل کر جنوبی تہران میں غریبوں کی حالتِ زار پر نظر ڈالنی چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں 1960ء کا آئین تھام کر شاہ پر ان دونوں کے دفاع کا حلف توڑنے کا الزام لگایا۔ 22 مارچ 1963ء کو' چھٹے امام کے یوم شہادت کی ماتمی تقریب کے موقع پر (جنہیں 765ء میں خلیفہ المنصور نے زہر دلوایا تھا) ساواک نے مدرسے کو گھیر کر حملہ کیا اور بے شمار طلباء کو قتل کر دیا۔ خمینی کو گرفتار کر لیا گیا۔ حکومت کے لیے اس تاریخ کو اقدام کرنا بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ خمینی کے ساتھ اپنی طویل کشمکش میں شاہ نے اپنے آپ کو ایک جابر حکمران اور اماموں کے دشمن کے طور پر پیش کیا۔

خمینی نے اس وقت کو بولنے کے لیے کیوں چنا؟ پوری زندگی انہوں نے ملا صدرا کے عرفان پر عمل کیا تھا۔ ملا صدرا کی طرح خمینی کے لیے بھی تصوف اور سیاست الگ الگ نہیں تھے۔ ان کے مطابق معاشرے میں سماجی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک روحانی اصلاح نہ کی جائے۔ خمینی نے وفات سے قبل لوگوں کو عرفان کے مطالعے اور اس پر عمل کی ہدایت کی تھی' یہ وہ نظام ہے' جس کو کہ علماء نظر انداز کرنے پر مائل تھے۔ خمینی کے نزدیک متھوس سے منسلک صوفیانہ جستجو کو لوگوں کی عملی سرگرمیوں سے لازماً مربوط ہونا چاہیے۔ خمینی سے ملنے والے لوگ روحانیت میں ان کے واضح انجذاب پر ہمیشہ چونک اٹھتے تھے۔ شیعہ ان کی کم آمیزی' اندر اتر جانے والی نگاہ اور ان کی یک آہنگ تقریر کو (جو مغربیوں کو بے کشش لگتی تھی) باآسانی ایک ''متین'' صوفی کی نشانی کے طور پر پہچان سکتے تھے۔ ملا صدرا امام کے روحانی ارتقاء کے بارے میں بیان کر چکے تھے۔ اپنا سیاسی سفر شروع کرنے سے پہلے اسے انسان سے خدا تک کا سفر لازمی کرنا چاہیے' اور ذات کے عرفان کی راہ میں رکاوٹ بننے والی انا پرستی سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹکارا پالینا چاہیے۔ صرف اس طویل اور منظم عمل کے بعد ہی وہ دنیا کی طرف لوٹ سکتا ہے اور معاشرے پر الوہی قانون کو نافذ کرسکتا ہے۔ امریکی سکالر حامد الگر لکھتا ہے کہ جب انہوں نے 1963ء میں شاہ کے خلاف بولنا شروع کیا تو خمینی ''خدا کی طرف اولین اور جوہری سفر'' مکمل کر چکے تھے اور سیاست میں ایک فعال کردار ادا کرنے کے لیے خود کو تیار محسوس کرتے تھے۔

خمینی کو چند روز حراست میں رکھ کر رہا کر دیا گیا تاہم وہ فوراً ہی جارحیت پر لوٹ آئے۔ فیضیہ مدرسہ پر ساواک کے حملے کے چالیس روز بعد طالب علموں نے مقتولین کے لیے روایتی ماتمی تقریبات منعقد کیں۔ خمینی نے اپنی تقریر میں رضا شاہ کی 1935ء میں مشہد کے مزار کی بے حرمتی کا حوالہ دیا' جب سینکڑوں احتجاج کرنے والوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ پورے موسم گرما وہ حکومت کی مذمت کرتے رہے' بالآخر یوم عاشورہ (3 جون 1963ء) کے جلوس میں خمینی نے ایک ماتمی خطاب کیا جبکہ لوگ روتے اور سسکیاں بھرتے رہے۔ خمینی نے کہا کہ شاہ یزید کے مانند ہے۔ جب پولیس نے گزشتہ مارچ میں فیضیہ مدرسہ پر حملہ کیا تو اس نے قرآن مجید کو کیوں شہید کیا تھا؟ اگر انہوں نے ایک عالم کو گرفتار کرنا تھا تو ایک اٹھارہ سالہ طالب علم کو کیوں قتل کیا تھا؟ اس کا واحد جواب یہی ہے کہ شاہ مذہب کو برباد کر دینا چاہتا ہے۔ انہوں نے اصلاح کی صدا بلند کی:

> ''ہمارا ملک' ہمارا اسلام خطرے میں ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو ہونے والا ہے' اس سے ہم پریشان اور اداس ہیں۔ ہم اس برباد کر دیئے گئے ملکی کی حالت پر پریشان اور اداس ہیں ہمیں خدا سے امید ہے کہ وہی اصلاح کرنے پر قادر ہے۔''

اگلی صبح خمینی کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور اس مرتبہ پیمانہ صبر چھلک گیا۔ جب ایرانیوں نے ان کی گرفتاری کی خبر سنی تو وہ ہزاروں کی تعداد میں تہران' مشہد' شیراز اور اصفہان کی سڑکوں پر نکل آئے اور احتجاج شروع ہوگیا۔ ساواک کو حکم دے دیا گیا کہ مظاہرین کو گولیوں سے اڑا دیا جائے۔ لوگوں کو جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روکنے کے لیے ٹینکوں سے تہران کی مسجدوں کا محاصرہ کرلیا گیا۔ تہران' قم اور شیراز میں ممتاز علماء نے جلوسوں کی قیادت کی' جبکہ دوسروں نے حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ بعضوں نے حضرت حسینؓ کی طرح جبر کے خلاف مرنے پر آمادگی کے اظہار کے لیے کفن پہن لیے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں' عام آدمیوں اور مذہبی پیشواؤں نے شانہ بشانہ یہ لڑائی لڑی۔ ساواک کو اس ابھار کو دبانے میں کئی دن لگ گئے' جس سے سطح کے نیچے سلگتا ہوا تناؤ اور آزردگی عیاں ہوئی۔ جب 11 جون کو نظم ونسق بالآخر بحال ہوا تو سینکڑوں ایرانی مارے جا چکے تھے۔

خمینی خود سزائے موت سے بال بال بچے۔ ایک انتہائی برگزیدہ مجتہد آیت اللہ محمد کاظم شریعت مداری (85-1904ء) نے خمینی کو آیت اللہ العظمیٰ کے منصب پر ترقی دے کر ان کی جان بچائی' کیونکہ اس کے بعد حکومت کے لیے انہیں قتل کروانا مشکل ہو گیا تھا۔ رہائی کے بعد خمینی عوام کے ہیرو بن گئے۔ ان کی تصویر اختلاف کے اظہار کے لیے ہر طرف نمایاں ہو گئی۔ انہوں نے شاہ کے خلاف ہزاروں بے نوا ایرانیوں کے جذبات کو آواز دے دی تھی۔ خمینی کے وژن میں بھی بنیاد پرستی کے عمومی نقائص موجود تھے۔ وہ اپنی تقریروں میں مستقلاً یہودیوں' عیسائیوں اور سامراجیوں کی سازش کا حوالہ دیتے رہے' یہ ایک ایسا تصور تھا' جو بہت سے ایرانیوں کو قابل اعتبار لگتا تھا' کیونکہ نفرت انگیز ساواک کے روابط سی آئی اے اور موساد کے ساتھ عیاں ہو چکے تھے۔ وہ غصے کا نظریہ تھا۔ تاہم خمینی نے ایرانیوں کے جائز خدشات کو اس زبان میں بیان کیا تھا' جس کو وہ سمجھ سکتے تھے۔ کوئی مارکسی یا لبرل ایرانی غیر جدیدیت پذیر ایرانیوں کی اکثریت کو متحرک نہیں کر پاتا' جبکہ ہر شخص کربلا کی علامتوں کو سمجھ سکتا تھا۔ دوسرے علماء کی طرح خمینی مشکل علمی زبان میں بات نہیں کرتے تھے' ان کی تقریر سادہ اور آسان زبان میں ہوتی تھی' جس کے مخاطب عام انسان ہوتے تھے۔ مغرب کے لوگ خمینی کو وسطی زمانے کا انسان تصور کرنے پر مائل تھے' لیکن حقیقت میں ان کا پیغام اور نظریہ بہت حد تک جدید تھا۔ ان کی مغربی استعماریت کی مخالفت اور فلسطینیوں کی حمایت اس زمانے کی تیسری دنیا کی دوسری تحریکوں سے مماثلت رکھتی تھی' اسی طرح عوام سے ان کا براہ راست ربط بھی۔

بالآخر خمینی بہت آگے چلے گئے۔ 27 اکتوبر 1964ء کو انہوں نے حال ہی میں امریکی فوجیوں اور دیگر مشیروں کو دی جانے والی سفارتی رعایت اور اسلحہ کے لیے شاہ کی 20 کروڑ ڈالر منظور کرنے کے فیصلوں کے خلاف سخت ترین تنقید کی۔ انہوں نے کہا کہ ایران حقیقتاً ایک امریکی نوآبادی ہے۔ کیا دوسری اقوام ایسی ذلت گوارا کریں گی؟ ایران میں سنگین جرم کا ارتکاب کرنے والے غیر ملکی ملزموں کو واقعتاً کوئی سزا نہیں دی جاتی جبکہ ایک امریکی کے کتے پر بے خیالی میں پاؤں رکھ دینے والے ایرانی شہری پر مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ غیر ملکی کئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عشروں سے ایران کے تیل کو لوٹ رہے ہیں' جبکہ غریب شدید مصائب کا شکار ہیں۔ انہوں نے آخر میں کہا:

''ایرانیوں کے لیے کوئی تلافیٔ مافات نہیں ہے۔ مجھے آنے والے موسم سرما میں غریبوں کی حالتِ زار کا غم کھائے جا رہا ہے' کیونکہ مجھے احتمال ہے کہ اللہ معاف کرے کئی غریب سردی اور فاقوں سے موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ لوگوں کو غریبوں کے بارے میں سوچنا چاہیے اور سابقہ موسم سرما جیسی ہلاکتوں سے محفوظ رہنے کے لیے عملی اقدام کرنا چاہیے۔ علماء کو اس مقصد کے لیے چندے کی اپیل کرنی چاہیے۔''

اس تقریر کے بعد خمینی کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ نجف کے مقدس شیعی شہر میں جا بسے۔

ایسا لگتا تھا کہ اب حکومت نے مذہبی پیشواؤں کو بندوق کی زد میں رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ خمینی کو ملک بدر کرنے کے بعد حکومت نے اوقاف کی املاک کا بندوبست شروع کیا اور مدارس کو سخت بیوروکریٹک کنٹرول میں لے آئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1960ء کی دہائی کے اواخر میں الٰہیاتی طالب علموں کی تعداد میں نمایاں کمی ہوگئی۔ 1970ء میں ایران میں امریکی سرمایہ کاری کے فروغ کے لیے منعقدہ کانفرنس پر احتجاج اور حکومت کو ''سامراج کی جابر گماشتہ'' قرار دے کر مذمت کرنے والے آیت اللہ رضا سعیدی کو تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ قم میں ہزاروں مظاہرین سڑکوں پر امڈ پڑے اور تہران میں آیت اللہ سعیدی کی مسجد کے باہر ہزاروں لوگ آیت اللہ طالقانی کی تقریر سننے کے لیے جمع ہوگئے۔ اسی زمانے میں حکومت نے ریاست کے فرمانبردار ''سول اسلام'' کو تشکیل دینے کی کوشش کی۔ ایک مذہبی کور قائم کی گئی' جو سیکولر یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے الٰہیات سے گریجویشن کرنے والوں پر مشتمل تھی۔ اس کور کا کام دیہاتی علاقوں میں مذہبی پراپیگنڈے کے لیے قائم کیے گئے نئے شعبے کی خدمات انجام دینا تھا۔ یہ روایتی علماء کی بیخ کنی کی ایک واضح کوشش تھی۔ تاہم شاہ' ایران اور شیعیت میں تعلق ختم کرنے کے لیے بھی مضطرب تھا۔ 1970ء میں اس نے اسلامی تقویم ختم کر دی اور اگلے برس قدیم فارسی بادشاہت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا گیا۔ یہ نہ صرف امیر و غریب کے مابین بہت بڑے خلا کا ایک گھناؤنا مظاہرہ تھا بلکہ حکومت کی اسلام سے پہلے کے ورثے پر اپنے تشخص کی بنیاد رکھنے کی خواہش کا اظہار بھی تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علی شریعتی کی انقلابی جدوجہد:

اگر ایرانی اسلام کو کھو دیں گے تو وہ اپنے آپ ہی کو گنوا بیٹھیں گے۔ یہ پیغام تھا نوجوان کرشماتی فلسفی ڈاکٹر علی شریعتی (77-1933ء) کا۔ 1960ء کے عشرے کے دوران مغربی تعلیم یافتہ نوجوان ایرانی ان کے لیکچر ذوق وشوق سے سنتے تھے۔ علی شریعتی نے روایتی مدرسہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے مشہد یونیورسٹی اور سوربون یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی' جہاں انہوں نے ایرانی فلسفے پر مقالہ لکھا اور فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینوں' وجودی فلسفی ژاں پال سارتر اور تیسری دنیا کے نظریہ ساز فرانز فینن کا مطالعہ کیا۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ ایک ایسے منفرد شیعی نظریے کو تخلیق کرنا ممکن ہے جو جدید ایرانیوں کی روحانی ضرورتیں ان کو اپنی جڑوں سے کاٹے بغیر پوری کرسکتا ہے۔ ایران واپس آ کر علی شریعتی شمالی تہران میں ''حسینیہ'' میں پڑھانے لگے' جسے 1965ء میں انسان دوست شخص محمد ہمایوں نے قائم کیا تھا۔ ہمایوں ساٹھ کی دہائی کے شروع میں اصلاح پسند علماء کی تقریروں سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس نے ایرانی نوجوانوں تک رسائی پانے کی کوشش میں ''حسینیہ'' قائم کیا تھا۔ ایران میں ''حسینیہ'' حضرت حسینؓ سے منسوب مرکز ہوتا تھا اور عموماً اسے مسجد کے ساتھ تعمیر کیا جاتا تھا۔ امید یہ ہوتی تھی کہ ''حسینیہ'' میں پڑھنے والے نوجوان واقعۂ کربلا سے متاثر ہوکر ایک بہتر معاشرے کے لیے کام کریں گے۔ ایران بھی 1967ء کی جنگ کے بعد مشرق وسطیٰ میں رونما ہونے والی مذہب کی لہر کے زیر اثر تھا اور 1968ء تک آیت اللہ مطہری' ایک اصلاح پسند جنہوں نے اسے قائم کرنے میں مدد دی تھی' لکھ سکتے تھے کہ ''حسینیہ کے طفیل ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان تحیر کے ایک دور سے گزرنے کے بعد' مذہب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔'' علی شریعتی نے طلباء کو سب لیکچراروں سے زیادہ متاثر کیا۔ طلباء ان کا لیکچر سننے کے لیے اپنے لیکچر یا کام چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ علی شریعتی ان سے مطابقت پیدا کرسکتے تھے۔ وہ انہی جیسا لباس پہنتے تھے' منقسم ثقافت کے حوالے سے انہی کی طرح مضطرب تھے اور بعض نوجوان تو انہیں بڑے بھائی کی طرح محسوس کرتے تھے۔

علی شریعتی ایک تخلیقی دانشور تھے' تاہم وہ روحانی انسان بھی تھے۔ وہ رسول کریمؐ اور اماموں کے پیروکار تھے اور ان کے ساتھ علی شریعتی کی وابستگی واضح اور عیاں تھے۔ وہ تصوف پر کاربند تھے۔ ان کے نزدیک شیعی تاریخ کے واقعات صرف ساتویں صدی کے تاریخی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعات نہیں بلکہ لازماں حقیقتیں تھیں' جو دورِ حاضر میں بھی لوگوں کو رہنمائی دے سکتی تھیں۔ وہ توضیح کیا کرتے تھے کہ امام غائب دنیا میں اب بھی موجود ہیں۔ شیعوں کو جبر کے خلاف امام کے اعلانِ جہاد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ شیعوں کو اپنی ذات کا مشاہدہ کرنے کے لیے اردگرد موجود ٹھوس حقیقتوں کے پار دیکھنا ہوگا۔ چونکہ الوہی اقلیم الگ نہیں ہے' اسی لیے مذہب کو اس طرح سیاست سے الگ کرنا ناممکن ہے جس طرح حکومت کوشش کر رہی ہے۔ انسان دوجہتی مخلوق ہیں۔ وہ مادی کے علاوہ روحانی وجود کے بھی حامل ہوتے ہیں' انہیں لوگوس کے ساتھ ساتھ متھوس کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہر سیاسی نظام کی ایک ماورائی جہت بھی لازماً ہونی چاہیے۔ امامت کے عقیدے کا حقیقی مفہوم یہی ہے' یہ علامتی یاددہندہ ہے کہ معاشرہ امام کے بغیر وجود نہیں رکھ سکتا' جو کہ لوگوں کو دنیوی مقاصد کے ساتھ ساتھ روحانی مقاصد کے حصول کے لیے الوہی رہنمائی دیتا ہے' مذہب اور سیاست کو الگ الگ کرنا توحید کے اصول کی خلاف ورزی ہے۔

توحید مغرب زدہ ایرانیوں کی بیگانگی کا بھی مداوا ہے۔ علی شریعتی نے ''بازگشت بہ خویشتن'' پر اصرار کیا' یعنی ''ذات کی طرف مراجعت''۔ جہاں یونانی روح کی خصوصیت فلسفہ ہے اور رومن روح کی خصوصیت فن اور عسکریت ہے' وہاں ایران کی نخستمائی ذات مذہبی اور اسلامی ہے۔ جہاں مغرب کی عقلی تجربیت پسندی (Empiricism) ''موجود'' (is) پر توجہ دیتی ہے' وہاں مشرق اس صداقت کو ڈھونڈتا ہے جس کو ہونا چاہیے۔ اگر ایرانیوں نے مغربی آدرش سے بہت زیادہ انسلاک کی کوشش کی تو وہ اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے اور اپنی نسل کشی میں معاونت کریں گے۔ شاہ کی طرح قدیم ایرانی کلچر کی بجائے انہیں اپنے شیعی ورثے کا جشن منانا چاہیے۔ تاہم یہ ایک سطحی یا خالصتاً قومی عمل نہیں ہوسکتا۔ اپنے خوب صورت مقالے ''حج'' میں انہوں نے اس موضوع پر بڑی گہری باتیں کیں۔ علی شریعتی نے ملاصدرا کے چار مراحل والے سفر کے برخلاف حج کو خدا تک جانے والا سفر قرار دیا۔ تصوف کے لیے ہر شخص اہل نہیں ہوتا' جس کے واسطے ایک مخصوص صلاحیت اور مزاج کی ضرورت ہوتی ہے' تاہم حج ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر مرد و زن مسلمان کی پہنچ میں ہے۔ حج کرنے کا فیصلہ ایک نئی تشریق (Orientation) کا غماز ہوتا ہے۔ حاجیوں کو اپنی بیگانگی زدہ اور الجھی ہوئی ذات کو پیچھے ہی چھوڑ جانا چاہیے۔ کعبہ کے گرد طواف سے حاجی کو ''احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی ندی ہے جو ایک بڑے دریا میں مل رہی ہے۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ہجوم کا دباؤ تمہیں اس قدر بھینچتا ہے کہ تمہیں ایک نئی حیات مل جاتی ہے۔ اب تم لوگوں کا جزو ہوتے ہو' اب تم ایک انسان ہوتے ہو' زندہ اور ابدی..... کعبہ کے گرد طواف کرتے ہوئے تم جلد ہی خود کو فراموش کر دو گے۔''

امت کے ساتھ اس اتحاد میں انا پرستی ختم ہو جاتی ہے اور ایک نیا ''مرکز'' حاصل ہوتا ہے۔ عرفات کے میدان میں شب بیداری کے دوران حاجیوں کو اپنے آپ کو الوہی علم کے نور کے لیے کھول دینا چاہیے اور اب دنیا میں دوبارہ شامل ہونے اور خدا کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ (ایک جہاد' جس کا عکاس منیٰ میں شیطان کو پتھر مارنا ہے)۔ اب حاجی کو دنیا میں اس شعور کے ساتھ واپس آنے کے لیے تیار ہونا چاہیے' جو ایک منصفانہ معاشرے کی تخلیق کی خاطر سماجی جدوجہد کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔

علی شریعتی کے مطابق اسلام کو عمل میں لازماً ڈھالنا چاہیے۔ ان کا ایقان تھا کہ کربلا میں حضرت حسینؓ کی مثال ساری دنیا کے مجبور اور بیگانگی زدہ انسانوں کو فیضان عطا کرتی ہے۔ وہ بے عمل علماء کو ناپسند کرتے تھے' جنہوں نے اپنے آپ کو مدرسوں میں مقفل کر لیا تھا اور اسلام کو نجی عقیدہ بنا کر مسخ کر دیا تھا۔ اگر شیعوں نے حضرت حسینؓ کی مثال پر عمل کیا اور جبر و استبداد کے خلاف مہم میں تیسری دنیا کے لوگوں کی قیادت کی تو امام غائب ظہور فرمائیں گے۔ تاہم علماء نے نوجوانوں کے لیے مذہب کو برباد کر دیا ہے۔ وہ کوفت زدہ ہو کر مذہب سے روگردانی اختیار کر رہے ہیں اور علماء ہی نے انہیں مغرب کی آغوش میں دھکیل دیا ہے۔ وہ اسلام کو لفظی اعتبار سے دیکھتے ہیں جبکہ شیعیت کی روح علامتوں میں ہے۔ وہ مسلمانوں کو درس دیتی ہے کہ ہر دنیوی شے کو خدا کی ''علامت'' سمجھو۔ شیعوں کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ علی شریعتی کے بقول حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی شیعیت کو ''صفوی شیعیت'' نے برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک متحرک عقیدے کو ایک نجی غیر فعال معاملہ بنا دیا گیا ہے۔ غیبت کا زمانہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ عام لوگوں کو چاہیے کہ مجتہدوں کی تقلید چھوڑ دیں' جیسا کہ صفوی شیعیت تقاضا کرتی ہے۔ ہر مسلمان کو خدا کی خود اطاعت کرنی چاہیے اور اپنی زندگی کی ذمہ داری اٹھانی چاہیے۔ اس کے علاوہ ہر شے شرک اور اسلام سے انحراف ہے۔ لوگوں کو اپنے رہنما خود منتخب کرنے چاہئیں۔ عوام سے ضرور مشورہ کیا جانا چاہیے' جیسا کہ شوریٰ کا اصول مقتضی ہے۔ عوام اجماع کے ذریعے اپنے رہنماؤں کے فیصلوں کو جواز عطا کریں گے۔ مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ علماء کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجائے ''روشن فکران'' (روشن خیال دانشور) امت کے نئے رہنما ہونے چاہئیں۔

علی شریعتی نے ''صفوی شیعیت'' کے ''اصولی'' عقائد سے انصاف نہیں کیا تھا۔ وہ ایک خاص دور کی ضرورتوں کے لیے وضع کیے گئے تھے اور گو وہ ہمیشہ متنازعہ رہے تھے' تاہم انہوں نے ماقبل جدید دور کی روحانیت کا اظہار کیا تھا جو کہ فرد کو بہت زیادہ آزادی نہیں دے سکتی تھی۔ تاہم دنیا بدل گئی تھی۔ خودمختاری اور دانشورانہ آزادی جیسے مغربی آدرشوں سے متاثر ایرانی اپنے باپ دادا کی طرح کسی مجتہد کے احکامات پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ قدامت پسندانہ روحانیت لوگوں کو اپنے معاشرے کی پابندیوں کو قبول کرنے اور سٹیٹس کو (Status Quo) کو قبول کرنے میں مدد دینے کے لیے وضع کی گئی تھی۔ واقعہ کربلا نے شیعوں میں عدل کی آرزو زندہ رکھی ہے تاہم اس سے اور دیگر اماموں کے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ انقلابی تبدیلی کو قبول نہ کرنے والی دنیا میں اس الوہی مثالیے (Ideal) کو نافذ کرنا کیسے ناممکن تھا۔ لیکن اب جدید دنیا پر اس بات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ایرانی خطرناک تبدیلی کا تجربہ کر رہے ہیں' وہ پرانی رسوم اور علامتوں کو اسی انداز سے نہیں لے سکتے۔ علی شریعتی شیعیت کی تشکیل نو کی کوشش کر رہے تھے تاکہ وہ اس بالکل بدلی ہوئی دنیا میں مسلمانوں کو راغب کر سکے۔

علی شریعتی کا اصرار تھا کہ اسلام کسی بھی دوسرے عقیدے سے زیادہ حرکی ہے۔ اس کی اصلاحات ہی اس کے ترقی پسندانہ تحرک کو عیاں کرتی ہیں۔ مغرب میں لفظ ''پالیٹکس'' کو یونانی ''پولس'' (Polis) 'شہر ..... ایک جامد انتظامی یونٹ ..... سے اخذ کیا گیا ہے۔ جبکہ اس کا اسلامی مترادف ''سیاست'' ہے' جس کا لفظی مطلب ہے ''وحشی گھوڑے کو سدھانا''، یہ ایک ایسا عمل ہے' جو خلقی کاملیت پیدا کرنے کے لیے پرقوت جدوجہد کا آئینہ دار ہے۔ عربی اصطلاحات ''امت'' اور ''امام'' کا مادّہ ایک ہی ہے یعنی ''ام'' (روانہ ہونے کا فیصلہ)' چنانچہ امام لوگوں کو ایک نئی سمت میں لے جائے گا۔ امت افراد کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک مقصد کے حصول' ایک دائمی انقلاب کے لیے ہر وقت تیار ہوتی ہے۔ اجتہاد صرف چند علماء کا استحقاق نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ''ہجرت'' تبدیلی کے لیے آمادگی کا نام ہے اور مسلمانوں کو ہستی کے نئے پن سے مربوط رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ ''انتظار'' (امام غائب کے ظہور کی راہ دیکھنا) قلبِ ماہیئت کے امکان کے لیے چوکس رہنے اور سٹیٹس کو (Status Quo) تسلیم کرنے سے انکار کا غماز ہے۔ حضرت علیؓ کی شیعیت ایک ایسا عقیدہ ہے' جو مسلمانوں کو بڑھاوا دیتی ہے کہ وہ ڈٹ جائیں اور کہیں ''نہیں!''۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شاہ کی حکومت اس قسم کے طرزِ گفتار کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اور 1973ء میں ''حسینیہ'' کو بند کر دیا گیا۔ علی شریعتی کو گرفتار کر کے تشدد کیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا۔ انہوں نے ملک سے جانے کی اجازت ملنے سے پہلے ایران میں ایک داخلی جلاوطنی کا دور گزارا۔ ان کے والد نے بتایا کہ اس عرصے کے دوران ایک شب انہوں نے علی شریعتی کو روتے ہوئے دیکھا' جیسے وہ موت سے پہلے رسول کریم ﷺ اور امام علیؓ کو الوداع کہہ رہے ہوں۔ 1977ء میں علی شریعتی لندن میں وفات پا گئے' تقریباً یقینی طور پر ساواک کے ایجنٹوں کے ہاتھوں۔ علی شریعتی نے تعلیم یافتہ ویسٹرنائزڈ ایرانیوں کو اسلامی انقلاب کے لیے تیار کیا۔ وہ 1970ء کے عشرے میں دانشوروں کے لیے دیسی ہی محوری شخصیت تھے' جیسے کہ ساٹھ کے عشرے میں آل احمد۔ 1978ء میں انقلاب سے پہلے کے برسوں میں جلوسوں میں خمینی کی تصویر کے ساتھ اکثر و بیشتر ان کی تصویر بھی اٹھائی گئی ہوتی تھی۔

خمینی کا ''ولایتِ فقیہہ'' کا نظریہ:

تاہم ایرانیوں کی اکثریت خمینی کو رہنما مانتی تھی۔ وہ عراق میں جلاوطنی کے دوران اپنی مخالفت کا اظہار کرنے میں قم کی نسبت زیادہ آزاد تھے۔ ان کی کتابیں' ٹیپیں اور فتوے ملک میں سمگل ہو کر جاتے رہے جیسا کہ تقویم میں شاہ کی تبدیلی کے بعد بھیجا گیا فتویٰ' جس میں شاہ کی حکومت کو اسلام کی مخالف قرار دیا گیا تھا۔ 1971ء میں خمینی نے ایک یادگار کتاب ''حکومت اسلامی'' شائع کروائی' جس میں مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا شیعی نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ صدیوں سے شیعوں نے امام غائب کی غیر موجودگی میں ہر حکومت کو غیر قانونی قرار دے رکھا تھا اور ریاست پر علماء کی حکمرانی کو درست نہیں کہتے تھے' لیکن ''حکومتِ اسلامی'' میں خمینی نے کہا کہ خدا کی مطلق حاکمیت کے تحفظ کے لیے علماء کو اقتدار لازماً حاصل کرنا چاہیے۔ اگر ایک فقیہہ انتظامی اور سیاسی اداروں کا کنٹرول سنبھال لے تو وہ اس امر کی ضمانت دے سکتا ہے کہ شریعت کا درست نفاذ ہوگا۔ چونکہ خدا واحد سچا قانون دہندہ ہے' اس لیے انسان ساختہ قانون تخلیق کرنے والی پارلیمنٹ کی بجائے ایک اسمبلی ہونی چاہیے جو روزمرہ زندگی کے ہر پہلو پر شریعت کا اطلاق کرے۔

خمینی جانتے تھے کہ ان کا استدلال انتہائی متنازعہ ہے اور ایک بنیادی شیعی عقیدے کو چیلنج کرتا ہے۔ تاہم سید قطب کی طرح انہیں بھی یقین تھا کہ موجودہ ہنگامی حالت اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بدعت کا جواز مہیا کرتی ہے۔ علی شریعتی کی طرح انہیں بھی یقین تھا کہ اب مذہب نجی حد تک نہیں رہ سکتا۔ رسول کریم ﷺ' امام علیؓ اور امام غائب نے اپنے اپنے زمانے کے جبر اور شرک سے جنگ کی تھی۔ عقیدہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں بلکہ ایک رجحان ہے ''جو انسانوں کو عمل کی تحریک دیتا ہے''۔

> ''اسلام عسکریت پسند افراد کا مذہب ہے جو عقیدے اور عدل سے مخلص ہوتے ہیں۔ یہ ایسے لوگوں کا مذہب ہے جو آزادی اور نجات کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو سامراجیت کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔''

یہ ایک بہت جدید پیغام تھا۔ علی شریعتی کی طرح خمینی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلام وسطی عہد کا عقیدہ نہیں بلکہ ایسی مستقل اقدار کا حامل ہے جن کے بارے میں مغرب سوچتا ہے کہ انہیں اس نے دریافت کیا ہے۔ تاہم اسلام کو سامراجیوں نے کمزور کر دیا ہے۔ لوگ مغربی طرز پر مذہب اور سیاست کو الگ الگ کرنا چاہتے ہیں۔ جبکہ ایسا کرنا مذہب سے انحراف ہوگا۔ خمینی نے افسوس کے ساتھ کہا: ''اسلام لوگوں میں یوں رہتا ہے گویا کوئی اجنبی ہو۔ اگر کوئی شخص حقیقی اسلام کو پیش کرے تو لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے۔'' ایرانی روحانی بے اطمینانی کی گرفت میں ہیں۔ خمینی کہا کرتے تھے: ''ہم نے اپنی شناخت کو مکمل طور پر فراموش کر دیا ہے' اور اس کی جگہ مغربی شناخت کو دے دی ہے۔'' ایرانی ''اپنے آپ کو فروخت کر چکے ہیں اور اجنبی آدرشوں کے غلام بن کر اپنی آگہی کھو چکے ہیں۔'' ان کا ایقان تھا کہ اس بیگانگی سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ مکمل طور پر' اسلامی قوانین کی اساس پر ایک معاشرہ تخلیق کیا جائے' جو ایرانیوں کے لیے نہ صرف درآمدی قانونی ضابطوں سے زیادہ فطری ہے بلکہ اس کا سرچشمہ مقدس ہے۔ اگر وہ خدا کے قوانین کے تحت زندگی بسر کریں گے تو ان کی زندگیاں مکمل طور پر تبدیل ہو جائیں گی۔ خمینی کے نزدیک عقیدہ کسی مسلک کی تصوراتی قبولیت نہیں بلکہ ایک ایسا رجحان اور طرز حیات ہے جو انسانیت کے لیے خدا کی پسندیدہ خوشی اور ثبات کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ ''جب عقیدہ آتا ہے تو ہر شے اس کے پیچھے پیچھے آ جاتی ہے۔''

ایسا عقیدہ انقلابی تھا کیونکہ وہ مغربی روح کی اجارہ داری کے خلاف انقلاب تھا۔ کوئی مغربی یقینی طور پر خمینی کے ''ولایت فقیہہ'' کے نظریے کو جابرانہ پاتا تاہم جیسی ''جدید'' حکومت کا تجربہ ایرانیوں کو ہوا تھا' اس نے لوگوں کو وہ آزادیاں نہیں دی تھیں جو یورپ اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امریکہ کے لوگوں کو میسر تھیں۔ خمینی پہلوی شہنشاہیت کے ایک شیعی متبادل مثالیے کو اپنی شخصیت میں مجسم کر رہے تھے۔ مغربی لوگوں کے لیے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ ایک سیاسی رہنما کی کشش اور کرشمے سے محروم خمینی کس طرح ایرانیوں کو اپنی وفاداری کے لیے تیار کر سکتے ہیں۔

جب خمینی نے ''حکومتِ اسلامی'' لکھی تو شاید انہیں کوئی خیال نہیں تھا کہ اسلامی انقلاب آنے ہی والا ہے۔ ان کا تو ایقان تھا کہ ولایتِ فقیہہ کے اطلاق کے لیے ایران کے تیار ہونے میں ابھی دو سو سال پڑے ہیں۔ اس زمانے میں خمینی مذہبی مثالیے پر زیادہ غور کر رہے تھے' بہ نسبت نظریے کی سیاسی اہمیت پر زور دینے کے۔ 1972ء میں' ''حکومتِ اسلامی'' کے شائع ہونے کے اگلے برس خمینی نے ایک مضمون لکھا جسے انہوں نے ''جہادِ عظمیٰ'' کا عنوان دیا' جو متنازعہ نظریے ولایتِ فقیہہ کے لیے ایک صوفیانہ جواز تھا۔ اس مضمون کا عنوان انہوں نے اپنی پسندیدہ حدیث سے لیا تھا' جو رسول کریم ﷺ نے ایک جنگ سے گھر واپسی کے موقع پر کہی تھی: ''ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔'' اس سے خمینی کے اس یقین کا اظہار ہوتا تھا کہ جنگیں اور سیاسی مہمات معاشرے کی روحانی قلبِ ماہیئت اور فرد کے اپنے قلب اور خواہش کے ارتباط کے مقابلے میں ''چھوٹی'' ہیں۔ علی شریعتی کی طرح انہیں بھی یقین تھا کہ ایران میں کوئی سیاسی حل عمیق مذہبی احیاء کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

1972ء والے مضمون میں خمینی نے کہا کہ ملا صدرا کی بیان کردہ صوفیانہ جستجو میں مصروف فقیہہ اماموں جیسی ''عصمت'' حاصل کر سکتا ہے۔ بلاشبہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فقیہہ اماموں کے رتبے تک پہنچ جاتا ہے' بلکہ جس وقت صوفی خدا تک پہنچتا ہے تو اسے انا پرستی سے نجات پائی ہوتی ہے' جو اسے الوہیت سے دور رکھے ہوتی ہے۔ اسے اپنے اوپر سے ''تاریکی کے پردے'' ہٹانے' ''دنیا سے تعلق'' توڑنے اور جنسی ترغیبات سے بچنا ہوتا ہے۔ خدا کی طرف سفر کے عروج پر وہ گناہ کے میلان سے محفوظ ہو جاتا ہے: ''اگر کوئی شخص اللہ پر ایقان رکھتا ہے اور اپنے دل کی آنکھوں سے اسے سورج کی طرح صاف صاف دیکھتا ہے تو اس سے کسی گناہ کا ارتکاب ناممکن ہوتا ہے۔ تاہم 1972ء میں خمینی کو اسلام سے فیضان یافتہ انقلاب کے ذریعے شاہ کا تخت الٹ دینے کا کوئی یقین نہیں تھا۔ اب خمینی ستر برس کے ہو چکے تھے۔ یقینی طور پر وہ اپنے آپ کو حکمران فقیہہ تصور نہیں کرتے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیاد پرست صیہونی:

اسرائیل میں یہودی بنیاد پرستی کی ایک شاخ پہلے ہی اسطورہ کو ٹھوس سیاسی حقیقت میں بدلنا شروع کر چکی تھی۔ اس کی جڑیں مذہبی صیہونیت میں تھیں' جو کہ سیکولر صیہونیت کے زیر سایہ ریاست سے قبل کے فلسطین میں پروان چڑھی تھی۔ یہ مذہبی صیہونی جدید آرتھوڈوکس تھے اور انہوں نے ابتدائی ایام ہی سے سوشلسٹ کبوٹزم (Kibbutzim) کے ساتھ ساتھ اپنی عبادت گاہیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ ہیریڈم کے برعکس مذہبی یہودیوں کا یہ چھوٹا سا گروپ صیہونیت کو آرتھوڈوکسی سے متضاد تصور نہیں کرتا تھا۔ وہ بائبل کی لفظی تعبیر کرتے تھے: توریت میں خداوند نے ابراہیمؑ کی اولاد کے لیے وطن کا وعدہ کیا ہے' اس لیے یہودیوں کے پاس فلسطین پر قبضے کا قانونی حق ہے۔ مزید براں ارتز اسرائیل میں یہودی ڈایا سپورا کی نسبت پوری طرح ''قانون'' پر عمل پیرا ہوں گے۔ واضح سی بات ہے کہ گیٹو میں تو زراعت اور وطن کی آبادکاری جیسے احکامات پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا یا سیاست اور حکومت سے متعلقہ احکامات پر۔ نتیجتاً ڈایا سپورا کی یہودیت گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ اب آخر کار اپنے وطن میں یہودی ایک بار پھر توریت پر پوری طرح عمل کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ جیسا کہ صیہونی آرتھوڈوکسی کے ایک رائد (Pioneer) پنکاس روزنبلتھ نے توضیح کی تھی:

> ہم مکمل توریت' اس کے احکامات اور تصورات کو قبول کرتے ہیں۔ (پرانی) آرتھوڈوکسی سینا گوگ یا خاندان میں ..... یا زندگی کے خاص خاص معاملات میں توریت کے ایک چھوٹے سے حصے پر ہی عمل کرتی تھی۔ ہم زندگی کے ہر شعبے میں ہر وقت توریت پر عمل کرنا چاہتے ہیں نیز فرد کی زندگی میں توریت اور اس کے قوانین کو مطلق حاکمیت دینا چاہتے ہیں۔

''قانون'' جدیدیت سے متضاد نہیں ہے بلکہ اس کی تکمیل کرتا ہے۔ دنیا دیکھے گی کہ یہودی ایک نیا سماجی نظام تخلیق کر سکتے ہیں جو حقیقتاً ترقی پسند ہوگا کیونکہ اس کا منصوبہ تو خداوند نے بنایا ہے۔

صیہونیت کی خصوصیت بن جانے والی کاملیت کی آرزو موجود تھی' جلاوطنی کے عذاب اور تناؤ کے بعد یہ ایک صحت بخش اور زیادہ کلیتی (Holistic) وژن کو پانے کا ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طریقہ تھا۔ تاہم یہ سیکولر صیہونیوں کے عقلیت پسندانہ وژن کے خلاف بغاوت بھی تھی جو کہ مذہبی آبادکاروں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے اور ارتز اسرائیل میں ایک توریتی ریاست (Torah State) کے قیام کے ان کے عزم کو نہ صرف وقت سے متصادم بلکہ نفرت انگیز تصور کرتے تھے۔ مذہبی صیہونی باغی ہونے کی حیثیت سے بہت حساس ہوتے تھے۔ جب انہوں نے 1929ء میں نوجوانوں کی تحریک بنی اکیوا (Bnei Aciva) یعنی ''اکیوا کے فرزند'' قائم کی تو ان نوجوانوں نے دوسری صدی عیسوی کے ایک عظیم صوفی اور عالم ربی اکیوا کو اپنے لیے عملی نمونہ بنا لیا' جس نے روم کے خلاف یہودی انقلاب کی حمایت کی تھی۔ سیکولر صیہونی بھی باغی تھے لیکن مذہبی یہودیت کے خلاف تھے۔ اب بنی اکیوا نے محسوس کیا کہ انہیں ''بغاوت کے خلاف بغاوت کی صدا بلند کرنی چاہیے' سیکولر نوجوانوں کے تصورات کے خلاف' جو کہ یہودیت اور یہودی روایت کی مخالفت کرتے تھے۔'' وہ خدا کے لیے ایک جنگ لڑ رہے تھے۔ الوہیت کو سیاسی اور ثقافتی زندگی سے الگ تھلگ رکھنے کی خواہش کے بجائے وہ مذہب کو اپنی ہستی پر ''ہر لمحہ اور ہر عہد میں'' حاوی کرنے کے آرزومند تھے۔ انہوں نے سیکولر صیہونیوں کو صیہونیت کا پوری طرح ''مالک'' بننے کی اجازت نہیں دی۔ اگرچہ وہ اقلیت میں تھے' تاہم وہ اپنے بقول سیکولروں کے مکمل طور پر عقلی نظریے کے غیر قانونی تسلط کے خلاف ایک چھوٹا انقلاب برپا کر رہے تھے۔

انہیں اپنے سکولوں اور اداروں کی ضرورت تھی۔ 1940ء کے عشرے میں ریو موشے زوی نیریا نے مذہبی صیہونی لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ایلیٹ بورڈنگ سکول قائم کیے۔ یشیوا ہائی سکولوں میں تعلیمی معیارات اعلیٰ ہوتے تھے' طالب علم توریت کے ساتھ ساتھ سیکولر مضامین بھی پڑھتے تھے۔ ہیریڈم کے برخلاف یہ نیوآرتھوڈوکس (Neo-Orthodox) مذہبی صیہونی جدید زندگی کے بڑے دھاروں سے الگ تھلگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ایسا کرنا ان کے کلیتی وژن سے غداری ہوتا' ان کا ایقان تھا یہودیت اتنی وسعت رکھتی ہے کہ ان غیر یہودی سائنسوں کو قبول کر سکتی ہے' تاہم وہ توریت کی تدریس کو بھی بلاشبہ بہت سنجیدگی سے لیتے تھے اور ہیریڈی یشیووت کے گریجویٹس کو توریت اور تالمود کی تدریس کے لیے متعین کرتے تھے۔ یشیوا ہائی سکولوں میں متھوس اور لوگوس کو اب بھی لازم وملزوم تصور کیا جاتا تھا۔ توریت الوہیت سے ایک صوفیانہ ربط مہیا کرتی تھی اور کل کو معنویت عطا کرتی تھی' حالانکہ اس کی کوئی عملی افادیت نہیں تھی۔ جیسا کہ مڈراشیاٹ نوام کے پرنسپل ربی یہوشوآ یوگل نے توضیح کی تھی کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طالب علموں کو روزی کمانے کے لیے یا ''معاشی' عسکری اور سیاسی ہستی کے ذریعے کے طور پر'' توریت کی تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہیے' Logoi کے سیکولر مضامین کی طرح یہ کوئی عملی افادیت نہیں رکھتی' بلکہ ''انسان کا کل مقصد'' تھی' تاہم ریاستِ اسرائیل کے قیام کے بعد نوجوان مذہبی صیہونیوں کے لیے اس کی تعلیم کافی نہیں تھی۔ 1950ء کی دہائی میں بڑی عمر کے طلباء کے لیے یشیووت قائم کیے گئے اور اسرائیلی حکومت کے ساتھ ایک خصوصی بندوبست (Hesder) کے تحت مذہبی نوجوانوں کو توریت کی تعلیم کے ساتھ آئی ڈی ایف میں قومی خدمت ادا کرنے کا موقع دلوایا گیا۔

اس طرح مذہبی صیہونیوں نے اپنے لیے ایک منفرد طرزِ حیات وضع کرلیا تھا' بلکہ ریاست کے ابتدائی برسوں میں بعض مذہبی صیہونی تشخص کے بحران سے بھی گزرے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دو دنیاؤں میں معلق ہیں: سیکولر انہیں صیہونی نہیں مانتے تھے اور ان کے کارنامے ریاست کو وجود میں لانے والے سیکولر رائدین کی فتح سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ اسی طرح ہیریڈم کے لیے وہ آرتھوڈوکس نہیں تھے اور جانتے تھے کہ وہ توریت میں ان کی مہارت کے ہمسر نہیں ہوسکتے۔ 1950ء کی دہائی کے دوران یہ بحران نوجوانوں کی ایک اور بغاوت کا پیش خیمہ بنا۔ ایک یشیوا ہائی سکول کفر ہاروآ (Kafr Haro'Eh) کے درجن بھر چودہ سالہ طالب علموں نے نہایت سختی کے ساتھ مذہبی زندگی گزارنی شروع کردی' جو بہت حد تک ہیریڈم کے مانند تھی۔ وہ حیادارانہ لباس پہننے اور مرد وزن کے الگ الگ رہنے پر زور دیتے تھے۔ انہوں نے آزادانہ میل جول اور تفریحات پر پابندی لگادی' نیز کھلے عام اعتراف اور کڑی آزمائشوں کے ایک نظام کے تحت ایک دوسرے کی زندگیوں کی نگرانی شروع کردی۔ انہوں نے اپنی ہیریڈی سخت گیری کو ایک شدید قوم پرستی کے ساتھ جوڑتے ہوئے اپنے آپ کو ''سلگتے ہوئے انگارے'' (Gahelet) کہلوانا شروع کردیا۔ وہ ایک کبٹز (Kibbutz) بنانے کے خواب دیکھتے تھے' جس کے مرکز میں ایک یشیوا ہو' جہاں مرد ہیریڈی کی طرح' دن رات تالمود پڑھیں' جبکہ عورتیں کٹر آرتھوڈوکس انداز میں لوگوں کے کمتر لیکن لازمی میدان میں نکلیں اور اپنے مردوں کی کفالت کرنے کے لیے کاشت کاری کریں۔ گامیلیٹ مذہبی صیہونیوں کے حلقے میں ایک اشرافی (Elite) گروپ بن گیا' تاہم وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی آرتھوڈوکسی اس وقت تک مکمل نہیں ہے جب تک وہ ہیریڈم اور مسنیگڈم کے مانند اپنی رہنمائی اور دعا کے لیے ایک ربی نہیں پا لیتے۔ 1950ء کی دہائی کے اواخر میں وہ ربی ابراہام یتزاك كك کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیٹے' بوڑھے ربی زوی یہودا کک کے سحر میں گرفتار ہو گئے' جس کے بارے میں ہم چھٹے باب میں بات کریں گے۔

اس وقت تک گاہیلیٹ نے تقریباً ستر سالہ ربی زوی یہودا کو دریافت کرلیا تھا' جو اپنے باپ کی طرح عمومی طور پر نصف انسان تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ شمالی یروشلم میں مرکز ہرویشیوا کا پرنسپل تھا' جو اس کے والد نے قائم کیا تھا مگر اب اس میں صرف بیس طالب علم پڑھتے تھے۔ تاہم کک کے تصورات نے گاہیلیٹ کو فوری طور پر راغب کرلیا' کیونکہ وہ ابراہام یتزاك سے آگے چلا گیا تھا اور بڑے کک کے پیچیدہ جدلیاتی وژن کے مقابلے میں اتنے آسان انداز میں بات کرتا تھا کہ وہ ایک جدید نظریہ لگتا تھا۔ جہاں پر کک نے سیکولر صیہونیت میں ایک الوہی مقصد دیکھا تھا' وہاں ربی زوی یہودا کو یقین تھا کہ اسرائیل کی سیکولر ریاست خداوند کی بادشاہت (Tout Court) تھی اور اس کا ہر گوشہ مقدس تھا:

> ''ارتز اسرائیل میں آنے والا ہر یہودی' اسرائیل کی زمین میں لگایا جانے والا ہر درخت' اسرائیل کی فوج میں شامل کیا جانے والا ہر فوجی' ایک اور روحانی مرحلے کو تشکیل دیتے ہیں' واقعتاً' نجات کے عمل کا ایک اور مرحلہ۔''

جہاں ہیریڈم اپنے طلباء کو یوم آزادی پر فوجی پریڈ دیکھنے سے منع کرتے تھے' چھوٹا کک تاکید کرتا تھا کہ فوج مقدس ہے' اس لیے اسے دیکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے۔ فوجی توریت کے عالموں کی طرح نیکوکار ہیں اور ان کے ہتھیار عبادت والے لباسوں کی طرح مقدس ہیں۔ ربی زوی یہودا نے باصرار کہا کہ ''صیہونیت آسمانی معاملہ ہے۔ ریاست اسرائیل ایک الوہی ہستی ہے' ہماری مقدس اور سنزہ ریاست۔'' جہاں بڑے کک کا ایقان تھا کہ یہودیوں کو سیاست میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے کیونکہ نجس دنیا کی سیاست ناپاک ہوتی ہے' وہاں چھوٹے کک کا ایقان تھا کہ مسیح کا زمانہ شروع ہو چکا ہے اور سیاست میں شمولیت' قبالائی روحانی سفر کی طرح' تقدیس کے عروج کی طرف بڑھنا ہے۔ اس کا وژن لفظی انداز میں کلیتی تھا۔ وطن' لوگ اور توریت ایک اٹوٹ مثلث تھے۔ ایک کو ترک کرنا تینوں کو ترک کرنا تھا۔ جب تک یہودی بائبل کے بیان کے مطابق پوری سرزمین اسرائیل میں آباد نہیں ہو جاتے نجات ممکن نہیں ہے۔ پورے ملک پر قبضہ' بشمول ان علاقوں کے جو اس وقت عربوں کے پاس تھے' ایک اعلیٰ ترین مذہبی فریضہ بن گیا۔ لیکن جب 1950ء کی دہائی میں گاہیلیٹ کک سے ملے تو اس مذہبی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فریضے کے پورا ہونے کی امید بہت کم تھی۔ 1948ء میں قائم ہونے والی ریاست اسرائیل کی سرحدوں میں صرف گیلیلی' نیجیو اور ساحلی میدان شامل تھے۔ دریائے اردن کے غربی کنارے والا انجیلی وطن اس وقت سلطنت ہاشمیۂ اردن سے تعلق رکھتا تھا۔ تاہم کک پر اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہر شے ایک پہلے سے متعین طریقۂ کار کے تحت رونما ہو رہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہولوکاسٹ بھی نجات کو قریب لے آیا تھا کیونکہ اس نے یہودیوں کو ڈایاسپورا چھوڑ کر وطن واپس آنے پر مجبور کیا تھا۔ کک نے 1973ء کو یوم ہولوکاسٹ پر خطاب میں کہا کہ یہودی ''غیر ملکی سرزمینوں سے اس قدر پختہ جڑے ہوئے تھے کہ جب آخری زمانہ آتا تو انہیں ایک عظیم خونریزی کے ذریعے الگ کرنا پڑتا۔'' یہ تاریخی واقعات خداوند کے الوہی ہاتھ کو عیاں کرتے تھے اور ''توریت اور ہر پاک شے کو دوبارہ وجود میں'' لے آئے تھے۔ اس طرح تاریخ ''کائنات کے مالک سے رابطہ تھی۔''

اسطورہ کی حقیقت میں تقلیب آخر کار واقع ہوگئی۔ ماقبل جدید دنیا میں اساطیر اور سیاست الگ الگ ہوتے تھے۔ ریاست کی تشکیل' عسکری مہمات' زراعت اور معیشت سب کے سب لوگوس کے تابع ہوتے تھے۔ اسطورہ ان عملیت پسندانہ سرگرمیوں کا احاطہ کرتی تھی اور انہیں معنویت عطا کرتی تھی' اسطورہ اصلاح کنندہ کے طور پر کام کرتی تھی اور مردوزن کو ہمدردی جیسی اقدار کی یاددہانی کرواتی تھی' جو کہ عقل کی عملیت پسندانہ تفکرات سے ماورا ہوتی تھیں۔ ایک ارضی حقیقت الوہیت کی علامت بن سکتی تھی' تاہم خود کبھی مقدس نہیں ہوتی تھی' وہ خود سے ماورا کی طرف اشارہ کرتی تھی' جہاں پر کہ عقل کی رسائی نہیں تھی۔ تاہم کک نے ان امتیازات کو مٹا دیا اور بعض لوگوں کے بقول شرک کو تخلیق کیا۔ کیا معصوم لوگوں کے قتل جیسے ہولناک اقدام کرنے والی فوج ''مقدس'' ہوسکتی ہے؟ روایتی طور پر مسیح پرستی (Messianism) نے لوگوں کو سٹیٹس کو (Status Quo) پر تنقید کرنے کی تحریک دی تھی' تاہم کک نے اسے اسرائیلی پالیسی کو مطلق منظوری دینے کے لیے استعمال کیا۔ ایساوژن ہر اہم قدر کا انکار کرنے والی ایک منفیت پسندی کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ ریاست اسرائیل کو مقدس اور اس کی علاقائی سالمیت کو اعلیٰ ترین قرار دے کر کک اس ترغیب کا شکار ہوگیا تھا جو بیسویں صدی میں بعض بدترین قوم پرستانہ مظالم کی ذمہ دار ہے۔ بڑے ربی کک کا دوسرے عقیدوں اور سیکولر دنیا کو بھی شامل رکھنے والا وژن کھو گیا تھا۔ چھوٹا کک عیسائیوں' اسرائیلی عزائم میں دخل اندازی کرنے والے گوئیم (Goyim) اور عربوں کے خلاف سراپا نفرت تھا۔ پرانے وژن میں دانش وحکمت تھی' جو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقل اور اسطورہ کو الگ الگ لیکن ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی تصور کرتا تھا۔ چھوٹے کک کے ان دونوں کو ملانے کے عمل میں بہت بڑا خطرہ تھا۔

تاہم گاہیلیٹ نے اس سوچ کو نہیں اپنایا۔ ربی کک کے کلیتی نظریے نے صیہونیت کو مذہب بنا دیا تھا۔ وہ مرکز ہرو کے کل وقتی طالب علم بن گئے اور اس گمنام یشیوا کو اسرائیل کے نقشے میں ایک مقام دلا دیا۔ انہوں نے کک کو ایک طرح کا یہودیوں کا پوپ بنا دیا تھا' جس کے فرمانوں پر عمل پیرا ہونا لازمی تھا اور جو ہر خطا سے پاک تھے۔ یہ نوجوان کک کا کیڈر اور نئی بنیاد پرست صیہونیت کے قائدین بن گئے: موشے لیونگر' یاکوف ایریئل' شلوموا ویز' ہائیم ڈرکمین' ڈوولیور' زیلمین میلامیڈ' اوراہام شپیرا اور ایلیازر والڈ مین۔ مرکز ہرو میں 1960ء کی دہائی کے دوران انہوں نے قوم کو خدا کی طرف واپس لے جانے اور سیکولر ریاست کو اس کے مذہبی امکان سے آگاہ کروانے کے لیے ایک جارحانہ منصوبہ بنایا۔ بڑے کک کے وضع کردہ سیکولر اور مذہبی جدلیاتی امتزاج (Dialectical Synthesis) کی بجائے ربی زوی یہودا کو توقع تھی کہ جلد ہی سیکولر پر الوہیت کا قبضہ ہو جائے گا۔

تاہم اپنے تمام تر جوش اور ولولے کے باوجود گاہیلیٹ منصوبے بنانے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکے۔ وہ سارے وطن کو بسانے یا قوم کے قلب کو تبدیل کرنے کے لیے موثر انداز میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم 1967ء میں تاریخ نے باری لی۔

1967ء کے یوم آزادی کے موقع پر چھ روزہ جنگ شروع ہونے سے چند ہفتے پہلے ربی کک مرکز ہرو یشیوا میں اپنا معمول کا وعظ دے رہا تھا۔ دفعتاً اس نے ایک چیخ ماری اور ایسے لفظ بولے جنہوں نے اس کی تقریر کے بہاؤ کو مکمل طور پر توڑ دیا: ''کہاں ہے ہمارا ہیبرون' شیکم' جیریکو اور اناطوط' جنہیں 1948ء میں ریاست سے کاٹ دیا گیا تھا' اور ہمارا خون بہہ رہا ہے؟''۔ تین ہفتے بعد اسرائیلی فوج نے ان انجیلی شہروں پر قبضہ کر لیا' جو پہلے عربوں کے ہاتھ میں تھے اور ربی کک کے شاگردوں کو یقین ہو گیا کہ اس نے سچی پیشگوئی کی تھی۔ اس مختصر جنگ کے اختتام تک اسرائیل نے مصر سے غزہ کی پٹی' اردن سے غربی کنارے اور شام سے سنہری پہاڑیوں کو حاصل کر لیا تھا۔ 1948ء سے اسرائیل اور اردن میں منقسم مقدس شہر یروشلم پر اب اسرائیل نے مکمل طور پر قبضہ کر لیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ وہ یہودی ریاست کا ابدی دارالحکومت ہے۔ یہودی ایک مرتبہ پھر مغربی دیوار پر عبادت کے قابل ہو گئے تھے۔ پورے ملک کو ایک سرور کی کیفیت اور قریب قریب صوفیانہ خوش کلامی نے گرفت میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لے لیا تھا۔ جنگ سے پہلے اسرائیل ریڈیو سنتے تھے کہ ناصر انہیں سمندر میں غرق کر دینے کا عہد کر رہا ہوتا تھا' اب وہ غیر متوقع طور پر یہودیوں کے لیے مقدس مقامات کے مالک بن گئے تھے۔ بہت سے کٹر سیکولروں نے جنگ کا تجربہ ایک مذہبی واقعے کے طور پر کیا' بحیرۂ احمر کو پار کرنے کی باقیات۔

تاہم کک کے پیروکاروں کے لیے جنگ کہیں زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ متوقع نجات کا ایک حتمی ثبوت ہے اور اس بات کا کہ تاریخ آخری منزل کی طرف گامزن ہے۔ اس حقیقت پر کہ کوئی مسیح واقعتاً نمودار نہیں ہوا تھا' گاہیلیٹ پریشان نہیں تھے' وہ جدید لوگ تھے اور مسیح کو ایک شخص کی بجائے ایک عمل کے طور پر دیکھنے کے لیے آمادہ تھے۔ نہ ہی وہ جنگ کو ''معجزہ'' تصور کرتے تھے بلکہ اس کی ایک سراسر فطری توضیح کرتے تھے کہ اسرائیلی فتح آئی ڈی ایف کی اعلیٰ کارکردگی اور عرب افواج کی نااہلی کا نتیجہ تھی۔ بارہویں صدی کے فلسفی میمونائیڈز (Memonides) نے پیشگوئی کی تھی کہ نجات مابعد الطبیعیاتی عمل نہیں ہوگا۔

فتح کے چند ماہ بعد مرکز ہرو میں ربیوں اور طالب علموں کی ایک کانفرنس ہوئی' جس میں لیبر حکومت کے ان منصوبوں کو غیر مؤثر کرنے کی تدابیر پر غور کیا گیا' جن کے تحت وہ اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ امن کے بدلے میں بعض نئے مقبوضہ علاقوں کو واپس کرنا چاہتی تھی۔ کک کے پیروکاروں کے لیے مقدس زمین کا ایک انچ بھی واپس کرنا شر کی قوتوں کی فتح ہوتی۔ اور انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس معاملے میں سیکولر بھی ان کے ساتھ تھے۔ جنگ کے تھوڑے عرصے بعد ممتاز اسرائیلی شاعروں' پروفیسروں' ریٹائرڈ سیاستدانوں اور فوجی افسروں کے ایک گروپ نے حکومت کو کسی قسم کی علاقائی رعایتیں دینے سے روکنے کے لیے ''سرزمین اسرائیل تحریک (Land Of Israel Movement) شروع کی تھی۔ اس تحریک نے کک کے پیروکاروں کو اپنا نظریہ اس انداز سے تشکیل دینے میں مدد دی کہ وہ عوام کو راغب کر سکے نیز انہیں مالی اور اخلاقی مدد بھی فراہم کی۔ کک کے پیروکار رفتہ رفتہ مرکزی دھارے میں آنے لگے۔

اپریل 1968ء میں موشے لیونگر نے کک کے پیروکاروں اور ان کے خاندانوں کے ساتھ ہیبرون میں جشن منانے گیا۔ سمجھا جاتا تھا کہ اس مقدس شہر میں حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ مدفون ہیں۔ چونکہ مسلمان بھی ان پیغمبروں کو مانتے تھے اس لیے ہیبرون ان کے لیے بھی مقدس تھا۔ فلسطینی صدیوں سے ہیبرون کو حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ سے اس کی مقدس نسبت کی بنا پر ''الخلیل'' کہتے تھے۔ لیونگر اور اس کی پارٹی پارک ہوٹل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں سوئس سیاحوں کے طور پر قیام پذیر ہوئے' تاہم جب وہ واپس جانے لگے تو انہیں غیر قانونی طور پر داخل ہونے کے الزام میں روک لیا گیا۔ یہ بات اسرائیلی حکومت کے لیے باعث ندامت تھی کیونکہ جنیوا کنونشن نے مقبوضہ علاقوں میں کسی آبادکاری سے روک دیا تھا اور اقوام متحدہ مطالبہ کر رہی تھی کہ اسرائیل اپنے مفتوحہ علاقوں سے نکل جائے۔ تاہم کک کے پیروکاروں کے چزپا (Chutzpa) لیبریوں (Laborites) کو سنہرے دور کے رائدین کو یاد دلا رہے تھے اور حکومت ان علاقوں سے نکلتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

لیونگر کا گروپ فوراً بزرگوں کی غار میں چلا گیا۔ چھ روزہ جنگ کے بعد اسرائیلی فوج حکومت نے اس مزار کو عبادت کے لیے دوبارہ کھول دیا تھا اور عربوں کو پریشان کیے بغیر یہودیوں کی عبادت کے لیے خصوصی انتظامات کیے تھے۔ یہودی آبادکار اسی پر مطمئن نہیں ہوئے اور غار میں مزید وقت اور جگہ کا مطالبہ کرنے لگے۔ انہوں نے جمعے کے دنوں میں مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنے کے لیے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ بعض اوقات وہ ہال تو خالی کر دیتے لیکن داخلی دروازے کو روک لیتے تاکہ مسلمان نمازی داخل نہ ہو سکیں۔ وہ غار میں ایک کدش (Kiddush) پکڑ لیتے' شراب پیتے اور 1968ء کے یوم آزادی پر انہوں نے حکومتی ضابطوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مزار پر اسرائیلی جھنڈا لہرا دیا۔ تناؤ بڑھ گیا اور بعض فلسطینیوں نے مسجد کے باہر کچھ سیاحوں پر دستی بم پھینک دیا۔ اسرائیلی حکومت نے ہچکچاتے ہوئے ہیبرون کے باہر آبادکاروں کے لیے ایک علاقہ بنا دیا اور اسے آئی ڈی ایف کی حفاظت میں دے دیا۔ لیونگر نے اسے کریت اربا (Kiryat Arba) کا نام دیا (ہیبرون کا انجیلی نام) اور وہ انتہائی تشدد پسند اور مشتعل صیہونی بنیاد پرستوں کا قلعہ بن گیا۔ 1972ء تک کریت اربا ایک قصبہ بن چکا تھا جس کی آبادی پانچ ہزار آبادکاروں پر مشتمل تھی۔ کک کے پیروکاروں کے لیے یہ مقدس جنگ میں ایک فتح تھی' جس نے ''دوسرے فریق'' کی سرحدوں کو مزید پرے دھکیل دیا تھا اور خداوند کے لیے ارضِ مقدس کے ایک اہم حصے کو آزاد کروا دیا تھا۔

تاہم دوسری صورت میں کک کے پیروکاروں نے بہت کم ترقی کی تھی۔ ان کے اشتعال سے ایسا لگتا تھا کہ نجات وقوع پذیر ہونے ہی والی ہے۔ لیبر حکومت نے مقبوضہ علاقے کا الحاق نہیں کیا تھا اور گو کہ وہ وہاں عسکری آبادکاری کر چکے تھے تاہم امن کے بدلے زمین دینے کی باتیں اب بھی ہو رہی تھیں۔ 1967ء کی فتح اسرائیل کی خوشی کا پیش خیمہ بنی' جو اس وقت سراب ثابت ہوئی جب اکتوبر 1973ء میں یوم کپور (کفارے کے دن' Yom

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Kippur) کو' جو کہ یہودی سال میں سب سے زیادہ متبرک دن ہوتا ہے' مصر اور شام نے سینائی اور سنہری پہاڑیوں پر حملہ کیا اور اسرائیلیوں کو سراپا حیرت بناتے ہوئے ان پر قبضہ کرلیا۔ اس مرتبہ عرب افواج نے بہت عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا اور آئی ڈی ایف نے انہیں بہت مشکل سے واپس دھکیلا۔ اسرائیلی ہل کر رہ گئے تھے اور ملک پر افسردگی اور شک کی فضا چھا گئی تھی۔ یہ شکست نظریاتی زوال کی آئینہ دار تھی۔ کک کے پیروکار اس بات سے متفق تھے۔ 1967ء میں خداوند نے اپنا ارادہ واضح کردیا تھا تاہم اسرائیلی حکومت نے اس فتح کو وسعت دینے اور ان علاقوں پر مستقل قبضہ جمانے کی بجائے انہیں عارضی قبضے میں رکھا تھا اور گوئیم کی' بالخصوص امریکہ میں موجود' ناراضی سے متفکر ہوئی تھی۔ یوم کپور جنگ خداوند کی سزا اور ایک تنبیہہ دی۔ اب مذہبی یہودیوں کو لازماً قوم کی مدد کو آنا چاہیے۔ کک کے پیرو ایک ربی نے سیکولر اسرائیل کو ایک ایسے فوجی سے تشبیہہ دی جو ایک ہیرو کی طرح جنگ لڑتے ہوئے صحرا میں گر گیا تھا۔ وفادار یہودی' جنہوں نے مذہب کو ترک نہیں کیا تھا' اس کے مشن کو پورا کریں گے۔

چھ روزہ جنگ نے کک کے پیروکاروں کے وژن کی تصدیق کردی تھی اور دو آبادکاریوں کا باعث بھی بنی تھی تاہم ان کی تحریک یوم کپور کی جنگ کے صدمے تک تقویت نہیں پکڑ سکی تھی۔ کک کے پیرو ایک ربی یہودا امتیل نے اپنے مضمون میں نئی عسکریت کا اظہار کیا۔ امتیل نے "The Meaning Of Yom Kippur War" میں فنا کے اس گہرے خوف کو عیاں کردیا' جو بہت سی بنیاد پرستانہ تحریکوں کے قلب میں نہاں ہوتا ہے۔ اکتوبر کے حملے نے تمام اسرائیلیوں کو مشرق وسطیٰ میں اپنے تنہا ہونے کا احساس دلا دیا اور یہ ظاہر کردیا کہ وہ ایسے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں' جو ان کی ریاست کو مٹانے پر کمربستہ ہیں۔ اس سے ہولوکاسٹ کی یادیں تازہ ہوگئی تھیں۔ اب امتیل نے اعلان کیا تھا کہ پرانی صیہونی پالیسی بے اعتبار ہوچکی ہے۔ سیکولر ریاست نے یہودی مسئلے کو حل نہیں کیا تھا' سامیت دشمنی پہلے سے بدترین ہوگئی تھی۔ اس نے کہا ''دنیا میں اسرائیل واحد ایسی ریاست ہے' جو تباہی کے خطرے سے دوچار ہے۔'' ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ یہودی بھی دوسری اقوام کی طرح ''نارمل'' ہوسکیں' جیسا کہ سیکولر صیہونی امید کرتے ہیں۔ تاہم ادھر ایک اور صیہونیت بھی موجود تھی' جس کا پرچار ربی زوی یہودا کک نے کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ نجات کا عمل کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اس جنگ کو ایک اور یہودی المیے کے طور پر دیکھنے کی بجائے اس کو تطہیر کا ایک عمل تصور کیا جانا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چاہیے۔ سیکولر صیہونیوں نے' جن کی صیہونیت افسوسناک حد تک اس قدر نااہل ہے کہ قوم کو اس المیے سے دوچار کر چکی ہے' یہودیت کو جدید مغرب کی تجربی عقلیت پسندی اور جمہوری کلچر سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ ان غیر ملکی اثرات کو لازماً مٹانا ہوگا۔

امتیل نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا تھا' جو مصر اور ایران میں اس وقت ابھرنے والی بنیاد پرستی سے کافی مماثلت رکھتا تھا۔ خداوند نے یوم کپور کی جنگ کے ذریعے یہودیوں کو تنبیہہ کی تھی کہ وہ اپنی طرف واپس آ جائیں۔ یہ ''مغرب زدہ'' اسرائیل کے لیے سچی اقدار کا اغتیاہ تھا۔ اسی طرح یہ جنگ ایک مسیحانہ عمل' مغربی تہذیب کے خلاف ایک مقدس جنگ کا حصہ تھی۔ جنگ نے یہ بھی عیاں کر دیا تھا کہ صرف یہودی ہی بقا کی لڑائی نہیں لڑ رہے۔ امتیل کو یقین تھا کہ اس موت و حیات کے تنازعے میں غیر یہودی بھی اپنی آخری جنگ لڑ رہے تھے۔ یہودی ریاست کے احیاء اور توسیع نے واضح کر دیا تھا کہ شیطان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور اسرائیل بے انصافی کی قوتوں کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسرائیل وطن کو فتح کر چکا ہے' جو باقی رہتا ہے وہ یہودیوں کی روحوں سے مغربی سیکولر جذبے کی آخری باقیات کو بھی مٹانے والی نجات سے پہلے پہلے فتح کر لیا جائے گا۔ اس جنگ نے سیکولرازم کی موت کی نوید سنا دی ہے۔ کک کے پیروکار اب متحرک ہونے کو اور اسرائیلی توسیع پسندی کو محدود کرنے والے مغرب کے خلاف' عربوں کے خلاف اور اسرائیل پر مغرب کے نافذ کردہ سیکولرازم کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے تیار تھے۔

امریکہ کے آمادۂ جنگ بنیاد پرست:

اسی طرح امریکہ کے پروٹسٹنٹ بنیاد پرست بھی تیار تھے۔ اباحتی نوجوان کلچر' جنسی انقلاب اور ہم جنس پرستوں' سیاہ فاموں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق کے فروغ سمیت 1960ء کی دہائی کا انتشار معاشرے کی عین بنیاد کو ہی ہلاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ بہت سوں کو یقین تھا کہ اس اتھل پتھل نیز مشرق وسطیٰ کے بحران سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ خوشی نزدیک ہے۔ انقلاب کے وقت سے امریکی پروٹسٹنٹ ازم دو متحارب گروہوں میں منقسم تھا اور سیکولر لوگوں اور لبرل عیسائیوں کی جدیدیت کو مسترد کرنے والے بنیاد پرست کوئی چالیس برس سے اپنی الگ دنیا تخلیق کر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی تصور کرتے تھے' لیکن حقیقت میں وہ امریکہ کے ایک ایسے بہت بڑے حصے کی ترجمانی کرتے تھے جو مشرقی سیکولر ایسٹیبلشمنٹ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی ثقافتی اجارہ داری سے آزردہ تھا اور جو بنیاد پرستوں کی قدامت پسندی سے زیادہ مانوسیت محسوس کرتا تھا۔ وہ امریکی معاشرے کو نجات دلانے کے لیے ابھی تک سیاسی تحریک تشکیل دینے کے لیے متحرک نہیں ہوئے تھے تاہم 1970ء کی دہائی کے اختتام تک اس کا امکان واضح ہو گیا تھا اور بنیاد پرستوں کو اپنی قوت کا احساس ہونے لگا تھا۔ 1979ء میں' کہ جس برس بنیاد پرست واپس آئے' جارج گیلپ کے قومی سروے نے واضح کر دیا کہ ہر تین میں سے ایک امریکی مذہبی تبدیلی کے تجربے سے گزر چکا ہے' تقریباً 50 فیصد کا ایقان تھا کہ انجیل خامیوں سے پاک ہے اور 80 فیصد سے زیادہ حضرت عیسیٰؑ کو ایک الوہی ہستی مانتے تھے۔ اس سروے نے انکشاف کیا کہ ملک میں تقریباً 1300 ایوانجیلکل عیسائی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشن ہیں۔ جن کے سامعین و ناظرین کی تعداد تقریباً تیرہ کروڑ ہے اور وہ 5 کروڑ ڈالر سے لے کر ''اربوں'' ڈالر تک منافع کماتے ہیں۔ جیسا کہ ایک ممتاز بنیاد پرست پیٹ رابرٹسن نے 1980ء کے الیکشن کے دوران اعلان کیا: ''ہمارے پاس اس ملک کو چلانے کے لیے کافی ووٹ ہیں!''

1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں اس نئی پیشرفت کے پس پشت تین عوامل کار فرما تھے۔ پہلا عامل جنوب کی ترقی تھا۔ اب تک بنیاد پرست شمال کے بڑے شہروں کی پیداوار تھے۔ جنوب زیادہ تر زرعی تھا۔ چرچوں میں لبرل عیسائیت نے بہت تھوڑی پیشرفت کی تھی' اسی لیے نئے تصورات اور ''سوشل گوسپیل'' سے لڑنے کے لیے ''بنیاد پرستوں'' کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم 1960ء کی دہائی کے دوران جنوب جدید ہونا شروع ہو گیا۔ شمال سے لوگ وہاں آنے لگے۔ وہ لوگ وہاں واقع تیل کی صنعت اور نئے ٹیکنیکل اور ایروسپیس منصوبوں میں ملازمتیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جنوب اسی تیز رفتار صنعت پذیری اور شہریت پذیری کے تجربے سے گزرنا شروع ہو گیا تھا' جس سے شمال ایک صدی پہلے گزرا تھا۔ 1930ء کی دہائی میں دو تہائی جنوب والے وہاں رہتے تھے۔ 1960ء تک نصف سے کم وہاں رہنے لگے تھے۔ جنوب ایک اونچا قومی رتبہ حاصل کرنے لگا تھا۔ 1976ء میں جمی کارٹر خانہ جنگی کے بعد صدر منتخب ہونے والا پہلا جنوبی (Southerner) بن گیا۔ 1980ء میں رونالڈ ریگن اس کی جگہ صدر بنا' جو کہ کیلیفورنیا کا گورنر تھا۔ لیکن اگرچہ جنوب والے اپنے نئے عروج کو خوش آمدید کہہ رہے تھے تاہم وہ دنیا کو مکمل طور پر بدلا ہوا پاتے تھے۔ شمال سے آنے والے لوگ اپنے ساتھ جدید اور لبرل تصورات لے کر آئے تھے۔ وہ سب پروٹسٹنٹ تو کیا عیسائی بھی نہیں تھے۔ جن اقدار اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعتقادات کو اب تک یقینی سمجھا جاتا تھا' اب ان کا دفاع کرنا پڑتا تھا۔ بالخصوص بپٹسٹ اور پریسبائٹیرین فرقوں میں پروٹسٹنٹ ایک بنیاد پرست تحریک کے لیے اسی طرح تیار تھے جس طرح اس صدی کے آغاز میں ان کے شمالی ہم مذہب تیار تھے' اور وجوہات بھی سب وہی تھیں۔

نئے جنوب کے لوگ' جو اپنے آپ کو اس معاشرے میں' کہ جس میں وہ جی رہے تھے' بیگانہ اور بے جڑ محسوس کرتے تھے' دیہاتی علاقوں سے تیزی سے توسیع پاتے ہوئے شہروں میں آئے تھے۔ بیشتر دیہاتی لوگوں نے اپنے بچوں کو کالج بھیجنا شروع کر دیا تھا' جنہیں کیمپسوں میں نئے لبرل ازم سے پالا پڑا۔ انہوں نے اپنے بہت سے ساتھی طالب علموں کو عقیدے سے محروم بھی پایا۔ والدین اپنی اولاد سے بیگانگی محسوس کرتے تھے اور چوکنے تھے کیونکہ وہ بظاہر بے خدا تصورات قبول کر رہے تھے۔ چرچوں میں انہیں کہیں زیادہ ہلا دینے والے تصورات سے واسطہ پڑتا تھا' جو شمال سے نئے آنے والے لوگ لائے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگ بنیاد پرست چرچوں کی طرف مائل ہونے لگے' خصوصاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ''برقیاتی'' چرچوں کی طرف۔ نئے طاقتور ٹیلی وینجلسٹوں (Televangelists) نے اس عرصے کے دوران سلطنتیں قائم کر لی تھیں۔ امکانی بنیاد پرست جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ رہتے تھے' جس کا آغاز ورجینیا بیچ (Beach) سے ہوتا تھا' جہاں پیٹ رابرٹسن نے اپنا کرسچین براڈ کاسٹنگ نیٹ ورک اور انتہائی مشہور ''700 کلب'' (700 Club) قائم کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لنچبرگ' ورجینیا آتا تھا' جہاں جیری فالویل نے 1956ء میں اپنی ٹیلی ویژن منسٹری (Ministry) شروع کی تھی' شارلٹ' نارتھ کیرولینا میں زندہ دل جم اور ٹیمی فے بیکر کی منسٹری تھی اور جنوبی کیلیفورنیا میں ''بائبل بیلٹ'' (Bible-Belt) ختم ہوتی تھی' یہ وہ علاقہ تھا جو سیاسی اور مذہبی قدامت پسندی کی طویل روایت کا حامل تھا۔

دوسرا عامل جو بہت سے قدامت پسندوں کے بنیاد پرست بننے کا باعث ہوا' دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں ریاستی طاقت میں تیز رفتار توسیع تھی۔ امریکی انقلاب کے وقت سے مرکزیت پسند حکومت پر اعتماد نہیں رکھتے تھے اور سیکولر ایسٹیبلشمنٹ سے اپنی بدمزگی کا اظہار مذہب کے وسیلے سے کرتے تھے۔ بنیاد پرست سپریم کورٹ کے ان فیصلوں سے بالخصوص مشتعل تھے جن کے تحت پبلک سکولوں کے میدانوں میں لازمی عبادات ادا کرنے پر پابندی لگا دی گئی تھی کیونکہ وہ سیاست اور مذہب کو الگ الگ کرنے والی ''علیحدگی کی دیوار'' کو توڑتی تھیں۔ سیکولر جج اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سکولوں میں عبادت کے پروگرام کی ریاستی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرپرستی آئین کی خلاف ورزی تھی' خواہ اس میں ٹیکسوں سے اخذ کردہ رقومات خرچ نہ بھی ہوتی ہوں اور خواہ عبادت رضا کارانہ ہی ہو۔ اس نوعیت کے فیصلے 1948ء' 1952ء اور 1962ء میں آئے۔ 1963ء میں سپریم کورٹ نے پہلی ترمیم کی مذہبی شق کا حوالہ دیتے ہوئے پبلک سکولوں میں بائبل پڑھنے پر بھی پابندی عائد کر دی۔ 1970ء کی دہائی کے دوران ایسے قوانین کو رد کرنے کے فیصلے سلسلہ وار صادر ہوئے جو (1) اگر مذہب کو فروغ دینے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ (2) اگر نیت سے قطع نظر ان کے نتیجے میں مذہب کو فروغ ملتا ہو۔ (3) اگر وہ حکومت کو مذہبی معاملات میں الجھاتے ہوں۔ عدالت تو امریکی کلچر کی بڑھتی ہوئی تکثیریت کی آئینہ دار تھی' اس نے اعلان کیا کہ وہ مذہب کے خلاف نہیں ہے تاہم اس امر پر بھی زور دیا کہ مذہب کو نجی دائرے میں محدود ہونا چاہیے۔ یہ فیصلے سیکولرازم کو فروغ دینے والے تھے' تاہم ان کا موازنہ ناصر یا شاہ کی مذہب کو محدود کرنے کی جارحانہ کوششوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بنیاد پرست اور ایوانجیلیکل عیسائی یکساں طور پر اپنے خیال کے مطابق بے خدا کروسیڈ پر مشتعل تھے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ مذہب کو جائز طور پر اس انداز سے محدود کیا جا سکتا ہے' اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کے تقاضے کلی اور خود مختار از تھے۔ انہیں اس بات کا غصہ تھا کہ جج (پہلی ترمیم کے تقاضے کے مطابق) مذاہب کو ''آزادانہ عمل'' کی اصولی اجازت دینے پر راضی تھے' ججوں کی نظر میں عیسائیت سمیت دیگر تمام مذاہب برابر تھے۔ ججوں کا اقدام ان کے مذہب کو جھوٹا کہنے کے مساوی محسوس ہوتا تھا۔ بنیاد پرست مذہب کو نجی زندگی تک محدود کرنے کے فیصلے کو نجی دائرے میں غیر ضروری اور عدیم النظیر مداخلت تصور کرتے اور اس پر سخت مشتعل تھے۔ جب داخلی محاصل سروس نے بعض بنیاد پرست کالجوں کے قواعد وضوابط کو سرکاری پالیسی سے متصادم قرار دے کر ان کا خیراتی ٹیکس سے استثنا کا درجہ ختم کرنے کی دھمکی دی تو اسے لبرل معاشرے کی طرف سے ایک جنگی اقدام تصور کیا گیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ صرف بنیاد پرستوں کو اپنے عقیدے کے اصولوں پر ''آزادانہ عمل'' کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ 1970ء کی دہائی کے وسط میں سپریم کورٹ نے آئی آر ایس کے ان فیصلوں کو درست قرار دے دیا' جو اس نے نارتھ کیرولینا کے گولڈز بارو کرسچین سکولوں میں افریقی امریکیوں کو داخلہ نہ دینے اور باب جونز یونیورسٹی میں بین النسلی مرد وزن میل جول پر پابندی کے خلاف دیئے تھے' یونیورسٹی کا دعویٰ تھا کہ بائبل نے اس عمل کی ممانعت کر رکھی ہے۔

یہ 1925ء کے سکوپس مقدمے کی طرح دو نظام ہائے اقدار کا تصادم تھا۔ دونوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فریقین کو ایقان تھا کہ وہ مطلق طور پر درست ہیں۔ پوری قوم دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ 1960ء کے عشرے کے اواخر اور 1970ء کے عشرے کے دوران جب ریاست نے سرکاری دائرۂ کار کے تصور کو توسیع دی تو جدید معاشرے کے حاشیوں پر موجود بہت زیادہ قدامت پسند عیسائیوں نے ان مداخلتوں کو سیکولر حملہ تصور کیا۔ وہ خود کو مین ہٹن' واشنگٹن اور ہارورڈ کی ''نو آبادیات'' محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کا تجربہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی اس آزردگی سے مختلف نہیں تھا' جو انہوں نے اجنبی طاقت کے تسلط پر محسوس کی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ حکومت خاندان کے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہی ہے: ایک آئینی ترمیم کے تحت عورتوں کو ملازمت کا حق دیا جانا بائبل کے اس حکم کی خلاف ورزی تھا جس میں کہا گیا تھا کہ عورت کا مقام گھر کی چار دیواری کے اندر ہے۔ بچوں پر جسمانی تشدد کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا تھا' حالانکہ بائبل واضح طور پر کہتی تھی باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو نظم وضبط کا پابند بنانے کے لیے مار پیٹ سکتا ہے۔ ہم جنس پرستوں کو شہری حقوق اور اظہار کی آزادی دے دی گئی تھی جبکہ اسقاط حمل کو بھی قانونی طور پر تحفظ دے دیا گیا تھا۔ جو اصلاحات سان فرانسسکو' بوسٹن یا ییل کے لبرلوں کو منصفانہ اور اخلاقی محسوس ہوتی تھیں' انہیں کوارکنساس اور الباما کے قدامت پسند مذہبی اعتبار سے گناہ تصور کرتے تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ بائبل کی لازماً لفظی تعبیر کی جانی چاہیے۔ وہ اباحتی معاشرے میں آزادی محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ یاد کرتے تھے کہ 1920ء کی دہائی میں دو تہائی ریاستوں نے شراب پر پابندی لگا دی تھی' لیکن اب پورے شمالی امریکہ میں لوگ ماری جوانا (Marijuana) کو قانون سے مبرا قرار دینے کے لیے کھلم کھلا مہم چلا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ یہی نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ امریکہ شیطان کے اثر میں جا رہا ہے۔

امریکی معاشرے میں بنیاد پرستی کا عروج:

ایک نئی قسم کی پریشانی کھڑی ہو گئی تھی۔ لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے مذہب کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر عیسائیوں نے جوابی حملہ نہیں کیا تو ہو سکتا ہے اگلی نسل کافر ہی ہو۔ 1970ء کے عشرے میں ہمیشہ سے زیادہ والدین نے اپنے بچوں کو سرکاری سکول سے نکال کر عیسائی اداروں میں داخل کروا دیا' جہاں انہیں عیسائی اقدار کی تعلیم دی جا سکتی تھی اور عیسائی نمونہ عمل مہیا کیا جا سکتا تھا اور جہاں تمام تعلیم بائبل کے تحت دی جاتی تھی۔ 1965ء سے 1983ء کے درمیانی عرصے میں ان ایوانجیلیکل سکولوں میں داخلوں میں

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھ گنا اضافہ ہو گیا جبکہ ایک لاکھ بنیاد پرست بچوں کو گھروں میں ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ ''انڈی پینڈنٹ کرسچین سکولز'' تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اب تک تو بنیاد پرستانہ سکول الگ تھلگ اور اکا دکا ہوتے تھے لیکن 1970ء کی دہائی کے دوران انہوں نے مربوط ہونا شروع کر دیا تا کہ تعلیمی معاملات میں قانون سازی کا جائزہ لیں' انشورنس پیکیج وضع کریں' اساتذہ کے تقرر کو منظم بنائیں اور ریاستی و وفاقی سطحوں پر لابی کرنے والے (Lobbying) گروپوں کی طرح کام کریں۔ یہ عمل جاری رہا۔ 1990ء کی دہائی تک ''امریکن ایسوسی ایشن آف کرسچین سکولز'' کے رکن سکولوں کی تعداد ایک ہزار تین سو ساٹھ تھی جبکہ ''ایسوسی آف کرسچین سکولز انٹرنیشنل'' کے اراکین سکولوں کی تعداد ایک ہزار نو سو تیس تھی۔ ہم جن دیگر سکولوں' کالجوں اور تعلیمی اداروں کا ذکر کر چکے ہیں' انہیں کی طرح یہاں بھی ایک ''کلیتی'' تعلیم کی خواہش موجود تھی' جس کے تحت سب کچھ' حب الوطنی' تاریخ' اخلاقیات' سیاست اور معیشت کو عیسائی تناظر میں دیکھا جا سکے۔ روحانی اور اخلاقی تربیت کو علمی کارناموں کی طرح اہم تصور کیا گیا۔ یہ امریکہ میں زندگی کو سیکولر بنائے جانے کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے مخلص اور بوقت ضرورت عسکریت پسند عیسائیوں کی تیاری کے مراکز تھے۔ مثال کے طور پر وہ امریکہ کی عیسائی تاریخ پڑھتے اور جارج واشنگٹن اور ابراہام لنکن جیسی شخصیات کی مذہبی بنیادوں کا تجزیہ کرتے' صرف ایسا ادب اور فلسفہ پڑھتے جو بائبل سے ''بہت زیادہ'' متفق ہوتا اور بائبل کی ''خاندانی اقدار'' پر زور دیتا۔

پروٹسٹنٹ بنیاد پرست بمقابلہ سیکولر ہیومنزم:

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ موثر انداز میں متحرک کرنے کی غرض سے کسی گروپ کو ایک دشمن کا واضح تعین کرنے والے نظریے کی ضرورت ہوتی ہے۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں کے دوران پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے دشمن کا تعین ''سیکولر ہیومنزم'' (Secular Humanism) کے طور پر کیا۔ اسلام پسندوں (Islamists) اور کک کے پیروکاروں کے برخلاف' جو کہ ''مغرب'' کے کلچر کو رد کر سکتے تھے' امریکی پروٹسٹنٹوں کے پاس' جو کہ جنوبی محب وطن تھے' ایسا کوئی آسان ہدف نہیں تھا۔ انہیں ''اندر کے دشمن'' سے لڑنا تھا۔ برسوں سے ''سیکولر ہیومنزم'' ایک ایسی جامع اصطلاح بن چکی تھی' کہ بنیاد پرست جس قدر یا عقیدے کو پسند نہ کرتے' اس پر اس اصطلاح کو چسپاں کر دیتے تھے۔ مثال کے طور پر یہاں بنیاد پرست ''خاندان دوست فورم'' (Pro-Family Forum) کی سیکولر ہومنزم کی تعریف درج کی جاتی ہے۔ یہ:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''خدا' بائبل اور عیسیٰؑ کا انکار کرتا ہے۔
موت کے بعد زندگی' روح' نجات اور جنت' عذاب اور دوزخ کا انکار کرتا ہے۔
بائبل کے تخلیق کے قصے کا انکار کرتا ہے۔
یقین رکھتا ہے کہ کچھ بھی مطلق نہیں ہے نہ خیر' نہ شر۔۔۔ کہ اخلاقی اقدار خود متعین کردہ اور واقعاتی ہوتی ہیں۔''جب تک کسی کو نقصان نہ پہنچے' اپنے عمل پر کاربند رہو۔
مرد اور عورت کے امتیازی کرداروں خاتمے پر یقین رکھتا ہے۔
عمر سے قطع نظر افراد کی باہمی رضامندی سے آزادانہ جنسی اختلاط' بشمول شادی سے قبل جنسی تعلق' ہم جنس پرستی' نسائی ہم جنس پرستی اور مباشرت محرمات (Incest) پر یقین رکھتا ہے۔
اسقاط حمل' یوتھینیز یا (Euthanasia)* اور خودکشی کے حق پر یقین رکھتا ہے۔
غربت کم کرنے اور مساوات قائم کرنے کے لیے امریکہ کی دولت کو برابر تقسیم کرنے پر یقین رکھتا ہے۔
ماحول اور توانائی کو قابو کرنے نیز اس کی محدودیت پر یقین رکھتا ہے۔
امریکی حب الوطنی کو مٹانے اور آزاد تجارتی نظام' اسلحے کے خاتمے اور یک عالمی سوشلسٹ حکومت کے قیام پر یقین رکھتا ہے''۔

یہ فہرست' ایسا لگتا ہے کہ معمولی اثر کی حامل تنظیم ''امریکن ہیومنسٹ سوسائٹی'' کے پہلے اور دوسرے منشور (1933ء اور 1937ء) کو سامنے رکھ کر ترتیب دی گئی تھی' اس کے باوجود اسے ساٹھ کی دہائی کے دوران تشکیل پانے والی لبرل ذہنیت کا معقول حد تک درست بیان کہا جا سکتا تھا۔

تاہم بیشتر نظریات کی طرح یہ بلاشبہ لبرل ازم کا ایک کیری کیچر (Caricature)

* کسی لاعلاج مرض میں مبتلا شخص کو بغیر اذیت کے ہلاک کر دینا' مثلاً زہر کا ٹیکہ لگا دینا' تاکہ وہ مرض کی بے انت اذیت سے بچ جائے۔(مترجم)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ضرورت سے زیادہ تعمیم بھی تھی۔ ہم جنس پرستوں کے حقوق کو ماننے والے لبرل مباشرت محرمات کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ کوئی لبرل یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ ''نہ کوئی خیر ہے نہ شر'' اس کے بجائے وہ تو یہ یقین رکھتے ہیں کہ ماضی کی پابندیوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یورپین یونین اور اقوام متحدہ جیسی تنظیموں کا ماضی کی دشمن قومی ریاستوں کو متحد کرنا کسی اعتبار سے ''یک عالمی سوشلسٹ حکومت'' بنانے کی خواہش نہیں ہے۔ تاہم یہ فہرست واضح کر دیتی ہے کہ جن اقدار کو بہت سے لبرل عیسائی اور سیکولر یکساں طور پر بدیہی خیر تصور کرتے ہیں (مثلاً غریبوں یا ماحول کی فکر کرنا) انہیں بنیاد پرست کس طرح شر تصور کرتے ہیں۔ یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ ایران یا اسرائیل کی طرح اس زمانے میں امریکہ میں بھی ''دو قومیں'' موجود تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جدید معاشرہ اس طرح سے دو حصوں میں منقسم ہو چکا تھا کہ مختلف دھڑوں کے لوگوں کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنا زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ چونکہ ضمنی کلچر اتنے الگ تھلگ تھے کہ بہت سوں کو تو یہ ادراک بھی نہیں تھا کہ کوئی مسئلہ وجود رکھتا تھا۔

تاہم پروٹسٹنٹ بنیاد پرست سیکولر ہیومنزم کی اس تعریف (Definition) کو کیری کیچر تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ سیکولر ہیومنزم کو ایک رقیب مذہب تصور کرتے تھے' جو اپنے مسلک' اپنے مقاصد اور اپنی ممتاز تنظیم کا حامل تھا۔ وہ اپنے اس ایقان کے لیے ٹورکاسو بمقابلہ واٹکنز مقدمے (1961ء) میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے حاشیے سے مدد لیتے تھے' جس میں سیکولر ہیومنزم کو واضح طور پر ایسے عالمی مذاہب میں شامل کیا گیا تھا ''جو عمومی طور پر خدا کے وجود پر ایقان تصور کیے جانے والے اعتقاد کا درس نہیں دیتے'' جیسے کہ بدھ مت' تاؤمت اور ایتھیکل کلچر (Ethical Culture)۔ بعد ازاں بنیاد پرستوں نے اس دلیل کو استعمال کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اور قانون ساز ''سیکولر ہیومنزم'' کی جن اقدار اور اعتقادات پر عمل کرتے ہیں' انہیں اسی طرح سرکاری زندگی میں خلاف قانون قرار دیا جائے جس طرح کہ قدامت پسندانہ پروٹسٹنٹ ازم کو قرار دیا گیا تھا۔

تاہم سیکولر ہیومنزم کے حوالے سے بنیاد پرستوں کی اس تشویش کو ایک چال یا لبرل رجحان کو بدنام کرنے کے ارادے سے مبالغہ آمیزی تصور کرنا ایک غلطی ہوگی۔ ''سیکولر ہیومنزم'' اور اس کے اعتقادات و اقدار بنیاد پرستوں کو خوف زدہ کر دیتے ہیں۔ وہ اسے شیطانی قوتوں کی سازش تصور کرتے تھا' جو ایک ممتاز بنیاد پرست نظریہ ساز ٹم لیہے کے بقول' ''خدا دشمن' اخلاق دشمن اور امریکہ دشمن'' تھا۔ اس کے بقول سیکولر ہیومنزم کو ایک چھوٹا سا کیڈر چلاتا ہے' جو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''عیسائیت اور امریکی خاندانی نظام کو تباہ کرنے'' کے لیے حکومت' سرکاری سکولوں اور ٹیلی ویژن نیٹ ورکس پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ ہیومنسٹ سینیٹروں' کانگرس مینوں اور کابینہ وزیروں کی تعداد چھ سو تھی اور ''امریکن سول لبرٹیز یونین'' میں ان کی تعداد کوئی دو لاکھ پچہتر ہزار تھی۔'' نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن''۔ ٹریڈ یونینیں' کارنیگی' فورڈ اور راک فیلر آرگنائزیشنز اور تمام کالج اور یونیورسٹیاں بھی ''ہیومنسٹ'' تھیں۔ قانون سازوں کا نصف فیصد سیکولر ہیومنزم کے مذہب سے وابستہ تھا۔ جان وائٹ ہیڈ (قدامت پسند رورفورڈ انسٹی ٹیوٹ کے صدر) نے پہلی ترمیم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا المیہ ہے کہ بائبل اساس ری پبلک (Bible-Based Republic) کے طور پر وجود میں آنے والا امریکہ ایک ایک سیکولر ریاست بن چکا ہے۔ وائٹ ہیڈ کا ایقان تھا کہ جیفرسن نے ''علیحدگی کی دیوار'' کا اصول ریاست کو مذہب سے نہیں بلکہ مذہب کو ریاست سے بچانے کے لیے وضع کیا تھا۔ تاہم اب ہیومنسٹ جج ریاست کو ایک صنم (Object of Worship) بنا چکے ہیں: اس نے کہا ''ریاست کو سیکولر تصور کیا جاتا ہے' ریاست تو مذہبی بن گئی ہے کیونکہ اس کا 'حتمی مقصد' خود ریاست ہی کا دوام ہے''۔ چنانچہ سیکولر ہیومنزم نے خدا کی مطلق حاکمیت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کی ریاست کی پرستش شرک تھی۔

سازش نہ صرف امریکی معاشرے میں نفوذ کر چکی تھی بلکہ اس نے دنیا کو بھی فتح کر لیا تھا۔ بنیاد پرست ادیب پیٹ بروکس کے بقول سیکولر ہیومنسٹوں نے ''ایک بہت بڑا سازشی نیٹ ورک'' تیار کر لیا ہے' جو ''ایک نئے عالمی نظام' (نیو ورلڈ آرڈر) کے نفاذ کے لیے' تمام دنیا کو غلام بنا لینے والی ایک عالمی حکومت کے قیام کے لیے تیزی سے کام کر رہا ہے''۔ دیگر بنیاد پرستوں کی طرح بروکس بھی دشمن کو ہر جگہ موجود اور طویل عرصے سے اپنے مقاصد کی بے رحمانہ تکمیل میں مصروف دیکھتا تھا۔ اس نے اسے سوویت یونین میں' وال سٹریٹ میں' صیہونیت میں' عالمی مالیاتی فنڈ' عالمی بینک اور فیڈرل ریزرو سسٹم میں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ اس سازش کو تیار کرنے والوں میں روتھ شیلڈز' راک فیلرز' کسنجر' برزیزنسکی' شاہ اور اومر ٹورجوز' پانامہ کا سابقہ آمر شامل تھے۔ سیکولر ہیومنزم کی یہ دہشت اتنی ہی غیر منطقی اور ناقابل علاج تھی جتنا کہ گزشتہ صفحات میں زیر بحث آنے والا کوئی مریضانہ وہم' اور یہ بھی ویسے ہی فنا کے خوف سے ابھری تھی۔ عموی طور پر جدید معاشرے اور بالخصوص امریکی جدید معاشرے کو پروٹسٹنٹ بنیاد پرست بھی اسلام پسندوں ہی کی طرح شیطانی تصور کرتے تھے۔ مثال کے طور پر فرینکی شیفر کے بقول مغرب:

''ایک الیکٹرانک دور ظلمت میں داخل ہونے والا ہے' جس میں نئے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کافر قبیلے تمامتر دستیاب ٹیکنالوجی کی قوت سمیت مہذب انسانیت کے آخری قلعے کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ہمارے سامنے تاریکی کا وژن پھیلا ہوا ہے۔ ہم نے عیسائیت کو ترک کر دیا ہے اور ہمارے سامنے مایوسی کا لامتناہی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے''۔

یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں کی طرح امریکی پروٹسٹنٹ بھی محسوس کرتے تھے کہ ان کی کمر دیوار سے لگ چکی ہے اور اب انہیں بقا کے لیے جوابی حملہ کرنا ہی پڑے گا۔

پروٹسٹنٹ بنیاد پرست امریکہ کا جیسا وژن تشکیل دے رہے تھے وہ مرکزی دھارے کے لبرل لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ بنیاد پرستوں کو یقین تھا کہ امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے تاہم وہ دوسرے امریکیوں کو مرغوب اقدار کو قبول نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے امریکی تاریخ لکھی تو تقریباً سارے مورخوں نے پیورٹن پلگرم فادروں کو ناسٹلجائی انداز میں دیکھا مگر ان کے ایسے اوصاف کی تعریف کی جو لبرلوں کے لیے کم کشش رکھتے تھے۔ پلائماؤتھ راک فاؤنڈیشن کے بانی رس والٹن نے پوچھا کہ پیورٹن نیو انگلینڈ میں کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں؟ اس نے خود جواب دیا کہ ''جمہوریت؟ نہیں' اولین امریکی اس نئی دنیا کے لیے ایسا کوئی تصور نہیں لائے تھے۔'' نہ ہی پیورٹنوں کو آزادی سے کوئی غرض تھی' وہ تو ''چرچ اور ریاست میں درست حکومت'' میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے' جو ''دوسرے انسانوں کو درست طریقے سے چلنے پر مجبور کرے''۔ اسی طرح ''انقلاب'' کو بھی ''جمہوری'' تصور نہیں کیا گیا۔ امریکی پروٹسٹنٹ بنیاد پرست جمہوریت کو یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں جیسی وجوہات کے تحت انہیں جیسے شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پیٹ رابرٹسن کے بقول امریکی ریپبلک کے بانیوں (Founding Fathers) نے کیلونسٹ انجیلی آدرشوں سے فیضان پایا تھا۔ اسی وجہ سے امریکی انقلاب فرانسیسی اور روسی انقلابوں والی راہ پر گامزن ہونے سے محفوظ رہا تھا۔ امریکی انقلابیوں کو عوامی حکومت سے کوئی سروکار نہیں تھا' وہ تو ایک ایسی ریپبلک قائم کرنا چاہتے تھے جس میں اکثریت کی رائے اور دیگر تمام مساوات پسندانہ (Egalitarian) رجحانات کو انجیلی قوانین کے تابع رکھا جائے۔ امریکہ کے بانی یقیناً ''ایک ایسی خالص' براہ راست جمہوریت نہیں چاہتے تھے' جس میں اکثریت اپنی من مانی کر سکے''۔ وہ اپنے قوانین کا نفاذ کرنے والی حکومت کے تصور کو اسی طرح ناپسند کرتے تھے جس طرح کہ بہت سے مسلمان بنیاد پرست آئین ''خدا کے قانون سے ماورا قانون بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا بلکہ اسے صرف بنیادی

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قانون کو انسان کی فہم اور موزونیت کے مطابق لاگو کرنا ہے''۔

امریکی ماضی کا یہ روپ لبرل ایسٹیبلشمنٹ والے روپ سے بہت مختلف ہے۔ بنیاد پرستانہ تاریخ ایک رد ثقافت کی تخلیق کردہ ہے' جو امریکہ کو واپس راہ راست پر لانا چاہتی ہے۔ سب امریکہ کی مذہبی شروعات سے اس کا زوال دیکھتے ہیں: سپریم کورٹ کے فیصلے' سماجی اختراعات اور اسقاط حمل کی قانونی اجازت نے ''آزادی'' کے نام پر سیکولرائزیشن کو فروغ دیا ہے۔ تاہم 1970ء کی دہائی کے اختتام تک بنیاد پرستوں کو اس حقیقت کا ادراک ہونے لگا تھا کہ انہیں خود بھی تھوڑا بہت الزام قبول کرنا ہوگا۔ انہوں نے سکوپس مقدمے کے بعد پسپائی اختیار کر لی تھی اور خود کو الگ تھلگ ہی رکھا تھا اور سیکولر ہیومنسٹوں کو کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ اب انہوں نے سیاسی فعالیت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ 1970ء کی دہائی کے آغاز میں ٹم لیہے نے کبھی تجویز نہیں دی تھی کہ بنیاد پرستوں کو سیاسی اعتبار سے سرگرم ہو جانا چاہیے تاہم اس دہائی کے اختتام تک اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہیومنسٹ امریکہ کو ''چند برس کے اندر اندر'' تباہ کر دیں گے' اس لیے عیسائیوں کو اخلاقیات اور شائستگی کے دفاع کی خاطر پچھلے تین عشروں کی نسبت زیادہ فعال ہونا ہوگا''۔

بنیاد پرستوں کو سیاست سے دور رکھنے والے عوامل میں سے ایک عامل ان کا پری ملینیل ازم (Premillennialism) ہے: چونکہ دنیا کا انجام بربادی ہے لہٰذا اس کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا بے سود ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ 1970ء میں ہال لنڈسے نے اپنی انتہائی کامیاب کتاب (The Last Great Planet Earth) شائع کروائی' جس کی 1990ء تک دو کروڑ اسی لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی تھیں۔ اس میں پرانے پری ملینیل تصورات کو رواں اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ لنڈسے نے آخری زمانے میں امریکہ کا کوئی خاص کردار نہیں دیکھا اور یہ نتیجہ نکالا کہ عیسائیوں کو قریب آتے ہوئے انجام کی ''نشانیاں'' واقعات جاریہ میں دیکھنے تک ہی قانع رہنا چاہیے۔ تاہم 1970ء کی دہائی کے اختتام تک ٹم لیہے کی طرح اس نے بھی اپنی سوچ تبدیل کر لی تھی۔ اس نے اپنی کتاب (The 1980s, Countdown to Armageddon) میں لکھا' اگر امریکہ متوازن رہا تو وہ ساری ہزاری ایک عالمی قوت رہے گا۔ تاہم

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک شہری اور خداوند کے خاندان کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری طرح نبھائیں۔ ہمیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فعال ہونے کی ضرورت ہے' ہم ایسے افراد منتخب کریں جو نہ صرف حکومت میں بائبل کی اخلاقیات کو رائج کریں بلکہ ہمارے ملک اور ہمارے طرز حیات کو محفوظ رکھنے والی پالیسیاں بنائیں''۔

بنیاد پرست تیار تھے۔ ان کے سامنے لڑنے کے لیے دشمن موجود تھا' امریکہ کے لیے ایک وژن تھا کہ اسے کیسا ہونا چاہیے' یہ وژن مرکزی دھارے کے لبرلوں کے وژن سے بہت مختلف تھا اور اب وہ اپنے تمام تر خوفوں کے باوجود یقین رکھتے تھے کہ وہ اپنا کروسیڈ جیتنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

1970ء کی دہائی کے اواخر تک امریکہ کے پروٹسٹنٹ بنیاد پرست بہت پراعتماد ہو چکے تھے۔ 1980ء کی دہائی میں ان کے متحرک ہونے کی یہ تیسری وجہ تھی۔ وہ سکوپس مقدمے سے پسپا ہو جانے والے کمزور لوگ نہیں رہے تھے۔ دولت مندی' جس نے مباح معاشرے کو ایک موقع بنا دیا تھا' ان پر بھی اثرانداز ہوئی تھی۔ جنوب کے نئے نئے عروج اور وہاں بنیاد پرستی کے ابھارنے بہت سوں کو یہ احساس دلایا کہ اب ان کے لیے ایسٹیبلشمنٹ کو چیلنج دینا ممکن ہے۔ وہ جانتے تھے کہ 1960ء کی دہائی کے دوران مرکزی دھارے کے فرقوں کی رکنیت میں کمی آ گئی تھی جبکہ ایوانجلسٹ چرچ کی رکنیت میں اوسطاً ہر پانچ سال میں آٹھ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ ٹیلی وینجلسٹ (Televangelist) بھی عیسائیت کی پیشکش اور مارکیٹنگ میں زیادہ ماہر ہو گئے تھے۔ یہ سرکاری شعبے سے غائب ہو جانے والے خداوند کی ایک ڈرامائی اور ٹھوس موجودگی کو تخلیق کرنا دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ پینٹی کوسٹلسٹ مبلغ اورل رابرٹس کو ٹی وی پر بیمار اور معذور لوگوں کو ظاہری طور پر صحت عطا کرتے ہوئے دیکھتے تو وہ الوہی قوت کو بروئے عمل آتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔ جب انہوں نے ایک ہفتے میں ایک لاکھ جانیں بچانے کے دعویدار انتہائی طاقتور ٹیلی وینجلسٹ جمی سوگیرٹ کو رومن کیتھولکوں' ہم جنس پرستوں اور سپریم کورٹ کو گالیاں نکالتے سنا تو انہیں احساس ہوا کہ کوئی تو ہے جو ان کے خیالات کو عوام میں بیان کر رہا ہے۔ جب بنیاد پرستوں نے پیٹ رابرٹسن اور بیکرز کو ہر ہفتے عطیے میں حاصل ہونے والی بے پناہ رقوم کے بارے میں سنا تو انہیں یقین ہو گیا کہ خداوند ہی معاشی مسئلوں کا حل ہے۔ انہوں نے تلقین کی کہ عیسائیوں کو پانے کے لیے لازماً دینا چاہیے۔ رابرٹسن کے بقول خداوند کی بادشاہت میں ''نہ کوئی معاشی مندا ہو گا نہ قلت''۔ دس چوٹی کی عیسائی ٹیلی ویژن سلطنتوں کو دیکھ کر یہ بات سچ دکھائی دیتی تھی' جنہیں ہر سال ایک ارب سے زیادہ ڈالر حاصل ہوتے ہیں' جن میں ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہزار سے زیادہ لوگ ملازمت کرتے ہیں اور وہ اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ پروگرام پیش کرتی ہیں۔

تاہم جیری فالویل نے اپنے زمانے میں سب سے زیادہ نام کمایا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ 1960ء اور 1970ء کی دہائی کے دوران امریکہ کے ہر دس میں سے چار گھروں میں لوگ اس کے لنچ برگ' ورجینیا والے سٹیشن کی نشریات دیکھتے تھے۔ اس نے وہاں 1956ء میں مٹھی بھر لوگوں کے ساتھ ایک متروک سوڈا فیکٹری میں اپنی منسٹری کا آغاز کیا تھا۔ تین سال بعد اس کے پیروکاروں کی تعداد تین گنا ہو گئی اور 1988ء تک تھامس روڈ بپٹسٹ چرچ کے اٹھارہ ہزار اراکین اور ساٹھ شریک پیسٹر (Pastors) تھے۔ چرچ کی سالانہ آمدنی چھ کروڑ ڈالر سے زیادہ تھی اور اس کے پروگرام 392 ٹیلی ویژن چینلوں اور 600 ریڈیو سٹیشنوں سے نشر ہوتے تھے۔ ایک بندھا ٹکا (Typical) بنیاد پرست ہونے کے ناطے فالویل ایک علیحدہ خود انحصار دنیا تشکیل دینا چاہتا تھا۔ لنچبرگ میں اس نے انجیلی خطوط پر چلایا جانے والا ایک سکول کھولا' 1976ء تک لبرٹی بپٹسٹ کالج میں 1500 طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ فالویل نے فلاحی کام بھی کیے: شراب کے عادیوں کے لیے ایک ہسپتال' ایک نرسنگ ہوم اور اسقاط حمل کا متبادل پیش کرنے والی بچے اپنانے والی ایجنسی (Adopting Agency)۔

فالویل سیکولر ہیومنزم کو شکست دینے کے لیے ایک متبادل معاشرہ تخلیق کر رہا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے چاہتا تھا کہ لبرٹی کالج ایک عالمی سطح کی یونیورسٹی بن جائے' ویسے ہی جیسے نوٹرے ڈیم رومن کیتھولکوں کے لیے یا مورمنوں کے لئے برگھم ینگ۔ 1920ء کی دہائی میں باب جونز کے اپنی یونیورسٹی قائم کرنے کے وقت سے بنیاد پرست تبدیل ہو گئے تھے۔ معاشرے سے علیحدگی ہی کافی نہیں رہی تھی۔ دیگر بنیاد پرست معلموں کی طرح فالویل بھی مستقبل کا ایک کیڈر تشکیل دے رہا تھا' ''نوجوانوں کی ایک ایسی فوج جو زندگی پرور' اخلاق پرور اور امریکہ پرور ہو''۔ جہاں باب جونز یونیورسٹی عیسائی سکولوں کے لیے اساتذہ تیار کرنے کی غرض سے سیکولر دنیا سے الگ تھلگ ہو گئی تھی' وہاں فالویل سیکولر ایسٹیبلشمنٹ میں نفوذ چاہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''لبرٹی'' زندگی کے تمام شعبوں اور بڑے پیشوں کے لیے طلباء کو تربیت دے گا۔ وہ معاشرے کو ''بچائیں'' گے۔ تاہم اس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں بنیاد پرستانہ نظام کی اطاعت کرنا ہو گی: کالج میں مذہبی مضامین ضرور پڑھائے جائیں گے' طلباء کو ہر سمیسٹر میں کلیسائی حلقے میں ''کرسچین سروس اسائنمنٹ'' پوری کرنا ہو گی' شراب اور تمباکو نوشی پر پابندی ہو گی' طلباء مذہبی لباس پہنیں گے اور ہفتے میں تین مرتبہ تھامس روڈ میں عبادت کریں گے۔ باب جونز کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برخلاف فالویل نے تعلیمی منظوری حاصل کی اور غیر بنیاد پرست طلباء بھی داخلے لینے لگے' جن کے والدین نے کالج کی متانت اور اچھے تعلیمی معیارات کی وجہ سے اسے چنا تھا۔ فالویل نے ایک درمیانی راستہ چنا۔ لبرٹی ایک طرف تو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کے اباحتی لبرل آرٹس کالجوں کا متبادل مہیا کرتا تھا تو دوسری طرف بعض پرانے بائبل کالجوں کے اوسط معیارات۔ عقیدے پر زور دینے کے باوجود کیمپس دانش ورانہ اور سماجی معاملات پر سنجیدہ مباحثے کے لیے کھلا تھا' اس کی وجہ سے طلباء سیکولر دنیا میں اسی کی شرائط پر شرکت اور اپنی (Reconquista) شروع کرنے کے قابل ہو جاتے۔

فالویل ایک حملے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا اور ایسا وہ جدید انداز سے کر رہا تھا۔ کالج' چرچ اور ریڈیو سٹیشن کھوئی ہوئی اور فنا ہوتی ہوئی دنیا کو بچانے کی ایک کوشش تھی۔ فالویل نے اپنی سلطنت کو نئے شاپنگ مالز (Malls) کی طرز پر بنایا تھا' جہاں خدمات کا ایک امتزاج پیش کیا جاتا تھا۔ فالویل نے اپنے کالج' چرچ اور دیگر اداروں کو سرمایہ دارانہ خطوط پر چلایا۔ جب سیکولر پاور بروکر 1980ء کی دہائی میں دائیں بازو کے ابھار کی قیادت کو تلاش کر رہے تھے تو فالویل ان کا آدمی بن گیا۔ وہ جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی حرکیت کو واضح طور پر سمجھتا تھا اور اس میں بھرپور کردار ادا کرنے پر قادر تھا۔

فالویل کی طرف راغب ہونے والے سب بنیاد پرست خوف سے بھرے ہوئے تھے۔ فالویل' لیہے یا رابرٹسن کو اس بات کا قائل کرنے کی امید میں بحث کرنا بے کار تھا کہ کوئی سیکولر ہیومنسٹ سازش نہیں ہے۔ یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں جیسے فنا کے اس مریضانہ خوف نے ان کی مہم کو مہمیز کیا تھا۔ جدید معاشرے نے مادی اور اخلاقی اعتبار سے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے خیر ہونے پر یقین کرنا باجواز ہوتا۔ یورپ اور امریکہ میں کم از کم جمہوریت' آزادی اور رواداری قابل تعریف اقدار تھیں۔ تاہم بنیاد پرست اس کو نہیں دیکھ سکتے تھے' اس لیے نہیں کہ وہ کجرو تھے بلکہ اس لیے کہ انہوں نے جدیدیت کا تجربہ ایک حملے کے طور پر کیا تھا' جس نے ان کی انتہائی مقدس اقدار کو خطرے میں ڈال دیا تھا اور ان کی ہستی ہی کو مخدوش بنا دیا تھا۔ 1970ء کی دہائی کے اواخر تک یہودی' عیسائی اور مسلمان روایت پسند جوابی حملے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب نہم

بنیاد پرستوں کا حملہ

(1974-79ء)

بنیاد پرستانہ حملہ اور سیکولروں کی حیرت:

بنیاد پرستانہ حملے نے بہت سے سیکولروں کو حیرت زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ تصور کرتے تھے کہ مذہب سیاست میں دوبارہ ایک بڑا کھلاڑی نہیں بن سکتا تاہم 1970ء کی دہائی کے اواخر میں عقیدے کا ایک عسکری فروغ رونما ہوا۔ 79-1978ء میں دنیا نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ ایک غیر معروف ایرانی آیت اللہ نے شاہ محمد رضا پہلوی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا' جو مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں میں سب سے زیادہ ترقی پسند اور مستحکم دکھائی دیتی تھی۔ عین اس زمانے میں کہ جب دنیا کی حکومتیں مصر کے صدر انور سادات کی امن کے لیے پہل کرنے' ریاست اسرائیل کو تسلیم کرنے اور مغرب کی طرف اس کے میلان کی تعریف کر رہی تھیں' مصری نوجوان مذہب کی طرف راغب ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اسلامی لباس پہننے لگے تھے' جدیدیت کی آزادیوں کو دھتکار رہے تھے اور بہت سے نوجوان یونیورسٹیوں میں جارحانہ قبضے کر رہے تھے۔ امریکہ میں جیری فالویل نے 1971ء میں ''مورل میجارٹی'' (Moral Majority) قائم کی اور اس نے پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں پر زور دیا کہ وہ سیاست میں حصہ لیں اور ''سیکولر ہیومنسٹ'' ایجنڈے کو فروغ دینے والے ریاستی اور وفاقی قوانین کو چیلنج کریں۔

سیکولر نظریے ایسٹیبلشمنٹ کو مذہب کا یہ اچانک ابھار ہلا دینے والا اور کجرو دکھائی دیتا تھا۔ ایک جدید نظریے کو اپنا لینے کے باوجود' جو کہ بہت مؤثر ثابت ہوا تھا' یہ ریڈیکل روایت پسند صحیفے کا حوالہ دیتے اور ایسے پرانے قوانین اور اصولوں کی بات کرتے جو بیسویں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صدی کے سیاسی مباحثے میں بالکل اجنبی لگتے تھے۔ ان کی ابتدائی کامیابی ناقابل توجیہہ لگتی تھی' یہ (واقعتاً؟) ناممکن تھا کہ کوئی جدید ریاست ان خطوط پر چلائی جا سکے۔ بنیاد پرست ماضی کی طرف واپس جا رہے تھے۔ مزید براں ان پالیسیوں کو جو ولولہ انگیز تائید ملی تھی وہ توہین آمیز تھی۔ جو امریکی اور یورپی یہ سمجھتے تھے کہ مذہب کے دن پورے ہو چکے ہیں وہ اب یہ دیکھنے پر مجبور تھے کہ نہ صرف ایک پرانا عقیدہ لوگوں پر اثر ڈال سکتا ہے بلکہ لاکھوں پکے یہودی' عیسائی اور مسلمان اس سیکولر' لبرل کلچر سے نفرت کرتے ہیں' جس پر انہیں فخر ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقت میں بنیاد پرست ابھار نہ تو اچانک رونما ہوا تھا اور نہ وہ حیران کن تھا۔ کئی عشروں سے اپنی سیکولر حکومتوں کے جبر و ستم کا شکار زیادہ قدامت پسند لوگ آزردگی سے بھرے ہوئے تھے۔ بہت سوں نے خالص عقیدے کا ایک مقدس حصار بنانے کے لیے جدید معاشرے سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ وہ خود کو تباہ کر دینے کا تہیہ کرنے والی حکومتوں کے ہاتھوں فنا کے خطرے سے دوچار ہو کر اپنے آپ کو میدانِ جنگ میں محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو اپنی بقا کی جدوجہد کے لیے متحرک کرنے کی خاطر نظریات وضع کیے۔ مذہب سے لاتعلق یا مذہب کی دشمن سماجی قوتوں میں گھرے ہونے کی وجہ سے ان میں ایک محصور ذہنیت پیدا ہو گئی تھی' جو باآسانی جارحیت میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ 1970ء کی دہائی کے وسط تک انتہا ہو چکی تھی۔ سب کو اپنی قوت کی آگہی تھی اور انہیں یقین تھا کہ بحران جنم لے چکا ہے اور وہ اپنی تاریخ کے ایک منفرد لمحے کا سامنا کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ دنیا انہیں تبدیل کر دے سب دنیا کو بدلنے پر تیار تھے۔ ان کے خیال میں تاریخ کا آخری موڑ آ چکا تھا' ہر شے غلط تھی۔ وہ اب ایسے معاشروں میں رہتے تھے جو یا تو بے خدا تھے یا انہوں نے مذہب کو الگ تھلگ کر دیا تھا اور وہ دنیا کو دوبارہ مقدس بنانے کے لیے تیار تھے۔ سیکولر لوگوں کو اپنی فخریہ خود انحصاری لازماً ترک کر دینی چاہیے' جس نے انسان کو ہر شے کی کسوٹی بنا دیا ہے اور الوہی ہستی کی مطلق حاکمیت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔

عقیدے کی جدید صورتیں:

سیکولر لوگ اس مذہبی ردعمل سے لاعلم رہے تھے۔ مختلف معاشرے اتنے منقسم ہو چکے تھے کہ امریکہ کے لبرل یا ایران جیسے ملک کے مغرب زدہ سیکولر برسوں سے پروان چڑھنے والی مذہبی ردِثقافت کے بارے میں غلط اندازے لگاتے تھے۔ ان کا یہ تصور غلط تھا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ جارحانہ مذہب پرانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے' یہ تو عقیدے کی جدید صورتیں تھیں' جو اکثر و بیشتر نہایت اختراعی اور صدیوں کی روایت کو ترک کرنے پر آمادہ تھیں۔ تینوں مذاہب کے بنیاد پرست جدیدیت کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ جدید تصورات اور ولولوں سے متاثر بھی تھے۔ تاہم انہیں بہت کچھ سیکھنا تھا۔ یہ ابتدائی حملے بنیاد پرستانہ عہد کے شان و شوکت والے زمانے کی عکاسی کرتے تھے تاہم جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے کسی مذہبی تحریک کے لیے جدید سیاست کی تکثیری' عقلی اور عملیت پسندانہ دنیا میں داخل ہونے کے بعد اپنے اتحاد کو باقی رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ جبر کے خلاف انقلاب اپنی باری آنے پر جابر ہوسکتا تھا' ایک متحد' کلیتی ریاست کو قائم کرنے کی غرض سے جدیدیت کی علیحدگیوں کو ختم کرنے والی مہم آمرانہ بن سکتی تھی۔ بنیاد پرستوں کی اساطیری' مسیحانہ یا صوفیانہ بصیرتوں کو سیاسی Logoi میں تبدیل کرنا خطرناک تھا۔ تاہم ابتداء میں بنیاد پرستوں نے محسوس کیا کہ کئی عشروں کی ذلت اور جبر کے بعد وہ تبدیلی لاسکتے ہیں اور یہ کہ وہ دنیا کو خدا کے لیے دوبارہ فتح کرسکتے ہیں۔

گش ایمونم:

ایرانی انقلاب نے پہلی مرتبہ دنیا کی توجہ بنیاد پرستی کے پوشیدہ امکان کی طرف دلائی تاہم سیاست کی دنیا میں کامیابی سے ہمکنار ہونے والی یہ کوئی پہلی تحریک نہیں تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ 1973ء کی یوم کپور جنگ کے بعد اسرائیل میں کک کے پیروکار (Kookists) اس امر کے قائل ہوگئے تھے کہ یہودی شر کی قوتوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں۔ یوم کپور جنگ تو ایک انتباہ تھی' نجات وقوع پذیر ہونے والی ہے تاہم اگر حکومت نے مسیحائی عمل کو روکنے والی پالیسیوں کو فروغ دینے کا تہیہ کر رکھا ہے تو پھر انہیں خود قدم اٹھانا ہوگا۔ انہیں کسی حد تک حیرت ہوئی تھی جب بعض سیکولر ان کے اتحادی بن گئے تھے' جو ربی کک کے وژن کو تو نہیں مانتے تھے تاہم جنہوں نے مقبوضہ علاقے کے ایک ایک انچ پر قبضہ برقرار رکھنے کا انہیں کی طرح عزم کر رکھا تھا۔ آری چیف آف سٹاف رافیل ایٹن یا نیو کلیائی طبیعیات داں اور کٹر قوم پرست یوول نیمین جیسے لوگ' جو نہ تو کک کے پیروکار تھے اور نہ باعمل یہودی تھے' مقبوضہ علاقوں کو اسرائیل کے لیے محفوظ رکھنے کے مقصد کے تحت مذہبی صیہونیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے پر رضامند تھے۔ فروری 1974ء میں رہیوں' جو شیلے نوجوان سیکولروں' کک کے پیروکاروں اور آئی ڈی ایف میں خدمات انجام دے چکے اور اسرائیل کے لیے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگیں لڑ چکے مذہبی صیہونیوں نے ایک گروپ قائم کیا' جسے انہوں نے گش ایمونم (Gush Emunim) کا نام دیا۔

کچھ عرصے بعد انہوں نے اغراض و مقاصد پر مبنی ایک کتابچہ شائع کر دیا۔ ''گش'' کوئی سیاسی جماعت نہیں تھی' جو نیسٹ (Knesset) میں نشستوں کے لیے میدان میں اتری ہو' بلکہ وہ تو ایک پریشر گروپ تھا' جو کہ صیہونی وژن کے مکمل اطلاق کے لیے ''یہودیوں کو بیدار کرنے'' کی خاطر کام کر رہا تھا ''اس ادراک کے ساتھ کہ اس وژن کا ماخذ اسرائیل کا یہودی ورثہ ہے اور یہ کہ اس کا مقصد اسرائیل اور ساری دنیا کی نجات ہے۔'' جہاں اولین صیہونیوں نے مذہب کو نظر انداز کر دیا تھا' وہاں ''گش'' نے اپنی تحریک کے یہودیت سے انسلاک پر زور دیا۔ جہاں ''گش'' کے سیکولر اراکین ''نجات'' کی اصطلاح کو ڈھیلے ڈھالے سیاسی مفہوم میں استعمال کر سکتے تھے' وہاں مذہبی اراکین' جنہوں نے کک کے کلیتی وژن کو اپنا لیا تھا' اس امر کے قائل تھے کہ نجات کا آغاز ہو چکا ہے اور یہ کہ جب تک یہودی پوری ارتز اسرائیل میں آباد نہیں ہو جاتے باقی دنیا میں امن نہیں ہوگا۔

گش ایمونم ابتداء ہی سے سیکولر اسرائیل کے لیے ایک چیلنج تھی۔ ان کے منشور میں پرانی صیہونیت کی ناکامی پر زور دیا گیا تھا۔ حالانکہ یہودی اپنے وطن میں بقا کی ایک خطرناک کشمکش میں پھنسے ہوئے ہیں:

> ''ہم صیہونی آدرش کے حقیقت کا روپ دھارنے کے عمل میں ایک زوال اور پسپائی کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس بحران کے ذمہ دار چار مربوط عوامل ہیں: طویل تنازعے کی پیدا کردہ ذہنی کوفت اور اضطراب' چیلنج کا فقدان' خود غرضانہ اہداف کا حصول' یہودی عقیدے کا ضعف۔''

گش کے مذہبی اراکین کے خیال میں آخری وجہ .....مذہب کی کمزوری.....اہم تھی۔ ان کا ایقان تھا کہ یہودیت سے الگ ہو کر صیہونیت معنویت سے محروم ہو جائے گی۔ کک کے پیروکار مقبوضہ عرب علاقوں کو فتح کرنا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ سیکولر اسرائیل کے خلاف جنگ میں بھی مصروف تھے۔ انہوں نے پرانے سوشلسٹ اور قوم پرست مباحثے کی جگہ انجیلی زبان کو رائج کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ جہاں لیبر صیہونی یہودی زندگی کو معمول پر لانے اور یہودیوں کو ''تمام دوسری اقوام جیسا'' بنانے کے خواہاں تھے' وہاں گش ایمونم اسرائیل کے لوگوں کی ''انفرادیت'' پر زور دیتی تھی۔ کیونکہ یہودیوں کو خداوند نے منتخب کیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا' وہ جوہری طور پر تمام دوسری اقوام سے مختلف تھے اور انہی جیسے قوانین کے پابند نہیں تھے۔ انجیل نے انہیں واضح طور پر ''پاک'' لوگ قرار دیا تھا' اسرائیل ساری دنیا سے منفرد تھا۔ جہاں لیبر صیہونیت نے جدید مغرب کے لبرل ہیومنزم کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی' وہاں گش ایمونم کا ایقان تھا کہ یہودیت اور مغربی کلچر باہم متضاد ہیں۔ چنانچہ کک کے پیروکار سیکولر صیہونیت کو بے کار تصور کرتے تھے۔ ان کا کام صیہونیت کو دوبارہ مذہبی رنگ دینا' ماضی کی غلطیوں کی اصلاح اور تاریخ کو درست کرنا تھا۔

یوم کپور جنگ میں شکست نے ظاہر کر دیا تھا کہ نجات کے عمل کو تیز کرنے کے لیے سرعت سے کام کرنے کی ضرورت تھی' جس کو سیکولر صیہونیت کی ''جھوٹی'' پالیسیوں نے مسخ کر دیا تھا۔ گش ایمونم کو پوری طرح فعال ہونے میں ایک سال کا عرصہ تو لگ گیا تاہم اس نے بالآخر اپنے اراکین کو ایک مکمل طرز حیات مہیا کر دیا گش کا اپنی طرز کا لباس' موسیقی' سجاوٹ' کتابیں اور بچوں کے نام ہوتے تھے اور حد تو یہ ہے کہ گفتگو کا ایک اپنا انداز تھا۔ گش نے ایک روِثقافت تخلیق کر لی تھی' جس نے انہیں بنیاد پرستوں کی طرح سیکولر اسرائیل سے الگ تھلگ ہونے کے قابل بنا دیا تھا۔ تاہم گش کے توریت پر عمل کرنے کا طریقہ جارحانہ تھا۔ ریاست کے ابتدائی زمانے میں سیکولر اسرائیلی روایتی ٹوپی پہننے والے یہودیوں کا مذاق اڑاتے تھے' اب مذہبی کارکن ''کپا'' (Kipa) پہنتے تھے۔ گش کے اراکین خود کو لیبروں کی نسبت زیادہ مصدقہ یہودی اور صیہونی تصور کرتے تھے اور وہ اپنے آپ کو نہ صرف پرانے مقدس جنگجوؤں سے جوڑتے تھے۔ بلکہ تھیوڈور ہرزل' بین گوریان اور ایک صوفیانہ وژن کے حامل اور اپنے زمانے میں پاگل تصور کیے جانے والے اولین رائدین سے بھی۔

جہاں گش کے مذہبی اور سیکولر اراکین تنظیم سازی میں مصروف تھے' وہاں موشے لیونگر کی مدد سے کک کے پیروکاروں کا ایک گروپ مغربی کنارے میں نابلوس کے عرب قصبے میں ایک ریلوے ڈپو میں ایک آبادی (Garin) قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نابلوس یہودیوں کے لیے بھی مقدس تھا۔ آبادکار اس زمین کو پاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے' جسے ان کے خیال میں فلسطینیوں نے ناپاک کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی آبادی کو اس شہر کا ایک انجیلی نام ''ایلون موریہ'' (Elon Moreh) دیا اور ریلوے ڈپو کو مقدس متنوں کی تدریس کے لیے ایک یشیوا بنانے کی کوشش کی۔ وہ گش ایمونم میں شمولیت پر بھی تیار تھے۔ حکومت نے آبادکاروں کو نکالنے کی کوشش کی کیونکہ گارین غیر قانونی تھا' لیکن گش اقوام متحدہ کے اعلامیوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی' جن کا تقاضا تھا کہ اسرائیل مقبوضہ علاقوں سے واپس چلا جائے۔ گش کا دعویٰ تھا کہ یہودی دوسروں کے قوانین کی اطاعت کرنے کے پابند نہیں ہیں۔ آبادکاروں کو اسرائیل میں بھرپور حمایت حاصل ہوگئی تھی' جبکہ حکومت ہچکچاہٹ کا شکار نظر آتی تھی۔ اپریل 1975ء میں موشے لیونگر کی قیادت میں مغربی کنارے میں بیس ہزار یہودیوں نے جلوس نکالا۔ اس نے ایلون موریہہ میں اپنے خیمے سے' جسے وہ اپنا ''جنگی مرکز'' کہتا تھا' اسرائیلی وزیر دفاع شیمون پیریز سے مذاکرات کیے۔ آئی ڈی ایف کے فوجیوں کے ساتھ جنگ ہوئی: کوئی گولی تو نہیں چلائی گئی تاہم سنگباری ہوئی اور رائفلوں کے بٹ مارے گئے۔ آخرکار پیریز ہیلی کاپٹر پر سوار ہوکر لیونگر سے اس کے خیمے میں ملنے گیا اور ملاقات کے بعد ربی تیزی سے باہر نکلا اور سوگ کی روایتی علامت کے طور پر اپنی سفید قمیض پھاڑ دی۔ چونکہ انتخابات نزدیک تھے اور پیریز کو خوف لاحق تھا کہ مذہبی ووٹ ہاتھ سے نہ چلے جائیں' اس لیے آخرکار دسمبر 1975ء میں وہ تیس ایلون موریہہ کو نزدیک واقع فوجی کیمپ میں رہائش دینے پر آمادہ ہوگیا۔ خوشی سے سرشار نوجوان ایک فاتحانہ جلوس میں لیونگر کو کندھوں پر اٹھا کر لائے۔ لیونگر ایک دبلا پتلا گنجا آدمی تھا' جس کی ڈاڑھی بکھری ہوئی اور عینک موٹے شیشوں کی تھی' وہ کاندھے پر ہر وقت بندوق لٹکائے رکھتا تھا۔ وہ ایک ایک نیا یہودی ہیرو بن چکا تھا۔ اسے سیکولروں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ خود کو دہشت گرد کہلوانے والے گیولا کوہن نے کہا ''لیونگر صیہونیت کے واپس آجانے کی علامت ہے۔ وہ جوڈیا اور سماریا (مغربی کنارے کے انجیلی نام) میں ایک شمع کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صیہونی انقلاب کا قائد ہے۔''

یروشلم کی 164 قبل از مسیح میں آزادی کی یاد میں منائے جانے والے تہوار ''ہنوکاہ'' (Hanukkah) کے موسم میں آخرکار اسے قائم کر دیا گیا۔ گش کی اساطیر میں گارین ایک نیا ہنوکاہ بن گیا تھا' ایک الوہی کامیابی اور خداوند کے لیے ایک فتح۔ وہ ایک تشکیلی لمحہ تھا: لگتا تھا کہ لہر رخ بدل رہی ہے' سیکولر صیہونیت الوہی ارادے کو ماننے پر مجبور ہوگئی تھی۔ لیونگر تاریخ کو واپس راستے پر لے آیا تھا۔

1974-77ء کے برس گش کے لیے سنہرا دور تھے۔ اس کے اراکین نے پورے ملک کا دورہ کر کے' تقریریں کیں اور مقبوضہ علاقوں میں آباد کرنے کے لیے سیکولر اور مذہبی نوجوان لڑکے لڑکیوں کو بھرتی کیا۔ گش کی شاخیں پورے ملک میں قائم ہوگئیں۔ کیڈر نے پورے مغربی کنارے میں آبادیاں قائم کرنے کا ماسٹر پلان تیار کیا: مقصد یہ تھا کہ علاقے میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہزاروں یہودیوں کو لایا جائے اور تمام سٹریٹیجک پہاڑی مراکز میں آبادیاں قائم کر لی جائیں۔ علاقے کے جغرافیے' آبادیات اور آبادکاری کے ماہرین سے مشورے لیے گئے۔ منصوبہ سازی اور پروپیگنڈے کے لیے انتظامی محکمے قائم کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک محکمہ میٹ مرتزائی (Mate Mirtzai) تھا' جس کا کام آبادکاری کے عمل کا انتظام کرنا تھا۔ غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے یہودی اکثر اوقات لیونگر کی قیادت میں اپنے کھٹارا ٹریلروں پر سوار رات کی تاریکی میں مغربی کنارے کی پہاڑی پر پہنچ جاتے۔ جب فوج انہیں نکالنے پہنچتی تو نیسیٹ میں دائیں بازو کی جماعتیں لیبر حکومت پر الزام لگاتیں کہ وہ ریاست سے پہلے والی برطانوی حکومت کی طرح کا سلوک کر رہی ہے۔ یہ ایک واضح چال تھی۔ اب اسرائیلی حکومت ایک جابر کا کردار ادا کر رہی تھی جبکہ گش کے آبادکار اسرائیل کے ہیرووانہ ماضی کو حقیقت کا روپ دے رہے تھے۔

تاہم گش ان برسوں میں صرف تین آبادیاں قائم کر پائی۔ وزیراعظم یتزاك رابن جنگ کے بعد کے اس زمانے میں مصر اور شام سے صلح کرنے کے لیے بے چین اور چھوٹی چھوٹی علاقائی رعایتیں دینے پر آمادہ تھا۔ اس نے گش اور دائیں بازو کے مشترکہ دباؤ کی مزاحمت جاری رکھی۔ تاہم گش نے پورے مغربی کنارے میں بڑے بڑے جلوس نکال کر اپنا پروپیگنڈا جاری رکھا۔

1975ء میں ہجوم توریت اٹھائے گاتے' رقص کرتے اور تالیاں بجاتے ہوئے مقبوضہ علاقوں سے گزرتے' سیکولر لوگ مذہبی صیہونیوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ 1976ء کو یوم آزادی پر بیس ہزار مسلح یہودیوں نے ساریا کے ایک سرے سے دوسرے تک مارچ کرتے ہوئے ''پکنک'' منائی۔ جب بھی کوئی غیر قانونی آبادی قائم کی جاتی ساتھ ہی اس طرح کے مسلح مظاہرے کیے جاتے۔ اس طرح کے اقدامات سے بعض اسرائیلی مقبوضہ علاقوں کو جوہری طور پر یہودی تصور کرنے لگے اور مقبوضہ علاقوں میں آبادکاری کے خلاف ٹیبو ٹوٹ گیا۔

گش عملیت پسند' عیار اور باوسیلہ تھی۔ اس نے سیکولر اور دہریوں کو بھی راغب کیا تاہم اپنے آرتھوڈوکس اراکین کے لیے وہ ایک جوہری طور پر مذہبی تنظیم تھی۔ کک ربیوں سے انہوں نے ایک قبالائی عقیدے کو حاصل کیا تھا۔ ہر آبادی گش کے بقول یہودی سرزمین میں تقدس کی حدود کو توسیع دینے اور ''دوسرے فریق'' کی سرحدوں کو پیچھے کرنے کا عمل تھی۔ ہر آبادی ناپاک دنیا میں الوہیت کی موجودگی کو ممکن بنانے والی پوشیدہ رحمت کی ظاہری علامت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی۔ اس کو آئزک یوریا نے ''تکون'' (Tikkun) کہا تھا' بحالی کا ایک عمل جو کسی دن دنیا اور کائنات کی قلبِ ماہیئت کر دے گا۔ جلوس' فوج کے ساتھ جھڑپیں اور غیر قانونی آبادکاری ایک طرح کی رسوم تھیں' جو کیف و سرور اور طمانیت کا احساس فراہم کرتی تھیں۔ سیکولر رائدین اور عالم فاضل ہیریڈم سے برسوں کمتری محسوس کرنے کے بعد کک کے پیروکاروں نے دفعتاً خود کو ہر معاملے میں مرکزی حیثیت کا حامل اور ایک کائناتی جنگ میں صفِ اول میں پایا۔ نجات کے وقوع کو تیز کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو کائنات کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ محسوس کرتے تھے۔ مشاہدین نے بتایا ہے کہ جب وہ عبادت کرتے تو آگے پیچھے ہلتے رہتے' ان کی آنکھیں سختی سے بھنچی ہوتیں' چہرے تنے ہوئے ہوتے' ان پر کرب نمایاں ہوتا اور وہ زاروقطار روتے رہتے تھے۔ یہ سب قبالائیوں کے بقول کواناہ (Kawwanah) کی نشانیاں تھیں' کسی حکم (Commandment) پر عمل کرتے ہوئے شدید ارتکاز پیدا کرنے کی ایک کوشش' جو یہودی کو اس رسم کی علامتی صورت کے پار جوہری اہمیت کو دیکھنے کے قابل بنا دیتی۔ کواناہ پر عمل کرنے سے نہ صرف عبادت کرنے والا خداوند کے قریب ہو جاتا بلکہ دنیا اور الوہیت کو الگ الگ کرنے والے عدم توازن کو ختم کرنے کے قابل ہو جاتا۔ گش نہ صرف عبادت کے دوران اس کیف کا تجربہ کرتے تھے بلکہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کو بھی اسی روشنی میں دیکھتے تھے۔ یہ محض سیاسی وقت نہیں تھا۔ کارکنوں کا عقیدہ تھا کہ انہوں نے واقعات کے ارضی خول کے پار حقیقت کے قلب میں الوہی ڈرامہ دیکھ لیا ہے۔

یوں سیاست عبادت (Avodah) بن گئی تھی۔ یہودی سیناگوگ میں عبادت سے پہلے ایک رسوماتی حمام مکویہہ (Mikveh) میں نہاتے۔ گش ربیوں نے اعلان کیا تھا کہ ''سیاست کے گٹر میں ڈوبنے سے پہلے ہمیں خود کو مکویہہ میں پاک کر لینا چاہیے کیونکہ یہ توریت کے اسرار میں غوطہ زنی کے مترادف ہے۔'' یہ ایک انکشاف انگیز اعلان تھا' کیونکہ اس نے گش کے عقیدے میں موجود دہرے پن کو عیاں کر دیا تھا۔ سیاست توریت کی طرح پاک تھی لیکن..... جیسا کہ بڑے کک نے مدتوں پہلے کہا تھا..... یہ گٹر بھی تھی۔ 1967ء سے کک کے پیروکار نے تاریخی واقعات کے صدمے کا تجربہ بڑے کک کی پسندیدہ تمثال ''روشنی کے جھماکے'' کے طور پر کرتے تھے' تاہم وہ سیاسی ناکامی' پسپائی اور رکاوٹوں کی تاریکی سے بھی مکمل طور پر آگاہ تھے۔ اسرائیلی فتوحات کو عظیم معجزے تصور کیا گیا' تاہم یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ انہیں جدید ٹیکنالوجی اور عسکری مہارت سے برپا کیا گیا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ کک کے پیروکار پاک کے ساتھ ساتھ ناپاک سے بھی بھرپور آگاہ تھے۔ الوہیت کے لیے ان کی تمنائے بیتاب کو دنیوی حقیقت نے متوازن کر دیا تھا۔ ان کا مقصد زندگی کو پوری طرح .....اس کے آلودہ اور نجس پہلوؤں سمیت .....تقدیس کی چھتری تلے لانا تھا۔ تاہم جہاں ہیسیڈم اس کام میں ایک نئی خوشی اور روشنی پاتے تھے' وہاں گش کے کارکن اکثر غصے اور آزردگی سے بھر جاتے تھے۔ وہ جدید دور کے مردوزن تھے۔ خداوند زیادہ دور تھا جبکہ یہ ہر جگہ موجود نجاست کی کچل دینے والی حقیقت کے دباؤ سے کچھ سوا تھا۔ گش کے کارکنوں نے اپنی ذاتی بیگانگی پر غلبہ اجنبی عربوں سے زمین چھیننے کی کوشش کر کے پایا تھا۔ انہوں نے اسرائیل کی سرحدوں سے دور جا کر اور مدتوں سے کھوئی ہوئی زمین پر آبادکاری کر کے اپنے ذہنوں کو سکون پہنچایا تھا۔ ارتز اسرائیل کی طرف ''واپسی'' الجھن پیدا کر دینے والے حال سے زیادہ بنیادی قدر اور ذہنی کیفیت کو بحال کرنے کی کوشش تھی۔

لیکوڈ پارٹی کا دورِ حکومت:

غصے اور فتح کی اس روحانیت میں واضح دشواریاں ہوتی ہیں۔ 1977ء میں اسرائیلی تاریخ میں پہلی مرتبہ لیبر کو عام انتخابات میں شکست ہوگئی اور مینا کم بیگن کی قیادت والی دائیں بازو کی لیکوڈ پارٹی اقتدار میں آ گئی۔ بیگن نے ہمیشہ دریائے اردن کی دونوں اطراف میں ایک یہودی ریاست کے قیام کی وکالت کی تھی لہٰذا پہلے پہل تو اس کے انتخاب کو خداوند کا ایک اور عمل تصور کیا گیا۔ یہ امر اس وقت واضح ہوگیا جب انتخاب کے تھوڑے عرصے بعد بیگن نے مرکز ہرو میں بوڑھے ربی کک سے ملاقات کی' اس کے پاؤں چھوئے اور اس کے سامنے جھک گیا۔ بیگن لیونگر کا زبردست مداح تھا' وہ گش ایمونم کو ''بہت پیارا بچہ'' کہنا پسند کرتا تھا اور جب وہ اپنی عقابی (Hawkish) پالیسیاں بیان کرتا تو اکثر و بیشتر انجیلی تمثالیں استعمال کرتا تھا۔

انتخابات کے بعد لیکوڈ حکومت نے مقبوضہ علاقوں میں بڑے پیمانے پر آبادکاری شروع کر دی۔ ''اسرائیل لینڈز کمیشن'' کے نئے سربراہ ایریل شیرون نے اعلان کیا کہ بیس برس کے اندر اندر مغربی کنارے میں دس لاکھ یہودیوں کو آباد کیا جائے گا۔ 1981ء کے وسط تک لیکوڈ پارٹی نے مقبوضہ علاقوں میں 40 کروڑ ڈالر خرچ کیے اور بیس آبادیاں قائم کیں۔ اگست 1984ء تک پورے مغربی کنارے میں ایک سو تیرہ حکومتی آبادیاں موجود تھیں' جن میں چھ بہت بڑے بڑے قصبے بھی شامل تھے۔ چھیالیس ہزار یہودیوں میں گھرے ہوئے عرب دہشت زدہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو گئے اور تشدد پر اتر آئے۔ 1978ء میں رافیل ایٹن نے مغربی کنارے کی ہر آبادی کو اپنی حفاظت کا خود ذمہ دار قرار دے دیا اور اپنی کمیونٹی کی حفاظت کرنے کے لیے سینکڑوں آبادکاروں کو ان کی فوجی یونٹوں سے بھیج دیا گیا جبکہ سڑکوں اور کھیتوں کی حفاظت پولیس کرتی تھی۔ وہ جدید ہتھیاروں اور عسکری آلات سے لیس ہوتے تھے۔ مارچ 1979ء میں حکومت نے مغربی کنارے میں پانچ علاقائی کونسلیں قائم کر دیں جنہیں ٹیکس عائد کرنے' خدمات مہیا کرنے اور ملازمین بھرتی کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ گش کے اراکین کو عموماً کلیدی عہدے دیے گئے حالانکہ وہ اب مغربی کنارے کے آبادکاروں میں صرف بیس فیصد تھے۔ گش کے لوگ برسوں تصادم میں گزار دینے کے بعد حکومت کے حوالے سے تشکیک کا شکار تھے۔

گش اپنی تشکیک میں درست تھے' کیونکہ لیکوڈ کے ساتھ ہنی مون مختصر نکلا۔ 20 نومبر 1977ء کو مصر کے صدر انور سادات نے امن کے عمل میں پہل کرنے کے لیے یروشلم کا تاریخی دورہ کیا اور اگلے برس بیگن نے سادات کے کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کے مطابق اسرائیل نے 1967ء میں فتح کیا ہوا جزیرہ نمائے سینائی مصر کو واپس کرنا تھا اور بدلے میں مصر اسرائیل کو تسلیم کر لیتا اور مشترکہ سرحدوں پر سلامتی کی ضمانت دیتا۔ معاہدے میں ''امن کے لائحۂ عمل'' کے تحت اسرائیل کو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے مستقبل کے حوالے سے مصر' اردن اور ''فلسطینیوں کے نمائندوں'' سے مذاکرات کرنا تھے۔ دونوں فریقوں کے لیے کیمپ ڈیوڈ ایک عملیت پسندانہ معاہدہ تھا۔ مصر نے اہم علاقہ واپس حاصل کر لیا تھا اور اسرائیل کو امن مل گیا تھا۔ سینائی مقدس علاقہ نہیں تھا' وہ بائبل میں بیان کردہ موعودہ وطن کی سرحدوں میں نہیں آتا تھا۔ بیگن ہمیشہ اس بات پر اڑا رہا تھا کہ مغربی کنارہ عربوں کو واپس دینے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ امن کے لائحۂ عمل کے تحت مذاکرات کبھی نہیں ہونے کیونکہ کوئی دوسری عرب ریاست ان کی حمایت نہیں کرے گی۔ جس روز کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر دستخط ہوئے بیگن نے اسی روز اعلان کیا کہ حکومت مغربی کنارے میں بیس نئی آبادیاں قائم کرے گی۔ اس سے مذہبی صیہونیوں' گش ایمونم یا عمومی طور پر اسرائیلی دائیں بازو کی تشفی نہیں ہوئی۔ کیمپ ڈیوڈ کی مخالفت اور مزید علاقائی رعایتوں کو روکنے کے لیے ربی کک کی آئیرواد سے 8/اکتوبر 1977ء کو نئی ''تحیا'' (نشاۃ ثانیہ Tehiya) پارٹی قائم ہوئی۔ اب مذہبی اور سیکولر ریڈیکل ایک ہی پارٹی میں کام کرنے لگے تھے۔ مغربی کنارے میں مزید آبادکاری کے لیے دباؤ ڈالنے کی غرض سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

1981ء میں کک کے پیروکار اور گاہیلیٹ کے سابق رکن ہائم ڈرکمین نے اپنی ''موراشا'' (ورثہ Morasha) پارٹی قائم کی۔ گش کے لیے کیمپ ڈیوڈ امن معاہدہ نہیں تھا۔ انہوں نے ''شالوم'' (امن) اور ''شلیموٹ'' (کلیت) میں لفظی ربط کی طرف اشارہ کیا: حقیقی امن کا مطلب اسرائیل کی پوری زمین علاقائی اتحاد اور تحفظ ہے۔ اس پر کوئی مصالحت نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ گش ربی ایلیازر والڈمین نے واضح کیا تھا' اسرائیل شر کے خلاف ایسی جنگ لڑ رہا تھا' جس سے ساری دنیا کی تقدیر منسلک تھی:

> ''نجات صرف اسرائیل کی نجات نہیں ہوگی بلکہ ساری دنیا کی نجات ہوگی۔ تاہم دنیا کی نجات کا انحصار اسرائیل کی نجات پر ہے۔ اس سے ساری دنیا پر ہمارا اخلاقی' روحانی اور ثقافتی اثر اخذ ہوتا ہے۔ اسرائیل کی پوری زمین پر آباد لوگوں کی طرف سے ساری انسانیت کے لیے رحمت امڈے گی۔''

لیکن عملیت پسندانہ سیکولر خطوط پر چلائی جانے والی دنیا میں اس اساطیری ضابطے کا اطلاق ناممکن دکھائی دیتا تھا۔ بیگن کی تقریریں خواہ کتنی ہی عقابی یا انجیلی ہوں' سیاست کی عملی لوگوس میں متھوس کو مداخلت کرنے کی اجازت دینے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ عین ابتدا ہی سے اہلیت جدید روح کا نعرہ رہی تھی۔ مطلق اصولوں کو عملی سیاست کے تقاضوں اور پالیسیوں کے مطابق تبدیل ہونا تھا۔ بیگن نے امریکہ کے ساتھ اچھے مراسم رکھنا تھے' جو کہ امن کے عمل کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

جدید سیاسی دنیا میں خدا کے لیے جنگ کرنے والے بنیاد پرستوں کا یہ ہمیشہ ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ گش ایمونم کو ان برسوں میں ضرور کچھ فائدہ حاصل ہوا۔ 1978ء میں سوربون اور مرکز ہرو کے ایک فرانسیسی گریجویٹ شلوموادیز نے مشرقی یروشلم کے وسطی علاقے میں ''پادریوں کا تاج'' (Ateret Cohanim) یشیوا قائم کیا۔ اس یشیوا کا مقصد مسیح کی آمد اور معبد کو اس کے پرانے مقام پر دوبارہ تعمیر کرنے کی تیاری کرنا تھی۔ چونکہ نئے یہودی معبد کی تعمیر کا مطلب مسلمانوں کے مقدس مقام کی تباہی تھا' اس لیے یشیوا کا قیام ہی اشتعال انگیز تھا' لیکن ایٹریٹ کوہانم نے یروشلم کے پرانے شہر میں آبادکاری کا ایک منصوبہ شروع کردیا۔ یشیوا نے مسلمانوں کے علاقے میں چوری چھپے املاک خریدنا اور پرانے سیناگوگوں کی تعمیر نو شروع کردی تاکہ عرب یروشلم میں یہودیوں کی موجودگی مضبوط ہوجائے۔ اس عرصے میں دوسرا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

واقعہ یہ ہوا کہ گش ایمونم نے اسرائیلی سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو چیلنج کر دیا جس میں حکم دیا گیا تھا کہ نابلوس کے جنوب مشرق میں ان کی نئی آبادی ایلون موریہ کو ختم کر دیا جائے۔ گش ایمونم نے خانہ جنگی کی دھمکی دی اور بھوک ہڑتال کر دی اور آخر کار جنوری 1980ء کے اواخر میں کابینہ نے موجودہ آبادیوں کے تحفظ کے ذرائع اور سپریم کورٹ کی عائد کردہ پابندیوں کے اندر نئے مواقع پیدا کرنے کی غرض سے ایک خصوصی کمیٹی قائم کی۔ 15 رمئی کو حکومت نے مغربی کنارے میں انسٹھ نئی آبادیاں قائم کرنے کے پانچ سالہ منصوبے کا اعلان کیا۔

تاہم اس کامیابی کے باوجود گش ایمونم کی عظمت کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اسرائیلی عوام میں امن مقبول ہو گیا تھا اور 1982ء میں گش کو ایک سنگین شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر عمل کرتے ہوئے اسرائیل کو لیبر حکومت کی طرف سے سینائی کے ساحلوں پر قائم کی گئی یامت (Yamit) کے سیکولر قصبے کو خالی کرنا تھا۔ موشے لیونگر نے اعلان کیا کہ صیہونیت کو ''امن کے وائرس'' نے بیمار کر دیا ہے۔ اس کی قیادت میں مغربی کنارے کے ہزاروں آبادکار آئی ڈی ایف کے روکنے کے باوجود یامت کے متروک گھروں میں آ بسے۔ یہ ایک مایوسانہ اقدام تھا۔ لیونگر نے آبادکاروں کو روم کے خلاف یہودی جنگیں (72ء-66ء) یاد دلائیں۔ جن کے دوران میسیڈا کے قلعے میں 960 مرد' عورتوں اور بچوں نے رومی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کر لی تھی۔ گش ربیوں نے اسرائیل کے دو بڑے ربیوں سے مشورہ کیا' تاہم انہوں نے موت کے خلاف فیصلہ دیا' اور لیونگر نے سوگ میں اپنے کپڑے ایک بار پھر پھاڑ دیئے۔ جب آئی ڈی ایف آبادکاروں کو نکالنے پہنچی تو یہودیوں کا خون تو نہیں بہا' تاہم گش ٹکراؤ کے لیے تیار تھی اور لمحہ بھر کے لیے تو مذہبی اور سیکولر اسرائیل محاذ جنگ پر آمنے سامنے کھڑے دکھائی دیئے۔

یامت میں آخری لڑائی ہو سکتا ہے ایک خوفناک صداقت کو رد کرنے کی ایک لاشعوری کوشش ہو۔ جس عظیم بیداری کی کک کے پیروکاروں کو توقع تھی وہ رونما نہیں ہوئی تھی' ممکن ہے نجات بھی رونما نہ ہونے والی ہو؟ ایسی بزدلانہ علاقائی رعایتیں دینے والی ریاست کس طرح پاک ہو سکتی تھی؟ گش کے مذہبی اراکین ایک عظیم مسیحانہ ناامیدی کے تجربے سے گزر رہے تھے۔ گش اپنی بہترین کوششوں کے باوجود خداوند کی سیاست کو دنیا میں رائج نہیں کر سکے۔ سینائی سے پسپائی کے تھوڑے عرصے بعد ربی کک مر گیا' جس سے مایوسی اور ناامیدی میں اضافہ ہو گیا۔ کک کے غیر متنازعہ جانشین کی حیثیت سے کوئی ایک شخص بھی سامنے نہیں آیا اور تحریک بکھر گئی۔ کچھ لوگ اسرائیل کی سچی روح کے احیاء کے لیے صبر' عبادت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور تعلیم پر توجہ مرکوز کرنے کی وکالت کرنے لگے دیگر تشدد کے لیے تیار تھے۔

سادات کا دورِ حکومت اور بنیاد پرست مصری:

کیمپ ڈیوڈ پر صرف بیگن ہی کو مذہبی مخالفت کا سامنا نہیں تھا۔ مصر میں انور سادات بھی مسلمانوں کی مخالفت سے دوچار تھا۔ سادات کی امن کے لیے پہل نے اسے مغرب میں محبت اور تعریف کے قابل بنا دیا تھا اور اگرچہ امن معاشرے کے بہت سے طبقوں میں مقبول تھا' تاہم مصری اپنے صدر کے حوالے سے دو متضاد جذبات کے حامل تھے۔ چھ روزہ جنگ کے المیے کے باوجود بیشتر مصری ناصر سے محبت کرتے تھے۔ سادات کبھی ویسی محبت حاصل نہیں کر سکا۔ اسے سیاسی اعتبار سے ہمیشہ کمتر تصور کیا گیا اور جب وہ پہلی مرتبہ 1971ء میں اقتدار میں آیا تھا تو اسے اپنے خلاف ایک محلاتی بغاوت کو ناکام کرنا پڑا تھا۔ تاہم 1973ء کی یوم کپور جنگ میں کامیابی نے سادات کو جواز عطا کیا تھا۔ اپنے آپ کو میدان جنگ میں ثابت اور عربوں کا اعتماد بحال کروا کر وہ اپنے عوام کو امن کے عمل میں شریک کرنے کے قابل ہو گیا تھا' جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ مصر کی مدد کرے گا اور مغرب سے اس کے تعلقات بحال کروا دے گا۔

1967ء کی شکست کے بعد ناصر نے سوشلزم سے کسی حد تک کنارہ کشی کر لی تھی اور امریکہ سے دوستی کی شروعات کی تھی۔ اس نے مشرق وسطیٰ کے نئے مذہبی مزاج کو بھی بھانپ لیا تھا اور گو کہ اخوان المسلمون قید میں ہی رہے تاہم اس نے اپنی تقریروں میں دوبارہ اسلامی حوالے دینے شروع کر دیئے تھے۔ سادات کے تحت یہ دونوں رجحانات مزید نمایاں ہو گئے۔ 1972ء میں اس نے ناصر کے متعین کردہ 1500 سوویت مشیروں کو فارغ کر دیا اور یوم کپور جنگ کے بعد اس نے مصر کو عالمی سرمایہ دارانہ منڈی میں داخل کرنے کے لیے وضع کردہ نئی پالیسی کا اعلان کیا۔ اس نے اس نئی معاشی پیش قدمی کو ''انفتاح'' (کھلے دروازے) کا نام دیا۔ تاہم سادات معاشیات داں نہیں تھا اور ''انفتاح'' سے مصر کے مالیاتی مسائل مزید الجھ گئے۔ اس کی وجہ سے مصر میں یقیناً غیر ملکی کرنسی اور غیر ملکی درآمدات آئیں۔ مغربی سرمایہ کاروں کو ٹیکسوں میں مراعات دی گئیں اور مصر امریکہ کے قریب تر آ گیا۔ انفتاح سے ابھرتی ہوئی مختصر سی بورژوازی کو بھی فائدہ پہنچا اور چند ایک مصریوں نے بہت دولت کمائی لیکن اکثریت پریشانیوں کا شکار تھی۔ واضح سی بات ہے کہ مصری کاروبار کے لیے غیر ملکی مسابقت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ناممکن تھی۔ بدعنوانی عام ہو گئی اور اشرافیہ کی اسراف پسندی نے شدید نفرت اور بے چینی کو ابھارا۔ بالخصوص نوجوان بیگانگی کا شکار تھے۔ صرف 4 فیصد کو اچھی ملازمت ملنے کی توقع تھی' باقی کو سرکاری شعبے میں کم تنخواہوں پر کام کرنا پڑتا تھا۔ آمدنی میں اضافے کے لیے وہ فارغ اوقات میں ٹیکسیاں چلاتے' پلمبری اور بجلی کا کام کرتے تھے۔ اچھی رہائش بہت مہنگی تھی' اس لیے شادی سے پہلے جوڑوں کو کئی کئی برس انتظار کرنا پڑتا۔ ان کی واحد امید ترک وطن تھی۔ ہزاروں مصری طویل مدت کے لیے گھر چھوڑ کر تیل پیدا کرنے والی ریاستوں میں جانے پر مجبور ہو گئے' جہاں وہ اچھی تنخواہ حاصل کر سکتے تھے' اپنے خاندانوں کو رقم بھیج سکتے تھے اور مستقبل کے لیے بچا سکتے تھے۔ کسان بھی خلیج کی طرف اس خروج میں شامل ہو گئے جہاں سے وہ صرف اس وقت لوٹتے جب ان کے پاس گھر بنانے یا ٹریکٹر خریدنے کے لیے پیسہ ہوتا۔ انفتاح نے سادات کو مغرب میں ہر دلعزیز بنا دیا تاہم اس کا نتیجہ صرف یہ تھا کہ بیشتر مصری اپنے ملک میں نہیں رہ سکتے تھے اور جلاوطنی پر مجبور تھے۔

جب مصر میں امریکی کاروبار کلچر جڑیں پکڑ گئے تو بہت سے مصریوں کو وہ بیگانہ اور مغرب زدہ لگنے لگا۔ سادات اپنے عوام کے لیے اجنبی ہونے لگا۔ اس کا اور اس کی بیوی جہاں کا طرز زندگی مغربی تھا' وہ کثرت سے غیر ملکی مشہور لوگوں اور فلمی ستاروں کی مہمانداری کرتے دیکھے جانے لگے تھے' مشہور تھا کہ وہ شراب نوشی کرتے ہیں اور اپنے لاتعداد پرتعیش ریسٹ ہاؤسوں میں رہتے ہیں' جنہیں مصیبتیں جھیلنے والی آبادی سے دور لاکھوں ڈالر خرچ کر کے بنایا گیا تھا۔ یہ چیزیں سادات کے محتاط انداز میں قائم کیے ہوئے مذہبی تاثر کے خلاف تھیں۔ سنی روایت کے مطابق اچھے مسلمان حاکم کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عوام سے الگ تھلگ نہیں رہے بلکہ سادہ زندگی گزارے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ معاشرے کی دولت جس قدر ممکن ہو انصاف کے ساتھ تقسیم ہو۔ سادات نے اپنے آپ کو ''نیک صدر'' کہلوایا اور اخباروں میں اپنی نماز پڑھتے ہوئے ایسی تصویریں شائع کروائیں' جن میں اس کے ماتھے کا سیاہ داغ نمایاں ہوتا' جو اس کی کثرت سجدہ کا غماز ہوتا۔ تاہم اس تاثر کی وجہ سے مسلمانوں کو ناگزیر طور پر دعوت ملی کہ وہ اس کے حقیقی اور مجازی رویے کا موازنہ کریں۔

تاہم ظاہری طور پر سادات مذہب کے لیے اچھا تھا۔ اسے اپنی حکومت کی ناصر سے مختلف شناخت کی ضرورت تھی۔ محمد علی کے زمانے سے مصریوں نے جدید دنیا میں داخل ہونے کی مسلسل کوششیں کی تھیں۔ انہوں نے مغرب کی نقالی کی تھی' مغربی پالیسیاں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصورات اپنا لیے تھے' آزادی کے لیے لڑے تھے اور جدید یورپی خطوط پر اپنے کلچر کی اصلاح کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی۔ ایرانیوں کی طرح بہت سے مصری محسوس کرتے تھے کہ یہ ''اپنی طرف واپسی'' اور ایک جدید لیکن منفرد اسلامی تشخص وضع کرنے کا وقت ہے۔ سادات اسلام کو مغربی نمونے پر ایک سول مذہب بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اخوانوں کو رہا کر دیا۔ مذہبی گروپوں پر ناصر کی قائم کردہ سخت گرفت ڈھیلی کر دی۔ اخوانوں کو سیاسی تنظیم قائم کرنے کی اجازت تو نہیں دی گئی البتہ وہ تبلیغ کر سکتے تھے اور انہوں نے اپنا رسالہ ''الدعوۃ'' جاری کیا۔ بہت سی مساجد تعمیر ہوئیں۔ سادات نے اسلامی طلباء گروپوں کی کیمپسوں میں سوشلسٹوں اور ناصرسٹوں کے غلبے کو کم کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ ناصر نے مذہب کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اسے پتا چلا تھا کہ یہ جابرانہ پالیسی الٹے نتائج پیدا کرنے والی تھی۔ اس سے سید قطب کی انتہا پسندانہ مذہبیت کو فروغ ملا تھا۔ اب سادات مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو اس کے نتائج بھی غلط نکلے۔

تاہم ابتدا میں سادات کی پالیسی کامیاب دکھائی دیتی تھی۔ مثال کے طور پر اخوان المسلمون اس کی راہ پر چلتے دکھائی دیتے تھے۔ جیلوں سے رہا ہونے والے پرانے قائدین سید قطب اور خفیہ شعبے کو رد کرتے اور حسن البنا کی عدم تشدد والی اصلاحی پالیسیوں کی طرف واپس آتے نظر آ رہے تھے۔ اب اخوان المسلمون ایک بالکل مختلف تنظیم بن چکی تھی۔ وہ ریاست کو اسلام کے مطابق چلانا تو چاہتی تھی لیکن وہ سمجھتی تھی کہ یہ ایک طویل المیعاد کام ہے جسے صرف قانونی اور پرامن طریقوں سے ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ جہاں سید قطب نے محنت کشوں اور درمیانے طبقے کو بالخصوص راغب کیا تھا' وہاں 1970ء کے عشرے کی ''نئی اخوان المسلمون'' نے سادات کی انفتاح سے فیض یاب ہونے والی بورژوازی پر توجہ دی۔ وہ خوشحال' پرسکون اور حکومت کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ تھے۔ اس نئی اخوان المسلمون نے سادات کے مصر میں تیزی سے بیگانگی محسوس کرنے والی اکثریت پر توجہ نہیں دی' جو سخت محرومی کا شکار تھی۔ حکومت کی مخالفت کے کسی اور ذریعے کی غیر موجودگی میں زیادہ غیر مطمئن لوگوں نے انتہا پسندانہ اسلامی متبادل ڈھونڈا۔

تاہم جلد ہی سادات کی پالیسیوں سے نئی اخوان المسلمون بھی ناراض ہونے لگی۔ اس کے رسالے ''الدعوۃ'' میں' جس کے 78000 شمارے فروخت ہوتے تھے' ہر ماہ اسلام کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چار ''دشمنوں'' کے حوالے سے خبریں شائع کی جاتی تھیں۔ وہ چار دشمن تھے: مغربی عیسائیت (اس کی سامراجیت کو ظاہر کرنے کے لیے اسے ''الصلیبیہ'' کہا جاتا تھا)' کمیونزم' سیکولرازم اور صیہونیت۔ یہودیت کو بالخصوص نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چنانچہ کیمپ ڈیوڈ کے بعد نئی اخوان المسلموں کا سادات سے وفادار رہنا ناممکن ہو گیا۔ 1978ء کے دوران پورے سال ''الدعوۃ'' نے حکومت کے اسلامی جواز کا مسئلہ اٹھائے رکھا۔ مئی 1981ء کے شمارے کے سرورق پر گنبد صخریٰ دکھایا گیا تھا' جس پر زنجیر لپٹی ہوئی تھی اور اس میں نجم داؤد والا قفل پڑا ہوا تھا۔

شکری مصطفیٰ کی تحریک:

تاہم جب سادات نے یروشلم کا دورہ کیا تو اس وقت ایک زیادہ انتہا پسند مسلم فرقہ سامنے آیا۔ مصری ان نوجوان مسلمانوں کے اس اعلان کو سن کر ہل کے رہ گئے کہ خلفائے راشدین کے دور کے بعد سے اسلام زوال کا شکار ہے اور مصری صدر اور مذہبی ایسٹیبلشمنٹ سمیت سبھی ''جاہلیت'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس فرقے نے اعلان کیا کہ ''جاہلی'' معاشرے کو لازماً تباہ کر دیا جانا چاہیے اور اس کے بعد قرآن وسنت کی بنیادوں پر نیا معاشرہ استوار کیا جانا چاہیے۔ اس فرقے کا بانی شکری مصطفیٰ تھا' جو اسلام تاریخ کو واپس سیدھے راستے پر لانا چاہتا تھا۔

شکری کو ناصر کی حکومت نے 1965ء میں گرفتار کر کے حوالۂ زنداں کر دیا تھا' اس وقت وہ تیئیس برس کا تھا اور اخوان المسلمون کے اشتہارات تقسیم کر رہا تھا۔ اس معمولی سے جرم کی سزا میں اسے چھ سال ناصر کی قید میں گزارنا پڑے' جہاں وہ ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب کا مطالعہ کرتا رہا اور دیگر نوجوان اخوانوں کی طرح وہ ان کے تصورات کا گرویدہ ہو گیا۔ سید قطب کی ہدایت پر انتہا پسند اخوان دوسرے قیدیوں اور بڑی عمر والے' معتدل اخوانوں سے الگ تھلگ رہتے تھے کہ وہ جاہلی تھے۔ تاہم کچھ نے اپنے خیالات خفیہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ قطب کا ایقان تھا کہ ان کے ہراول دستے کو جاہلی معاشرے کے خلاف جہاد شروع کرنے سے پہلے کافی عرصہ تیاری کرنا ہوگی۔ چنانچہ جیلوں میں قید کچھ نوجوان انتہا پسندوں نے اتفاق کیا کہ فی الحال وہ ''کمزور'' ہیں اور شر کی حکومت کو چیلنج کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ موزوں وقت آنے تک وہ ''جاہلیت'' میں معمول کے مطابق زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ تاہم شکری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زیادہ جوشیلے گروپ سے تعلق رکھتا تھا' جو ''مفاصلۂ کامل'' (مکمل علیحدگی) کی وکالت کرتا تھا: ہر ایسا شخص جو ان کے فرقے میں شمولیت نہ کرے' وہ کافر ہے اور سچے مسلمانوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اپنے قیدی ساتھیوں سے بات بھی نہیں کرتے تھے اور اکثر ہاتھا پائی پر اتر آتے تھے۔

جب 16 اکتوبر 1971ء کو شکری ابوزابل کیمپ سے رہا ہوا تو اس نے ایک نیا گروپ قائم کیا اور اسے سوسائٹی آف مسلمز کا نام دیا۔ اس کے اراکین کو یقین تھا کہ وہ سید قطب کا ہراول دستہ ہیں اور انہوں نے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ وہ جہاد کی تیاری کے لیے مرکزی دھارے والے معاشرے سے الگ ہو گئے۔ چونکہ پورا مصری معاشرہ بدعنوان تھا' اس لیے انہوں نے مسجدوں میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا اور مذہبی اور سیکولر ایسٹیبلشمنٹ کی ''تکفیر'' کا فرمان جاری کیا۔ بعضوں نے شکری کے آبائی قصبے اسیوط کے گرد پہاڑی غاروں اور صحراؤں کا رخ کیا۔ بیشتر بڑے شہروں کے محیط پر واقع محروم بستیوں میں رہنے لگے' جہاں وہ حقیقی اسلامی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے۔ 1976ء تک سوسائٹی آف مسلمز کے دو ہزار مرد وزن اراکین تھے۔ جن کا ایقان تھا کہ خدا نے انہیں جاہلیت کے ملبے پر ایک خالص امت کو استوار کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ انہیں صرف پہل کرنا ہوگی' باقی سب خدا کرے گا۔ پولیس سوسائٹی پر نگاہ رکھتی تھی تاہم انہیں بے ضرر تصور کرتی تھی۔ لیکن اگر سادات اور اس کے مشیروں نے ان نوجوان مایوس بنیاد پرستوں کی زندگیوں پر نگاہ ڈالنے کی زحمت کی ہوتی تو انہیں ان نوجوانوں میں ''انفتاح'' کا الٹ عکس اور جدید مصر کا تاریک رخ نظر آ جاتا۔

ہوسکتا ہے شکری کا پورے مصری معاشرے کو کافر قرار دینا انتہا پسندانہ عمل ہو' تاہم یہ سراسر بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ سادات کے مصر میں خواہ کتنی مساجد ہی کیوں نہ تعمیر کر دی گئی ہوں' یہاں کوئی شے اسلامی نہیں تھی کیونکہ یہ ایک ایسی قوم تھی' جس میں دولت ایک قلیل سی اشرافیہ کے ہاتھوں میں تھی جبکہ اکثریت ناامیدی سے بھرپور زندگی گزار رہی تھی۔ شہروں کے نواح کی طرف ''ہجرت'' سے اس بات کا پتا چلتا تھا کہ نوجوان مصری اپنے لیے مصر میں کوئی جگہ نہیں پاتے تھے' وہ خود کو اپنے ہی ملک سے نکالا ہوا تصور کرتے تھے۔ سوسائٹی کے کمیونوں کو وہ نوجوان چلاتے تھے' جنہیں شکری نے بہت سے دوسرے مصری نوجوانوں کی طرح خلیجی ریاستوں میں بھیج دیا تھا۔ سوسائٹی کے بہت سے اراکین نے یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہوئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھی لیکن شکری نے اعلان کر دیا تھا کہ تمام سیکولر تعلیم وقت کا ضیاع ہے۔ یہ ایک اور انتہا پسندانہ موقف تھا' تاہم اس میں صداقت کی رمق تھی۔ 1970ء کی دہائی میں اکثر مصری جو تعلیم حاصل کر رہے تھے' وہ ان کے لیے بالکل بے فائدہ تھی۔ نہ صرف طریقۂ تدریس خام تھے بلکہ یونیورسٹی کی ڈگری بھی اس بات کی ضمانت نہیں دیتی تھی کہ گریجویٹ کو اچھی ملازمت مل جائے گی: غیر ملک میں تو کسی لیڈی کی نوکرانی بھی یونیورسٹی کی پروفیسر سے کہیں زیادہ کما لیتی تھی۔

جب تک سوسائٹی غیر نمایاں رہی حکومت نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ تاہم 1977ء میں شکری نے اپنا نقاب اتار پھینکا۔ نومبر 1976ء میں مقابل اسلامی گروپوں نے سوسائٹی کے بعض اراکین توڑ لیے اور شکری کی نگاہ میں وہ لوگ موت کے مستحق مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے پیروکاروں نے ان پر حملے شروع کر دیئے اور نتیجتاً سوسائٹی کے چودہ اراکین اقدام قتل کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے۔ شکری فی الفور جارحیت پر اتر آیا۔ 1977ء کے ابتدائی چھ مہینے اس نے اپنے پیروکاروں کی رہائی کے لیے مہم چلائی۔ اخبارات میں مضامین شائع کروائے اور ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کروانے کی کوشش کی۔ جب یہ پرامن طریقے ناکام ہو گئے تو شکری نے تشدد دوبارہ شروع کر دیا۔ 7 جولائی کو اس نے محمد الضہبی کو اغوا کر لیا' جس نے سوسائٹی کو بدعتی قرار دینے کے لیے پمفلٹ لکھا تھا۔ اغوا کے اگلے روز شکری نے کئی دیگر اسلامی ملکوں اور نیویارک' پیرس اور لندن کے ساتھ ساتھ تین مصری اخباروں میں ایک اعلان شائع کروایا۔ اس نے اپنے پیروکاروں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا اور ذرائع ابلاغ میں سوسائٹی پر منفی دباؤ ڈالنے کے حوالے سے معافی پر زور دیا اور حکومت کے قانونی نظام اور انٹیلی جنس سروس کے بارے میں تفتیش کے لیے ایک کمیٹی قائم کرنے کی درخواست کی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ سادات اپنی خفیہ پولیس کے طریقۂ کار کو زیر بحث آنے کی اجازت دے گا۔ جب چند دنوں بعد ضہبی کی لاش ملی تو شکری اور اس کے سینکڑوں پیروکاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ تیزی سے نمٹایا گیا اور شکری کو اس کے پانچ ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی۔ اخبارات نے اس فرقے کو ''تکفیر والہجرۃ'' کا نام دیا۔ یہ بھی بہت سی بنیاد پرست تحریکوں کی طرح غصے اور علیحدگی سے پیدا ہوا تھا' تاہم شکری کی کہانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ایسی کسی تحریک کو محض پاگل پن کہنا ہمیشہ درست نہیں ہوتا۔ شکری نے ایک ردثقافت تخلیق کی تھی جو سادات کے نئے مصر کے تاریک پہلو کی عکاسی کرتی تھی' جس کو مغرب پرجوش انداز میں سراہ رہا تھا۔ حقیقت حال ایک مسخ شدہ اور مبالغہ آمیز انداز میں عیاں ہوئی اور اس سے ایک ایسے ملک میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصری نوجوانوں کی بیگانگی کا اظہار ہوا جسے وہ اپنا ملک محسوس نہیں کرتے تھے۔

جماعت اسلامیہ:

ایسی ہی انکشاف انگیز تاہم زیادہ کامیاب ''جماعت اسلامیہ'' تھی۔ یہ اسلام پسند طلبا کی تنظیم تھی' سادات کی صدارت کے دوران یونیورسٹی کیمپسوں پر غالب آ گئی تھی۔ شکری کی سوسائٹی کی طرح ''جماعت'' اپنے آپ کو سید قطب والا ہراول تصور کرتی تھی۔ تاہم انہوں نے مرکزی دھارے سے علیحدگی اختیار نہیں کی بلکہ اپنی ضرورتوں سے بے نیاز دکھائی دینے والے معاشرے میں اپنے لیے ایک اسلامی ماحول کی تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ مصری یونیورسٹیاں آکسفورڈ' ہارورڈ یا سوربون نہیں تھیں۔ بلکہ ان میں تو سہولیات کا شدید فقدان تھا۔ 1970ء سے لے کر 1977ء کے دوران طلباء کی تعداد میں دو لاکھ سے پانچ لاکھ تک اضافہ ہو گیا۔ نتیجتاً یونیورسٹیاں پر ہجوم ہو گئیں۔ ایک ایک نشست پر دو دو تین تین طلباء بیٹھا کرتے تھے اور لیکچر ہال اور لیبارٹریاں اتنی بھری ہوئی ہوتیں کہ استاد کی آواز کا سنائی دینا واقعتاً ناممکن ہوتا تھا۔ بالخصوص اس لیے کہ مائیکروفون اکثر ٹوٹے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ صورتحال طالبات کے لیے خصوصاً پریشان کن تھی۔ بیشتر طالبات روایت پسند گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کے لیے لیکچر ہال یا بسوں میں طلباء کے ساتھ بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ پڑھائی رٹے سے ہوتی تھی اور امتحانات میں کامیابی کے لیے لیکچر نوٹس اور پروفیسروں کے جاری کردہ مینوئلز (Menuals) ہی کو مکینیکل انداز میں نقل کروایا جاتا تھا۔ ہیومنیٹیز' قانون اور سماجی علوم کو ''کچرا گھر'' کہا جاتا تھا۔ ذہین طلباء کے ذاتی رجحانات کچھ بھی ہوں انہیں طب' علم الادویہ' انجینئرنگ یا معاشیات پڑھنے پر مجبور کیا جاتا یا وہ بدترین پروفیسروں اور گریجویشن کے بعد اچھی ملازمت حاصل ہونے کے کم تر امکان کی وجہ سے پڑھنے سے ہی انکار کر دیتے۔ اس صورتحال میں طلباء کو انسانیت یا معاشرے کے مسائل کے بارے میں تخلیقی انداز میں سوچنے کی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس کے بجائے ان سے معلومات کو مجہولیت کے ساتھ اور بے روح پن کے ساتھ جذب کرنا مطلوب ہوتا تھا۔ چنانچہ جدید کلچر سے ان کا تعارف سطحی تھا اور ان کے مذہبی اعتقادات اور اعمال ویسے ہی رہ جاتے۔

واضح طور پر جماعت اسلامیہ نے سید قطب سے فیضان پایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مصریوں کے لیے ملک پر طویل مدت سے حاوی چلے آ رہے مغربی اور سوویت نظریات سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چھٹکارا پانے اور اسلام کی طرف واپسی کا وقت آ چکا تھا۔ مصر پر عملاً کافروں کی حکومت ہے اور جب تک عظیم مذہبی بیداری رونما نہ ہو سچی آزادی کا کوئی امکان نہیں۔ جماعت نے خود کو تصورات پر بحث مباحثے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انہوں نے اپنے حالات پر اسلامی نظریے کا تخلیقی اور عملی انداز میں اطلاق کیا۔ 1973ء میں طلباء نے بڑی یونیورسٹیوں میں سمر کیمپ لگانے شروع کیے۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے' راتوں کو عبادت کرتے اور اسلام کے سنہرے دور' سیرت رسولؐ اور خلفائے راشدین کے حالات زندگی کے بارے میں وعظ سنتے۔ دن میں کھیل کود ہوتے اور ذاتی دفاع کے طریقے سکھائے جائے۔ طلباء چند ہفتوں کے لیے ایک مکمل اسلامی نظام میں رہتے۔ مبلغ اور مقرر جدیدیت کے حوالے سے تلخ مایوسیوں کا اظہار کرتے جو کہ یورپ اور امریکہ میں تو ہو سکتا ہے خوبصورتی سے کام کرتی ہو' تاہم مصر میں اس نے صرف امیروں ہی کو فائدہ پہنچایا تھا۔

جب طلبا یونیورسٹی کی زندگی میں واپس آتے تو اپنے اس تجربے کے عملی اطلاق کی کوشش کرتے۔ انہوں نے طالبات کو سرکاری ٹرانسپورٹ میں محسوس ہونے والی پریشانی سے بچانے کے لیے ایک منی بس سروس شروع کی۔ انہوں نے لیکچر ہالوں میں بھی ایسی ہی وجوہات کے تحت طلبا اور طالبات کے الگ الگ صفوں میں بیٹھنے کا مطالبہ کیا نیز انہوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ طلبا اور طالبات اسلامی لباس پہنیں۔ جماعت نے مسجدوں میں دہرائی کا بھی اہتمام کیا جو پرشور رہائشی ہالوں میں سکون سے ممکن نہیں تھی۔ یہ پالیسیاں اثر آفرین تھی۔ جب کوئی طالبہ لیکچر میں الگ صف میں بیٹھتی تو اسے احساس ہوتا کہ ''جماعت'' کے مقابلے میں حکومت کو اس کی مشکلات کے حوالے سے کم تشویش تھی۔ پرشور ہوسٹل کی بجائے مسجدوں میں پڑھنے سے طالب علموں کو پتا چلتا کہ اسلامی نظام ان کے لیے بہت زیادہ بہتر ہے۔ بہت سے طالب علم دیہاتی علاقوں اور ایک روایت پسند' ماقبل جدید معاشرے سے آئے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹیوں میں جدیدیت کو نہ صرف اجنبی' غیر شخصی اور حواس باختہ کر دینے والا پایا بلکہ انہیں حکومت پر تنقید کرنے کے اہل بنانے والے کوئی دوسرے دانشورانہ ذرائع بھی مہیا نہیں کیے گئے۔ بہت سوں کے لیے اس دنیا میں صرف اسلام معنویت رکھتا تھا۔

مغربی مشاہدین عورتوں کو پردے کی طرف واپس آتا پا کر بالخصوص پریشان تھے' جسے لارڈ کرومر کے زمانے سے اسلامی پسماندگی اور پدریت کی علامت تصور کیا جاتا تھا۔ تاہم مسلمان عورتیں ایسا نہیں سمجھتی تھیں وہ اسلامی لباس کو عملی وجوہ سے اپناتیں نیز اجنبی مغربی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تشخص کو رد کرنے کے لیے بھی۔ پردہ ''اپنی طرف واپسی'' کی علامت ہوسکتا تھا' جس کے لیے اسلام پسند مابعد نوآبادیاتی دور میں کوششیں کر رہے تھے۔ عورتوں کا پردہ اسلامی اثبات ذات اور مغرب کے استرداد کی علامت بن گیا تھا۔ شکری مصطفیٰ کے کمیونوں کی طرح پردہ دار مسلمان عورتیں بھی جدید روح کے تاریک رخ پر ایک بلیغ تنقید تھیں۔

پردہ:

ایسی عورت جو اسلامی لباس پہننے کا فیصلہ کرتی تھی وہ ضروری نہیں تھا کہ ماقبل جدید پرانی نسائی کمتری کو قبول کر لیتی۔ 1982ء میں مصر میں ہونے والے ایک سروے نے ظاہر کیا کہ جہاں پردہ کرنے والی عورتیں مغربی لباس کو ترجیح دینے والی عورتوں کے مقابلے میں عمومی طور پر زیادہ قدامت پسند تھیں' وہاں اسلام پسند عورتوں کا غیر معمولی حد تک زیادہ تناسب صنفی معاملات پر ترقی پسندانہ خیالات کا حامل تھا۔ پردہ کرنے والی اٹھاسی فیصد عورتیں یقین رکھتی تھیں کہ عورتوں کے لیے تعلیم اہم ہے (جبکہ 93 فیصد غیر پردہ دار عورتیں اس سوچ کی حامل تھیں)' اٹھاسی فیصد پردہ دار عورتیں عورتوں کے گھروں سے باہر کام کرنے کو قبول کرتی تھیں اور 77 فیصد نے گریجویشن کے بعد ملازمت کرنے کا خیال ظاہر کیا (بالترتیب غیر پردہ دار عورتوں کا 95 اور 85 فیصد انہی خیالات کا حامل تھا)۔ دیگر شعبوں میں فرق زیادہ تھا تاہم پردہ دار عورتوں کی اکثریت (53 فیصد) کا اب بھی ایقان تھا کہ عورتوں اور مردوں کو یکساں حقوق و فرائض سے متصف ہونا چاہیے اور یہ کہ عورتوں کو ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں پر لانا چاہیے (63 فیصد)۔ صرف 38 فیصد پردہ دار عورتیں شادی کے حوالے سے مرد و زن کو مساوی دیکھنا چاہتی تھیں تاہم صرف 66 فیصد غیر پردہ دار عورتیں سوچتی تھیں کہ مرد و زن کو ازدواجی مساوات حاصل ہونی چاہیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پردہ دار (67 فیصد) اور غیر پردہ دار عورتوں (52.7 فیصد) کی اکثریت کا ایقان تھا کہ شریعت کو ملک کا قانون ہونا چاہیے۔

لیلیٰ احمد نے اپنی کتاب Women and Gender in Islam میں نشاندہی کی ہے کہ یہ عورتیں ماضی کے بہت سے مسلم مصلحین کی طرح قرآن و سنت کے ''سچے اسلام'' کی طرف مراجعت کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کا ایقان تھا کہ ''سچا اسلام'' عورتوں سمیت سب کے لیے انصاف اور مساوات کی بات کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی لباس ہمیشہ عورتوں کی قلبی اطاعت کا اظہار نہیں کرتا۔ ترک عالم نیلوفر گولے لکھتی ہیں کہ پردہ دار عورتیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اکثر عسکریت پسند' گفتگو میں بے دھڑک اور اچھی تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ بہت سی پردہ دار عورتوں نے بنیاد پرستانہ حملے میں ایک فعال اور بعض اوقات ہیروانہ (Heroic) کردار ادا کیا۔

لیلیٰ احمد یہ بھی لکھتی ہیں کہ مصر میں اسلامی لباس ماضی کی طرف واپسی نہیں ہے۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں جس لباس کو اکثر عورتوں نے ترجیح دی وہ کسی طور روایتی نہیں تھا۔ وہ تو ایک نیا فیشن تھا۔ بلاشبہ اسے جدیدیت کو اپنانے سے پہلے ایک عبوری مرحلہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ان برسوں میں پہلے سے بہت زیادہ عورتوں نے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ یونیورسٹیوں میں اسلامی لباس کو ترجیح دینے والی طالبات کی اکثریت کا پس منظر دیہاتی تھا اور وہ اپنے خاندانوں میں بنیادی تعلیم سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے والی پہلی عورتیں تھی۔ چنانچہ ان کا یہ اسلامی لباس بھی ان کے اپنے خاندانوں میں پہنے جانے والے لباسوں کا ''جدید'' روپ تھا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ماضی میں مذہب نے روایتی سے زیادہ جدید طرز زندگی اور نظرئے کی طرف جانے میں لوگوں کی مدد کی تھی۔ ممکن ہے اسلام لباس مردوزن دونوں کے لیے ایسی ہی ایک حکمت عملی ہو۔

تاہم تمام عبوری مرحلے اذیت ناک ہوتے ہیں۔ 1970ء کے عشرے کے دوران کیمپسوں میں ''اسلامی جماعت'' کی نوجوانوں کی تحریک (Youth Movement) نے نوجوان مردوزن کو اپنی الجھن اور اضطراب کے اظہار میں مدد دی۔ یہ اکثر و بیشتر تشدد پر بھی اتر آئی۔ ''جماعت'' 1970ء کی دہائی کے دوران مصری اسلامی تحریکوں میں سب سے کم جارحانہ تھی تاہم کیمپس پر قبضے کے لیے بعض عسکریت پسند رہنماؤں نے اسلحے سے کام لیا۔ امریکہ کے عرب داں (Arabist) پیٹرک گیفنی نے بالائی مصر میں نئی یونیورسٹی آف مینیا میں ''جماعت اسلامیہ'' کا مطالعہ کیا' جو ہنوز غیر ترقی یافتہ تھی اور مختصر سے اسلامی کیڈر کے مقابل کم تھے۔ انہوں نے خصوصی مقامات کو اسلامی علاقے قرار دینے سے آغاز کیا: ایک بلیٹن بورڈ' کیفے ٹیریا کا ایک حصہ یا سبزہ زاروں (Lawns) کے سایہ دار گوشے۔ 1977ء تک اسلام پسندوں نے طلبا یونین پر کنٹرول پانا شروع کیا۔ انہوں نے کالجز آف آرٹ اینڈ ایجوکیشن کے مشترکہ میدان میں مسجد بنالی' جہاں طلبا پڑھائی کے دوران نماز ادا کرتے تھے۔

سیکولر علاقے میں اس پیشرفت کو مغرب زدہ دنیا میں اسلام کی تعمیر نو کی ایک خام کوشش تصور کیا جا سکتا ہے۔ مینیا کے اسلام پسندوں نے مغربی تہذیب کی آفاقی توسیع کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور نقشے میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسلامی لباس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قبولیت کی طرح ایک عام جگہ کو مسجد میں بدلنے کا عمل مکمل طور پر سیکولر طرز حیات کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ تقریباً ایک صدی سے ترقی پذیر دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح مصریوں کو بھی تاریخ تخلیق کرنے اور ایک جدید معاشرہ قائم کرنے کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اب اسلام پسند' خواہ کتنے چھوٹے درجے پر ہی سہی' کچھ کر کے دکھا رہے تھے۔ وہ مغربی نقطۂ نظر کی مرکزیت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے اور خود کو حاشیے سے نکال کر مرکزی دھارے میں لا رہے تھے۔ شہری حقوق کی تحریکوں یا نسلی تحریکوں کی طرح' نسائیت پسندی یا ماحولیات پسندی کی طرح مسلمان طلباء کی تنظیمیں اپنے خیال کے مطابق جدیدیت کی کچلی ہوئیں اقدار' تشخص اور معاملات کے اثبات کی جدوجہد کر رہی تھیں اور مغرب کے ٹھونسے ہوئے عالمی معاشرے کی یکسانیت پر اپنے مقامی اور مخصوص معاشرے کی جانداری پر زور دے رہی تھیں۔ دیگر مابعد جدید تحریکوں کی طرح یہ علامتی نوآبادیات شکنی (Decolonization) کا ایک قدم تھا' مغرب کی مرکزیت کو ختم کرنے کی ایک کوشش تھی اور اس حقیقت کا اظہار کہ انسانیت کے دوسرے امکانات بھی وجود رکھتے ہیں۔ جب سادات مغرب سے زیادہ قریب ہوا اور اسرائیل سے (جسے اسلام پسند مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا دوسرا روپ تصور کرتے تھے) امن معاہدہ کر لیا تو حکومت سے اختلاف ناگزیر ہو گیا۔ مینیا میں طالب علم زیادہ متشدد ہو گئے۔ انہوں نے چرچوں پر پتھراؤ کیا' اسلام لباس رد کرنے والے طالب علموں پر حملے کئے اور فروری 1979ء میں ایک ہفتے تک میونسپل حکومت کی عمارت پر قبضہ کیے رکھا۔ جب پولیس نے ایک مسجد کی تالابندی کر دی تو طلبا نے ایک اہم پل پر ٹریفک روکتے ہوئے عین درمیان میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اگلے مرحلے میں انہوں نے یونیورسٹی اور طلباء کے رہائشی بلاک پر قبضہ کر لیا اور تیس عیسائی طلبا کو یرغمال بنا لیا۔ دو دن بعد شورش کو دبانے کے لیے ایک ہزار فوجی پہنچ گئے۔

1977ء سے پہلے سادات نے ''جماعت اسلامیہ'' کی حمایت کی تھی تاہم مینیا کے واقعات نے اس کی سوچ بدل دی۔ 14 اپریل 1979ء میں اس نے بالائی مصر کا دورہ کیا اور مینیا اور اسیوط کی یونیورسٹیوں میں خطابات کیے' اور کہا کہ حکومت مذہب کے اس غلط استعمال کو مزید برداشت نہیں کرے گی۔ جون میں مصری طلباء کی جنرل یونین پر پابندی لگا دی گئی اور سارے اثاثے منجمد کر دیئے گئے۔ جماعت اسلامیہ نے رمضان کے مہینے میں مصر کے اہم شہروں میں بڑے بڑے جلوس نکالے۔ قاہرہ میں صدر کے عابدین محل کے سامنے پچاس ہزار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طلبا نماز کے لیے جمع ہو گئے' ان کا مقصد سادات کو یاد دہانی کروانا تھا کہ اسے لازماً خدا کے قانون کے تحت حکومت کرنا ہو گی۔ ممتاز اخوان یوسف القرضاوی خلیج سے بذریعہ جہاز اس اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے آیا۔ اس نے سادات کو' جس نے حال ہی میں فرعون رعمسیس دوم (Ramses II) کی ممی کو محفوظ رکھنے پر بہت توجہ دی تھی' یاد دلاتے ہوئے کہا:

''مصر فرعونی نہیں مسلمان ملک ہے..... مصر کے حقیقی ترجمان اہرام' تھیٹر اور فلمیں نہیں جماعت اسلامیہ کے نوجوان ہیں..... عریاں عورتیں نہیں بلکہ الوہی قانون کے احکامات پر کاربند پردہ دار عورتیں مصر ہیں۔ ڈاڑھیاں رکھنے والے نوجوان مصر ہیں..... یہ الازہر کی سرزمین ہے!''

جبر و استبداد اپنے عمومی اثرات کے حامل تھے اور اسلام پسند طلبا نے کیمپسوں کو اسلام کے قلعوں میں بدلنے کے لیے اپنی کوششوں میں اضافہ کر دیا' سینماؤں' تھیٹروں' عیسائیوں اور بے پردہ عورتوں پر مزید حملے ہوئے۔ انہوں نے یونیورسٹیوں کے باہر بھی تقاریر کرنا شروع کر دیا۔ اب حکومت اور اس کے سیکولر نظام کے خلاف ایک کھلی جنگ کی حالت رونما ہو چکی تھی۔ ''جماعت'' کو دوبارہ منظم ہونے کی اجازت نہیں دی گئی اور اس کے بہت سے اراکین نے جہاد کے لیے وقف خفیہ گروپوں میں شمولیت کر لی۔

یہ سب واقعات انقلاب ایران کے زمانے میں رونما ہو رہے تھے۔ جہاں سادات مغرب سے قریب تر ہونے کی کوشش میں فخر کے ساتھ شاہ کو اپنا دوست کہتا تھا' وہاں مصر کے اسلامی عسکریت پسند شاہ کو گرانے کی کوششوں میں مصروف ایرانی انقلابیوں کی خبریں سن کر ان کی تعریفیں کر رہے تھے۔ 79-1978ء کا انقلاب ایران ایک سیل بے پناہ تھا۔ وہ ساری دنیا کے ایسے ہزاروں مسلمانوں کے لیے ایک فیضان (Inspiration) تھا' جو طویل عرصے سے اپنے مذہب کو حملے کی زد میں محسوس کر رہے تھے۔ خمینی کی فتح نے ظاہر کر دیا تھا کہ تباہی اسلام کا مقدر نہیں ہے' بلکہ وہ سیکولر قوتوں سے لڑ کر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ تاہم مغرب میں بہت سے لوگوں کو اس انقلاب نے دہشت زدہ کر دیا۔ انہیں یوں محسوس ہوا کہ وحشت نے روشن خیالی پر فتح پا لی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایران کی حالتِ زار:

1970ء کی دہائی کے اوائل میں ایران ترقی پاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ امریکی سرمایہ کاری اور ایرانی اشرافیہ سفید انقلاب کے پیدا کردہ نئے کاروباروں اور صنعتوں سے بہت دولت کما رہے تھے۔ تہران میں واقع امریکی سفارتخانہ جاسوسی کا مرکز ہونے کی بجائے (جیسا کہ آگے چل کر انقلابیوں نے الزام لگایا تھا) امیر امریکیوں کو امیر ایرانیوں سے ملانے والا ایک بروکریج سنٹر (Brokerage Center) کے مثل تھا۔

تاہم فائدہ صرف اشرافیہ ہی کو ہوا تھا۔ ریاست امیر ہو گئی تھی اور لوگ غریب۔ 74-1973ء میں تیل کی قیمتوں میں اضافے کے بعد افراط زر میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ دس لاکھ افراد بے روزگار تھے' غیر ملکی اشیاء کی بھرمار سے چھوٹے تاجر برباد ہو گئے اور 1977ء تک افراط زر امیروں کو بھی متاثر کرنے لگی تھی۔ اس بے اطمینانی اور اضطراب میں امریکی فوجیوں اور مشیروں کو قتل کرتے ہوئے دو بڑی گوریلا تنظیمیں فعال تھیں۔ ایران میں امریکی ہنرمندوں کے خلاف شدید آزردگی موجود تھی' جو ایسا لگتا تھا کہ عوام کی بربادی سے نفع اندوزی کر رہے ہوں۔ ان برسوں کے دوران شاہ کی حکومت ہمیشہ سے زیادہ جابر اور آمر ہو گئی تھی۔

بہت سے غیر مطمئن ایرانی علماء کی طرف دیکھتے تھے' جنہوں نے اس بحران کا جواب مختلف طریقوں سے دیا۔ قم میں انتہائی معتبر مجتہد آیت اللہ شریعت مداری نے حکومت سے کسی سیاسی تصادم کی مخالفت کی' گو کہ وہ 1906ء کے آئین کی بحالی کے حوالے سے متفکر تھے۔ آیت اللہ طالقانی' جو آئین کے بھرپور نفاذ کا مطالبہ کرنے اور حکومت کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرنے پر کئی بار جیل کی ہوا کھا چکے تھے' مہدی بارزگان اور ایران میں ایک اسلامی جمہوریہ قائم کرنے کے خواہش مند ابوالحسن بنی صدر جیسے عام مصلحین کے شانہ بشانہ کام کر رہے تھے۔ طالقانی کا ایقان تھا کہ مذہبی پیشواؤں کا حکومت میں کوئی مراعاتی کردار نہیں ہونا چاہیے' وہ خمینی کے ولایت فقیہہ کے تصور سے متفق نہیں تھے۔ تاہم خمینی حکومت کی بھرپور مخالفت کی علامت تھے۔ جون 1975ء میں فیضیہ مدرسہ کے طلبا نے 1963ء میں وہاں سے خمینی کی گرفتاری کی یاد میں ایک مظاہرہ کیا۔ پولیس مدرسے میں گھس گئی' اس نے آنسو گیس استعمال کی اور ایک طالب علم کو چھت سے گرا کر ہلاک کر دیا۔ حکومت نے مدرسہ بند کر دیا اور اس کے خاموش خالی صحن شاہ کی اپنے خلاف احتجاج کی کسی سرگوشی سے بنیادی نفرت اور مذہب سے بیزاری کی علامت بن گئے۔ لوگ رفتہ رفتہ اسے یزید تصور کرنے لگے اور انہوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے خمینی کو امام کہنا شروع کر دیا۔

ایرانی شعراء اور انقلابی جدوجہد:

تاہم 1977ء کے آغاز میں ایسا لگتا تھا کہ حکومت نرم پڑ گئی ہے اور عوامی دباؤ کے سامنے جھک گئی ہے۔ جمی کارٹر گزشتہ سال امریکہ کا صدر منتخب ہو چکا تھا اور اس کی انسانی حقوق کی مہم نیز ایرانی عدالتوں اور جیلوں کے حوالے سے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ نے ممکن ہے شاہ کو غلبہ پاتی ہوئی بے اطمینانی کو کم کرنے کے لیے کچھ رعایتیں دینے پر مائل کیا۔ حقیقی تبدیلی تو بہت کم آئی تاہم سنسر شپ کے قوانین میں نرمی کر دی گئی اور معاشرے کے ہر طبقے کی فکر کی ترجمانی کرنے والے ادب کا سیلاب سا آ گیا۔ طالب علم یونیورسٹیوں میں حکومت کی مداخلت سے مشتعل تھے' کسان زرعی درآمدات کے حوالے سے احتجاج کر رہے تھے کیونکہ ان کی وجہ سے دیہی علاقوں میں غربت بڑھ گئی تھی' کاروباری لوگ افراط زر اور کرپشن پر فکرمند تھے' وکلاء سپریم کورٹ کی بے توقیری پر احتجاج کناں تھے۔ تاہم انقلاب کی صدا ابھی تک بلند نہیں ہوئی تھی۔ بیشتر علماء شریعت مداری کی پیروی میں روایتی خاموشی والا وطیرہ اپنائے ہوئے تھے۔ 1977ء میں حکومت کے خلاف بھرپور احتجاج علماء نے نہیں بلکہ ادیبوں نے کیا۔ 10 سے لے کر 19 اکتوبر تک ساٹھ ممتاز ایرانی شاعروں اور ادیبوں نے ہزاروں بالغوں اور طالب علموں کو اپنا کلام اور تحریریں سنائیں۔ ساواک نے حکومت پر شدید تنقید کے باوجود ان شعراء کے کلام سنانے میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ ایسا لگتا تھا کہ حکومت پر امن احتجاج کو برداشت کرنا سیکھ رہی ہے۔

مصطفیٰ خمینی کی پراسرار ہلاکت:

تاہم نیا دور زیادہ دیر برقرار نہیں رہا' مشاعروں کے تھوڑے عرصے بعد شاہ نے واضح طور پر محسوس کیا کہ معاملات اس کے ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ بے شمار معروف منحرفین کو گرفتار کر لیا گیا اور 3 نومبر 1977ء کو عراق میں خمینی کا بیٹا مصطفیٰ پراسرار انداز میں ہلاک ہو گیا' تقریباً یقینی طور پر ساواک کے ایجنٹوں کے ہاتھوں۔ شاہ نے اپنے آپ کو ایک بار پھر یزید ثابت کر دیا تھا۔ پورے ایران میں لوگ روایتی انداز میں روتے اور سینے پیٹتے ہوئے مصطفیٰ خمینی کی ہلاکت کا سوگ منانے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ تہران میں پولیس نے ماتمیوں پر حملہ کیا اور 16,15 اور 25 نومبر کو تہران میں منعقدہ مشاعروں میں مزید مار پیٹ اور گرفتاریاں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوئیں۔ تاہم اب بھی عمومی ابھار کا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ نجف میں خمینی' جو مصطفیٰ کو ''اپنی آنکھوں کا نور'' کہتے تھے' لب بستہ تھے۔ اسی اثنا میں 13 نومبر 1977ء کو شاہ صدر کارٹر سے مذاکرات کے لیے امریکہ پرواز کر گیا۔ امریکی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے والے ایرانی طلباء روزانہ وائٹ ہاؤس کے باہر شاہ کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے جمع ہونے لگے۔ ایک پرتکلف عشائیے میں صدر کارٹر نے امریکہ' ایران خصوصی تعلقات کے حوالے سے ولولہ انگیز خطاب کیا اور ایران کو ''دنیا کے ایک بحرانی گوشے میں استحکام کا جزیرہ'' قرار دیا۔ 31 دسمبر کو کارٹر ہندوستان جاتے ہوئے تہران اترے' جہاں انہوں نے حکومت کے لیے بھرپور حمایت کا اظہار کیا۔ آخر تک صدر شاہ پر اعتماد کا اظہار کرتے رہے۔ ان کا دورہ محرم کے مہینے میں ہوا تھا' جب ہر شخص کے ذہن میں سانحۂ کربلا سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے لیکن اس سال ہر شخص خمینی کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا: شاہ نے مصطفیٰ خمینی کے چہلم پر تازہ تازہ پابندی جو عائد کی تھی۔ جب اس انتہائی اہم مرحلے پر کارٹر نے شاہ کی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے خصوصی دورہ کیا تو وہ واضح طور پر شیطان بزرگ (Great Satan) قرار پا گیا۔

شیطانِ بزرگ:

امریکی انقلاب کے دوران اور بعد میں اپنی قوم کے لیے شیطان کا لفظ سن کر صدمہ محسوس کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ 1953ء والی سی آئی اے کی بغاوت کے وقت سے امریکہ کے لیے ایرانیوں کے دلوں میں موجود آزردگی سے آگاہ لوگ بھی اس شیطانی تمثال پر تلملا رہے تھے۔ امریکی پالیسی خواہ کتنی ہی غلط رہی ہو' اس کی اس انداز سے مذمت نہیں کی جانی چاہیے تھی۔ اس سے اس یقین کی تصدیق ہوتی تھی کہ انقلابی' جنونی' ہسٹیریائی اور غیر متوازن ہیں۔ تاہم بیشتر لوگ ''شیطان بزرگ'' کی مثال کو غلط سمجھے تھے۔ ایرانیوں کے خیال میں امریکہ پست کام کرنے والا تھا۔ مغرب زدہ شمالی تہران کے مے کدے' جوا خانے اور سیکولر نظام امریکی اثرات کو ظاہر کرتے تھے۔ امریکہ اس لیے بھی شیطان کہلوایا کیونکہ اس نے صرف ''ظاہر'' کو اہمیت دی۔ چونکہ وہ ہستی کی باطنی معنویت سے لاعلم تھا' اس لیے شیطان تھا۔ مزید برآں امریکہ' یعنی شیطان نے شاہ کو اسلام کی سچی اقدار سے بہکا کر سطحی سیکولرازم کی راہ پر ڈال دیا تھا۔

ایرانی شیعیت کے ہمیشہ دو محرک جذبے رہے ہیں: سماجی عدل اور الغیب۔ جہاں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مغربی لوگوں نے صدیوں کے عمل سے طبیعی عالم کے حوالے سے ایک عقلی نظام وضع کیا تھا' وہاں ایرانی شیعہ' دیگر ماقبل جدید لوگوں کی طرح' عالم باطن کے شعور کے حامل تھے۔ سفید انقلاب کے دوران ایرانیوں نے بجلی' ٹیلی ویژن اور جدید ٹرانسپورٹ تو حاصل کر لی تھی لیکن ملک میں مذہب کے احیا نے ظاہر کر دیا کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ ''ظاہری'' کارنامے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ مارڈنائزیشن بہت تیزی سے ہوئی تھی اور ناگزیر طور پر سطحی تھی۔ بہت سے ایرانی اب بھی ''باطن'' کے تشنہ تھے اور محسوس کرتے تھے کہ اس کے بغیر ان کی زندگیوں کی نہ کوئی قدر ہے نہ اہمیت۔ جیسا کہ ایک امریکی عالم بشریات (Anthropologist) ولیم بیمین نے وضاحت کی تھی کہ ایسا ایرانی جسے یقین ہو کہ وہ زندگی کی مادی سطح میں پھنسا ہوا ہے' محسوس کرتا تھا کہ اس کی روح کھو چکی ہے۔ ایرانی معاشرے میں ایک خالصتاً داخلی زندگی کی آرزو اعلیٰ ترین قدر تھی۔ روحانی شعور کے بغیر بہت سے ایرانی یکسر کھویا ہوا محسوس کرتے۔ سفید انقلاب کے دوران بعض ایرانیوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ان کے مغرب زدہ معاشرے کو مادیت پسندی' اشیائے صرف' تفریح کے اجنبی طریقوں اور غیر ملکی اقدار کے نفاذ نے مسموم کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ ایسا لگتا تھا شاہ نے امریکہ کی تائید سے اسلام کو تباہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہو۔ اس نے خمینی کو ملک بدر اور فیضیہ مدرسہ کو بند کر دیا تھا' وہ مذہبی پیشواؤں کی تحقیر کرتا تھا' اس نے ان کے محاصل میں کمی کر دی تھی اور الٰہیات کے طالب علموں کو قتل کروا دیا تھا۔

انقلاب ایران محض سیاسی نہیں تھا۔ یقیناً شاہ کی ظالمانہ اور آمرانہ حکومت اور معاشی بحران بھی بہت اہم تھے اور ان کے بغیر شورش پیدا نہ ہوتی۔ بہت سے سیکولر جو روحانیت کے تجربے سے نہیں گزرے تھے وہ علماء کے ساتھ صرف اس لیے شامل ہوئے تھے کہ وہ شاہ سے نجات پانا چاہتے تھے اور ان کی مدد کے بغیر انقلاب کامیاب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ مذہب کو بے دخل کر دینے والے سیکولر نظام کے خلاف بھی بغاوت تھی' جسے بہت سے عام ایرانی اپنی رضا کے خلاف عائد کردہ محسوس کرتے تھے۔ اس احساس کا واضح اظہار امریکہ کو شیطان بزرگ قرار دینے سے ہوا۔ لوگ درست یا غلط تصور یہ کرتے تھے کہ اگر امریکہ شاہ کی مدد نہ کرتا تو اس کا رویہ ویسا نہ ہوتا جیسا کہ تھا۔

کارٹر کے دورے کے اگلے برس میں امریکہ کو ایران کے روحانی' معاشی اور سیاسی مسائل کا ذمہ دار قرار دیا جانے لگا۔ گلیوں میں بنی تصویروں میں کارٹر کو یزید اور شاہ کو شمر دکھایا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانے لگا۔ گلیوں میں بنائی جانے والی ایک تصویر میں خمینی کو موسیٰ ؑ، شاہ کو فرعون اور کارٹر کو بت دکھایا گیا' فرعون شاہ جس کی پوجا کرتا تھا۔

شاہ کے انجام کا آغاز:

1978ء میں محرم کے اختتام پر شاہ نے اپنے آپ کو ایک بار پھر شیعوں کا دشمن ثابت کر دیا۔ 8 جنوری کو سرکاری اخبار ''اطلاعات'' میں خمینی کے بارے میں توہین آمیز مضمون شائع ہوا جس میں انہیں ''ایک مہم جو اور نو آبادیت کے مراکز سے ربط رکھنے والا'' قرار دیا گیا تھا۔ مضمون میں کہا گیا کہ وہ برطانیہ کے جاسوس ہیں اور سفید انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے برطانیہ سے پیسہ حاصل کر رہے ہیں۔ یہ شاہ کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اگلے روز چار ہزار طلبا قم کی گلیوں میں نکل آئے: انہوں نے 1906ء کے آئین کی بحالی' اظہار کی آزادی' سیاسی قیدیوں کی رہائی' فیضیہ مدرسے کو دوبارہ کھولنے اور خمینی کو ایران واپس آنے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا۔ انہیں موت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ پولیس نے غیر مسلح مظاہرین پر گولیوں کی بارش برسادی اور علماء کے بقول ستر طلبا ہلاک ہو گئے۔ (گو کہ حکومت نے اعلان کیا کہ صرف دس طلبا ہلاک ہوئے تھے)۔ 1963ء کے فسادات کے بعد یہ ایرانی تاریخ کا خونیں ترین دن تھا اور شاہ کے انجام کا آغاز۔ ولیم بیمین نے نشاندہی کی ہے کہ ایرانی بہت برداشت کے حامل ہوتے ہیں لیکن عقیدے کی توہین کے کسی ایک عمل سے بھی شخصی' کاروباری اور سیاسی تعلقات ختم کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ لکیر عبور کر لی گئی تو پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لاکھوں عام مذہبی ایرانیوں کے نزدیک شاہ نے قم میں مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دے یہ لکیر عبور کر لی تھی۔ انہوں نے اس قتل عام کا جواب خام اشتعال سے دیا اور انقلاب شروع ہو گیا۔

علماء: انقلاب کے قائد

حالیہ مہینوں میں دانشور' ادیب' وکیل اور کاروباری افراد شاہ کی حکومت کے خلاف احتجاجوں کی قیادت کر چکے تھے۔ تاہم جنوری میں شیعوں پر اس سفاکانہ حملے کے بعد قیادت علماء کے پاس آ گئی۔ یہ قتل و غارت گری اس قدر ہلا دینے والی تھی کہ آیت شریعت مداری نے بھی خاموشی ترک کر دی اور سخت ترین الفاظ میں فائرنگ کی مذمت کی۔ اس سے پورے ملک کے علماء کو ایک اشارہ مل گیا۔ کوئی منصوبہ یا پہلے سے تیاری نہیں تھی۔ خمینی نے نجف سے کوئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سٹریٹجک احکامات جاری نہیں کیے' تاہم جس وقت ''اطلاعات'' میں مضمون چھپا' وہ انقلاب کے غیر مرئی محرک بن گئے۔ کسی بھی شخص کے چہلم کی ماتمی تقریب احتجاجی مظاہرے میں ڈھل جاتی تھی۔ اس دوران مزید ہلاکتیں ہوتیں اور ان ہلاک ہونے والوں کے چہلم منائے جاتے اور مزید احتجاجی مظاہرے ہوتے' یوں تازہ ترین شہید کا سوگ مناتے ہوئے حکومت کے خلاف مظاہروں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ انقلاب نے روکی نہ جاسکنی والی رفتار پکڑ لی تھی۔ ہر مظاہرے کے درمیان چالیس دنوں کے وقفے میں قائدین تقریریں کرتے اور بغیر کسی واضح منصوبے یا اشتہارات کے ہجوم کو پتا ہوتا تھا کہ کب اکٹھا ہونا ہے۔

یوں 18 فروری کو' قم کے قتل عالم کے چہلم کے روز' اہم ایرانی شہروں میں ماتمی لوگ علماء کی قیادت میں ہلاک ہونے والوں کا سوگ منانے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ پردہ دار طالبات اور عورتیں جلوسوں کے آگے آگے تھیں' گویا پولیس کو چیلنج دے رہی ہوں کہ ان پر سیدھی گولی چلائی جائے۔ پولیس نے ضرور گولیاں چلائیں اور مزید شہادتیں ہوئیں۔ تبریز میں سب سے زیادہ تشدد رونما ہوا' جہاں ایک سو سوگوار ہلاک ہوئے اور چھ سو کو گرفتار کر لیا گیا۔ نوجوانوں نے جلوس سے نکل کر سینماؤں' بینکوں اور شراب خانوں (شیطان بزرگ کی علامتوں) پر حملے کیے تاہم کسی فرد پر حملہ نہیں کیا۔ چالیس دن بعد 30 مارچ کو ماتمی ایک بار پھر سڑکوں پر نکل آئے' اس مرتبہ تبریز کے شہدا کا سوگ منانے کے لیے۔ اس موقع پر یزد میں مسجدوں سے نکلتے ہوئے ایک سو مظاہرین کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ 8 مئی کو یزد کے شہیدوں کے احترام میں نئے جلوس نکالے گئے۔ جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھر گئیں اور مرنے والوں کی تعداد نے اپنے ہی عوام کے خلاف ہو جانے والی حکومت کی برہنہ جارحیت کو عیاں کر دیا تھا۔

یہ مظاہرے جذبات سے بھرپور ہوتے تھے۔ مظاہرین پلے کارڈ لہراتے' جن پر لکھا ہوتا ''ہر طرف کربلا ہے' ہر دن عاشورہ ہے''۔ جون اور جولائی میں شاہ نے آزادانہ انتخابات اور کثیر جماعتی نظام بحال کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے کچھ رعایتیں دیں۔ ان مہینوں کے دوران مظاہرین نے خاموشی اختیار کر لی۔ مغربی تعلیم یافتہ سیکولر لوگ اور دانشور' جنہوں نے اب تک ماتمی جلوسوں میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور حکومت کے خلاف صرف لفظی احتجاج کیا تھا' یہ تصور کر بیٹھے کہ جنگ جیت لی گئی ہے۔ تاہم 19 اگست 1953ء میں بحال ہونے والی پہلوی شہنشاہ کی 25 ویں سالگرہ پر ابادان میں ریکس سینما کو آگ لگا دی گئی' جس کی وجہ سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چار سو افراد ہلاک ہو گئے۔ اس حادثے کی ذمہ داری فوری طور پر ساواک پر ڈال دی گئی اور جنازے میں دس ہزار افراد شریک ہوئے' جو نعرے لگا رہے تھے ''شاہ مردہ باد! شاہ کو جلا دو!'' واشنگٹن' لاس اینجلس اور ہیگ میں ایرانی طالب علموں نے بڑے بڑے مظاہرے کیے۔ شاہ نے مزید رعایتیں دے دیں: مجلس میں مباحثوں پر سے پابندی اٹھا لی گئی' منظم مظاہروں کی اجازت دے دی گئی' بعض جوا خانے بند کر دیے گئے اور اسلامی تقویم بحال کر دی گئی۔

لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ رمضان کے آخری ہفتے کے دوران چودہ ایرانی شہروں میں مظاہرے ہوئے' جن میں پچاس سے سو کے درمیان افراد ہلاک ہو گئے۔ 4 ستمبر کو' ماہ رمضان کے آخری دن' تہران میں ایک بہت بڑا پرامن مظاہرہ ہوا۔ لوگوں نے سڑکوں پر نماز ادا کی اور سپاہیوں کو پھول پیش کیے۔ فوج اور پولیس نے پہلی مرتبہ گولیاں نہیں چلائیں اور ایک انتہائی اہم پیشرفت یہ ہوئی کہ درمیانی طبقہ بھی مظاہروں میں شامل ہونا شروع ہو گیا۔ ''آزادی!'' اور ''اسلامی حکومت!'' کے نعرے لگاتے ہوئے ایک چھوٹے سے جلوس نے رہائشی علاقوں کی گلیوں میں چکر لگایا۔ 7 ستمبر کو شمالی تہران سے ایک بہت بڑا جلوس پارلیمنٹ کی عمارت تک نکالا گیا' جس میں شرکت کرنے والوں نے خمینی اور علی شریعتی کی بڑی بڑی تصویریں اٹھا رکھی تھیں اور وہ پہلوی حکومت کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے لیے نعرے لگا رہے تھے۔ علی شریعتی' بازرگان اور بنی صدر جیسے دانشوروں نے مغربی تعلیم یافتہ اشرافیہ کو ممکنہ اشرافیہ کو ممکنہ جدید اسلامی حکومت کے لیے تیار کر دیا تھا۔ حالانکہ ان کے خیالات خمینی سے مختلف تھے' تاہم درمیانے طبقے کے لبرل دیکھ سکتے تھے کہ خمینی کو بہت زیادہ عوامی حمایت حاصل ہو چکی ہے اور وہ شاہ سے نجات پانے کے لیے ان کے ساتھ ملنے کو تیار تھے۔ سیکولر حکومت ایران میں تباہ کن ثابت ہوئی تھی اور وہ کسی مختلف شے کو آزمانے کے لیے آمادہ تھے۔

جب شاہ کو درمیانے طبقے نے چھوڑ دیا تو پھر اس کے لیے کچھ نہیں بچا اور اسے خطرے کا ضرور پتا چل گیا ہو گا۔ جمعہ 8 ستمبر چھ بجے صبح مارشل لا لگا دیا گیا اور تمام بڑے اجتماعات پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن ایک پرامن جلوس کے لیے اکٹھے ہونے والے بیس ہزار افراد کو اس کا علم نہیں تھا جب انہوں نے منتشر ہونے سے انکار کیا تو فوجیوں نے فائر کھول دیا اور تقریباً نو سو افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس قتل عام کے بعد مشتعل ہجوم گلیوں میں بکھر گیا' رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں اور عمارتوں کو آگ لگا دی گئی' جبکہ اس دوران فوجی اپنے ٹینکوں سے ان پر گولیاں برساتے رہے۔ 10 ستمبر بروز اتوار صبح 8 بجے صدر کارٹر نے کیمپ ڈیوڈ سے شاہ کو فون

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر کے اپنی حمایت کی یقین دہانی کروائی اور چند گھنٹوں بعد وائٹ ہاؤس نے اس فون کال کی تصدیق کی' امریکہ اور ایران کے مابین خصوصی تعلقات کا اقرار کیا اور اطلاع دی کہ صدر کو تہران میں انسانی جانوں کے زیاں کا دکھ تو ہے تاہم انہوں نے امید ظاہر کی ہے کہ شاہ نے سیاسی آزادی کے جس عمل کو حال ہی میں شروع کیا تھا' وہ جاری رہے گا۔

لیکن اس قتل عام کے بعد شیطان بزرگ کی مدد بھی شاہ کو نہیں بچا سکی۔ اب تیل کے کارکنوں نے ہڑتال کر دی اور اکتوبر کے اواخر تک پیداوار گزشتہ سطح سے 28 فیصد تک کم ہو گئی۔ ان حالیہ برسوں میں خاموشی اختیار کر لینے والے گوریلا گروپوں نے فوجی افسروں اور حکومتی وزراء پر حملے دوبارہ شروع کروائے۔ 4 نومبر کو طالب علموں نے تہران یونیورسٹی کے صدر دروازے پر نصب شاہ کا مجسمہ گرا دیا۔ 5 نومبر کو بازار بند تھے اور طلباء نے برطانوی سفارت خانے' بہت سی امریکی ایئرلائنوں کے دفاتر' سینماؤں اور شراب خانوں پر حملے کئے۔ اس مرتبہ فوج نے کوئی مداخلت نہیں کی۔

اس وقت تک عراقی حکومت تہران کے دباؤ کے تحت خمینی کو نجف سے شہر بدر کر چکی تھی اور انہوں نے پیرس میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ حال ہی میں بحال ہونے والے قومی محاذ کا ایک وفد پیرس میں ان سے ملا' جس نے ایک بیان جاری کیا کہ وہ اور خمینی اس امر پر متفق ہیں کہ 1906ء کا آئین بحال کیا جائے۔ 2 دسمبر کو محرم آ گیا۔ خمینی نے حکم دیا کہ اس مرتبہ روایتی ماتمی جلوس نکالنے کی بجائے حکومت کے خلاف مظاہرے کیے جائیں۔ محرم کی پہلی تین راتوں میں لوگ کفن اٹھائے کرفیو توڑتے ہوئے گلیوں میں دوڑنے بھاگنے لگے۔ دیگر چھتوں سے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے شاہ کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ بی بی سی نے دعویٰ کیا کہ صرف ان دنوں میں پولیس اور فوج نے نو سو افراد کو ہلاک کر دیا۔ 8 دسمبر کو چھ ہزار افراد جنوبی تہران میں بہشت زہرا قبرستان میں اکٹھے ہو گئے' یہاں اکثر انقلابی شہداء کو دفن کیا گیا تھا' لوگ ''شاہ مردہ باد!'' کے نعرے لگاتے رہے۔ اصفہان میں بیس ہزار لوگوں نے جلوس نکالا اور پھر بینکوں' سینماؤں اور امریکی ٹیکنیشنوں کے فلیٹوں پر حملہ کر دیا۔ 9 دسمبر کو' عاشورہ کی شام آیت اللہ طالقانی نے' جو ابھی جیل سے رہا ہوئے ہی تھے' ایک عظیم الشان پرامن جلوس کی قیادت کی' جو تہران کی سڑکوں پر چھ گھنٹے گزرتا رہا' اس میں تین سے پندرہ لاکھ کے درمیان لوگوں نے شرکت کی۔ تبریز' قم' اصفہان اور مشہد میں پرامن مظاہرے ہوئے۔

عاشورہ کے دن تہران میں پہلے سے بڑا جلوس نکلا جو آٹھ گھنٹے تک سڑکوں سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گزرتا رہا' اس میں تقریباً بیس لاکھ افراد نے شرکت کی۔ مظاہرین نے سبز' سرخ اور سیاہ پرچم (بالترتیب اسلام' شہادت اور شیعوں کی علامت) اور بینر اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا ''ہم ایران کے آمر کو قتل کر دیں گے!'' اور ''ہم ایران میں یانکی پاور (امریکہ) کو تباہ کر دیں گے!'' یہ اعتماد بڑھتا جا رہا تھا کہ ایران کے عوام' جو پہلے کبھی اس قدر متحد نہیں ہوئے تھے' پہلوی ریاست سے نجات پالیں گے۔ مظاہرے کے اختتام پر ایک قرارداد منظور کی گئی: خمینی کو ایران کا نیا قائد بننے کی دعوت دی گئی تھی اور ایرانیوں کو شاہ کا تخت الٹنے تک متحد رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔

تین دن بعد فوج نے شاہ کے حق میں مظاہرے کروانے کی کوشش کی اور فوج اور انقلابیوں میں تصادم مزید تشدد آمیز ہو گئے۔ شاہ نے آخری کوشش کرتے ہوئے ایک معروف لبرل شاہ پور بختیار کو آئینی حکومت بنانے کے لیے تفویض کیا۔ شاہ نے وعدہ کیا کہ وہ ساواک کو ختم' سیاسی قیدیوں کو رہا اور اپنی معاشی اور خارجی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ لیکن یہ اقدام بھی ایک سال دیر سے کیا گیا تھا' لوگوں نے ایسے بہت سے وعدے سنے تھے' اور انہیں اب کوئی اعتبار نہیں رہا تھا۔ خمینی نے قم کے قتل عام کا سوگ منانے کے لیے 30 دسمبر کی تاریخ کا اعلان کر دیا۔ مشہد' تہران اور قاذرین میں مزید ہلاکتیں ہوئیں۔ ان تازہ شہداء کی تصویریں خمینی کے پوسٹروں کے ساتھ لگا دی گئیں۔ 23 دسمبر کو' جب فوجیوں نے مشہد میں خمینی کی تصویریں پھاڑ دی تھیں' ہنگامہ بپا ہو گیا اور بارہ افراد ہلاک ہو گئے۔ ہجوم فوری طور پر اس جگہ اکٹھا ہو گیا اور فوجیوں کی طرف بڑھنے لگا' نوجوان آگے آگے تھے' جو اپنی جانیں قربان کر دینے پر راضی تھے۔ فوجی پسپا ہونا شروع ہو گئی' فوجیوں نے لوگوں کو روکنے کے لیے زمین پر گولیاں چلائیں۔ اگلے روز ہزاروں لوگ ہلاکتوں پر احتجاج کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔

جنوری کے وسط تک یہ سب تمام ہو گیا۔ وزیراعظم شاہ پور بختیار نے شاہ کی رخصتی کے لیے مذاکرات کیے۔ شاہی خاندان مصر چلا گیا' جہاں سادات نے ان کا خیر مقدم کیا۔ شاہ پور بختیار نے سیاسی قیدیوں کو آزاد' ساواک کو ختم' اسرائیل اور جنوبی افریقہ کو تیل دینے سے انکار اور تمام غیر ملکی معاہدوں پر نظر ثانی کے احکامات دے کر نیز فوجی مصارف میں بہت زیادہ کمی کر کے انقلاب کو روکنے کی کوشش کی لیکن بہت دیر ہو چکی۔ لوگ اس شخص کی واپسی کا پرزور مطالبہ کر رہے تھے جسے وہ امام کہتے تھے اور 11 فروری 1979ء کو شاہ پور بختیار خمینی کو واپسی کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خمینی کی واپسی:

خمینی کی تہران میں آمد ان علامتی واقعات میں سے ایک تھی' جو ایسے لگتے ہیں کہ دنیا کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیں گے۔ ایران کے اندر اور باہر موجود سیکولروں کے لیے وہ ایک تاریک لمحہ تھا' عقلیت پر توہم کی فتح۔ لیکن مسلمانوں' شیعوں کے ساتھ ساتھ سنیوں کے لیے' جو کہ طویل عرصے سے اسلام کی فنا کے خوف کا شکار تھے' یہ ایک درخشاں لمحہ تھا۔ بعض ایرانی شیعوں کو تو خمینی کی واپسی معجزہ دکھائی دیتی تھی۔ جب ان کی کار تہران کی سڑکوں سے گزری تو ''امام خمینی'' کے نعرے لگاتا ہوا ہجوم پراعتماد تھا کہ عدل کا ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے۔ معتبر مجتہد' مثلاً آیت اللہ شریعت مداری' امام کے خطاب کو اس طرح استعمال کرنے پر برافروختہ تھے اور یہ بات سختی سے سرکاری سطح پر کہی گئی کہ خمینی امام غائب نہیں ہیں۔ تاہم سرکاری موقف جو کچھ بھی ہو لاکھوں ایرانی عوام کے لیے تو خمینی اپنی وفات کے دن تک امام ہی رہے۔

خمینی کی واپسی سے فوری پہلے طہ حجازی نے ایک نظم شائع کروائی' جو بے شمار ایرانیوں کی توقعات کی عکاسی کرتی تھی: ''جس روز امام واپس آیا'' میں آفاقی اخوت کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ شاعر نے کہا کہ اب کوئی جھوٹ نہیں بولے گا' چوروں کے ڈر سے دروازے مقفل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی' سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھائیں گے:

امام کو ضرور واپس آنا چاہیے.....
تاکہ حق تخت نشین ہو سکے تاکہ زمانے سے شر' دھوکا اور نفرت مٹ جائیں۔
جب امام واپس آئیں گے' تو ایران ..... یہ شکستہ' زخمی ماں..... ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے آزاد ہو جائے گی۔ جبر اور جہالت کے طوق سے اور فریب' تشدد
اور قید خانوں کی زنجیروں سے۔

امریکہ میں بنیاد پرستی کا احیاء:

امریکہ میں 1970ء کی دہائی میں بنیاد پرستی کا احیاء کم ڈرامائی تھا۔ امریکی پروٹسٹنٹوں کو ایسے انتہائی اقدام کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ تو وہ یہودیوں کی طرح ہولوکاسٹ کی یادوں سے خوفزدہ تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی طرح سیاسی اور معاشی جبر کا شکار تھے۔ وہ تو جدید سیکولر کلچر سے بیگانگی محسوس کرتے تھے تاہم کم از کم ان کے رہنما خوشحال اور کامیابی سے لطف اندوز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتے تھے۔ آگے چل کر یہی ان کا ایک مسئلہ ثابت ہوا۔ پروٹسٹنٹ بنیاد پرست اس امر سے آگاہ ہونے کے باوجود کہ وہ امریکہ میں پردیسی ہیں' امریکہ کو دیس ہی سمجھتے تھے۔ امریکہ میں جمہوریت راسخ ہو چکی تھی اور وہ انتقامی کارروائی سے ڈرے بغیر اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کر سکتے تھے اور اپنے کاز کو بڑھانے کے لیے جمہوری اداروں کو استعمال کر سکتے تھے۔ تاہم 1970ء کی دہائی میں بنیاد پرست محسوس کرنے لگے تھے کہ پچاس برس سے معاشرے سے کنارہ کش رہنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہنے کے بعد اب انہیں سیاسی طور پر فعال ہونا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ انہیں امریکہ کو واپس لانے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ ایک ٹھوس ایوانجیلیکل حلقہ خاندانی اقدار' اسقاط حمل اور مذہبی تعلیم جیسے مسائل پر متحرک ہو سکتا تھا۔ پرانے خوف تو موجود تھے لیکن ایک نیا اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔

اس تازہ بنیاد پرستی کی علامت ''مورل میجارٹی'' (Moral Majority) تھی' جو 1979ء میں جیری فالویل کی قیادت میں قائم ہوئی تھی۔ مورل میجارٹی نے خود کو بنیاد پرستوں تک ہی محدود نہیں رکھا۔ اس کے رہنما اخلاقی اور سیاسی مسائل پر مشترک خیالات کے حامل دوسرے لوگوں سے تعاون کرنا اور امریکہ کے تمام قدامت پسندوں کے لیے ایک فورم تخلیق کرنا چاہتے تھے۔ اگر نیا گروپ اہم اثر قائم کرنا چاہتا تھا تو اسے ہم خیال رومن کیتھولکوں' پینٹی کوسٹلسٹوں' مورمنوں' یہودیوں اور سیکولروں کی مدد مطلوب تھی' کیونکہ ایوانجیلیکل پروٹسٹنٹ امریکہ کی آبادی میں صرف 15 سے 20 فیصد ہی تھے۔ بنیاد پرست عملیت پسندانہ محرکات کے تحت حرکت میں آ کر محسوس کرتے تھے کہ انہیں اپنی علیحدگی پسندی ترک کرنا ہوگی' اپنے علاقوں سے نکلنا اور جدید زندگی کی تکثیریت کو قبول کرنا ہوگا۔ یہ امر قیادت سے عیاں تھا۔ فالویل' لیبے' ڈکسن اور باب بلنکنن بنیاد پرست تھے جبکہ پال ویریچ یہودی اور ہاورڈ فلپس اور رچرڈ وگنیری کیتھولک تھے۔ اس تکثیریت کی وجہ سے انہیں بعض عیسائی بنیاد پرستوں کی حمایت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مثال کے طور پر باب جونز دوم نے فالویل کو ''امریکہ کا سب سے زیادہ خطرناک انسان'' کہا۔ تاہم مورل میجارٹی کو زیادہ حمایت پروٹسٹنٹوں ہی کی حاصل رہی۔ اسے جنوب میں عوامی ہمدردی حاصل تھی جبکہ ڈبلیو اے ایس پی (WASP) کے حلقوں سے باہر تحریک کی پذیرائی کم کم تھی۔ قدامت پسند کیتھولک اسقاط حمل' ہم جنس پرستانہ حقوق اور آزاد سکولوں کے لیے ٹیکس سہولیات کے حوالے سے مورل میجارٹی کے موقف کی تائید کر سکتے تھے تاہم وہ رومن کیتھولک ازم سے بنیاد پرستوں کی روایتی نفرت کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اسی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح یہودی' سیاہ فام' بپٹسٹ اور پینٹی کوسٹلسٹ تحریک کے کچھ انتہائی نمایاں رہنماؤں اور سرپرستوں کی نسل پرستی سے نفور ہو سکتے تھے۔ مثال کے طور پر سینیٹر جیسی ہیمز شہری حقوق کی تحریک کا سرگرم مخالف تھا۔

مورل میجارٹی کا پیغام نیا نہیں تھا۔ اس نے لبرل ایسٹیبلشمنٹ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تھا اور وہ امریکہ کے مستقبل کے لیے مصروف جنگ تھی۔ اس کے اراکین کا عقیدہ تھا کہ امریکہ کی تہذیب کو لازماً مذہبی ہونا چاہیے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ایسٹ کوسٹ میں مرتکز ایک سیکولر اشرافیہ سیاسی اور ثقافتی زندگی پر غالب آ گئی تھی۔ یہ لبرل جیری فالویل کے بقول ''ایک غیر اخلاقی اقلیت'' بن گئے تھے۔ قدامت پسندوں کو چاہیے کہ خود کو ایک ردعمل کرنے والا اور الگ تھلگ گروپ نہ سمجھیں۔ حقیقت میں تو وہ اکثریت کی ترجمانی کرتے ہیں اور انہیں روایتی اقدار کے تحفظ کے لیے جنگ وغیرہ ضرور کرنی چاہیے۔ ٹم لیہے نے دعویٰ کیا ''ہم لاکھوں میں ہیں ــــ اور وہ محض مٹھی بھر ہیں''۔ پیٹ رابرٹسن نے کہا ''ہم پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کے پاس مل کر اتنے ووٹ ہیں کہ ہم اس ملک کو چلا سکتے ہیں''۔

1970ء کے عشرے کے اواخر اور 1980 کے عشرے کے اوائل میں بعض بنیاد پرستوں نے پرانی پری ملینیل قنوطیت کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ ساری دنیا کا مقدر بربادی ہے تاہم عیسائیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کو ایونجلائز (Evangelize) کریں' انجیل کو پھیلائیں اور جتنے زیادہ لوگوں تک ممکن ہو اسے پہنچانے کی کوشش کریں۔ اگر عیسائیوں نے اقدام کیا تو امریکہ کو خوشی سے پہلے عارضی مہلت مل جائے گی۔

بنیاد پرست' جو جلد ہی ''نیو کرسچین رائٹ'' (New Christian Right) مشہور ہو گئے' پچاس برس کی خاموشی کے بعد جارحیت پر اترے تھے' یہ نئے عسکریت پسند عیسائی اسقاط حمل' ہم جنس پرستوں کے حقوق اور منشیات کے خلاف تھے۔ وہ سوویت یونین کے ساتھ کسی دیتانت (De Tente) کے سختی سے مخالف تھے جسے انہوں نے ہمیشہ ایک شیطانی سلطنت تصور کیا تھا۔ ٹیلی ویجلسٹ جیمز رابسن کے بقول ''(حضرت عیسیٰؑ کی) واپسی سے پہلے امن کی ہر کوشش بدعت ہے..... یہ خداوند کے کلام کے خلاف ہے' یہ اینٹی کرائسٹ ہے''۔ مورل میجارٹی اور نیو کرسچین رائٹ کا ایجنڈا استرداد پسندانہ تھا' امریکہ پر غالب آنے کے لیے تیار کھڑے شر کے خلاف ایک کروسیڈ۔

بعد ازاں جنسیت پر دیا جانے والا زور اہمیت کا حامل تھا۔ نیو کرسچین رائٹ اسلام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسندوں کی طرح عورت کی حیثیت کے بارے میں متفکر تھا' تاہم ان کا وژن بہت زیادہ خوف سے لبریز تھا۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک بنیاد پرست مرد وزن کو یکساں طور پر دہشت سے بھر دیتی تھی۔ مورل میجارٹی کے ایک رومن کیتھولک رہنما فلس سکلیفلی نے ''نسائیت پسندی'' (Feminism) کو ایک ''مرض'' قرار دیا جو دنیا کی تمام خرابیوں کا سبب تھا۔ مساوی حقوق کی مجوزہ ترمیم زیادہ ٹیکس عائد کرنے' سوویت طرز کی نرسریاں بنانے اور ''ہماری زندگی کے باقیماندہ پہلوؤں کی فیڈرلائزشن (Federalization)'' کرنے کی حکومتی سازش ہے۔ بیورلے لیہے کے نزدیک نسائیت پسندی ''بیماری سے بھی زیادہ بری'' تھی' مارکسی اور ہیومنسٹ تعلیمات پر استوار ''یہ موت کا فلسفہ ہے..... ریڈیکل نسائیت پسند خود کو تباہ کرنے والے ہیں اور ایک پوری تہذیب کی موت کا سامان کر رہے ہیں''۔ یہ عیسائی عورتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مردوں کو دوبارہ مرکزیت دلوائیں اور عورتیں اپنے آپ کو ایثار و قربانی کا مجسمہ بنائیں۔ ''ہمارے معاشرے کو بچانا'' اور تہذیب اور انسانیت کو اکیسویں صدی میں لے جانا ان کا فرض ہے۔ وہ اپنے معاشرے کے اتحاد اور حد تو یہ ہے کہ بقا کو بھی عورتوں کی روایتی حیثیت سے جوڑتے تھے۔

پروٹسٹنٹ بنیاد پرست اور عیسائی قدامت پسند اپنے آپ کو سیکولر ہیومنزم کی شیطانی قوتوں کے سامنے نامرد محسوس کرتے تھے۔ وہ مردانہ بانجھ پن کے حوالے سے بہت متفکر لگتے تھے۔ ٹم اور بیورلے لیہے نے

The Act of Marriage: The Beauty of Sexual Love (1976ء) میں نوحہ خوانی کرتے ہوئے لکھا کہ جدید آدمی ''پہلے کی نسبت اپنی قوت مردی کے بارے میں کم تیقن رکھتے ہیں''۔ یہ ان کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی جنسی کتاب ہے۔ انہوں نے کہا مرد بانجھ جنسی طور پر پریشان' اپنی بیوی کو مطمئن کرنے یا دوسرے آدمیوں کے مقابلے میں اپنی کارکردگی کے حوالے سے متفکر ہیں۔ اس کا سبب عورتوں کا نیا اثبات ذات تھا' حد تو یہ تھی کہ بنیاد پرست عورتیں بھی اس کلچرل وائرس کا شکار ہو گئی تھیں' نتیجتاً مرد یا تو ''زنانے'' یا ''ہیجڑے'' ہو گئے تھے۔ بنیاد پرستوں کی ہم جنس پرستوں سے نفرت کی تہہ میں بھی یہی خوف تھا' وہ انہیں بھی نسائیت پسندی کی طرح ایک وبا' امریکہ کے زوال کا سبب تصور کرتے تھے۔ ہم جنس پرستی کے خلاف اپنے ٹیلی ویژن پروگرام میں ہم جنس پرستوں پر زہریلی تنقید کی وجہ سے مشہور جیمز رابسن گرجا ''یہ اعلیٰ ترین نظام سے انحراف ہے۔ یہ خداوند کے خلاف ہے' خداوند کے کلام'

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرے اور فطرت کے خلاف ہے۔ یہ اتنی گھناؤنی ہے کہ اسے سوچا یا بیان بھی نہیں کیا جا سکتا''۔ بنیاد پرستوں کا یہ خیال تھا کہ ہم جنس پرستی ناکام گھرانوں کا نتیجہ بھی ہے' جو کہ ''سیکولر ہیومنزم'' کا شکار ہو چکے تھے۔ خاندانی اقدار پر لکھنے والے بنیاد پرست لوگ بہت مشترکہ طور پر ایقان کے حامل تھے کہ امریکہ کو حقیقی انسان کی ضرورت ہے۔ تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ بنیاد پرست نے خود عیسائیت کے نامردانہ رجحان کے حوالے سے اپنی فکر کو دفنا چکے تھے' جو کہ ایک زنانہ اقدار والا مذہب بن چکی تھی: معافی' رحم اور نزاکت۔

نیو کرسچین رائٹ کی فعالیت کسی حد تک بنیادی خوف سے ابھری تھی۔ بنیاد پرست اپنے آپ کو نامرد اور جڑ سے کٹے ہوئے محسوس کرتے تھے۔ ان کا نظریہ تبدیل نہیں ہوا تھا' تاہم اب انہوں نے اپنے لوگوں کو سیاسی طور پر فعال کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مورل میجارٹی کے نیٹ ورک نے دوسری سیاسی مہمیں چلانے والی تحریکوں کی طرح کام کرنا شروع کیا۔ ان کا بنیادی کام یہ تھا کہ اپنے اراکین کے ووٹ درج ہونے کو یقینی بنایا جائے اور انہیں ووٹ درست طریقے سے ڈالنا سکھایا جائے۔ اگلی دہائی کے دوران عسکریت پسندوں نے مرکزی دھارے کے اداروں میں پہنچنا شروع کر دیا۔ 1986ء میں تو پیٹ رابرٹسن نے صدارت کے لیے انتخاب لڑا۔ کچھ سیاستدانوں کے لیے عیسائی مسئلہ بننے لگے تھے۔ اب عیسائی کارکنوں نے اسلحہ کے قوانین' اسقاط حمل کے کلینکوں کے لیے رقومات یا مساوی حقوق کی ترمیم کے لیے ''غلط'' انداز سے ووٹ دینے والے امیدواروں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ دفاع' سکول میں عبادت یا ہم جنس پرستوں کے حقوق کے حوالے سے غلط خیالات کا حامل ہونا خاندانی دشمنی' امریکہ دشمنی اور خداوند دشمنی قرار پائی۔

پہلے پہل تو بنیاد پرست کارکنوں نے اناڑی پن کا مظاہرہ کیا' تاہم رفتہ رفتہ وہ جدید سیاسی کھیل کھیلنا سیکھ گئے۔ وہ مبلغ اور ٹیلی ویژن کے پیش کار تھے اور فطری سیاستدان نہیں تھے' تاہم انہوں نے کچھ کامیابی ضرور حاصل کر لی۔ ان کی سب سے زیادہ نمایاں کامیابی مساوی حقوق کی ترمیم کو روکنا تھی۔ اس ترمیم کے لیے دو تہائی اکثریت حاصل کرنے کے لیے اڑتیس ریاستوں کا ووٹ دینا ضروری تھا اور 1973ء تک تیس ریاستوں نے اس کے لیے ووٹ دیا تھا۔ لیکن فلس سکلیفلی اور کرسچین رائٹ کے مقامی کارکنوں کے مہم چلانے کی وجہ سے ترمیم کی رفتار کو سست کر دیا: نبراسکا' ٹینیسی' کینٹکی' انڈیانا اور ساؤتھ ڈکوٹا سب نے اپنی سابقہ رضامندی کو واپس لے لیا۔ ارکنساس اور لوئیسیانا میں قانون منظور ہوئے جن میں یقین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دہائی کروائی گئی تھی کہ سکول کے نصاب میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے ساتھ ساتھ بائبل کی کتاب پیدائش کی لفظی تعلیمات بھی دی جائیں گی۔ تاہم وہ سکولوں میں عبادت اور اسقاطِ حمل جیسے مسائل پر ریاستی یا وفاقی سطح پر قانون تبدیل نہیں کروا سکے۔ لیکن اس ظاہری ناکامیابی سے عیسائی کارکن فکرمند نہیں تھے' ان کا کہنا تھا کہ ان کا طویل المیعاد مقصد کانگرس کے دونوں ایوانوں میں کٹر قدامت پسندوں کو اکثریت دلوانا ہے۔ جب ایک مرتبہ یہ مقصد حاصل ہو گیا تو وہ جو اصلاحات کرنا چاہتے ہیں' معمول کے تحت ہو جائیں گی۔

زیرِنظر کتاب لکھتے وقت تک' جبکہ مورل میجارٹی کو اس قسم کا سیاسی عمل شروع کیے بیس سال گزر چکے ہیں' اس کے طویل المیعاد اثر کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ حالات و واقعات اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ بنیاد پرستوں کے اقدامات کے الٹ نتائج نکلے ہیں' جیسا کہ بل کلنٹن اور مونیکا لیونسکی کے معاملے میں ہوا۔ صدر کلنٹن کو' بنیاد پرستوں کی تنقید اور سیاست میں نجی معاملات کو لانے کے ردِعمل میں لبرل لوگوں کی تائید مل گئی۔

قومی سیاست سے قطع نظر یہ بھی سچ ہے کہ کرسچین رائٹ نے 1970ء کی دہائی اور 1980ء کی دہائی میں مقامی سطح پر زبردست کامیابیاں حاصل کیں۔ انہوں نے مقامی سطح پر اپنی سخت گیر پالیسیاں نافذ بھی کیں۔ جنوری 1982ء میں سینٹ ڈیوڈز' ایریزونا کے مقامی عیسائیوں نے سکولوں میں ولیم گولڈنگ' جان سٹائن بیک' جوزف کونراڈ اور مارک ٹوین کی کتابوں پر پابندی لگوا دی۔ بعض ریاستوں میں نصابی کتابوں کے پبلشروں نے اپنے نقصان کے ڈر سے ان عبارتوں کو کتابوں سے نکلوا دیا جن پر کرسچین رائٹ نے اعتراض کیا تھا۔

بنیاد پرستوں نے ان مہمات کے ذریعے جدید کلچر کے حوالے سے اپنی طویل عرصے سے چلی آ رہی فکرمندیوں کو عیاں کر دیا: نوآبادی بننے کا خوف' ماہرین' عدم تیقن' غیرملکی اثرات' سائنس اور جنس کا خوف۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ امریکہ کو سفید فام اور پروٹسٹنٹ ہی بننا ہے۔ یہودی اور مسلمان بنیاد پرستوں کی طرح مورل میجارٹی کے عیسائی بھی تقدیس کے علاقے کو وسیع کرنے' سیکولر نظام کی پیشرفت کو محدود کرنے اور الوہیت کو دوبارہ غلبہ دلانے کے لیے لڑ رہے تھے۔ کرسچین رائٹ کی فتوحات خواہ کتنی ہی چھوٹی اور غیر اہم ہوں' تاہم انہوں نے سیاسی اکھاڑے میں پاؤں جمانا سیکھ لیا۔

لبرلوں نے اپنی تنظیمیں بنانا اور جوابی حملے کرنا شروع کر دیے۔ بعض بنیاد پرستوں کو یقین تھا کہ ان کے رہنما فروخت ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر 1982ء میں فالویل نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسقاطِ حمل کو مکمل طور پر ختم کروانے کی مہم چلانے کی بجائے اسے محدود کرنے کا عملیت پسندانہ مطالبہ کیا۔ پیٹ رابرٹسن نے اپنی صدارتی مہم کے دوران مرکزی دھارے کے فرقوں کے بارے میں نرم انداز میں بات کی حالانکہ بنیاد پرست آرتھوڈوکسی مطالبہ کرتی ہے کہ کافروں کے چرچوں کو ہر دستیاب موقع پر حملوں کا نشانہ بنایا جائے۔

پروٹسٹنٹ احیاء کے ان ابتدائی برسوں میں فالویل اور رابرٹسن دونوں ہی نے جان لیا کہ جدید سیاست مصالحت کی متقاضی ہے۔ مطلق پالیسیاں جمہوری میدان میں کام نہیں آتیں، جہاں اقتدار کے لیے مسابقت میں سودے بازی بھی ہوتی ہے اور مخالفوں کو بھی گنجائش دی جاتی ہے۔ گزشتہ بیس برسوں میں اس مسئلے کے بعض حل پیش کیے گئے ہیں جو کہ خود مذہب کے لیے شکست ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دہم

بنیاد پرستی کی شکست؟

(1979-90ء)

مذہب چلا ہوا کارتوس نہیں ہے:

بنیاد پرستانہ جنگی فتوحات نے ثابت کر دیا کہ مذہب چلا ہوا کارتوس نہیں ہے۔ اب کسی کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں' جیسا کہ ایک اشتعال زدہ امریکی سرکاری افسر نے ایرانی انقلاب کے بعد کہا تھا: ''مذہب کو کسی نے کب سنجیدگی سے لیا ہے؟'' بنیاد پرست عقیدے کو تاریکی سے نکال لائے اور انہوں نے دکھا دیا کہ وہ جدید معاشرے میں بہت بڑے حلقے کو متاثر کر سکتا ہے۔ ان کی فتوحات نے سیکولروں کے تو چھکے چھڑا دیئے تھے' کیونکہ وہ روشن خیالی کے دور کا نمائشی' نجی عقیدہ نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جدیدیت کی مقدس اقدار کو رد کر رہا ہے۔ 1970ء کی دہائی کے مذہبی حملے نے ثابت کر دیا تھا کہ معاشرے دو قطبین میں بٹ چکے تھے۔ بیسویں صدی کے اختتام تک یہ واضح ہو گیا تھا کہ مذہبی اور سیکولر لوگوں میں تقسیم زیادہ رونما ہو چکی ہے۔ وہ نہ تو ایک دوسرے کی زبان بول سکتے تھے اور نہ ہی ان کے وژن مشترک تھے۔ خالصتاً عقلی نقطۂ نظر سے بنیاد پرستی ایک تباہی تھی۔ لیکن چونکہ یہ بنیاد پرستوں کے بقول سائنسی عقلیت پسندی کی بے جواز اجارہ داری کے خلاف بغاوت تھی' اس لیے مذکورہ سوچ حیرت ناک نہیں تھی۔ ہمیں ان بنیاد پرستیوں (Fundamentalisms) کو کس طرح مذہبی تحریکوں کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے؟ یہ جدید اور مابعد جدید دنیا میں مذہب کو درپیش مخصوص چیلنجوں کے حوالے سے ہمیں کیا آگاہی دے سکتی ہیں؟ کیا بنیاد پرستانہ فتوحات درحقیقت مذہب کی شکست ہیں اور کیا بنیاد پرستانہ خطرہ دب گیا ہے؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایران کا اسلامی انقلاب ان لوگوں کے لیے بالخصوص پریشان کن تھا' جو اب بھی روشن خیالی کے اصولوں سے وابستہ تھے۔ انقلابوں کے بارے میں تصور کیا جاتا تھا کہ وہ اس وقت رونما ہوتے ہیں جب مادی اقلیم نیا وقار حاصل کر چکی ہوتی ہے اور مذہب کی اساطیری تعلیم سے آزادی کا اعلان کرنے والی ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہنا ایرنڈ نے اپنی معروف کتاب On Revolution(1963ء) میں توضیح کرتے ہوئے لکھا تھا: ''یہ حتمی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جسے ہم انقلاب کہتے ہیں' وہ ایک عبوری دور ہوتا ہے' جس کے بطن سے ایک نئی سیکولر اقلیم جنم لیتی ہے۔'' ایک تھیوکریٹک (Theocratic) ریاست میں عوامی ابھار ایک انوکھا تصور لگتا تھا' مسلمہ مغربی دانش کے ظاہری بے تصنع استرداد کے حوالے سے تو تقریباً ندامت انگیز۔ انقلابِ ایران کے فوری بعد کسی شخص کو توقع نہیں تھی کہ خمینی کی حکومت باقی رہ سکے گی۔ مذہبی انقلاب کا تصور ہی' جدید اسلامی حکومت کی طرح' تضادات کا امتزاج لگتا تھا۔

ایران: انقلاب کے بعد

تاہم مغرب والوں کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی تھا کہ بیشتر ایرانی اسلامی حکومت کے خواہاں تھے۔ امریکی اور یورپی مبصرین کی توقع کے برخلاف ''معتدل لوگ'' ''پاگل ملاؤں'' کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے نمودار نہیں ہوئے۔ ایسے قوم پرست جو ایران میں ایک سیکولر اور جمہوری ریپبلک قائم کرنا چاہتے تھے انہوں نے انقلاب کے بعد اپنے آپ کو اقلیت میں پایا۔ تاہم اس امر پر اتفاق رائے نہیں تھا کہ ایک اسلامی حکومت کو کیسی صورت اپنانی چاہیے۔ مغربی تعلیم یافتہ دانشور اور علی شریعتی کے پیروکار عام لوگوں کی حکومت چاہتے تھے' جس میں مذہبی پیشواؤں کا محدود اقتدار ہو۔ خمینی کا نیا وزیراعظم مہدی بازرگان چاہتا تھا کہ 1906ء کا آئین بحال کر دیا جائے اور مجتہدوں کی ایک ایسی کونسل قائم کر دی جائے جس کو غیر اسلامی پارلیمانی قانون سازی کو ویٹو کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ قم کے مدرسے خمینی کی ولایت فقیہہ پر زور دیتے تھے' لیکن آیت اللہ شریعت مداری اور آیت اللہ طالقانی قوم پر حکمران مذہبی پیشوا کے تصور کی بھرپور مخالفت کرتے تھے کیونکہ اس سے صدیوں پرانی مقدس شیعی روایت کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ وہ اس قسم کے نظام میں زبردست خطرات مضمر دیکھتے تھے۔ اکتوبر 1979ء تک سنگین تنازعہ کھڑا ہو گیا تھا۔ بازرگان اور شریعت مداری نے خمینی کے پیروکاروں کے بنائے ہوئے آئین پر تنقید کی' جس میں فقیہہ (خمینی) کو اقتدار اعلیٰ سونپا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گیا تھا' جو مسلح افواج کو کنٹرول کرتا اور وزیراعظم کو معزول کر سکتا تھا۔ آئین میں منتخب صدر اور پارلیمنٹ' کابینہ اور شریعت کے خلاف قوانین کو ویٹو کرنے کے اختیار کی حامل بارہ رکنی مجلس بزرگان کے قیام کی بھی دفعات شامل تھیں۔

اس آئین کی مخالفت بہت زیادہ ہوئی۔ بائیں بازو کی گوریلا تحریکیں' ایران کے اندر موجود نسلی اقلیتیں اور بااثر مسلم پیپلز ریپبلکن پارٹی (قائم کردہ آیت اللہ شریعت مداری) سب کے سب اس کے خلاف تھے۔ لبرل اور مغربی تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اپنے خیال کے مطابق اس مذہبی انتہا پسندی پر مایوسی کا شکار ہونے لگا تھا۔ انہیں ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے شاہ کے استبداد سے نجات پانے کے لیے بہادری سے جنگ صرف اس لیے لڑی تھی کہ اپنے آپ کو اسلامی آمریت کا غلام بنا دیں۔ انہوں نے اس بات کو بطور خاص محسوس کیا کہ آئین میں اخبارات اور سیاسی اظہار کی آزادی (جس کے لیے لبرل لوگوں نے پہلوی حکومت سے جنگ لڑی تھی) کی ضمانت تو دی گئی تھی مگر مشروط کر دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی قانون اور عمل میں مداخلت نہیں کریں۔ وزیراعظم بازرگان نے بالخصوص زیادہ نکتہ چینی کی۔ اس نے کبھی خمینی پر تو تنقید نہیں کی' تاہم اس نے مجوزہ آئین میں اپنے دعوے کے مطابق اسلامی انقلاب کے پورے مقصد کی خلاف ورزی کرنے والی دفعات شامل کروانے والے اسلامی انقلابی پارٹی کے مذہبی پیشواؤں پر شدید تنقید کی۔

خمینی کو ایک بحران کا سامنا تھا۔ 3 دسمبر 1979ء کو لوگوں نے مجوزہ آئین پر ایک ریفرنڈم میں ووٹ دینے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ولایت فقیہہ کی شکست یقینی ہے۔ خمینی نے اس مرحلے تک تو عملیت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بائیں بازو والوں' اسلام پسندوں' دانشوروں' قوم پرستوں اور لبرلوں کو پہلوی حکومت کا تختہ الٹنے سے اتحاد بنائے رکھا تھا تاہم 1979ء کے اختتام تک یہ واضح ہو گیا تھا کہ متضادات مقاصد کے حامل ان گروپوں کا اتحاد ٹوٹ جائے گا اور ___ جیسا کہ انہوں نے خود مشاہدہ کیا کہ ___ انقلاب کا مستقبل خطرے میں تھا۔ تب امریکہ نادانستہ طور پر ان کی مدد کے لیے آ گیا۔

امریکہ کو شیطان بزرگ قرار دینے کے باوجود انقلاب کے بعد تہران کی اسلامی حکومت اور امریکی حکومت کے مابین محتاط لیکن درست تعلقات تھے۔ 14 فروری 1979ء کو' خمینی کی ایران واپسی کے تھوڑے عرصے بعد ہی طالب علم دارالحکومت میں واقع امریکی سفارتخانے میں گھس گئے تھے اور اس پر قبضہ جما لیا تھا' تاہم خمینی اور بازرگان نے انہیں فوری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر واپس بلا لیا تھا۔ اس کے باوجود خمینی کو شیطان بزرگ پر بھروسہ نہیں تھا اور انہیں یقین تھا کہ امریکہ ایران میں اپنے مفادات کو محفوظ رکھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ انہیں یقین تھا کہ امریکہ وقت کا انتظار کر رہا ہے اور موقع ملتے ہی وہ نئی اسلامی ریپبلک کے ساتھ وہی کرے گا جو 1953ء میں مصدق کے ساتھ کیا تھا۔ جب 22 اکتوبر 1979ء میں جب سابق شاہ کینسر کے علاج کے لیے نیویارک سٹی پہنچا تو ایسا لگتا تھا خمینی کے خدشات کی توثیق ہو گئی ہے۔ امریکی حکومت کو اس کے اپنے ماہروں اور تہران نے انتباہ کیا کہ وہ سابق شاہ کو قبول نہیں کرے تاہم کارٹر کا ایقان تھا کہ اپنے سابقہ وفادار اتحادی کو اس انسانی خدمت کی فراہمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فوراً ہی خمینی نے شیطان بزرگ پر مزید سخت تنقید کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ محمد رضا پہلوی کو سزا دینے کے لیے ایران کو واپس کیا جائے نیز انہوں نے سابقہ حکومت سے وفادار تمام حکومتوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ایران میں ایسے غدار موجود ہیں' جو اب بھی مغرب پر انحصار کرتے ہیں' انہیں لازماً ملک سے نکال دیا جانا چاہیے۔ یہ بات سمجھنے کے لیے غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں تھی کہ ان کا اہم ہدف وزیراعظم بازرگان تھا اور اس کے ساتھ ساتھ آئین کے تمام مخالف۔ یکم نومبر کو بازرگان الجزائر کے یوم آزادی کی تقریب میں شرکت کے لیے وہاں گیا۔ تقریب میں کارٹر کے نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر زبگنیف برزیزنیسکی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کی تصویر اتار لی گئی۔ بازرگان کو اسلامی انقلابی پارٹی میں اس کے دشمنوں نے امریکہ کا ایجنٹ قرار دے دیا۔ اسی تناؤ زدہ ماحول میں ہی 4 نومبر کو تین ہزار ایرانی طالب علموں نے تہران میں واقع امریکی سفارتخانے پر دھاوا بول دیا تھا اور نوے افراد کو یرغمال بنا لیا تھا۔ پہلے پہل تو یہ تصور کیا گیا کہ خمینی اس مرتبہ بھی طالب علموں کو واپسی کا حکم دیں گے' جیسا کہ انہوں نے پہلے کیا تھا۔ آج تک یہ بات واضح نہیں کہ خمینی کو طلبا کے اس فیصلے کا پیشگی علم تھا یا نہیں۔ بہرصورت تین دن تک انہوں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ تاہم جب بازرگان کو ادراک ہوا کہ اسے سفارتخانہ خالی کروانے میں خمینی کی مدد حاصل نہیں ہو سکتی تو اس نے 6 نومبر کو استعفیٰ دے دیا اور اس کے ساتھ وزیر خارجہ ابراہیم یزدی نے بھی استعفیٰ دے دیا۔۔ خود طلباء کے لیے یہ امر باعث حیرت تھا کہ انہوں نے امریکہ اور ایران کے درمیان ایک بڑا تنازعہ کھڑا کر دیا تھا' انہیں تو یہ توقع تھی کہ ان کا قبضہ چند دن ہی قائم رہے گا۔ خمینی اور اسلامی انقلابی ریپبلک نے طلباء کی بھرپور حمایت کی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عورتوں اور سیاہ فام میرین گارڈز کو رہا کر دیا گیا لیکن باقی باون امریکی سفارتکاروں کو 444 دنوں تک یرغمال رکھا گیا اور یہ واقعہ ایرانی ریڈیکل ازم کی ایک علامت بن گیا۔

یہ واقعہ خمینی کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوا۔ شیطان بزرگ پر توجہ مرکوز ہونے سے انقلاب کے بعد والے پریشان کن دور میں ایرانی خمینی کے پیچھے صف بستہ ہو گئے۔ بازرگان کے استعفیٰ سے آئین کی مخالفت کم ہوگئی۔ دسمبر میں ہونے والے ریفرنڈم میں آئین متاثر کن کثرت رائے سے منظور ہو گیا۔ بعدازاں خمینی نے نئے وزیراعظم بنی صدر سے کہا:

> ''اس اقدام سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ امریکی اسلامی جمہوریہ کو مضبوط ہوتا نہیں دیکھنا چاہتے۔ سفارتخانے پر قبضے کے بعد اسے ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔ ہمارے عوام متحد ہو گئے ہیں۔ ہم انہیں اس وقت تک یرغمال رکھیں گے جب تک اپنا داخلی کام پورا نہیں کر لیتے۔ ہم صدارتی اور پارلیمانی انتخابات کروائیں گے اور اس کے بعد یرغمالیوں کو چھوڑ دیں گے''۔

اس واقعے نے مغربی استعماریت کے خلاف جدوجہد کرنے کی وجہ سے خمینی کو امت کا رہنما بنا دیا۔ ان کی تقریروں میں لفظ ''انقلاب'' بہت اہمیت اختیار کر گیا۔ صرف وہی اس قابل تھے کہ دنیا کی سب سے زیادہ مضبوط استعماری قوت کے خلاف کھڑے ہوں اور اس کی کمزوری کو عیاں کر دیں۔ دوسری طرف داخلی خطروں کا بھی سامنا تھا۔ مئی کے اواخر سے لے کر جولائی 1980ء کے وسط تک چار الگ الگ بغاوتوں پر قابو پایا گیا اور اس سال کے اختتام تک پاسداران انقلاب اور سیکولر گوریلوں کے درمیان مستقلاً خونریزی ہوتی رہی۔ پورے ملک میں ''غیر اسلامی رویوں'' کے حامل افراد مثلاً طوائفوں اور پہلوی حکومت کے سابق عہدیداروں کو قتل کر دیا گیا۔ خمینی نے ایسے واقعات کی مذمت کی اور انہوں نے ان کے ذمہ دار افراد اور انقلابی کونسل نامی تنظیم کو اسلامی قانون کی جڑیں کاٹنے والے قرار دیا۔ تاہم کسی مرکزی حکومت کے خاتمے کے بعد اس قسم کے گروہوں کا ابھرنا انقلاب کی ایک آفاقی خصوصیت ہے۔ انہوں نے آخرکار ان کو اپنا مطیع بنا لیا اور یہ کونسلیں حکومت کا حصہ بن گئیں۔

خمینی کو عراق کے ساتھ جنگ بھی لڑنا پڑی۔ 20 ستمبر 1980ء کو عراق کے صدر صدام حسین کی افواج نے جنوبی ایران پر حملہ کر دیا۔ اسے امریکہ کی تائید حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے خمینی نے جن سماجی اصلاحات کے منصوبے بنائے ہوئے تھے، وہ شروع نہ ہو سکے۔ 20 جنوری 1981ء کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(نئے امریکی صدر رونالڈ ریگن کی صدرات کے پہلے دن) یرغمالیوں کو رہا کر دیا گیا۔

بنیاد پرستی ایک جنگجو عقیدہ ہے اور خود کو اپنی دشمن دنیا میں بقا کی جنگ لڑتا ہوا محسوس کرتی ہے۔ ایران میں شروع شروع میں حکومت کو بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔ ملک میں انقلابی اسلام پسندوں اور سیکولر لوگوں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ 22 جولائی 1981ء کو بنی صدر کو برطرف کر دیا گیا اور وہ پیرس چلے گئے۔ وہ ایک سال تک صدر رہے تھے۔ 28 جون کو خمینی کے ایک بڑے اتحادی مذہبی پیشوا آیت اللہ بہشتی اور اسلامی انقلابی پارٹی کے پچہتر اراکین ایک بم حملے میں ہلاک ہو گئے۔ اس مرحلے تک تو خمینی نے اعلیٰ عہدوں کے لیے عام لوگوں کو ترجیح دی تھی تاہم اب اکتوبر میں انہوں نے حجۃ الاسلام علی خامنہ ای کو صدر بنانے کی اجازت دے دی۔ اب مجلس میں مذہبی پیشوا اکثریت میں تھے۔ 1983ء تک حکومت کی تمام تر سیاسی مخالفت ختم کر دی گئی تھی۔ بنی صدر کے جانے کے بعد مجاہدین خلق زیر زمین چلے گئے تھے' قومی محاذ' قومی جمہوری پارٹی (جس کا رہنما مصدق کا پوتا تھا) اور آیت اللہ شریعت مداری کی مسلم عوامی جمہوری پارٹی بکھر چکی تھیں۔ خمینی نے ''اظہار کی وحدت'' کی بات زیادہ کرنا شروع کر دی۔

مغرب کو اشتعال زدہ کر دینے کے بعد ایران ضروری آلات' اضافی پرزہ جات اور تیکنیکی مشاورت سے محروم ہو گیا۔ 1982ء تک افراط زر بہت زیادہ ہو گئی تھی' اشیائے صرف کی شدید ترین قلت تھی اور بیروزگاری عمومی آبادی کے تیس فیصد سے بڑھ گئی (شہروں میں 50 فیصد)۔ خمینی نے غریبوں کی فلاح کے لیے اپنی سی بہترین کاوشیں کیں۔ انہوں نے پہلویوں کے دور میں مصائب کا شکار لوگوں کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کیا۔ کارخانوں اور ورکشاپوں میں قائم اسلامی تنظیمیں محنت کشوں کو سود سے پاک قرضے دیا کرتی تھیں۔ دیہاتوں میں کسانوں کے لیے نئے گھر تعمیر کرنے کی غرض سے نیز زرعی' صحت عامہ اور فلاحی منصوبوں میں نوجوانوں کو بھرتی کیا گیا۔ تاہم عراق کے ساتھ جنگ نے ان تمام کوششوں کے اثرات محدود کر دیئے تھے۔

خمینی اور علماء میں اختلافات:

خمینی اس امر سے آگاہی رکھتے تھے کہ ایک جدید ریاست کو عوام کی شرکت اور ایک مکمل طور پر نمائندہ حکومت مطلوب ہوتی ہے۔ جیسا کہ مغرب نے اپنے جدید ہونے کے عمل میں یہ جانا تھا کہ ایک صنعتی معاشرے میں اس قسم کا نظام حکومت چل سکتا ہے۔ ولایت فقیہہ کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریہ جدید سیاسی اداروں کو اسلامی معنویت عطا کرنے کی ایک کوشش تھی۔ 1981ء میں مجلس نے بعض اہم اصلاحات اراضی کیں' جو وسائل کی زیادہ منصفانہ تقسیم کی ضمانت تھیں۔ خمینی نے اس اقدام کی تائید کی کیونکہ اس سے عوام کو فائدہ ہوتا۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ جب تک ایران میں ایسی بنیادی اصلاحات نہیں ہوں گی وہ جاگیردارانہ اور زرعی ہی رہے گا اور کسی بھی قسم کی ماڈرنائزیشن سطحی ثابت ہوگی۔ تاہم اصلاح اراضی کا مسودۂ قانون دشواریوں کا شکار ہوگیا۔ آئین کے مطابق ہر قانون کو مجلس بزرگان منظور کیا کرتی تھی' جس کے پاس غیر اسلامی قانون کو رد کرنے کا اختیار تھا۔ جب مسودۂ قانون مجلس بزرگان کے علماء کے سامنے آیا تو انہوں نے اسے ویٹو کر دیا۔ خمینی نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ ''مذہبی پیشواؤں کو ایسے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے' جن کی اہلیت نہیں رکھتے''۔ یہ ایک ناقابل معافی گناہ ہے کیونکہ اس سے قوم مذہبی پیشواؤں پر اعتبار کرنا چھوڑ دے گی''۔ ان کا کہنا تھا کہ مذہبی پیشوا مذہب اور فقہ کو تو سمجھتے ہیں لیکن جدید معاشیات کو نہیں سمجھتے۔ اسلامی جمہوریہ کو لازماً ایک جدید ریاست ہونا چاہیے' جس کے لیے اپنے اپنے شعبوں کے ماہرین مطلوب ہیں۔

تاہم مسئلہ جوں کا توں رہا۔ مارچ 1981ء کو انہوں نے مذہبی پیشواؤں کے ایک الگ گروپ کو کہا: ''کسی کو اپنی اصلاح کیے بغیر دوسرے کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے''۔ اگر مذہبی پیشوا خودغرضی کا شکار اور اقتدار کی لایعنی کشمکش میں پڑے رہے تو عوام کو مذہب کی طرف واپس نہیں لاسکیں گے۔

عراق کے ساتھ جنگ:

عراق سے جنگ کے دوران نوجوانوں کا شوق شہادت مثالی تھا۔ بیس لاکھ نوجوان جن کی عمریں بارہ سال تک تھیں اور جو زیادہ غریب والدین کی اولاد تھے' اسلام اور وطن کے تحفظ کے لیے فوج میں بھرتی ہوگئے۔ خمینی نے ان نوجوانوں کے جذبہ شہادت کی بہت تعریف کی۔ انہوں نے کہا ''شہادت زندگی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب موت نہیں ہوتا''۔

سلمان رشدی کے خلاف فتویٰ:

14 فروری 1989ء کو خمینی نے اپنی وفات سے چار ماہ پہلے برطانوی ادیب سلمان رشدی کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ اس نے اپنے ناول The Satanic Verses میں رسول کریمؐ اور قرآن مجید کی توہین کی تھی۔ اس کے خلاف پاکستان میں احتجاجی جلوس نکالے گئے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بریڈفورڈ' انگلستان میں' جہاں ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے' ناول کو جلایا گیا' یہ اقدام برطانیہ کے اس قانون کے خلاف بھی احتجاج تھا جس میں صرف عیسائیت کی توہین کرنے پر سزا متعین کی گئی تھی نیز احتجاج کرنے والے انگلستان میں اسلام کے خلاف وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے تعصب سے بھی آگاہ تھے۔ جب پاکستان میں مظاہرین پر پولیس نے گولی چلائی تو خمینی نے نتیجہ نکالا کہ یہ ناول یقیناً شر ہے۔ انہوں نے اپنے فتوے میں ساری دنیا کے مسلمانوں کو حکم دیا کہ ''سلمان رشدی اور اس کا پبلشر جہاں پائے جائیں' انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے''۔

خمینی کی وفات:

جون 1989ء میں خمینی وفات پا گئے۔ مغرب تو ان کے جنازے میں عوام کے رنج والم کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ اسلامی جمہوریہ ان کی وفات کے بعد بھی مستحکم رہی' گو اس نے کافی لچک اختیار کر لی۔ نیا آئین 9 جولائی 1989ء کو منظور ہو گیا۔ آیت اللہ خامنہ ای کو خمینی کی تدفین کے اگلے روز فقیہہ بنا دیا گیا تھا اور 28 جولائی 1989ء کو ہاشمی رفسنجانی نئے صدر منتخب ہوئے۔ ان کی کابینہ میں انقلابیوں کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ایک تہائی وزراء مغرب سے تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے معاشی معاملات میں کم مداخلت کرنے والی اور زیادہ سرمایہ دارانہ حکومت کی طرف پیشرفت کی۔ تاہم مسائل اب بھی موجود تھے۔ سخت گیر لوگوں کی عملیت پسندوں سے کشمکش جاری رہی۔ مجلس بزرگان اصلاحات کے عمل میں رکاوٹیں ڈالتی تھی تاہم ایسا لگتا تھا کہ ریاست کی ضروریات ایرانیوں کو تکثیریت اور مغربی روایت کی بجائے شیعیت پر استوار سیکولرائزیشن کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ لوگ پہلے کی نسبت جدید اقدار سے کم نفرت کرتے ہیں کیونکہ اب وہ ان تک ایک اسلامی ماحول میں پہنچ رہی ہیں۔

یہ تبدیلی ایران کے ممتاز دانشور عبدالکریم سروش کی تحریروں میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ سروش نے لندن یونیورسٹی سے سائنس کی تاریخ کی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے اور وہ انقلاب کے بعد خمینی کی حکومت میں اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اب وہ سیاسی ایسٹیبلشمنٹ کا حصہ تو نہیں رہے تاہم وہ مقتدروں پر زبردست اثر رکھتے ہیں۔ ان کے جمعہ کے خطابات کو باقاعدگی سے نشر کیا جاتا ہے' نیز وہ مساجد اور یونیورسٹیوں میں خطاب کرنے والے ایک معتبر ترین مقرر ہیں۔ سروش خمینی اور علی شریعتی دونوں کے معترف ہیں' تاہم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ ان سے مختلف بھی ہیں۔ مغرب کے حوالے سے ان کی رائے زیادہ درست ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے اواخر میں ایرانی تین طرح کے تشخص کے حامل تھے: ماقبل اسلامی' اسلامی اور مغربی' اس مسئلے کو سلجھانے کی انہیں لازماً کوشش کرنی چاہیے۔ مغرب کی ہر شے نحس یا زہریلی نہیں ہے۔ ان کے خیال میں سائنسی عقلیت پسندی مذہب کا موزوں متبادل فراہم نہیں کر سکتی۔ انسانوں کو ہمیشہ ایک روحانیت کی ضرورت رہے گی' جو کہ انہیں مادے سے ماورا لے جائے۔ ایرانیوں کو جدید سائنس کی اقدار اپنانا تو چاہئیں لیکن اپنی شیعی روایات پر بھی کاربند رہنا چاہیے۔ سروش علماء کی حکمرانی کے بھی خلاف ہیں' کیونکہ ''مذہب کا مقصد اتنا اعلیٰ ہے کہ اسے صرف مذہبی پیشواؤں پر نہیں چھوڑا جا سکتا''۔ قدامت پسند مذہبی پیشوا سروش کو اکثر ہراساں کرتے ہیں تاہم ان کی مقبولیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایک ایسے مابعد انقلابی (Post Revolutionary) مرحلے سے گزر رہی ہے' جو اسے مغرب سے زیادہ قریب لے آئے گا۔

یہ امر 23 مئی 1997ء کو اس وقت واضح ہو گیا جب حجۃ الاسلام سید خاتمی انتخابات میں زبردست فتح حاصل کر کے صدر بن گئے۔ انہوں نے تین کروڑ میں سے دو کروڑ بیس لاکھ ووٹ حاصل کیے۔ انہوں نے فوراً ہی واضح کیا کہ وہ مغربی دنیا سے زیادہ مثبت تعلقات کے خواہاں ہیں اور ستمبر 1998ء میں انہوں نے سلمان رشدی کے فتویٰ سے حکومت کی لاتعلقی کا اعلان کیا۔ بعدازاں فقیہہ آیت اللہ خامنہ ای نے اس اعلان کی توثیق کر دی۔ خاتمی کو اب بھی اپنی اصلاحات میں مجلس بزرگان کی طرف سے رکاوٹوں کا سامنا ہے' تاہم ان کے انتخاب سے عوام کی اکثریت کی زیادہ تکثیریت' اسلامی قانون کی زیادہ نرم تعبیر' غریبوں کے لیے معاشی تحفظ اور عورتوں کے لیے زیادہ ترقی پسندانہ سیاست کی گہری خواہش ظاہر ہو گئی ہے۔* یہ اسلام سے دوری نہیں ہے۔ ایرانی شیعیت کے دائرے میں جدید اقدار کو اپنانا چاہتے ہیں۔ مذہب کو دبایا جائے تو وہ انتہائی تشدد آمیز ہو جاتا ہے۔

انور سادات کا قتل:

یہ حقیقت 1981ء میں اس وقت مصر میں واضح ہو گئی جب مغربی دنیا نے سنی بنیاد پرستوں کے ہاتھوں صدر انور سادات کے قتل کی خبر سنی۔ صدر سادات 6 اکتوبر کو 1973ء کی

* یہ خواہش اس وقت زیادہ واضح ہو گئی جب 1999ء کے موسم گرما میں ایرانی طلباء سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے علماء کی مداخلت سے آزاد زیادہ جمہوری اسلامی حکومت کا مطالبہ کیا۔ (مصنفہ)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنگ میں اسرائیل کے خلاف حاصل ہونے والی کامیابیوں کی خوشی منانے کے لیے پریڈ دیکھ رہے تھے۔ اچانک پریڈ کرنے والے ٹرکوں میں سے ایک ٹرک صدارتی سٹیج کے سامنے سے گزرتے ہوئے قطار سے باہر نکل آیا اور صدر نے دیکھا کہ فرسٹ لیفٹیننٹ خالد اسلامبولی چھلانگ مار کر اترا اور اس کی طرف دوڑا' صدر یہ سوچتے ہوئے کھڑا ہو گیا کہ وہ اسے سلیوٹ کرنے آ رہا ہے۔ لیکن اسے مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا ہوا۔ اسلامبولی نے سادات کے جسم پر لاتعداد گولیاں برسائیں۔ حملہ پندرہ سیکنڈ پر محیط تھا لیکن سادات کے علاوہ سات افراد ہلاک اور اٹھائیس زخمی ہو گئے تھے۔

مغرب کے لوگ اس حملے کی شدت سے دہل کر رہ گئے۔ وہ سادات کو پسند کرتے تھے۔ خمینی کے برخلاف سادات ایک ایسا مسلمان حکمران تھا کہ جس کو وہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ راسخ العقیدہ تو لگتا تھا لیکن ''جنونی'' نہیں۔ مغرب والے اسرائیل کے ساتھ امن کے لیے اس کی پہل اور اس کی کھلے دروازے والی پالیسی کو سراہتے تھے۔ سادات کے جنازے میں بہت سارے امریکی اور یورپی شہزادے' سیاستداں اور صدور شامل ہوئے۔ تاہم کوئی عرب رہنما نہیں آیا اور نہ ہی لوگ سڑکوں پر قطاروں میں کھڑے تھے۔ مصری عوام نے سادات کی موت پر آنسو نہیں بہائے' نہ ہی وہ اس کی لاش کے گرد اس طرح اکٹھے ہوئے جیسے ایرانی عوام خمینی کے تن مردہ کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے تھے۔ ایک بار پھر جدید مغرب اور مشرق وسطیٰ کے زیادہ روایتی معاشرے الگ الگ قطبین پر کھڑے تھے اور ایک دوسرے کے وژن کو قبول نہیں کر سکے تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مصریوں کی خاصی تعداد سوچتی تھی کہ سادات کی حکومت اسلام کی نسبت ''جاہلیت'' سے زیادہ مماثل ہے۔ 1980ء میں عیدالاضحیٰ کے دن جماعت اسلامیہ کے رکن طلباء نے مسجد صلاح الدین پر قبضہ کر لیا تھا اور کیمپ ڈیوڈ معاہدے کی مذمت کرتے ہوئے صدر سادات کو ''تاتاری'' قرار دیا تھا۔ چونکہ جماعت اسلامیہ پر پابندی عائد تھی اس لیے اس کے بعض اراکین خفیہ گروپوں میں شامل ہو گئے' جو حکومت کے خلاف جہاد کے لیے عزم کیے ہوئے تھے۔ خالد اسلامبولی' جو کہ یونیورسٹی آف میڈیا کا طالب علم رہا تھا' ایک جہادی تنظیم کا رکن تھا۔

سادات اس امر سے آگاہ تھا اور اس نے اپنے دوست شاہ جیسے انجام سے بچنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ 1978ء میں' جب ایران میں انقلاب برپا ہوا' تو اس نے ایک قانون جاری کیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کے تحت حکومت کے خلاف کسی قسم کے اقدام کرنے پر شہری حقوق سے محرومی' پاسپورٹ اور جائیداد کی ضبطی کی سزا کا اعلان کیا گیا۔ عوام کی کسی بھی تنظیم میں شمولیت پر پابندی لگا دی گئی اور ''قومی اتحاد یا معاشرتی امن'' کے لیے خطرہ بننے والی تنقیدی نشرواشاعت میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے خاندان میں بھی کوئی شخص کچھ بات کرتا تو سزا سے بچ نہیں سکتا تھا۔ سادات کی زندگی کے آخری دنوں میں حکومت زیادہ جابرانہ ہو گئی تھی۔ 3 ستمبر 1981ء کو سادات نے اپنے اوپر تنقید کے لیے مشہور 1536 افراد کو گرفتار کروالیا۔ ان میں وزرا' سیاستدان' دانشور' صحافی' مبلغ اور اسلام پسند گروپوں کے اراکین شامل تھے۔ ان گرفتار شدگان میں ایک محمد اسلامبولی بھی تھا' سادات کے قاتل کا بھائی۔

عبدالسلام فرج نے' جو کہ اسلامبولی کی تنظیم جہاد کا روحانی قائد تھا' ''الفریضہ الغائبہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں جہاد کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ موجودہ کافر حکومت سے نجات پانے کا واحد راستہ جہاد ہے۔ فرج نے اعلان کیا کہ مصر کے موجودہ حکمران منگولوں سے بھی بدترین ہیں۔

''دور حاضر کے حکمران مرتد ہیں۔ وہ کمیونزم اور صیہونیت کے گماشتے ہیں۔ وہ صرف نام کے مسلمان ہیں''۔

1980ء میں مسجد صلاح الدین پر قبضہ کرنے والے طلباء نے بھی سادات کو منگول قرار دیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ فرج کا تصور انتہا پسندوں کے ایک چھوٹے سے گروپ تک ہی محدود نہیں رہا تھا۔

فرج نے تسلیم کیا تھا کہ جہاد ایک اجتماعی فرض ہے۔ کوئی فرد اس مقدس جنگ کو نہیں چھیڑ سکتا بلکہ امت اس اقدام کا فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن اس کا اصرار تھا کہ مصر پر درحقیقت کافروں کا قبضہ ہو چکا ہے لہٰذا جہاد ہر اس مسلمان پر فرض ہے جو لڑنے کی سکت رکھتا ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ فرج کے نظریات انتہا پسندوں کے چھوٹے گروپ تک ہی محدود نہیں رہے تھے بلکہ مصری معاشرے میں بہت زیادہ پھیل گئے تھے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ بہت کم مصری سادات کے قتل کے خواہش مند تھے۔ زیادہ تر کو اس کے قتل کا سن کر دھچکا تو لگا تھا لیکن ایسا لگتا ہے' سادات کو کھونے پر وہ دل شکستہ نہیں ہوئے تھے۔ سادات کے قتل کے بعد ازہری جریدے کے پہلے شمارے میں سادات کا ذکر دوسرے صفحے پر تھا جبکہ اس کی کوئی تصویر شائع نہیں کی گئی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیا صدر: حسنی مبارک

نئے صدر حسنی مبارک کو ملک کے مذہبی مزاج کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے سادات کے دور میں ستمبر 1981ء میں گرفتار ہونے والے بیشتر افراد کو رہا کر دیا۔ اس نے اسلامی تحریکوں پر قابو پانے کی کوشش تو جاری رکھی تاہم صرف مخصوص گروپوں ہی کو نشانہ بنایا اور اخوان المسلمون کو (جسے ہنوز سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے) جماعتی انتخابات میں حصہ لینے اور حکومتی عہدے حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔ اخوان المسلمون کی نئی سیاسی تنظیم اسلامی اتحاد نے خود کو انتہا پسندوں سے دور رکھا ہے۔ اس نے مصر کے کاپٹک (Coptic) عیسائیوں سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے پرامن جدوجہد کی ہے۔ مصر اب ایک بہت مذہبی ملک ہے۔ آج اسلام اسی طرح غالب ہے جس طرح 1960ء کی دہائی میں ناصرازم حاوی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اخوانوں کے اس نعرے کے قائل ہوتے جا رہے ہیں کہ ''اسلام ہر مسئلے کا حل ہے''۔ رسائل و جرائد کے خطوط والے صفحات پر اب ذاتی ایمان کے مسائل زیادہ چھائے ہوئے ہیں اور ذرائع ابلاغ میں اسلامی معاملات پر جاندار مباحثے ہوتے ہیں۔ مذہبی لباس عام ہو گیا ہے' کلاس روموں میں مرد و زن الگ الگ بیٹھتے ہیں اور زیادہ لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں۔ مذہبی امیدوار ہر انتخاب میں زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مصر نام کی حد تک کثیر جماعتی' جمہوری ملک ہے تاہم بدعنوانی عام ہے' انتظامیہ آمریت پسند ہے اور ریاستی جماعت محض ایک حکمران جماعت بننے کو رد کرتی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر انتخابات آزادانہ ہوں تو لوگ زیادہ مذہبی رہنماؤں کو ووٹ دیں گے۔ نتیجتاً اسلام حسنی مبارک کی حکومت کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن چکا ہے۔

مصر کی موجودہ صورتِ حال:

1970ء کا مذہبی احیاء عروج کو پہنچ چکا ہے۔ ہر عمر اور طبقے کے مرکزی دھارے والے مصری بنیاد پرستی کی ایک معتدل صورت کو اپنا چکے ہیں۔ بیشتر کو سیاست میں دلچسپی نہیں ہے تاہم مذہبی مزاج کے حامل ہونے کی وجہ سے کسی سماجی یا معاشی بحران میں کوئی اسلامی رہنما انہیں متحرک کر سکتا ہے۔ تاہم اکثر نوجوان اب بھی جدید مصری معاشرے سے غیر مطمئن اور نالاں کی ہیں۔ سائنس' انجینئرنگ اور ریاضی کے طلباء انتہا پسند گروپوں کی طرف مائل ہیں۔ وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام کے ایک سخت گروپ کو سیکولرازم کا متبادل سمجھتے ہیں' جو انہیں دیہاتی سے ایک جدید شہری کلچر کی طرف منتقلی میں مدد دے اور مصدقہ پن اور تعلق کا احساس دے سکتا ہے۔ جدید معاشرے میں انسان کے لیے نہایت اہم ضرورت کمیونٹی کا ملنا بہت دشوار ہے اور مذہب انہیں کمیونٹی بھی مہیا کرتا ہے۔ وہ وقت کو پیچھے نہیں لے جا رہے بلکہ وہ تو اسلام کو نافذ کرنے کے نئے طریقے ڈھونڈ رہے ہیں۔

سادات کے قتل کی صورت میں ابلنے والا لاوا اب بھی سطح کے نیچے سنسنا رہا ہے' حالانکہ مبارک کی محدود لبرلائزیشن اور جمہوریت کے جزوی اطلاق کو دو عشرے ہو چلے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اسلام پسند اب زیادہ منظم ہیں۔ امریکی عرب دان پیٹرک گیفنی نے 1991ء میں مینیا کا دوبارہ دورہ کیا اور محسوس کیا کہ جمعے کو نماز پڑھنے والے 1970ء کے عشرے سے زیادہ منظم ہیں۔ زیادہ تر شرکاء کی عمریں تیس اور چالیس کے پیٹے میں ہیں' یکساں طور پر سفید جلابیہ پہنتے اور سر ڈھانپتے ہیں۔ وہ ایک ممتاز ذیلی کلچر کی تشکیل کا تاثر دیتے ہیں' جس کی اپنی جہت اور تشخص ہے' مصر میں ایک شیزوفرینیائی خلیج کے آر پار دو اقلیمیں موجود ہیں' جن کے ملنے کی نشانیاں بالکل نہیں دکھائی دیتیں۔

چنانچہ حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ ''دو قوموں'' میں جنگ برپا ہے۔ پولیس اور انتہا پسند مسلمان گروپوں میں فائرنگ اور گرفتاریوں کی خبریں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ جہاں اسلام پسندوں کی اکثریت سیکولر معاشرے سے بنیاد پرستانہ علیحدگی پر مطمئن ہے' وہاں ایک اقلیت دہشت کی قائل ہے۔ 1986ء سے امریکیوں' اسرائیلیوں اور ممتاز مصریوں پر حملے ہو چکے ہیں۔ 1987ء میں ایک سابق وزیر داخلہ اور ہفت روزہ ''المصور'' کے مدیر نبوی احمد کو گولی مار دی گئی۔ اکتوبر 1990ء میں انہوں نے مصری پارلیمنٹ کے سپیکر رفعت محجوب کو قتل کر دیا اور 1992ء میں مشہور سیکولر فرج فوضہ کو گولی سے اڑا دیا۔ اسلام پسندوں نے اسی برس یورپی اور امریکی سیاحوں پر پہلی بار حملے کیے۔ چونکہ سیاحت مصری معیشت کے لیے بے حد اہم ہے اس لیے مبارک نے زبردست پکڑ دھکڑ کروائی' جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ انسانی حقوق کے گروپوں کا دعویٰ ہے کہ 1997ء تک بیس ہزار مشکوک گوریلوں کو مصری جیلوں میں بغیر مقدمہ چلائے بند رکھا گیا تھا۔ 17 نومبر 1997ء کو دہشت گرد گروپ جماعت اسلامیہ نے لکسر میں اٹھاون غیر ملکی سیاحوں اور چار مصریوں کو قتل کر دیا اور کہا کہ یہ حملہ ''آخری نہیں ہے' بلکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجاہدین اپنا کام اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک حکومت اسلام پسند تحریکوں کے بیٹوں کو قتل کرتی رہے گی''۔ جنگ جاری ہے۔

اسرائیل: بنیاد پرستی میں شدت

مصر کی طرح اسرائیل بھی ایک زیادہ مذہبی ملک بن رہا تھا۔ اس امر کی شہادت 1980ء کی دہائی میں ہیریڈم کا سیاسی ابھار تھا۔ کٹر آرتھوڈوکس یہودیوں کی ایک اقلیت ریاست اسرائیل کو خلقی طور پر شر سمجھتی رہی ہے ''تمام نجاستوں سے زیادہ نجس اور سب سے بڑی بدعت''۔ یرمائیل ڈومب نے 1975ء میں نیچری کارٹا کے نیوز لیٹر میں لکھا تھا ''جوہری اعتبار سے صیہونیت ہمارے عقیدے کے بنیادی اصولوں کا سراسر انکار کرتی ہے''۔ تاہم بیشتر ہیریڈم اتنا آگے نہیں گئے تھے' وہ سمجھتے تھے کہ ریاست کوئی مذہبی اہمیت نہیں رکھتی اور اس سے مکمل بے اعتنائی برتتے تھے۔ اس غیر جانبداری نے انہیں سیاسی عمل میں شرکت کے قابل بنا دیا تھا۔ ہیریڈم اپنے سیاسی عمل ہی کو مذہبی روشنی میں دیکھ سکتے تھے' وہ اسے ریاست کے سیکولر اداروں میں مقید الوہی روشنی کو آزاد کروانے کا عمل تصور کرتے تھے۔ خنزیر کے گوشت پر پابندی یا سبت کے دن تعطیل جیسی مذہبی قانون سازی پر زور دے کر وہ اسرائیلی معاشرے کو مسیحانہ قلب ماہیئت کے امکان کے لیے زیادہ کشادہ بنا سکتے تھے۔ لیتھوانیائی مسنگیڈم کا رویہ زیادہ عملیت پسندانہ تھا۔ انہیں ریاست' دفاع' داخلہ یا خارجہ پالیسیوں سے کوئی غرض نہیں تھی' ان کا ایک یا دوسری پارٹی کی حمایت کرنے کا واحد معیار یشیوا کے لیے رقوم کی فراہمی اور سیاسی پشت پناہی تھی۔

ہیریڈم کا بڑا مسئلہ ہنوز بقا تھی۔ غیر یہودی دنیا کی طرف ان کا رجحان 1960ء کے عشرے میں زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ 1961ء میں یروشلم میں ایڈولف آئیکمین کے مقدمے نے ہولوکاسٹ کی یادیں تازہ کر دی تھیں اور انہوں نے Goyische کلچر اور اس میں شامل سیکولر یہودیوں سے دور رہنے کا تہیہ کر لیا تھا وہ خود کو جدید تہذیب کے ساتھ حالت جنگ میں محسوس کرتے تھے اور غیر یہودیوں یا غیر ہم خیال سیکولر اور مذہبی یہودیوں سے بالکل لاتعلق تھے۔ یوں ایکبار پھر جبر اور عقوبت مذہبی آفاق کی تنگی اور نظریاتی سخت گیری کا باعث بنے تھے۔ رفتہ رفتہ ہیریڈم زبان اور تصورات کے حوالے سے یشیووت یا ہیسیڈی کورٹس کے باہر بامعنی انداز سے ربط قائم کرنے سے قاصر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے اسرائیلی ہمسایوں سے اسی طرح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اجنبیت محسوس کرتے تھے جس طرح کہ ان کے آباؤ اجداد ڈایا سپورا میں محسوس کرتے تھے۔

ہولوکاسٹ کی اس نئی آگہی نے انہیں یہودیت کے ضعف کے حوالے سے سخت مضطرب کر دیا تھا۔ وہ توریت کے تحفظ کے لیے سیاسی عمل میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے۔ ان کے اس رجحان کو 1950ء میں ایڈاہ ہیریڈس کا ایک رکن بڑے عمدہ انداز میں بیان کر چکا تھا۔

''ہم کمزور ہیں' مضبوط ذرائع ہمارے مخالفوں کے پاس ہیں۔ خدا کی پناہ ہم منتشر اور منقسم حالت میں خود کو فنا کر دینے والے طوفانوں کے مقابل کھڑے ہیں۔ ہماری باطنی ہستی کو مجروح کر دینے والے قوانین ہماری صورتحال کو المناک اور ناقابل برداشت بنا دیں گے۔ چنانچہ ہمیں اپنے تحفظ کا بندوبست کرنا چاہیے اور حکومتی حملوں کا منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔''

تاہم 1950ء میں حالات درست نہیں تھے۔ ایگودات اسرائیل 1952ء میں آئی ڈی ایف میں عورتوں کی بھرتی کے مسئلے پر لیبر حکومت سے الگ ہوگئی تھی اور اس کے بعد سے نیسیٹ میں نہیں رہی تھی۔ تاہم 1977ء میں لیکوڈ کی فتح کے بعد ایگودات متحدہ حکومت کی ایک رکن بن گئی تھی۔ یوں ایگودات کی مشاورتی شاخ ''توریت کے داناؤں کی کونسل'' (moetzet G'dolay ha-Torah) بوڑھے ربیوں کو' جنہیں صیہونی تاریخ کے کچرے کا ڈھیر تصور کرتے تھے' اقتدار کے مراکز کے قریب لے آئی۔ لیکن ہیسیڈم اور مسیگیڈم کے مابین عشروں سے دبی ہوئی معاندت کونسل میں سطح پر ابھر آئی۔ انہوں نے مساوی رقومات کے حصول کے لیے ایک دوسرے کو رقیب کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں نئی ہیریڈی پارٹیاں اور نئے سیاسی کھلاڑی سامنے آئے۔

مثال کے طور پر پونفرویز یشیوا کا سربراہ اور اسرائیل میں لتھوانیائی یہودیوں کا رہنما ربی ایلیزر شاچ سیفرڈک یہودیوں کے اثر و رسوخ پر متفکر تھا' جو کہ 1948ء کے بعد عرب ملکوں سے اسرائیل آئے تھے۔ بہت سے سیفرڈک ایگودات اسرائیل کے ہیسیڈی اراکین کے زیر اثر آ رہے تھے اور شاچ کو ڈر تھا کہ ہیسیڈی حلقے میں اضافے سے مسیگیڈی پشیوت کے فنڈز میں کمی آ جائے گی۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے اس نے بڑے سیفرڈی ربی اوویدیا یوسف کے ساتھ مل کر ایک نئی سیفرڈی پارٹی ''شاس تورہ گارڈینز'' (Shas Torah Guardians) قائم کی۔ جب تک 1948ء میں ریاست اسرائیل وجود میں نہیں آئی تھی' انہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرب ملکوں میں عقوبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور ان میں گیٹو ذہنیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ یورپی یہودیوں کی طرح صیہونیت کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے۔ وہ ریاستی امور سے چڑتے نہیں تھے اور سیاسی زندگی میں جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے۔ 1984ء کے انتخابات میں ''شاس'' نے نیسنیٹ میں چار نشستیں حاصل کر لیں۔

تاہم 1988ء میں ساتویں لیوباوچر ربی (Lubavitcher Rebbe) نے شاچ اور مسنگیڈم کے اثر ورسوخ کو روکنے کا فیصلہ کیا۔ وہ یہودیت کی ایک زیادہ سخت گیر تعریف کے لیے ایگودات پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے تمام پیروکاروں کو حکم دیا کہ آئندہ انتخابات میں ایگودات کو ووٹ دیں۔ اس اقدام سے ریاست اسرائیل کی سیاسی بہبود سے ہیریڈم کی بے اعتنائی ظاہر ہوئی۔ اگر اسرائیلی حکومت ربی کی خواہشوں کے مطابق عمل کرتی تو امریکی یہودی مشتعل ہو جاتے' جنہوں نے امریکہ میں اسرائیل کے لیے کامیاب لابی کی تھی' اسرائیل کی بقا کے لیے امریکی تائید انتہائی ضروری تھی لیکن لیوباوچر ربی کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس یہودی دنیا میں صرف اپنے مشن ہی کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کے کارندوں کو ان لوگوں میں دشواری محسوس ہوتی تھی' جو خود کو یہودی تصور کرتے تھے لیکن ہلاقائی (Halakhic) معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ اگر ریاست اسرائیل ایسے لوگوں کو باوقار طور پر غیر یہودی قرار دے دیتی تو اس سے لیوباوچ کی زندگی بہت زیادہ سہل ہو جاتی۔ تاہم ربی کی مداخلت نے ایگودات میں ہیسیڈی رکنیت میں زبردست اضافہ کر دیا' اس لیے اس کی مخالفت میں ربی شاچ نے نئی مسنگیڈم پارٹی ''توریت پرچم'' (Degel ha-Torah) قائم کی۔

1988ء کے انتخابات میں مذہبی پارٹیوں نے اٹھارہ نشستیں لے کر اسرائیلی عوام کو حیران کر دیا۔ اب سیکولر سیاستدان حکومت بنانے کے لیے ان کی مدد کے محتاج ہو گئے تھے۔ ہیریڈم ہمیشہ کی طرح ریاست اسرائیل کے شدید مخالف تھے اور انہیں ہنوز یقین تھا سیکولر یہودیوں نے مذہب کو تباہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ وہ اپنے کام کو ناگزیر شر مانتے تھے' اپنے دفاع کا ایک اقدام۔ 1991ء میں ربی ناتھن گروسمین نے لتھوانیائی اخبار Yated Neeman میں لکھا: ''اسے دشمن کے کیمپ میں چوری قرار دیا جا سکتا ہے۔'' تاہم ہیریڈم اس ریاست میں عدیم المثال اقتدار حاصل کر چکے تھے' جس سے وہ خود کو جنگ کی حالت میں محسوس کیا کرتے تھے۔ ہولوکاسٹ کے بعد سے ہیریڈم یورپی یہودیت کی گمشدہ دنیا کو دوبارہ تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مشرقی یورپ کی پرانی زندگی کو سنہرے دور کے طور پر اور فیضان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے ماضی کے عظیم ربیوں کی طرف دیکھتے تھے۔ تاہم 1980ء کی دہائی کے اواخر تک وہ ان سے کنارہ کش ہوگئے۔ 1970ء میں معبد کی تباہی کے بعد سے کوئی مذہبی یہودی ربی شاچ جتنا طاقتور نہیں گزرا تھا' جو 1988ء تک دو سیاسی پارٹیوں کی قیادت کر چکا تھا اور بڑے بڑے سیاستدان اس کے فیصلہ کن ووٹ کے لیے اس کے پاؤں چھو چکے تھے۔

یہ 26 مارچ 1990ء کو ڈرامائی طور پر عیاں ہوگیا۔ تل ابیب کا یدایلیا ہو باسکٹ بال سٹیڈیم اسرائیلی سیکولر کلچر کا علامتی معبد ہے۔ اسرائیل میں باسکٹ بال تقریباً قومی مذہب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کھیل صیہونیوں کے نئے یہودی کے خواب کی ترجمانی کرتا ہے۔ تاہم 1990ء کے مارچ کی شام سٹیڈیم قومی باسکٹ بال ٹیم (Maccabees) کے پرشوق حمایتیوں سے نہیں بلکہ دس ہزار ڈاڑھیوں والے ہیریڈم سے بھرا ہوا تھا۔ کٹر آرتھوڈوکس سیکولر اسرائیل کے قلب میں گھس آئے تھے اور کم از کم اس شام کے لیے انہوں نے اس کے ایک بڑے قلعے پر قبضہ کرلیا تھا۔ مزید براں اس واقعے کو ٹیلیویژن سے نشر بھی کیا گیا اور اسے مذہبی اور سیکولر اسرائیلیوں نے دم سادھ کر دیکھا۔ آخر یہ کیا واقعہ تھا؟ ربی شاچ اپنے پیروکاروں سے خطاب کرنے والا تھا اور اس نے انہیں ہدایت کرنا تھی کہ آئندہ انتخاب میں انہیں کس طرح ووٹ ڈالنے چاہئیں۔ اس شام ربی شاچ نے لیکوڈ اور لیبر پارٹی کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔

اسرائیل اور فلسطینیوں کے مابین امن کا عمل سست روی اور بڑی دشواریوں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا' لیکن مخلوط قومی حکومت میں انتشار پیدا کر چکا تھا۔ لیبر اور لیکوڈ دونوں پارٹیوں ہی نے چھوٹی مذہبی جماعتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کی کوششیں شروع کردی تھیں۔ لیبر پارٹی نے ایگودات اور شاس کے ساتھ رسمی معاہدہ کرلیا تھا لیکن شاس کے ایک لیڈر ربی یوسف کو احتمال تھا کہ لیبر اتحاد پارٹی میں دراڑیں ڈال سکتا ہے۔ سیفرڈی زبردست قوم پرست تھے' وہ عربوں سے نفرت کرتے تھے اور لیبر پارٹی کی مجوزہ علاقائی رعایتوں کے سخت مخالف تھے۔ ربی شاچ' جو شاس کا شریک بانی تھا' امداد کے لیے آیا۔

ربی کی دس منٹ طویل تقریر نہ صرف حواس باختہ کر دینے والی تھی بلکہ اپنے ٹیلی ویژنوں پر اسے دیکھنے والے اسرائیلیوں کے لیے پریشان کن بھی تھی۔ اس نے اتحاد کے لیے ہونے والے مذاکرات کا ذکر تک نہیں کیا اور کسی ایسے مسئلے پر کوئی بات نہیں کی جن کی وجہ سے باقی پوری قوم فکرمند تھی۔ وہ فلسطینیوں کے حقوق' قومی دفاع اور امن کے لیے علاقے کے تبادلے جیسے معاملات سے واضح طور پر لاتعلق تھا۔ اس نے ریاست اسرائیل کے حوالے سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھلائی کا ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ اس نے یہودی ریاست کو نجات دہندہ کے طور پر دیکھنے کی بجائے اس نے ہیریڈم کو درپیش ''خوفناک اور دہشت انگیز'' حالات کا ذکر کیا۔ جن جنگوں کے حوالے سے ربی متفکر تھا وہ عرب اسرائیل جنگیں نہیں تھیں بلکہ مذہب کے خلاف صیہونیوں کی چھیڑی ہوئی طویل جنگ تھی۔ ربی نے جذبات سے بھرپور انداز میں کہا: ''ہم (روایت کے مخالفوں) سے جو جنگیں لڑ رہے ہیں' وہ آج شروع نہیں ہوئیں بلکہ پہلی عالمی جنگ کے زمانے سے شروع ہوئی تھیں اور صرف کائنات کا مالک (Master Of The Universe) ہی جانتا ہے کہ کیا متوقع ہے۔'' تاہم نتیجے کے بارے میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا: ''یہودی کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے اسے قتل کر دیا جائے لیکن اس کی اولاد توریت پر کاربند رہے گی۔''

لیبر پارٹی والوں کی بدبختی کہ ان کے مقدس ادارے نہ صرف غیر یہودی بلکہ یہودی دشمن قرار پائے۔ ربی نے نفرت آمیز انداز میں پوچھا: ''کیا لیبر پارٹی کے پاس کوئی پاک شے ہے؟ کیا انہوں نے اپنے آپ کو ماضی سے الگ نہیں کر لیا اور ایک نئی توریت نہیں ڈھونڈ لی؟'' اس نے کہا کہ یہ کبوتزنک (Kibbutzniks) غیر یہودیوں سے بدتر ہیں' انہیں تو سبت اور یوم کپور کی بھی اہمیت کا ادراک نہیں ہے۔ ''یہودیوں کو درپیش انتہائی اہم معاملات کے حوالے سے'' فیصلہ کرنے کے لیے ایسے لوگوں پر کس طرح بھروسا کیا جا سکتا ہے؟ لیبر سیاستدانوں سے کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا۔ ''جب وہ نیسیٹ میں ہوتے ہیں تو انہیں مذہب کو تقویت دینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس وہ تو یہودیت کو تباہ کر دینے والے قانون منظور کرتے ہیں۔'' اس شام نہ صرف ربی شاچ نے طاقت کا توازن لیکوڈ کے حق میں کر دیا بلکہ ہیریڈم کی حیثیت غیر معمولی طور پر تبدیل ہوگئی تھی اور وہ ایک غیر اہم گروپ رہنے کی بجائے اقتدار کا مرکز بن گئی تھی۔ اس موقع پر یہ بھی عیاں ہوگیا کہ اسرائیل میں ''دو قومیں'' بستی ہیں جو نہ تو ایک دوسرے کی زبان سمجھتی ہیں اور نہ ہی ان کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ اس نے ہیریڈم کی گہری نفرت کو بھی عیاں کر دیا' ایک اشتعال کو جو کہ غیر یہودیوں پر نہیں بلکہ اپنے ہم مذہب یہودیوں پر تھا۔

انتہا پسند مذہبی صیہونی اور گش ایمونم بھی لڑائی کے لیے تیار تھے۔ وہ ایک طرف تو سیکولر قوم پرستی اور دوسری طرف آرتھوڈوکسی کے خلاف انقلاب برپا کرنے والے باغی تھے۔ یہودیوں کے لیے زندگی بہت تبدیل ہوگئی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یہودیوں کے لیے ڈایاسپورا سے تعلق رکھنے والی روایات پر کاربند رہنا ضروری نہیں ہے کیونکہ مسیحانہ دور شروع

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو چکا ہے۔ شبتائی زیوی کے بعد یہودی محسوس کرتے تھے کہ وہ عبوری دور میں ہیں اور انہیں یقین تھا کہ ایک عدیم المثال تبدیلی وقوع ہونے ہی کو ہے۔ لیکن جہاں شبتائیتی گیٹو کی پابندیوں کے خلاف بغاوت کر چکے تھے' وہاں گش کے ارکان خود کو محصور محسوس کرتے تھے۔ وہ سرحدوں کے خبط کا شبتائیتیوں کی طرح شکار تھے اور گو کہ انہوں نے ارتز اسرائیل کی سرحدوں پر توجہ مرکوز کی تھی تاہم وہ بھی یہودیت کی حدود متعین کرنے کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ سیکولر اور مذہبی یہودیوں کے مابین سرحدوں کو توڑنا چاہتے تھے۔ کک کے پیروکار اس امر کے قائل تھے کہ ہیریڈم کی سوچ خواہ کچھ بھی ہو' بیک وقت آرتھوڈوکس اور صیہونی ہونا ممکن ہے۔ وہ سیکولروں کے برخلاف اس امر پر بھی زور دیتے تھے کہ مذہبی جہت کے بغیر صیہونیت ادھوری ہے۔ تاہم وہ مشکل زمانہ تھا۔ کک کے پیروکار محسوس کرتے تھے کہ لیکوڈ حکومت نے' جس نے انہیں یامت (Yamit) سے نکلوا دیا تھا' ان کے ساتھ دغا کیا ہے نیز عربوں کے ساتھ امن قائم کر کے نجات کے عمل کو روک دیا ہے۔ یہ امر 1987ء میں تب واضح تر ہو گیا جب ''انتفاضہ'' کے نام سے مشہور فلسطینی ابھار کا آغاز ہوا اور لیبر حکومت نے بالآخر ایک ایسے امن معاہدے پر دستخط کر دیئے جو کک کے پیروکاروں کی نگاہوں میں کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے بھی زیادہ ناقابل قبول تھا' کیونکہ اس میں مغربی کنارے کی مقدس زمین کے حصوں کو واگزار کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کک کے پیروکاروں کا یہ احساس زیادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ نہ صرف ایک دشمن غیر یہودی دنیا میں محصور ہیں — بلکہ اس طرح جیسے کہ یہودی ڈایاسپورا میں تھے — بلکہ انہیں اپنی منزل تک رسائی پانے سے روکنے والے ہم مذہبی یہودیوں میں بھی۔

نتیجتاً وطن میں گش کی باطنی مسرت اشتعال کی لذت میں بدل گئی' جو کسی موقع پر خوفناک تشدد کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا' خصوصاً عربوں کے خلاف۔ گش آبادکاروں نے اپنی تحریک کے ابتدائی زیادہ پرامید دنوں میں اعلان کیا تھا کہ وہ مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کی ''مدد'' کرنے اور دونوں فریقوں میں حائل ''نفرت کی دیوار'' گرانے کے لیے آئے ہیں۔ لیونگر نے 1970ء کی دہائی میں وعدہ کیا تھا: ''ہم یہاں قتل و غارت گری کا ماحول صاف کرنے آئے ہیں' جس کے آپ لوگ عادی ہو چکے ہیں۔'' لیکن اس کا رویہ زیادہ سے زیادہ اشتعال انگیز ہوتا گیا۔ وہ مغربی کنارے کے عرب قصبوں سے جارحانہ انداز میں' بندوق ہاتھ میں لیے' گزرا کرتا تھا۔ اگر کسی آبادی پر فلسطینی حملہ کرتے تو وہ خود جوابی کارروائیوں کی قیادت کرتا' کاروں کو توڑتا پھوڑتا اور دکانوں کو جلاتا۔ انتفاضہ شروع ہونے کے بعد اس نے کہا کہ وہ کبھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ کبھی ہیبرون ضرور پہنچے گا' ''میرے اندر ہیجان بپا ہے' جو مجھے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتا۔''
1988ء میں جب لیونگر کی کار پر ہیبرون میں پتھراؤ ہوا تو وہ چلانگ لگا کر کار سے نکلا اور فلسطینیوں پر فائر کھول دیا' جس سے خالد صالح ہلاک ہوگیا' جو کہ پتھراؤ میں کوئی حصہ لیے بغیر فقط اپنی جوتوں کی دکان میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد لیونگر دیوانہ وار گولیاں برساتا' سبزیوں کی ریڑھیوں کو الٹتا اور بلند آواز میں گالیاں بکتا ہوا دوڑنے لگا۔ جب اس پر مقدمہ چلایا گیا تو اس نے بیان دیا کہ اگرچہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا تاہم اس کی خواہش ہے کہ اسے ''کسی عرب کو قتل کرنے کا اعزاز'' حاصل ہوا ہوتا۔

گش کے ارکان ارتزاسرائیل میں موجود عربوں سے برتاؤ کے حوالے سے مختلف نظریات کے حامل تھے۔ سب متفق تھے کہ ملک پر فلسطینیوں کا کوئی حق نہیں ہے اور ان کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ نفرت کا عقیدہ یہودی مذہب کو مسخ کرنے کے مترادف تھا۔ کک کے بنیاد پرست پیروکار ارضِ موعود سے مقامی لوگوں کو نکال دینے' ان سے کوئی معاہدہ نہ کرنے' ان کی مقدس علامات کو تباہ کرنے اور حد تو یہ ہے کہ انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ وہ یہودیوں کے خدا کے منتخب لوگ ہونے کے عقیدے کی تاویل یوں کرتے تھے کہ وہ ان قوانین کی پیروی کرنے کے پابند نہیں ہیں' جو دوسری قوموں پر فرض ہیں' بلکہ وہ تو منفرد اور پاک لوگ ہیں۔ شلوموادینر نے کہا کہ وطن کو فتح کرنا ''یہاں بسنے والے غیر یہودی لوگوں کے قومی اور انسانی حقوق'' سے زیادہ اہم ہے۔

کک کے بیشتر پیروکاروں کا ایقان تھا کہ عربوں کو ارتزاسرائیل میں رہنے دیا جانا چاہیے' لیکن ''اجنبی باشندوں'' (Gerim Toshavim) کے طور پر۔ جب تک وہ ریاست اسرائیل کا احترام کریں' ان کے ساتھ لازماً مہذبانہ برتاؤ کیا جانا چاہیے' تاہم انہیں کبھی نہ تو شہری بنایا جائے اور نہ سیاسی حقوق دیے جائیں۔ دیگر تو اس کے بھی قائل نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ انہیں نقل مکانی پر مجبور کر دیا جائے۔ ایک اقلیت نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی تجویز دی۔ 1980ء میں ربی اسرائیل ہیس نے بار ایلان یونیورسٹی کے رسالے میں ''نسل کشی: توریت کا ایک حکم'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کروایا۔ اس نے کہا کہ یہودیوں کے لیے فلسطینی ایسے ہی ہیں جیسے روشنی کے لیے اندھیرا اور انہیں ایمالیک کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جانا چاہیے۔ اسی برس گش آبادکار ہائم زیوریا نے لکھا کہ یہ نفرت ''فطری ہے اور مریضانہ نہیں ہے۔''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ہر نسل میں لوگ ہمارے خلاف اٹھے ہیں' اسی لیے ہر نسل کے اپنے ایما لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری نسل کا ایما لیک ازم ہمارے آباؤ اجداد کے وطن میں ہماری قومی نشاۃ ثانیہ سے عربوں کی نفرت کی صورت میں رونما ہوا ہے۔''

3 مئی 1980ء کو بیرون میں چھ یشیوا طلباء کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے سے کک کے چند شدید انتہا پسند پیروکاروں میں انتقام کا جذبہ پیدا ہوا۔ دو یہودیوں نے پانچ عرب میئروں کی کاروں میں بم نصب کر دیئے۔ جب ربی ہائم ڈرکمین نے دھماکوں کی خبریں سنیں تو اس نے انتہائی مسرت کے عالم میں کہا: کاش اسرائیل کے تمام دشمن اسی طرح مٹ جائیں!'' اپریل 1984ء میں حکومت نے ایک ایسی زیر زمین تنظیم کا سراغ لگایا جو گنبد صخریٰ کو' جو کہ اسلامی دنیا میں تیسرا مقدس ترین مقام ہے' بم سے اڑانے کی سازش کر رہی تھی۔

1967ء کی چھ روزہ جنگ کے دوران آئی ڈی ایف نے مشرقی یروشلم اور پرانے شہر کو اردن سے چھین لیا تھا اور جنگ کے چند دنوں بعد ان علاقوں کو اسرائیل کا حصہ بنا لیا گیا اور اعلان کیا کہ یروشلم یہودی ریاست کا ابدی دارالحکومت ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیصلہ تھا کیونکہ 1947ء میں اقوام متحدہ نے اعلان کیا تھا کہ یروشلم کو ایک بین الاقوامی علاقہ ہونا چاہیے اور چھ روزہ جنگ کے بعد اس نے مطالبہ کیا تھا کہ اسرائیل کو یروشلم سمیت تمام مقبوضہ علاقوں سے نکل جانا چاہیے' یروشلم 638ء سے ایک مسلمان شہر چلا آ رہا ہے' سوائے صلیبیوں کی مختصر دورانئے کی حکومت کے (1187ء-1099ء)۔ یروشلم جسے مسلمان ''القدس'' کہتے ہیں' مکہ اور مدینہ کے بعد اسلامی دنیا کا تیسرا مقدس ترین شہر ہے۔ گنبد صخریٰ ان کے لیے انتہائی قابل احترام ہے۔

تاہم صدیوں سے مسلمان اور یہودی امن چین سے رہ رہے تھے۔ عثمانی سلطان سلیمان عالیشان نے تو یہودیوں کو یہاں اپنی عبادت گاہ بنانے کی بھی اجازت دے دی تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کے درباری معمار سنان پاشا نے ان کے لیے ایک سادہ سی عبادت گاہ تعمیر کر دی تھی۔

عرب اسرائیل تنازعے نے اس مقدس شہر میں مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین ہم آہنگی کے دور کا خاتمہ کر دیا تھا اور 1920ء کی دہائی میں اس مقدس شہر میں بہت خونریزی ہوئی۔ 1967ء کی چھ روزہ جنگ میں مشرقی یروشلم پر قبضے کو سیکولر یہودیوں نے بھی ایک گہرا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روحانی واقعہ سمجھا تھا۔

جب اسرائیلیوں نے جنگ کے بعد یروشلم کو ملحق کیا تھا تو وعدہ کیا تھا کہ عیسائی اور مسلمان اپنے مقدس مقامات پر بلا روک ٹوک جا سکیں گے۔ بیت المقدس مسلمانوں ہی کے پاس رہنے دیا گیا۔ تاہم قوم پرست اسرائیلیوں اور انتہا پسند مذہبی صیہونیوں نے اس پالیسی کی شدید مخالفت کی۔ یہودی انتہا پسندوں نے اپنے معبد کو دوبارہ تعمیر کرنے کے منصوبے بنانے شروع کر دیئے۔ دوسرے بنیاد پرستوں کی طرح وہ بھی یقین رکھتے تھے کہ انہیں پہل کرنی چاہیے اور معبد کے مقام سے اس مسلم یادگار کو ہٹا دینا چاہیے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اگر وہ پہلا قدم اٹھائیں گے تو خدا بھی ان کی مدد کرے گا۔ وہ گنبد صخریٰ کو ''اپنی نسل کی تمام روحانی خامیوں کی وجہ'' قرار دیتے تھے۔

اس زیر زمین یہودی تنظیم کا بڑا نظریہ ساز یشوا بین شوشن تھا۔ وہ ایک شائستہ' نرم گفتار قبالائی تھا۔ اس نے گنبد صخریٰ کو بم سے اڑانے والے انتہا پسندوں کو نظریاتی تربیت دی تھی۔ یہ ایک سنگین لمحہ تھا۔ گنبد صخریٰ میں بم دھماکہ نہ صرف امن کے عمل کو ختم کر دیتا بلکہ ایک ایسی جنگ کا باعث بنتا جس میں یقیناً ساری اسلامی دنیا اسرائیل کے خلاف میدان میں نکل آتی۔ واشنگٹن کے تزویراتی ماہرین سرد جنگ کے تناظر میں اس بات سے متفق تھے کہ تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی' کیونکہ سوویت یونین عربوں کا حامی تھا اور امریکہ اسرائیل کا۔ تاہم ایٹمی تباہی کے خدشے نے کک کے ان انتہا پسند پیروکاروں پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ یہ اساطیر کو عمل کے لیے خاکے کی طرح استعمال کرنے کے بنیاد پرستانہ رجحان کی ایک ہولناک مثال تھی۔ مجوزہ بم دھماکا کرنے والے لیونی نے آئی ڈی ایف میں بموں کے ماہر کے طور پر تربیت حاصل کی تھی۔ اس گولان کی پہاڑیوں میں واقع اسرائیلی فوجی کیمپ سے دھماکہ خیز مواد چرایا تھا اور گنبد صخریٰ کو اڑانے کے لیے اٹھائیس بم تیار کیے تھے۔ گنبد صخریٰ کو تباہ کرنے کی سازش فنا پرستی کے رجحان کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ المناک رویہ موت کی اس خواہش کو عیاں کرتا ہے' جو طویل عرصے سے جدید تجربے کا حصہ چلی آ رہی ہے۔

ایک اخلاقی فنا پرستی ربی میر کاہن کی شروع کی ہوئی تحریک کی خصوصیت تھی۔ وہ 1974ء میں اسرائیل آیا اور کریت ارربا میں آباد ہو گیا' جہاں اس نے اپنی تنظیم کا نام رکھا: ''اس طرح!'' (Kach)۔ یہ تنظیم اس نے نیویارک سٹی میں جیوش ڈیفنس لیگ (Jewish Defense League) کے نام سے بنائی تھی۔ اب اس کا مقصد عربوں کو ہراساں کر کے ارتز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسرائیل چھوڑ دینے پر مجبور کرنا تھا۔ کاہن کی بنیاد پرستی بہت ظالمانہ تھی اور اس نے عقیدے کو کیری کیچر (Caricature) بنا دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''ہمیں خدا نے اس جگہ آنے اور ایک یہودی ریاست تشکیل دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ عربوں کو لازماً چلے جانا ہوگا۔ اس طرح مذہب نسلی صفائی (Ethnic Cleansing) کا جواز بن گیا تھا۔

تباہی اور موت کا یہ تاریک وژن عمیق حد تک فنا پرستانہ تھا۔ یہ نفرت اور انتقام کی خواہش سے بھی لبریز تھا۔ کاہن کو ہر طرف دشمن دکھائی دیتے تھے۔ اس کے ایک پیروکار باروک گولڈسٹائن نے 25 فروری 1994ء کو ہیبرون میں پچیس فلسطینیوں کو قتل کر دیا۔ اس نے 24 فروری 1929ء کو فلسطینیوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے انسٹھ یہودیوں کا بدلہ لیا تھا۔ اس انتقامی عمل نے مقبوضہ علاقے اور اسرائیل میں اسلام پسندی میں اضافہ کر دیا۔

غزہ کی پٹی میں ''المجامعہ'' کا قیام:

فلسطینی 1967ء کے بعد اسلامی دنیا میں رونما ہونے والے مذہبی احیاء سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔ عربوں کی شکست پر ان کا ردعمل سیاسی' سیکولر اور قوم پرستانہ تھا۔ یاسر عرفات نے تنظیم آزادیٔ فلسطین کو دوبارہ منظم کیا اور مسئلہ فلسطین حل کرنے کے لیے گوریلا اقدامات اور سفارت کاری پر مبنی ایک مہم شروع کی۔ تاہم 1971ء میں ایریل شیرون کے غزہ کی پٹی میں پی ایل او کو کچل دینے کے بعد شیخ احمد یاسین نے ''المجامعہ'' کے نام سے ایک اسلامی تحریک شروع کی' جس نے اخوان المسلمون کے فلاحی پروگرام جیسا پروگرام شروع کیا۔ 1987ء تک ''المجامعہ'' غزہ کی پٹی میں ایک فلاحی سلطنت تشکیل دے چکی تھی' جو کلینکوں' انسدادِ منشیات کے پروگراموں' نوجوانوں کے کلبوں' کھیل کے میدانوں اور قرآن کی تدریس پر مشتمل تھی۔ ان کاموں کے لیے رقومات تیل پیدا کرنے والی خلیجی ریاستوں سے زکوٰۃ کی مد میں حاصل کی جاتی تھیں نیز اسرائیل بھی مجامعہ کو مالی مدد دیتا تھا۔ اس زمانے میں شیخ احمد یٰسین اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک مصلح تھے اور غزہ کے پناہ گزینوں کو اسلامی طریقے سے جدیدیت کے ثمرات سے فیضیاب کروانا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ فلسطین کا تشخص سیکولر نہیں بلکہ اسلامی ہو۔ مجامعہ کی مقبولیت نے واضح کر دیا کہ فلسطینی اس خیال سے متفق تھے۔ وہ عرفات پر فخر تو کرتے تھے تاہم ان کا سیکولرازم صرف مغربی تعلیم یافتہ اشرافیہ کو سمجھ آتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''اسلامی جہاد'':

''اسلامی جہاد'' ایک بالکل مختلف تنظیم تھی۔ وہ مصر کی ''تنظیم جہاد'' سے مشابہ ایک زیرزمین تنظیم تھی۔ ''اسلامی جہاد'' سید قطب کے نظریے کا اطلاق فلسطینی المیے پر کرتی تھی۔ اس کے ارکان فلسطین کے سیکولر معاشرے کو ''جاہلی'' تصور کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ امت کے مستقبل کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ الجامعہ کے برخلاف ''اسلامی جہاد'' اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد کی قائل تھی۔ اب یہ تنظیم غزہ سے لے کر مغربی کنارے تک پھیل چکی ہے۔

انتفاضہ:

9 ردسمبر 1987ء کو غزہ میں عوامی فلسطینی ابھار انتفاضہ شروع ہوا جو مغربی کنارے اور مشرقی یروشلم تک پھیل گیا۔ 1967ء کے بعد سے ان مقبوضہ علاقوں میں فلسطینیوں کی ایک پوری نسل پروان چڑھ چکی تھی۔ فلسطینی پی ایل او کی قیادت سے غیر مطمئن تھے' جو فلسطین کو آزاد کرانے میں ناکام رہی تھی اور وہ ایک جابر قوت کے زیرحکومت ذلت وتحقیر کی زندگی گزارنے کی وجہ سے مضطرب تھے۔ 1987ء میں فلسطینیوں کا غصہ عروج کو پہنچ گیا اور فلسطینی ریاست کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ نوجوان رہنما اسرائیلی قبضے کو ختم کروانے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے ہر فلسطینی کو اس مقصد کے لیے سرگرم کیا' لہٰذا عورتیں اور بچے اسرائیلی فوجیوں پر پتھراؤ کرنے لگے' انہیں ان کی قوت اور بندوقوں کا کوئی ڈر نہیں ہوتا تھا۔ انتفاضہ نے عربوں اور بین الاقوامی برادری دونوں کو متاثر کیا۔ انتفاضہ نے یتزاك رابن کو بھی متاثر کیا اور جب وہ 1992ء میں وزیراعظم بنا تو وہ پی ایل او سے مذاکرات پر راضی تھا۔ اگلے برس اسرائیل اور فلسطین نے اوسلو معاہدے پر دستخط کروائے۔

حماس:

تاہم انتفاضہ کے ابتدائی ایام میں ''حماس'' کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم ہوئی۔ وہ اسرائیلی قبضے اور فلسطینی قوم پرست تحریک دونوں کی مخالف تھی۔ نوجوان جوق در جوق حماس میں شامل ہونے لگے۔ اکثر نوجوانوں کا تعلق پناہ گزین کیمپوں سے تھا لیکن بہت سے درمیانے طبقے اور سفید پوش محنت کشوں کے طبقے سے آئے تھے۔ 18 اکتوبر 1990ء کو حرم شریف میں سترہ فلسطینی نمازیوں کے قتل کے بعد حماس کی کارروائیاں تیز ہو گئیں۔ ''اسلامی جہاد'' کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طرح حماس بھی عرب اسرائیل تنازعے کو مذہبی تناظر میں دیکھتی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ فلسطینی صرف اسلام پر عمل پیرا ہو کر ہی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ اسرائیل نے اسلام کو تباہ کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے چہلم تک انتظار کیا اور اس کے بعد مقبوضہ علاقے میں نہیں بلکہ عین اسرائیل میں ایک خودکش بمبار نے سات اسرائیلی شہریوں کو ہلاک کر دیا۔ ایک ہفتے بعد 13 اپریل 1994ء کو ایک اور خودکش بمبار نے پانچ اسرائیلیوں کو ہلاک کر دیا۔ تشدد نے تشدد کو جنم دیا تھا۔

اوسلو معاہدے پر اسرائیل میں ردِعمل:

ان خودکش بم دھماکوں کی وجہ سے بہت سے اسرائیلی گزشتہ سال ہونے والے اوسلو معاہدے کے خلاف ہو گئے جس کے تحت پی ایل او نے اسرائیل کو 1948ء والی سرحدوں کے اندر تسلیم کر لیا تھا اور دہشت گردی اور تشدد کو روکنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے صلے میں فلسطینیوں کو غزہ اور مغربی کنارے میں پانچ سال کے لیے خودمختاری دی گئی تھی؛ جس کے بعد مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی آبادکاری، فلسطینی پناہ گزینوں کے لیے تلافی اور یروشلم کے مستقبل جیسے معاملات پر مذاکرات ہونا طے پائے تھے۔ لیکن خودکش بم دھماکوں نے واضح کر دیا کہ یاسر عرفات اپنی سیکولر حکومت کی مخالفت کرنے والے اسلامی عسکریت پسندوں پر قابو نہیں پا سکتے۔ بعض اسرائیلیوں، خصوصاً دائیں بازو والوں نے رابن پر الزام لگایا کہ انہوں نے اوسلو میں اسرائیل کی سلامتی کو مخدوش کر دیا ہے۔

یتزاك رابن کا قتل:

کک کے پیروکار ربی تو اوسلو معاہدے پر زیادہ چراغ پا تھے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے مقدس سرزمین کے باہر معاہدے پر دستخط کر کے ایک جرم کیا ہے۔ جولائی 1995ء میں ربی اور اہام شپیرا اور چودہ دوسرے گش ربیوں نے فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے افسروں کے احکامات پر عمل مت کریں اور مقبوضہ علاقے خالی کرنے سے انکار کر دیں۔ یہ صورتحال خانہ جنگی کے مترادف تھی۔ دیگر گش ربیوں نے یہودی قانون کے مطابق رابن کو سزائے موت کے گھاٹ اتارنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ 4 نومبر 1995ء کو ہیسڈ ریشیوا کے ایک سابق طالب علم یگال عامر نے تل ابیب میں ایک امن ریلی کے دوران رابن کو قتل کر دیا۔ اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے بعد میں کہا کہ یہودی قانون کے مطالعے نے اس کو قائل کیا تھا کہ رابن یہودیوں کا دشمن (Rodef) ہے' اس لیے اس کا فرض تھا کہ وہ اسے قتل کر دے۔

سادات کی طرح رابن کے قتل نے ظاہر کر دیا کہ مشرق وسطیٰ میں دو جنگیں لڑی جا رہی ہیں۔ ایک عرب اسرائیل تنازعہ ہے جبکہ دوسری جنگ مصر اور اسرائیل کے اندر سیکولر اور مذہبی لوگوں کے مابین ہو رہی ہے۔ صرف مذہبی یہودی ہی شدید مشتعل نہیں ہیں بلکہ سیکولر اسرائیلی بھی ان سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ممتاز اسرائیلی ناول نگار ایموس اوز نے یروشلم کے ہیریڈی علاقے کی دیواروں پر سیاہ سواستیکا کے نشان بنے اور نعرے لکھے دیکھے: ''ہٹلر کے پیروکار صیہونی مردہ باد!'' ''لیبر حکومت مردہ باد!'' اوز نے لکھا ہے کہ اسے اپنے استاد ڈوو سیڈن کی بات بھی یاد آئی' جس نے کہا تھا کہ سیکولر صیہونیت یہودی تاریخ میں عارضی حیثیت رکھتی ہے' اور آرتھوڈوکس یہودیت دوبارہ ابھرے گی۔ سیکولر اسرائیلی بھی ایسا لگتا ہے کہ تب فنا کے خوف اور غیر منطقی دہشت کا شکار ہو جاتے ہیں جب ان کا سامنا اپنے مذہبی دشمنوں سے ہوتا ہے۔

اوز نے مسئلے کی جڑ کو بیان کر دیا ہے۔ بنیاد پرست اور سیکولر — خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو — حالت جنگ میں ہیں کیونکہ ان کے تقدس کے تصورات بالکل مختلف ہیں۔ اوز نے گش ایمونم کا ذکر کرتے ہوئے اسے ''ایک سفاک اور ہٹ دھرم فرقہ'' قرار دیا' جو کہ ''یہودیت کے تاریک گوشے سے پیدا ہوا ہے اور ہر اُس شے کو تباہ کر رہا ہے جو ہمیں عزیز ہے اور مقدس ہے''۔ سیکولر اور لبرل لوگوں کے لیے — خواہ وہ یہودی ہوں' عیسائی یا مسلمان — فرد کی خود مختاری اور دانش ورانہ آزادی کی روشن خیالی والی اقدار مقدس ہیں۔ وہ ایسے معاملات پر مفاہمت نہیں کر سکتے یا رعایتیں نہیں دے سکتے۔ یہ اصول لبرل اور سیکولر تشخص میں اتنی مرکزی اہمیت رکھتے ہیں کہ اگر انہیں خطرہ لاحق ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنا وجود مخدوش ہو گیا ہے۔ جس طرح بنیاد پرست سیکولروں کے ہاتھوں فنا ہونے کے خوف کا شکار ہیں۔ اوز کہتا ہے کہ گش کا حقیقی مقصد نابلوس یا ہیبرون کو فتح کرنا نہیں بلکہ

> ''ریاست اسرائیل پر یہودیت کے ایک بدصورت اور مسخ شدہ روپ کو نافذ کرنا ہے۔ اس فرقے کا حقیقی مقصد عربوں کو اس لیے بے دخل کرنا ہے تاکہ بعد میں وہ یہودیوں کو اپنے جبر کا نشانہ بنا سکے''۔

مذہبی اور سیکولر لوگ ایک دوسرے کو دہشت کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے فریق کو واضح نہیں دیکھ سکتا۔ ہر کوئی ''دوسرے فریق'' کی زیادتیوں' مظالم اور عدم رواداری کو یاد کرتا ہے اور ان میں امن نہیں ہو سکتا۔

امریکہ میں نفرت اور تقسیم:

تقسیم اور نفرت امریکہ میں بھی موجود تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ امریکہ میں مذہبی بنیاد پرست زیادہ محدود اور قانون کے پابند تھے۔ ان بنیاد پرستوں نے اپنے صدور کو قتل نہیں کیا' انقلابات کی قیادت نہیں کی اور لوگوں کو یرغمال نہیں بنایا۔ سروے ظاہر کرتے تھے کہ امریکہ کی مذہبی آبادی دو مساوی طور پر مشتعل دھڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ 1984ء میں ہونے والے ایک گیلپ سروے نے ظاہر کیا کہ 43 فیصد امریکی اپنے آپ کو ''لبرل'' کہلواتے ہیں جبکہ 41 فیصد ''قدامت پسند'' اور یہ کہ بڑے فرقے تقسیم کا شکار ہیں۔

سروے میں سوالوں کے جواب دینے والے بیشتر لوگوں نے کہا کہ یہ تقسیم بہت ''سنگین'' ہو چکی ہے''۔ دیگر سروے ظاہر کرتے تھے کہ اگرچہ صرف 9 فیصد امریکیوں نے خود کو ''بنیاد پرست'' قرار دیا' تاہم پروٹسٹنٹ بنیاد پرستی کے اساسی عقائد اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر مانے جاتے ہیں۔

''44 فیصد کا عقیدہ تھا کہ نجات صرف حضرت عیسیٰؑ دلوائیں گے۔

30 فیصد نے اپنے آپ کو Born-again قرار دیا۔

28 فیصد کا عقیدہ تھا کہ بائبل کو لفظی طور پر ہی پڑھنا چاہیے۔

27 فیصد نے اس خیال کو رد کر دیا کہ بائبل میں سائنسی اور تاریخی غلطیاں ہو سکتی ہیں''۔

امریکی بنیاد پرستی کی کامیابی سراسر جیری فالویل اور دیگر ٹیلی ویجلسٹوں کی مرہون منت نہیں تھی۔ امریکی کلچر اور مذہبی زندگی میں ایسے عناصر موجود تھے جو عقیدے کی سطحی صورت کے لیے سازگار تھے اور جنہوں نے اس کے لیے زرخیز زمین کا سا کردار ادا کیا۔

تاہم 1980ء کی دہائی میں بنیاد پرستی کو شدید دھچکا لگا۔ کسی صدر کا قتل نہیں ہوا تھا یا کوئی دہشت گردانہ مہم نہیں چلی تھی۔ اس کی بجائے بنیاد پرستانہ کاز کو ایک سکینڈل سے نقصان ہوا تھا۔ اس سکینڈل نے ٹیلی ویجلسٹوں کو دولت لوٹنے اور جنسی سازش کے سمندر میں ڈبو دیا۔

عقائد سے عیسائی دلچسپی کی وجہ سے پروٹسٹنٹ بنیاد پرستی ان تحریکوں سے' جن کا ہم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے ذکر کر چکے ہیں' مختلف جہت میں شروع ہوئی تھی۔ یہودیوں اور مسلمانوں نے اپنی اپنی Mythoi کو عملیت پسندانہ Logoi میں ڈھالا۔ اس کے برعکس پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے اسطورہ کو مختلف طریقے سے ڈھالا تھا۔ انہوں نے عیسائی اسطورہ کو سائنسی حقائق میں ڈھال دیا تھا اور ایک چوں چوں کا مربہ تیار کیا تھا جو نہ تو اچھی سائنس تھا اور نہ اچھا مذہب۔ چونکہ پروٹسٹنٹ بنیاد پرست وجدان اور تصوف کے قائل نہیں تھے' اس لیے وہ لاشعور سے' شخصیت کے عمیق تر محرکات سے بھی نابلد رہے۔ نتیجتاً امریکی احیاء پسندی بعض اوقات انار کی زدہ (Anarchic) اور نیوراتی رہی ہے۔ 1980ء کی دہائی کے اواخر تک بعض بنیاد پرست اس عقلیت پسندانہ عقیدے کی حد بندیوں کے خلاف بغاوت کرنے پر تیار تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بنیاد پرستی کے لیے جنس مسئلہ رہی ہے۔ شاید اسی لیے حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جب بھی مسئلہ ابھرتا ہے' اس کا روپ جنسی ہوتا ہے۔

''ہیریٹیج یو ایس اے'' (Heritage USA) شمالی امریکہ میں ایوانجیلیکل تجربے کا ڈزنی طرز کا اظہار ہے۔ یہ ایک پارک ہے' جس میں عیسائیت کو پیش کیا گیا ہے کافی زیادہ لوگ اس کی سیر کرنے آتے ہیں۔ امریکی عالم بشریات سوسن ہارڈنگ ایک مضمون میں لکھتی ہیں کہ بیکرز نے شعوری طور پر فالویل کی کامن سینس مذہبیت کے خلاف بغاوت کی تھی اور بنیاد پرستی کو ایک نئے مابعد جدید مرحلے میں ڈال دیا تھا۔ وہ علیحدگی کی اخلاقیات کے حامل تھے۔ بنیاد پرستوں نے ایک ایسی روثقافت تخلیق کی تھی' جس میں وہ سب کچھ تھا' جو مرکزی دھارے کے بے خدا کلچر میں نہیں تھا۔

بنیاد پرستوں نے اپنے عقیدے کو سائنسی اور عقلی بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ایک غیر فطری روپ دیا۔ ہیریٹیج یو ایس اے میں صداقت کو سطحی اور غیر فطری طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ مارچ 1987ء میں سکینڈل نے پورے ملک کو لپیٹ میں لے لیا۔ ''شارلٹ آبزرور'' نے الزام لگایا کہ 1980ء میں جم بیکر نے جیسیکا ہان کو نشہ آور شے پلائی اور اسے ورغلایا۔ جیسیکا ہان لانگ آئی لینڈ کی رہنے والی ایک چرچ سیکرٹری تھی' جس کو بعدازاں خاموش رہنے کے لیے 250,000 ڈالر ادا کیے گئے۔

فالویل نے قدامت پسندانہ' ماقبل جدید مذہب کی حدود میں رہنے کی کوشش کی تھی۔ بیکر کے قصے سے عیاں ہوتا ہے کہ جب پابندیاں مکمل طور پر ہٹا دی جاتی ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ بیکرز کے پاس اتنی بے اندازہ دولت آ گئی تھی کہ انہوں نے سوچا وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی پابندیاں نہیں تھیں اور خیر وشر کی پرانی درجہ بندی کو اسی طرح تحلیل کیا جا سکتا تھا جس طرح ہیریٹیج یو این اے میں سچ اور افسانے کو باہم ملایا گیا ہے۔

آپریشن ریسکیو:

تاہم امریکہ میں بنیاد پرستی فنا نہیں ہوئی تھی' بلکہ حقیقت میں وہ ایک نئے اور زیادہ انتہا پسندانہ مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ 28 نومبر 1987ء کو رینڈل ٹیری جو نیویارک کا ایک Bornagain عیسائی ہے' اپنے تین سو ''بچانے والوں'' کے ساتھ نیوجرسی میں چیری ہل کے ایک اسقاط حمل کرنے والے کلینک پہنچا۔ وہاں انہوں نے ٹیری کے بقول ''جہنم کی دہلیز'' پر تقریباً گیارہ گھنٹے عبادت کی اور خواتین اور عملے کو کلینک میں داخل ہونے سے روک دیا۔ دن کے اختتام پر 211 ''بچانے والوں'' کو گرفتار کر لیا گیا' تاہم ٹیری نے فاتحانہ انداز میں کہا ''کوئی بچہ نہیں مرا''۔ یہ ''آپریشن ریسکیو'' (Operation Rescue) کا پہلا اقدام تھا' اس تنظیم نے مرکزی دھارے کے کلچر کو خلقی طور پر ہلاکت انگیز قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف اعلان جنگ کیا ہوا تھا۔ یہ تحریک جنگی اصطلاحات استعمال کرتی تھی۔ 1988ء میں اٹلانٹا میں منعقدہ جمہوری کنونشن کے دوران تحریک نے ٹیری کے بقول ''اٹلانٹا کا محاصرہ'' کیا' جس میں شہر کے اسقاطِ حمل کرنے والے کلینکوں کا راستہ روکنے والے تیرہ سو کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ فالویل اور رابرٹسن کے برخلاف ٹیری قانون کے احاطے سے باہر بھی اقدام کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس کا مقصد بنیاد پرستانہ تھا: ''ایک ایسی قوم تخلیق کرنا ہے' جہاں ہماری سیاست' ہمارے عدالتی نظام اور ہماری عوامی اخلاقیات کی بنیاد ایک بار پھر یہودی عیسائی اصول اخلاق ہوں گے۔ ایک ایسی قوم جو ہیومنزم کے غیر یقینی سمندر میں غوطے نہیں کھا رہی ہوگی بلکہ ایک ایسا ملک جس کی اساس ''اعلیٰ قانون'' ہوں گے۔''

یہ مہم صرف اسقاطِ حمل کے خلاف نہیں ہے۔ 1920ء کی دہائی کے ولیم جینگز برائن کی طرح ٹیری اور اس کے پیروکاروں کو یقین ہے کہ وہ سیکولر جدیدیت کے ایک انتہائی ظالمانہ عمل کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ٹیری کو یقین ہے کہ اگر آپریشن ریسکیو کامیاب نہیں ہوا تو امریکہ برباد ہو جائے گا۔ تاہم وہ پراعتماد ہے کہ: ''ہمارے پاس فوج ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا کہ ان اقدامات کے نتیجے میں ''بچوں کا قتل عام رک جائے گا' بچہ فحاشی (Child Pornography) اور فحاشی ختم ہو جائے گی.....ہم کلچر کی طرف لوٹ آئیں گے۔'' اس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بقول یہ متوقع المیے سے امریکی تہذیب کو بچانے کی جنگ ہے۔

ری کنسٹرکشن موومنٹ:

ٹیکساس کے باشندے اور ماہر معاشیات گیری نارتھ اور اس کے سسر روس جان رشڈونی نے ''دی ری کنسٹرکشن موومنٹ'' (The Reconstruction Movement) کے نام سے ایک تحریک شروع کی ہوئی ہے۔ یہ ''مورل میجارٹی'' (Moral Majority) سے زیادہ انتہاپسندی کے ساتھ سیکولر ہیومنزم کے خلاف جنگ کررہی ہے۔ ری کنسٹرکشنسٹوں (Reconstructionists) نے پری ملینیل قنوطیت کو ترک کرکے ایک تحرک آمیز نظریہ اپنایا ہوا ہے۔ انہوں نے عزم کیا ہوا ہے کہ ایک ایسی عیسائی تہذیب کو لازماً تشکیل دیا جانا چاہیے جو شیطان کو شکست دے اور ملینیل بادشاہت کا آغاز کرے۔ عیسائیوں کا فرض ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی دوبارہ آمد سے قبل پوری دنیا پر عیسائیت کی حکمرانی قائم کریں۔ یہ نظریہ ری کنسٹرکشن کی بنیاد ہے۔ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ جدید ریاست کو منہدم کرنے کے لیے عیسائیوں کو کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے' خداوند خود ایک ہولناک المیے میں اس کو تباہ کردے گا۔ عیسائی خداوند کے اس عمل کے نتیجے میں فتح یاب ہوں گے۔

اس دوران ری کنسٹرکشنسٹوں کو سیکولر ہیومنسٹ ریاست کی تباہی کے بعد اقتدار سنبھالنے کے لیے تربیت لینی چاہیے۔ ہمدردی اور رحم کے عیسائی عقیدے کو ترک کرکے انہوں نے عیسائیت کو بری طرح مسخ کردیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ''بادشاہت'' قائم ہوجائے گی تو چرچ اور ریاست میں دوئی نہیں رہے گی' جمہوریت کی جدیدیت والی بدعت مٹ جائے گی اور معاشرے کو بائبل کے احکامات کے مطابق سختی سے دوبارہ تشکیل دیا جائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ بائبل کے ہر ایک قانون کا اطلاق لفظاً کیا جائے گا۔ غلامی کو دوبارہ شروع کردیا جائے گا' برتھ کنٹرول (Birth Control) ختم کردیا جائے گا (کیونکہ عیسائی عقیدے کو ماننے والوں کی تعداد میں لازماً اضافہ ہونا چاہیے)' زناکاروں' ہم جنس پرستوں' مقدس شخصیات کی توہین کرنے والوں' ماہرین فلکیات اور جادوگرنیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ سرمایہ دارانہ معیشت کو سختی سے قائم کیا جائے گا' سوشلسٹ اور بائیں بازو کی طرف مائل لوگ گناہگار ہیں۔ خداوند غریبوں کا طرف دار نہیں ہے۔ نارتھ نے وضاحت کی کہ اس کی بجائے ''برائی اور غربت میں تو گہرا تعلق ہوتا ہے۔'' ٹیکسوں کو فلاحی پروگراموں پر خرچ نہیں کیا جائے گا کیونکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''کاہل افراد کی اعانت کرنا شر کی اعانت کرنے کے مترادف ہے۔'' تیسری دنیا کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جائے گا کیونکہ اس کے معاشی مسائل اس کے اپنے کفر اور اخلاقی بے راہروی کا نتیجہ ہیں۔ بائبل غیر ملکی امداد (Foreign Aid) کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ نارتھ اعتراف کرتا ہے کہ فتح میں دیر لگ سکتی ہے تاہم عیسائیوں کو اس دوران خداوند کے خاکے (Blueprint) کے مطابق معاشرے کی تشکیل نو کے لیے تیاری کرنی چاہیے اور حکومت کی ان پالیسیوں کی تائید کرنی چاہیے' جو بائبل کے ان سخت احکامات سے مطابقت رکھتی ہوں۔

نارتھ اور رشڈونی کی متصورہ سلطنت کلیت پسندانہ ہوگی۔ وہاں کسی دوسری سوچ یا پالیسی کی جگہ نہیں ہوگی' مقابل جماعتوں کے لیے کوئی جمہوری رواداری نہیں ہوگی' نہ ہی انفرادی آزادی ہوگی۔ اس نظریے کے امریکہ میں مقبولیت حاصل کر لینے کے امکانات بہت کم ہیں تاہم میں یہ ضرور کہوں گی کہ اگر کوئی بڑا ماحولیاتی یا معاشی المیہ رونما ہوا تو روشن خیالی کے لبرل نظام کی جگہ ایک آمریت پسندانہ ریاستی چرچ (State Church) لے لے گا۔ بہرطور عیسائیت نے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے متضاد سرمایہ داریت کو بھی تو قبول کر لیا تھا۔ یہ ایک فاشسٹ نظریے کو بھی اپنا سکتی ہے' جو کہ خوفناک حد تک تبدیل شدہ حالات میں نظم و نسق بحال کرنے کے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔

بعض زیادہ قدامت پسند پینٹی کوسٹلسٹ ری کنسٹرکشن الٰہیات میں دلچسپی کا اظہار کر چکے ہیں' حالانکہ رشڈونی پینٹی کوسٹل ازم کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ پیٹ رابرٹسن ایک عبوری شخصیت دکھائی دیتا ہے۔ وہ پینٹی کوسٹل ازم اور احیاپسندی (Revivalism) کی طرف میلان رکھنے والا بپٹسٹ ہے۔ نارتھ کی طرح اسے بھی یقین ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی دوسری آمد میں دیر ہو سکتی ہے — یہ عقیدہ اسے روایتی پری ملینیل بنیاد پرستی سے الگ کرتا ہے۔ رابرٹسن کا ایقان ہے کہ اس دوران عیسائیوں کو چاہیے کہ وہ معاشرے کو انجیلی خطوط پر تعمیر کرنے کے لیے حکومتی عہدے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس نے ورجینیا بیچ (Virginia Beach) پر واقع اپنی یونیورسٹی کا نام تبدیل کر کے ''ریجنٹ یونیورسٹی'' رکھ دیا ہے۔ اس نے وضاحت کی کہ ریجنٹ (Regent) ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو ''بادشاہ کی عدم موجودگی میں حکومت کرتا ہے۔'' اس یونیورسٹی کا مقصد اپنے طلباء کو ''بادشاہت'' قائم ہونے پر اقتدار سنبھالنے کے لیے تیار کرنا ہے۔ امریکہ میں بنیاد پرستی ''دی فنڈامینٹلز'' (The 1910-15ء Fundamentals) کی اشاعت کے زمانے والی بنیاد پرستی کی نسبت تبدیل ہو چکی ہے۔ اب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ایک طرف تو مابعد جدید مذہبی رجحانات اور دوسری طرف ایک سخت گیر کلیت پسندانہ وژن کی حامل ہے۔

امریکی بنیاد پرستوں اور لبرل لوگوں میں ڈھکی چھپی جنگ:

بنیاد پرستی ختم نہیں ہوگی۔ امریکہ میں مذہب طویل عرصے سے حکومت کا مخالف ہے۔ اس کا عروج و زوال ہمیشہ دائروی ہوتا ہے اور گزشتہ چند برسوں کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ قدامت پسندوں اور لبرل لوگوں میں اب ایک ڈھکی چھپی جنگ جاری ہے جو وقتاً فوقتاً خوفناک انداز میں ظاہر بھی ہو جاتی ہے۔ 1992ء میں جیری فالویل نے' جو کہ اب بھی پرانے طرز کی بنیاد پرستی پر کاربند ہے' اعلان کیا کہ بل کلنٹن کے صدارتی انتخاب جیتنے سے امریکہ میں شیطان کو کھلی چھٹی مل گئی ہے۔ فالویل نے کہا کلنٹن فوج اور قوم کو تباہ کر دے گا۔ وفاقی امداد سے چلنے والے اسقاطِ حمل کے کلینکوں کے قیام کی اجازت دینے والے سرکاری حکام اور ہم جنس پرستوں کے حقوق کی سرکاری منظوری جیسے اقدامات اس امر کی نشانیاں ہیں کہ امریکہ نے ''خداوند کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے۔''

1993ء میں اس جنگ میں جانی نقصان ہوا۔ 28 فروری 1993ء کو الکوحل' تمباکو اور آتشیں اسلحہ کے بیورو نے واکو' ٹیکساس میں واقع ڈیوڈ کوروش کے احاطے پر دھاوا بول دیا' کیونکہ وہ مبینہ طور پر اسلحہ ذخیرہ کر رہا تھا۔ درحقیقت ٹیکساس کے اکثر باشندوں کی طرح سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹس سے جنم لینے والی ایک تنظیم Branch Davidians کے پاس کافی زیادہ اسلحہ موجود تھا' تاہم بظاہر وہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کی کوئی سوچ نہیں رکھتے تھے۔ یہ حملہ امریکی حکومت کی طاقت اور جواز کو ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا تھا لیکن اس کے الٹ نتائج پیدا ہوئے۔ اس حملے کے دوران احاطے کو ایف بی آئی نے گھیر لیا' عمارت کو آگ لگا دی گئی اور 80 مرد' عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے۔ اس اقدام سے امریکی حکومت کی اس فرقے سے لاعلمی' محصور داؤدیوں (Davidians) کے سامنے اس کی بے بسی اور حالات و واقعات کو کنٹرول کرنے کی اس کی المناک نااہلی عیاں ہو گئی۔

انتہا پسند امریکی عیسائی:

ادھر انتہا پسند عیسائی بھی سیکولر حکومت سے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کتاب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں ایک فاشسٹ گروپ Christian Identity کا ذکر نہیں کیا جا رہا کیونکہ اس نے بنیاد پرستی کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس تنظیم کے ارکین Rapture پر یقین نہیں رکھتے' جس نے ان کے بقول امریکی مذہب کو بیجڑا بنا دیا ہے۔ وہ سامیت دشمن ہیں اور صیہونیت کو مدد دینے والے بنیاد پرستوں سے نفرت کرتے ہیں اور اس عمل کو بہت بڑا گناہ تصور کرتے ہیں۔ وہ یہودیوں کے ارضِ مقدس پر قبضے کو غلط سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ ''آخری زمانے'' کی جنگیں مشرق وسطیٰ میں نہیں بلکہ امریکہ میں لڑی جائیں گی۔ انہوں نے ایک نئے ہولوکاسٹ کی پیشگوئی کی ہے جس میں سفید فام نسل اور امریکہ فنا ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو اس المیے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ وہ وفاق کی متوقع تباہی کی پیش بینی کرتے ہیں جسے وہ زیڈ او جی (Zionist Occupation Government) کہتے ہیں۔ ان کے بقول اس حکومت پر شیطان اور یہودیوں کا غلبہ ہے' جو آریائی قوم کو تباہ کرنا چاہتے ہیں' اس کے بعض اراکین جنوب مغربی امریکہ کے دور دراز علاقوں میں عسکریت پسند گروپوں کی صورت میں اکٹھے ہو چکے ہیں' جنگی تیکنیکیں سیکھ رہے ہیں' اسلحہ اکٹھا کر رہے ہیں اور آخری جنگ لڑنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ بعض گروپوں نے ریاستی اہلکاروں کو قتل کر کے زیڈ او جی پر عسکری حملے کیے ہیں۔ دیگر نے اسقاطِ حمل کے کلینکوں پر بم پھینکے اور آگ لگائی ہے۔ اسی نظریے کے زیر اثر ٹموتھی میک وائی نے 19/اپریل 1995ء کو اوکلاہوما سٹی میں وفاقی عمارت پر بم حملہ کیا تھا۔

کرسچین آئیڈینٹٹی:

''کرسچین آئیڈینٹٹی'' کی سرگرمیوں کا احاطہ کرنا مشکل ہے' کیونکہ وہ بہت سی تنظیموں کا ملغوبہ ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد کم ہے' شاید ایک لاکھ کے قریب اور ہو سکتا ہے۔ اس سے پچاس ہزار زیادہ ہو۔ تاہم ایک رجحان کے طور پر ''کرسچین آئیڈینٹٹی'' پریشان کن ہے۔ بنیاد پرستوں کی طرح انہوں نے بھی خوف اور توہین کے زیر اثر دنیا کو ترک کر دیا ہے اور اس پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اس کے اراکین کو بھی بنیاد پرستوں کی طرح ہر طرف سازش کارفرما نظر آتی ہے اور وہ اشتعال اور آزردگی کی الٰہیات پر کاربند ہیں۔ تاہم وہ اپنے واضح فاشسٹ نظریے' امریکی حکومت سے اپنی شدید نفرت اور جدید زندگی سے اپنی انتہا پسندانہ علیحدگی میں بنیاد پرستوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ امریکہ میں اپنی الگ آریائی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کرسچین آئیڈینٹٹی بیگانگی اور دہشت کا ایک ایسا نظریہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وضع کر چکی ہے جس کی امریکی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ہوسکتا ہے سیکولر ایسٹیبلشمنٹ اور مرکزی دھارے کے فرقے یہ محسوس کرتے ہوں کہ امریکہ میں بنیاد پرستانہ خطرہ ٹل گیا ہے۔ تاہم جہاں تک کچھ عیسائیوں کا تعلق ہے تو ان کے لیے جنگ اب بھی جاری ہے' ان کا عقیدہ ہے کہ وفاقی حکومت کو لازماً تباہ کر دینا چاہیے اور یہ تنازعہ یقیناً اکیسویں صدی عیسوی میں بھی جاری رہے گا۔

مذہب بہرحال معدوم نہیں ہوا اور بعض حلقوں میں یہ ہمیشہ سے زیادہ عسکریت پسندانہ ہو چکا ہے۔ تینوں توحید پرست مذاہب میں بنیاد پرستی مذہب کو نجی معاملہ قرار دینے یا مذہب کو دبا دینے کی کوششوں کے ردعمل میں پیدا ہوئی ہے۔ بنیاد پرستوں کا ایقان ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کو مٹنے سے بچا چکے ہیں۔ یہ ایک مشکل جدوجہد ہے اور اس دوران عقیدہ اکثر و بیشتر مسخ ہوا ہے' اس سے مذہب کی شکست کی عکاسی ہوتی ہے۔ تاہم بنیاد پرستی اب جدید دنیا کا حصہ بن چکی ہے۔ یہ وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی مایوسی' بیگانگی' اندیشگی اور اشتعال کی عکاس ہے' جسے کوئی حکومت نظرانداز نہیں کر سکتی۔ اب تک تو بنیاد پرستی سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ ہم ماضی سے کیا سبق سیکھ سکتے ہیں جو ہمیں مستقبل میں بنیاد پرستی سے پیدا ہونے والے مسائل سے زیادہ تخلیقی انداز میں نمٹنے میں مدد دیں؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پس لفظ

ہم اس طرح سے مذہبی نہیں ہو سکتے جس طرح کہ ہمارے آباؤاجداد ماقبل جدید قدامت پسندانہ دنیا میں ہوا کرتے تھے۔ اب ہم مستقبل اساس ہو چکے ہیں اور ہم میں سے ایسے افراد جو جدید دنیا کے عقلیت پسندانہ سانچے میں ڈھل چکے ہیں' وہ روحانیت کی پرانی صورتوں کو با آسانی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم روایتی مذہب اختیار کرنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں' ہم صداقت کو واقعاتی' تاریخی اور تجربی صورت میں دیکھنے کا فطری رجحان رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس امر کے قائل ہو چکے ہیں کہ عقیدے کو تبھی سنجیدگی سے لیا جا سکتا ہے جب وہ تاریخی اور عملی طور پر کارآمد ہو۔ لوگوں کی کثیر تعداد' بالخصوص مغربی یورپ میں' مذہب کو رد کر چکی ہے۔ وہ عقل کو صداقت تک جانے والا واحد راستہ تصور کرتے ہیں۔ تاہم ہماری صدی میں ہونے والی نسل کشی کی دہشت کا سامنا ہونے پر عقل دم بخود ہے۔

جدید کلچر کے قلب میں ایک خلا ہے' جس کے تجربے سے مغرب کے لوگ اپنے سائنسی انقلاب کے ابتدائی مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ پاسکل' ڈیکارٹ' ہابز اور نطشے جیسے فلسفیوں نے سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیا۔ سارتر اور البیر کامیو (1931-60ء) جیسے ادیبوں نے مذہب کو ترک کر دینے والے مردوزن کو مستقبل میں انسانیت پر محبت نثار کرتے دیکھا۔ روشن خیالوں نے مستقبل کے انسان کو زیادہ عقلی اور روادار تصور کیا' انہوں نے فرد کی آزادی کو زیادہ اہمیت دی۔ وہ روحانیت کی سیکولر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورتیں وضع کر چکے ہیں' جو انہیں بصیرت' ماورائیت اور مسرت عطا کرتی ہیں۔

بایں ہمہ لوگوں کی کثیر تعداد اب بھی مذہبی ہونا چاہتی ہے اور وہ عقیدے کی نئی صورتیں وضع کرنے کی کوششیں کر چکے ہیں۔ بنیاد پرستی ان جدید مذہبی تجربوں میں سے صرف ایک ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں' اس نے مذہب کو دوبارہ بین الاقوامی ایجنڈے پر لا کر ایک خاص کامیابی بھی حاصل کی ہے' تاہم اس نے مذہب کی انتہائی مقدس اقدار کو اکثر نظر انداز کیا ہے۔ بنیاد پرستوں نے متھوس کو لوگوس میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ امریکی پروٹسٹنٹ بنیاد پرستوں نے اس امر پر اصرار کر کے کہ عیسائیت کی صداقتیں واقعاتی اور سائنسی اعتبار سے ثابت کی جا سکتی ہیں' مذہب اور سائنس دونوں کا کیری کیچر بنا دیا ہے۔ سب بنیاد پرستوں نے زیادہ روادارانہ' ہمہ گیر اور ہمدردانہ تعلیمات کو نظر انداز کیا ہے اور غصے' آزردگی اور انتقام کے نظریات کو فروغ دیا ہے۔

تاہم بنیاد پرستانہ اشتعال ہمیں احساس دلاتا ہے کہ ہمارا جدید کلچر انسانوں سے انتہائی مشکل مطالبے کرتا ہے۔ یقیناً اس نے ہمیں طاقت عطا کی ہے' نئی دنیائیں ہم پر کشادہ کی ہیں' ہمارے آفاق کو وسعت بخشی ہے اور ہم میں سے بہت سوں کو زیادہ مسرور اور صحت مند زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا ہے' تاہم اس نے ہماری عزتِ نفس کو اکثر مجروح کیا ہے۔ جہاں عقلی تصورِ جہاں (ورلڈ ویو) نے انسان کو ہر شے کا معیار قرار دیا وہاں اسے حقیر اور بے وقار بھی ٹھہرایا۔ کوپرنیکس نے ہمیں کائنات کے مرکز کی حیثیت سے محروم کر دیا اور محیط پر دھکیل دیا۔ ڈارون نے تو سیدھا سیدھا ہمیں جانور قرار دے دیا اور فرائیڈ نے انکشاف کیا کہ مکمل طور پر عقلی مخلوق ہونا تو دور کی بات ہے' انسان تو لاشعور کی غیر منطقی قوتوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ بلاشبہ اس کا مظاہرہ جدید تاریخ میں جادوگرنیوں کے شکار اور عالمی جنگوں کی صورت میں ہو چکا ہے۔ ایک ''اعلیٰ تر'' اساطیری صداقت کی پابندیوں کے بغیر عقل شیطانی ہو سکتی ہے اور بنیاد پرستوں کی طرح ہی بڑے جرائم کا ارتکاب کر سکتی ہے۔

جبر و استبداد مسئلے کا حل نہیں ہیں۔ امریکہ کے پروٹسٹنٹ بنیاد پرست سکوپس مقدمے میں اپنی تحقیر و تذلیل کے بعد زیادہ سخت گیر ہو گئے تھے۔ سُنّی بنیاد پرستی کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انتہا پسندانہ صورتیں ناصر کے عقوبت کدوں میں پیدا ہوئی تھیں اور شاہ کا ظلم و ستم اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بنا تھا۔ بنیاد پرستی ایک جنگجویانہ عقیدہ ہے' یہ متوقع فنا کے ڈر میں رہتی ہے۔ یہودی بنیاد پرست' خواہ وہ صیہونی ہوں یا الٹرا آرتھوڈوکس' اب بھی ہولوکاسٹ اور سامیت دشمن کے المیے سے خوفزدہ ہیں۔ جبر و استبداد نے ان لوگوں کی روحوں میں گہرا ڈنک مارا ہے' جنہوں نے سیکولرازم کا تجربہ ایک جارحیت کے طور پر کیا اور اس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے مذہبی وژن کو تشدد آمیز اور عدم رواداری بنا لیا ہے۔ بنیاد پرست ہر جگہ سازش دیکھتے ہیں اور بعض اوقات ایسے اشتعال کا شکار ہو جاتے ہیں جو شیطانی دکھائی دیتا ہے۔

دو باتوں کا جان لیا جانا بہت اہم ہے: اول' ان تصورات کی جڑیں خوف میں ہیں۔ بنیاد پرستوں کے تمام تر علیحدگی پسندانہ رجحانات' سرحدیں کھینچنا اور محفوظ علاقے تشکیل دینا ــــ سب فنا کے خوف کے آئینہ دار ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ سیکولر لوگ انہیں مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس خوف کو جابرانہ اقدامات کے ذریعے ختم کرنا ناممکن ہے۔ دوم: اس حقیقت کو جان لینا اہم ہے کہ یہ تحریکیں ماضی کی طرف واپسی نہیں ہیں بلکہ یہ تو جدید' اختراعی اور جدید بنانے والی ہیں۔ پروٹسٹنٹ بنیاد پرست بائبل کو ایک لفظی' عقلی انداز میں پڑھتے ہیں' جو کہ ماقبل جدید روحانیت کے زیادہ صوفیانہ' مجازی طریقے سے بالکل مختلف ہے۔ خمینی کا ولایت فقیہہ کا نظریہ صدیوں کی شیعی روایت میں ایک ہلا دینے والی اور انقلابی تبدیلی تھی۔ مسلمان مفکرین نے آزادی کی الٰہیات کی تبلیغ کی اور ایک استعمار دشمن نظریہ تخلیق کیا' جو اپنے زمانے کی تیسری دنیا کی دوسری تحریکوں سے مماثل تھا۔

ہم ساری کتاب میں دیکھ چکے ہیں کہ مذہب نے لوگوں کو جدیدیت سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد دی ہے۔ بلاشبہ یورپ میں سیکولرازم اور سائنسی عقلیت پسندی کو پہلے پہل مذہبی ہونے کے نئے طریقے ہی تصور کیا گیا تھا۔ بعض حالیہ تحریکیں بھی جدید بنانے والی تھیں۔ حسن البنا' علی شریعتی اور حتیٰ کہ خمینی نے بھی مسلمانوں کو ایک اسلامی سانچے کے اندر جدیدیت کی طرف لانے کی کوشش کی تھی' جو کہ مغرب سے درآمد شدہ نظریات کی نسبت ان کے لیے زیادہ شناسا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ
www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

کئی حوالوں سے بنیاد پرست جدیدیت کی تقسیموں کو (چرچ اور ریاست' سیکولر اور غیر سیکولر کے درمیان) رد کر چکے ہیں اور انہوں نے گمشدہ کاملیت کو دوبارہ تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کے لیے لڑی جانے والی یہ جنگ سائنسی عقلیت پسندی کی اساس پر استوار معاشرے کے قلب میں موجود خلا کو بھرنے کی ایک کوشش تھی۔ اخوان المسلمون اور جماعت اسلامیہ نے غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت بڑے پیمانے پر خدمات انجام دیں جبکہ حکومتیں غریبوں کی حالت سے یکسر لاتعلق تھیں۔ ان تحریکوں کی مقبولیت نے عیاں کر دیا کہ مصری سیکولر کی بجائے مذہبی بننا چاہتے ہیں۔ ایران میں خمینی کی کامیابی نے بھی اس حقیقت کی توثیق کی تھی۔

جنگ کی حالت میں ہونے کی وجہ سے معاشرے کو مقدس بنانے کی یہ مہم جارحانہ ہوگئی تھی۔ اس میں مذہبی زندگی میں جوہری حیثیت کی حامل رحم اور ہمدردی کی قدروں کا فقدان تھا۔ اس کے بجائے اس نے اخراج' نفرت اور حد تو یہ ہے کہ تشدد کے نظرئے کا پرچار کیا۔ تاہم غصے پر بنیاد پرستوں ہی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ ان کی تحریکیں جارحانہ سیکولر ازم کے ساتھ ایک جدلیاتی تعلق سے پیدا ہوئی تھیں' جس نے کہ مذہب اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ بنیاد پرستوں اور سیکولر لوگوں کی نفرت باہم مربوط ہے۔ اس لیے دونوں ہی کو رحم دلی اور رواداری لازماً اپنانا ہوگی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

BIBLIOGRAPHY

Abidi, A. *Jordan: A Political Study*. London, 1965.

Ahlstrom, Sydney E. *A Religious History of the American People*. Garden City, N.Y., 1972.

Ahmed, Akbar S. *Postmodernism and Islam, Predicament and Promise*. London and New York, 1972.

Ahmed, Leila. *Women and Gender in Islam: Historical Roots of a Modern Debate*. New Haven, Conn., and London, 1992.

Akhavi, Shahrough. *Religion and Politics in Contemporary Iran: Clergy-State Relations in the Pahlavi Period*. Albany, N.Y., 1980.

———. "Shariati's Social Thought." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.

Alatus, Syed H. *Intellectuals in Developing Societies*. London, 1977.

Al-e Ahmad, Jalal. *Occidentosis: A Plague from the West*. Trans. R. Campbell. Ed. Hamid Algar. Berkeley, 1984.

Algar, Hamid. *Religion and State in Iran, 1785–1906*. Berkeley, 1969.

———. "The Oppositional Role of the Ulama in Twentieth-Century Iran." In Nikki R. Keddie (ed.), *Scholars, Saints and Sufis, Muslim Religious Institutions in the Middle East Since 1500*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1972.

———. *Mirza Malkum Khan, A Biographical Study of Iranian Modernism*. Berkeley, 1973.

Altmann, Alexander. *Moses Mendelssohn: A Biographical Study*. University, Ala., 1973.

———. *Essays in Jewish Intellectual History*. Hanover, N.Y., 1981.

Amir-Moezzi, Mohammed Ali. *The Divine Guide in Early Shiism: The Sources of Esotericism in Islam*. Trans. David Streight. Albany, N.Y., 1994.

Ammerman, Nancy T. *Bible Believers: Fundamentalists in the Modern World*. New Brunswick, N.J., 1987.

———. "North American Protestant Fundamentalism." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms Observed*. Chicago and London, 1991.

Andrews, Samuel J. *Christianity and Anti-Christianity in Their Final Conflict*. Chicago, 1937.

Annesley, George. *The Rise of Modern Egypt: A Century and a Half of Egyptian History, 1798–1952*. Durham, UK, 1994.

Appleby, R. Scott (ed.). *Spokesmen for the Despised: Fundamentalist Leaders of the Middle East*. Chicago, 1997.

Aran, Gideon. "The Roots of Gush Emunim," *Studies in Contemporary Jewry* 2, 1986.

———. "Jewish Zionist Fundamentalism." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms Observed*. Chicago and London, 1991.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

——. "The Father, the Son and the Holy Land, The Spiritual Authorities of Jewish-Zionist Fundamentalism in Israel," in R. Scott Appleby (ed.), *Spokesmen for the Despised: Fundamentalist Leaders of the Middle East*. Chicago, 1997.

Arendt, Hannah. *The Origins of Totalitarianism*. New York, 1958.

——. *On Revolution*. New York, 1963.

Avineri, Schlomo. *The Making of Modern Zionism: The Intellectual Origins of the Jewish State*. London, 1981.

Avishai, Bernard. *The Tragedy of Zionism: Revolution and Democracy in the Land of Israel*. New York, 1985.

Baer, Y. *History of the Jews in Christian Spain*. Philadelphia, 1961.

Baker, George W., and Dwight W. Chapman (eds.). *Men and Society in Disaster*. New York, 1962.

Bakker, Jim (with Robert Paul Lamb). *Move That Mountain!* Plainfield, N.J., 1976.

Bakker, Tammy (with Cliff Dudley). *I Gotta Be Me*. Harrison, Ark., 1978.

——— (with Cliff Dudley). *Run to the Roar*. Harrison, Ark., 1980.

Baktash, Magel. "Ta'ziyeh and Its Philosophy." In Peter J. Chelkowski (ed.), *Ta'ziyeh: Ritual and Drama in Iran*. New York, 1979.

Baring, Evelyn, Lord Cromer. *Modern Egypt*. 2 vols. New York, 1908.

Barkett, Larry. *Your Finances in Changing Times*. Chicago, 1975.

Barkun, Michael. *Disaster and the Millennium*. New Haven and London, 1974.

——. "Divided Apocalypse: Thinking About the End in Contemporary America." *Soundings* 66: 3, 1983.

——. *Religion and the Racist Right: The Origins of the Christian Identity Movement*. Chapel Hill, N.C., 1994.

Baron, Salo Wittmayer. *A Social and Religious History of the Jews*. 16 vols. New York, 1952.

Barr, James. *Fundamentalism*. Philadelphia, 1978.

Bateson, M. C., J. W. Clinton, J. B. M. Kassarjian, H. Safavi, and M. Soraya. "Safavy Batin: A Study of the Iranian Ideal Character Types." In L. Carl Brown and Norman Itzkowitz (eds.), *Psychological Dimensions of Near Eastern Studies*. Princeton, N.J., 1977.

Bauman, Zygmunt. *Modernity and the Holocaust*. Ithaca, N.Y., 1989.

Bayat, Mangol. *Mysticism and Dissent: Socioreligious Thought in Qajar Iran*. Syracuse, N.Y., 1982.

Beeman, William. "Cultural Dimensions of Performance Conventions in Iranian Ta'ziyeh." In Peter J. Chelkowski (ed.), *Ta'ziyeh: Ritual and Drama in Iran*. New York, 1979.

——. "Images of the Great Satan: Representations of the United States in the Iranian Revolution." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.

Beinart, Haim. *Conversos on Trial: The Inquisition in Ciudad Real*. Jerusalem, 1981.

Bellah, Robert N., and Phillip E. Hammond. *Varieties of Civil Religion*. San Francisco, 1980.

Berger, Peter L. *The Social Reality of Religion*. London, 1969.

Berthoff, Rowland, and John M. Murrin. "Feudalism, Communalism, and the Yeoman Freeholder: The American Revolution Considered as a Social Accident." In Stephen G. Kurtz and James H. Hutson (eds.), *Essays on the American Revolution*. Chapel Hill, N.C., 1973.

Bloch, Ruth H. *Visionary Republic: Millennial Themes in American Thought, 1756–1800*. Cambridge, U.K., 1985.

———. "Religion and Ideological Change in the American Revolution." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.

Bloom, Harold. *The American Religion: The Emergence of the Post-Christian Nation*. New York, 1992.

Bollier, D., *Liberty and Justice for Some: defending a free society from the radical right's holy war on democracy*. Washington, D.C., 1982.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Bonomi, Patricia U. *Under the Cape of Heaven: Religion, Society and Politics in Colonial America*. New York and Oxford, 1986.
Boone, Kathleen C. *The Bible Tells Them So: The Discourse of Protestant Fundamentalism*. London, 1990.
Borujerdi, Mehrzad. *Iranian Intellectuals and the West: The Tormented Triumph of Nativism*. Syracuse, N.Y., 1996.
Bossy, John. *Christianity and the West, 1400–1700*. Oxford and New York, 1985.
Boyer, Paul. *When Time Shall Be No More: Prophecy and Belief in Modern American Culture*. Cambridge, Mass., and London, 1992.
Briggs, Robin. "Embattled Faiths: Religion and Natural Philosophy." In Euan Cameron (ed.), *Early Modern Europe*. Oxford, 1999.
Brinton, Crane. *The Anatomy of Revolution*. New York, 1950.
Brookes, James. *Maranatha, or The Lord Cometh*. New York, 1889.
Brooks, Pat. *The Return of the Puritan*., 2nd ed. Fletcher, N.C., 1979.
Brown, Jerry Wayne. *The Rise of Biblical Criticism in America, 1800–1870: The New England Scholars*. Middletown, Conn., 1969.
Brown, L. Carl, and Norman Itzkowitz (eds.). *Psychological Dimensions of Near Eastern Studies*. Princeton, N.J., 1977.
Browne, E. G. "The Babis of Persia." *Journal of the Royal Asiatic Society* 21, 1889.
———. *A Year Amongst the Persians*. Cambridge, U.K., 1927.
Bruce, Steve. *The Rise and Fall of the New Christian Right: Conservative Protestant Politics in America 1978–1988*. Oxford and New York, 1990.
Brumberg, Daniel. "Khomeini's Legacy: Islamic Rule and Islamic Social Justice." In R. Scott Appleby (ed.), *Spokesmen for the Despised: Fundamentalist Leaders of the Middle East*. Chicago, 1997.
Buber, Martin. *Jewish Mysticism and the Legend of Baal Shem*. London, 1932.
———. *Hasidism and Modern Man*. New York, 1958.
Buckley, Michael J. *At the Origins of Modern Atheism*. New Haven, Conn., and London, 1987.
Bull, Hedly. *The Anarchic Society: A Study of Order in World Politics*. New York, 1977.
Butler, Jon. *Awash in a Sea of Faith, Christianizing the American People*. Cambridge, Mass., and London, 1990.
Cameron, Euan (ed.). *Early Modern Europe*. Oxford, U.K., 1999.
Cantor, Norman. *The Sacred Chain: A History of the Jews*. New York, 1994; London, 1995.
Caplan, Lionel (ed.). *Studies in Religious Fundamentalism*. Albany, N.Y., 1987.
Cassirer, Ernst. *The Philosophy of Enlightenment*. 4 vols. Trans. F. C. A. Koelin and J. T. Peregrove. Princeton, N.J., 1951.
Chadwick, Owen. *The Victorian Church*. 2 vols. London, 1970.
———. *The Secularization of the European Mind in the Nineteenth Century*. Cambridge, U.K., 1975.
Chelkowski, Peter J. (ed.). *Ta'ziyeh: Ritual and Drama in Iran*. New York, 1979.
Chilton, David. *Paradise Restored: A Biblical Theology of Dominion*. Fort Worth, Tex., 1985.
Choueiri, Youssef M. *Islamic Fundamentalism*. London, 1990.
Clarke, I. F. *Voices Prophesying War: Future Wars 1763–3749*. 2nd ed. Oxford and New York, 1992.
Clifford, James A., and G. E. Marcus (eds.). *Writing Culture: The Poetics and Politics of Ethnography*. Berkeley and London, 1986.
Cohn, Norman. *The Pursuit of the Millennium: Revolutionary Millennarians and Mystical Anarchists of the Middle Ages*. London, 1957.
———. *Europe's Inner Demons*. London, 1976.
———. *Cosmos, Chaos and the World to Come: The Ancient Roots of Apocalyptic Faith*. New Haven, Conn., and London, 1993.
Cole, Edwin Louis. *Maximized Manhood: A Guide for Family Survival*. Springdale, Pa., 1982.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Cole, Juan R. "Imami Jurisprudence and the Role of the Ulama: Mortaza Ansari on Emulating the Supreme Exemplar." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.

Colwell, Stephen. *The Position of Christianity in the United States, in Its Relations with Our Political Institutions and Especially with Reference to Religious Instruction in the Public Schools*. New York, 1853.

Cooper, John, Ronald L. Nettler, and Mohamed Mahmoud (eds.). *Islam and Modernity: Muslim Intellectuals Respond*. London and New York, 1998.

Corbin, Henri. *Creative Imagination in the Sufism of Ibn Arabi*. Trans. W. Trask. London, 1970.

Cox, Harvey. *The Secular City: A Celebration of Its Liberties and an Invitation to Its Disciplines*. New York, 1965.

———. *Fire from Heaven: The Rise of Pentecostal Spirituality and the Reshaping of Religion in the Twenty-first Century*. New York, 1995.

Crecelius, Daniel. "Nonideological Responses of the Egyptian Ulama to Modernization." In Nikki R. Keddie (ed.), *Scholars, Saints and Sufis: Muslim Religious Institutions in the Middle East Since 1500*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1972.

Cromartie, Michael (ed.). *No Longer Exiles: The Religious New Right in American Politics*. Washington, D.C., 1993.

Cromer, Gerald. "Withdrawal and Conquest: Two Aspects of the Haredi Response to Modernity." In Laurence J. Silberstein (ed.), *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology, and the Crisis of Modernity* (New York and London, 1993).

Cuddihy, John Murray. *The Ordeal of Civility: Freud, Marx, Levi-Strauss and the Jewish Struggle with Modernity*. Boston, 1974.

Darby, John N. *The Hopes of the Church of God in Connexion with the Destiny of the Jews and the Nations as Revealed in Prophecy*. 2nd ed. London, 1842.

———. *Lectures on the Second Coming*. Repr. London, 1909.

Davis, Joyce M. *Between Jihad and Salaam: Profiles in Islam*. New York, 1997.

Delumeau, Jean. *Catholicism Between Luther and Voltaire: A New View of the Counter Reformation*. London and Philadelphia, 1977.

De Nerval, Gérard. *Oeuvres*. Eds. Albert Beguin and Jean Richter. Paris, 1952.

De Vos, Richard. *Believe!*. Old Tappan, N.J., 1976.

Dinur, Benzion. "The Origins of Hasidism and Its Social and Messianic Foundations." In Gershon David Hundert (ed.), *Essential Papers on Hasidism, Origins to Present*. New York and London, 1991.

———. "The Messianic-Prophetic Role of the Baal Shem Tov." In Marc Saperstein (ed.), *Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History*. New York and London, 1992.

Djaït, Hichem. *Europe and Islam: Cultures and Modernity*. Berkeley, 1985.

Dobson, Ed, and Ed Hindson. *The Seduction of Power*. Old Tappan, N.J., 1988.

Dobson, James. *Dare to Discipline*. New York, 1977.

Donovan, John B. *Pat Robertson: The Authorized Biography*. New York, 1988.

Douglas, Mary, and Steven Tipton (eds.). *Religion and America: Spiritual Life in a Secular Age*. Boston, 1982.

Dreshner, S. H. *The Zaddik*. New York, Toronto, and London, 1960.

Dubnow, Simon. "The Beginnings: The Baal Shem Tov (Besht) and the Center in Podolia." In Gershon David Hundert (ed.), *Essential Papers on Hasidism, Origins to Present*. New York and London, 1991.

———. "The Maggid of Miedzyrzecz, His Associates and the Center in Volhynia." In Gershon David Hundert (ed.), *Essential Papers on Hasidism, Origins to Present*. New York and London, 1991.

Duby, Georges. *L'an Mil*. Paris, 1980.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Dupré, Louis, and Don E. Saliers (eds.). *Christian Spirituality: Post Reformation and Modern*. New York and London, 1989.

Duprée, A. Hunter. *Asa Gray 1810–1888*. Cambridge, Mass., 1959.

———. "Christianity and the Scientific Community in the Age of Darwin." In David C. Lindberg and Ronald L. Numbers, *God and Nature: Historical Essays on the Encounter between Christianity and Science*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1986.

Durkheim, Emile. *The Elementary Forms of the Religious Life*. New York, 1961.

———. *Sociology and Philosophy*. New York, 1974.

Durraq, A. *L'Egypte sous le Regne de Barsbay 1422–1438*. Damascus, 1961.

Dwight, Timothy. *A Valedictory Address to the Young Gentlemen Who Commenced Bachelors of Arts, July 25th, 1776*. New Haven, Conn., 1776.

———. *The Duty of an American*. New Haven, Conn., 1798.

———. *A Discourse in Two Parts*. Boston, 1813.

Edwards, Jonathan. *The Works of the Rev. Jonathan Edwards*. Ed. E. Hickman. 2 vols. London, 1865.

Ehrenreich, Barbara. *Blood Rites: Origins and History of the Passions of War*. New York, 1997.

Eidsmore, John. *God and Caesar: Biblical Faith and Political Action*. Westchester, Ill., 1984.

Eisen, A. M. "Strategies of Modern Jewish Faith" in Arthur Green (ed.), *Jewish Spirituality*. Vol. II. London, 1988.

Eliade, Mircea. *The Myth of the Eternal Return, or Cosmos and History*. Trans. Willard J. Trask. Princeton, N.J., 1954.

———. *Patterns of Comparative Religion*. Trans. Rosemary Sheed. London, 1958.

———. *The Sacred and the Profane*. Trans. Willard J. Trask. New York, 1959.

———. *Images and Symbols: Studies in Religious Symbolism*. Trans. Philip Mairet. Princeton, N.J., 1991.

Elior, Rachel. "HaBaD: The Contemplative Ascent to God." In Arthur Green (ed.), *Jewish Spirituality*. Vol. II. London, 1988.

Eliot, Charles O. "The Future of Religion," *Harvard Theological Review* (2), 1909.

Elon, Amos. *The Israelis: Founders and Sons*. Rev. ed. London, 1984.

Enayat, Hamid. "The Politics of Iranology." *Iranian Studies*, 1973, 6.1.

Esposito, John. *Islam, The Straight Path*. Rev. ed. New York and Oxford, 1988.

———. *The Islamic Threat: Myth or Reality*. New York and Oxford, 1995.

———— (ed.). *Voices of Resurgent Islam*. New York and Oxford, 1983.

————, with John L. Donohue (eds.). *Islam in Transition: Muslim Perspectives*. New York and Oxford, 1982.

Ettinger, Shmuel. "The Hasidic Movement—Reality and Ideals." In Gershom David Hundert (ed.), *Essential Papers on Hasidism, Origins to Present*. New York and London, 1991.

Evenett, H. O. *The Spirit of the Counter-Reformation*. Cambridge, U.K., 1968.

Fakhry, Majid. *A History of Islamic Philosophy*. New York and London, 1970.

Falwell, Jerry. *Listen America!*. Garden City, N.Y., 1980.

———. *Strength for the Journey: An Autobiography*. New York, 1987.

———, with Ed Dobson and Ed Hindson, eds.). *The Fundamentalist Phenomenon: The Resurgence of Conservative Christianity*. Garden City, N.Y., 1981.

———, with Elmer Towns. *Church Affairs*. Nashville, Tenn., 1971.

Febvre, Lucien. *The Problem of Unbelief in the Sixteenth Century*. Trans. Beatrice Gottlieb. Cambridge, Mass., 1982.

Festinger, Leon. *A Theory of Cognitive Dissonance*. Stanford, Calif., 1957.

Feuerbach, Ludwig. *The Essence of Christianity*. Trans. George Eliot. New York, 1957.

Fine, Lawrence. "The Contemplative Practice of Yehudim in Lurianic Kabbalah." In Arthur Green (ed.), *Jewish Spirituality*. Vol. II. London, 1988.

Finney, Charles Grandison. *Lectures on Revivals of Religion*. Ed. William G. McLaughlin. Cambridge, Mass., 1960.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Fisch, Harold. *The Zionist Revolution: A New Perspective*. Tel Aviv and London, 1978.
Fischer, Michael J. *Iran: From Religious Dispute to Revolution*. Cambridge, Mass., and London, 1980.
———. "Imam Khomeini: Four Levels of Understanding." In John Esposito (ed.), *Voices of Resurgent Islam*. New York and Oxford, 1983.
Floor, Willem M. "The Revolutionary Character of the Ulama: Wishful Thinking or Reality?" In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Islam: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.
Foetillon, Henri. *L'An Mille*. Paris, 1952.
Foster, Lawrence. *Religion and Sexuality: Three American Communal Experiments in the Nineteenth Century*. Oxford and New York, 1981.
Foucault, Michel. *Language, Counter-Meaning, Practice: Selected Essays and Interviews*. Ed. Donald F. Bouchard. Ithaca, N.Y., 1977.
———. *Power/Knowledge: Selected Interviews and Other Writings*. Ed. Colin Gordon. New York, 1980.
Fox, George. *The Journal of George Fox*. Ed. J. L. Nickalls. Cambridge, U.K., 1911.
Friedman, Menachem. "The Market Model and Religious Radicalism." In Laurence J. Silberstein (ed.), *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology and the Crisis of Modernity*. New York and London, 1993.
———. "Habad as Messianic Fundamentalism." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.
Friedman, Robert I. *Zealots for Zion: Inside Israel's West Bank Settlement Movement*. New York, 1992.
Fuller, Robert C. *Naming the Antichrist: The History of an American Obsession*. Oxford and New York, 1995.
Gaffney, Patrick D. *The Prophet's Pulpit: Islamic Preaching in Contemporary Egypt*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1994.
Gay, Peter. *The Enlightenment: An Interpretation*. 2 vols. New York, 1966.
———. *A Godless Jew: Freud, Atheism and the Making of Psychoanalysis*. New Haven, Conn., and London, 1987.
Geertz, Clifford. *Local Knowledge*. New York, 1983.
———. *Postmodernism, Reason and Religion*. London and New York, 1992.
Gibb, H. A. R., and H. Bowen. *Islamic Society and the West*. London, 1957.
Gilsenan, Michael. *Recognizing Islam: Religion and Society in the Modern Middle East*. London, 1990.
Ginsberg, Asher (Ahad Ha-Am). *Complete Writings*. Jerusalem, 1965.
Ginsburg, Faye. "Saving America's Souls: Operation Rescue's Crusade Against Abortion." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and the State*. Chicago and London, 1993.
Göle, Nilufâ. *The Forbidden Modern: Civilization and Veiling*. Ann Arbor, Mich., 1996.
Goodwyn, Lawrence. *The Populist Movement: A Short History of the Agrarian Revolt in America*. New York, 1978.
Grant, George. *The Dispossessed: Homelessness in America*. Fort Worth, Tex., 1986.
———. *In the Shadow of Plenty: The Biblical Blueprint for Welfare*. Fort Worth, Tex., 1986.
———. *The Changing of the Guard: Biblical Blueprints for Political Action*. Fort Worth, Tex., 1987.
———. *Bringing In the Sheaves: Transforming Poverty into Productivity*. Brentwood, Tex., 1988.
Green, Arthur (ed.). *Jewish Spirituality*. 2 vols. London, 1986, 1988.
Guttmann, Julius. *Philosophies of Judaism: The History of Jewish Philosophy from Biblical Times to Franz Rosenzweig*. London and New York, 1964.
Haddad, Yvonne. "Sayyid Qutb: Ideologue of Islamic Revival." In John Esposito (ed.), *Voices of Resurgent Islam*. New York and Oxford, 1983.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Haldeman, Isaac M. *The Signs of the Times*. New York, 1912.
Hall, David D. (ed.). *The Antinomian Controversy, 1636–1638: A Documentary History*. Middletown, Conn., 1968.
Hall, Stuart. "Significance, Representation, Ideology," *Critical Studies in Mass Communication* 2:2, 1985.
Halliday, Fred. *Islam and the Myth of Confrontation: Religion and Politics in the Middle East*. London and New York, 1996.
HAMAS, *The Covenant of the Islamic Resistance Movement*. Jerusalem, 1988.
Hambrick-Stowe, Charles. "Puritan Spirituality in America." In Louis Dupré and Don E. Saliers (eds.), *Christian Spirituality: Post Reformation and Modern*. New York and London, 1989.
Hammond, Phillip E. (ed.). *The Sacred in a Secular Age: Toward Revision in the Scientific Study of Religion*. Berkeley, 1985.
———. *The Protestant Presence in Twentieth-Century America: Religion and Political Culture*. Albany, N.Y., 1992.
Hanan, Denis, and H. Aldersworth (eds.). *British-Israel Truth*. 14th ed. London, 1932.
Handy, Robert T. "Protestant Theological Tensions and Political Styles in the Progressive Period." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.
Hanna, Sami, and George H. Gardner (eds.). *Arab Socialism: A Documentary Survey* Leiden, Netherlands, 1969.
Harding, Susan. "Contesting Rhetorics in the PTL Scandal." In J. Silberstein (ed.), *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology, and the Crisis of Modernity*. New York and London, 1993.
———. "Imagining the Last Days: The Politics of Apocalyptic Language." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.
Hatch, Nathan O. *The Democratization of American Christianity*. New Haven, Conn., and London, 1989.
Hegland, Mary. "Two Images of Husain: Accommodation and Revolution in an Iranian Village." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.
Heikal, Mohamed. *Autumn of Fury: The Assassination of Sadat*. London, 1984.
Heilman, Samuel. *Defenders of the Faith: Inside Ultra-Orthodox Jewry*. New York, 1992.
———. "Quiescent and Active Fundamentalisms: The Jewish Cases." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.
———. "Guides of the Faithful: Contemporary Religious Zionist Rabbis." In R. Scott Appleby (ed.), *Spokesmen for the Despised: Fundamentalist Leaders of the Middle East*. Chicago, 1997.
——— (with Menachem Friedman). "Religious Fundamentalism and Religious Jews." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms Observed*. Chicago and London, 1991.
Heimert, Alan. *Religion and the American Mind: From the Great Awakening to the Revolution*. Cambridge, Mass., 1968.
Helms, Jesse. *When Free Men Shall Stand*. Grand Rapids, Mich., 1976.
Herberg, Will. *Protestant, Catholic, Jew*. Garden City, N.Y., 1955.
Hertzberg, Arthur. *The Zionist Idea*. New York, 1969.
Hill, Donna. *Joseph Smith, The First Mormon*. Garden City, N.Y., 1977.
Hobbes, Thomas. *Leviathan*. Ed. Michael Oakeshott. New York, 1962.
Hodge, Charles. *What Is Darwinism?* Princeton, N.J., 1874.
Hodgson, Marshall G. S. *The Venture of Islam: Conscience and History in a World Civilization*. 3 vols. Chicago and London, 1974.
Hoffer, Eric. *The True Believer: Thoughts on the Nature of Mass Movements*. New York and Evanston, Ill., 1951.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Hofstadter, Richard. *Anti-Intellectualism in American Life*. New York, 1962.
———. *The Paranoid Strain in American Politics*. New York, 1965.
Holt, P. M. (ed.). *Political and Social Change in Modern Egypt: Historical Studies from the Ottoman Conquest to the United Arab Republic*. London, 1968.
———, "The Pattern of Egyptian Political History from 1517 to 1798." In ibid.
Hoogland, Eric. "Social Origins of the Revolutionary Clergy." In Nikki R. Keddie and E. Hoogland (eds.), *The Iranian Revolution and the Islamic Republic*. Syracuse, N.Y., 1986.
Hourani, Albert. *Arabic Thought in the Liberal Age, 1798–1939*. Oxford, 1962.
———. *A History of the Arab Peoples*. London, 1991.
Hudson, Bradford B. "Anxiety Response to the Unfamiliar." *The Journal of Social Issues* 10:3, 1954.
Hundert, Gershom David (ed.). *Essential Papers on Hasidism. Origins to Present*. New York and London, 1991.
Hunter, J. D. *Evangelicalism. The Coming Generation*. Chicago, 1987.
Hussain, Asaf. *Islamic Iran: Revolution and Counter-Revolution*. London, 1985.
Huxley, T. H.. *Science and Christian Tradition*. New York, 1896.
Jacobs, Louis. *Hasidic Prayer*. New York, 1973.
———. "The Uplifting of the Sparks in Later Jewish Mysticism." In Arthur Green (ed.), *Jewish Spirituality*, Vol. II. London, 1988.
———. "Hasidic Prayer." In Gershom David Hundert (ed.), *Essential Papers on Hasidism: Origins to Present*. New York and London, 1991.
——— (ed.). *The Jewish Mystics*. London, 1990; New York, 1996.
Jansen, Johannes J. G. *The Neglected Duty: The Creed of Sadat's Assassins and Islamic Resurgence in the Middle East*. New York and London, 1988.
Johnson, Paul. *A History of the Jews*. London, 1987.
Jones, Bob, II. *Cornbread and Caviare*. Greenville, S.C., 1985.
Jones, Richard F. *Ancients and Moderns: A Study in the Rise of the Scientific Movement in Seventeenth-Century England*. Berkeley, 1965.
Kamen, Henry. *The Spanish Inquisition: An Historical Revision*. London, 1997.
Kant, Immanuel. *Critique of Practical Reason and Other Writings*. Ed. Lewis Beck White. Indianapolis, Ind., 1963.
———. *On History*. Ed. Lewis Beck White. Indianapolis, Ind., 1963.
Kaplan, Laurence (ed.). *Fundamentalism in Comparative Perspective*. Amherst, 1992.
Karam, Azza M. *Women, Islamism and the State: Contemporary Feminism in Egypt*. London and New York, 1998.
Katouzian, Homa. "Shiism and Islamic Economics: Sadr and Bani Sadr." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.
Katz, Jacob. "Halakah and Kabbalah as Competing Disciplines in Study." In Arthur Green (ed.). *Jewish Spirituality*. Vol II. London, 1988.
———. "Israel and the Messiah." In Marc Saperstein (ed.), *Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History*. New York and London, 1992.
Kautsky, John H. (ed.). *Political Change in Underdeveloped Countries*. 7th ed. New York, 1967.
Keddie, Nikki R. *Islamic Response to Imperialism: Political and Religious Writings of Sayyid Jamal ad-Din "al-Afghani"*. Berkeley, 1968.
———. *Roots of Revolution: An Interpretive History of Modern Iran*. New Haven, Conn., and London, 1981.
——— (ed.). *Scholars, Saints and Sufis: Muslim Religious Institutions in the Middle East Since 1500*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1972.
——— (ed.). *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

———, with Beth Baron (eds.). *Women in Middle Eastern History: Shifting Boundaries in Sex and Gender*. New Haven, Conn., and London, 1991.
———, with Eric Hoogland (eds.). *The Iranian Revolution and the Islamic Republic*. Syracuse, N.Y., 1986.
———. "The Roots of the Ulama's Power in Modern Iran." In Keddie (ed.), *Scholars, Saints and Sufis*.
Kedourie, E. *Afghani and Abduh: An Essay on Religious Unbelief and Political Activism in Modern Islam*. London, 1966.
———, with S. Haim (eds.). *Zionism and Arabism in Palestine and Israel*. London, 1982.
Kepel, Gilles. *The Prophet and Pharaoh: Muslim Extremism in Egypt*. Trans. Jon Rothschild. London, 1985.
———. *The Revenge of God: The Resurgence of Islam, Christianity and Judaism in the Modern World*. Trans. Alan Braley. Cambridge, U.K. 1994.
Khan, Muhammad Zafrulla. *Islam, Its Meaning for Modern Man*. London, 1962.
Khomeini, Sayeed Ruhollah. *Islam and Revolution*. Trans. and ed. Hamid Algar. Berkeley, 1981.
Kilpatrick, F. P. "Problems of Perception in Extreme Situations," *Human Organization* 16, Summer, 1957.
Kobben, A. J. F. "Prophetic Movements as an Expression of Social Protest," *International Archives of Ethnography* 49, part I, 1960.
Kook, Abraham Isaac. *The Essential Writings of Abraham Isaac Kook*. Ed. and trans. Ben Zion Bokser. Warwick, N.Y., 1988.
Kuhn, Thomas S. *The Structure of Scientific Revolutions*. 2nd ed. Chicago, 1970.
Laclau, Ernesto (ed.). *The Making of Political Identities*. London and New York, 1994.
LaHaye, Beverley. *The Spirit-Controlled Woman*. Eugene, Or., 1976.
———. *I Am a Woman by God's Design*. Old Tappan, N.J., 1980.
———. *The Restless Woman*. Grand Rapids, Mich., 1984.
LaHaye, Tim. *How to Be Happy Though Married*. Wheaton, Ill., 1968.
———. *Understanding the Male Temperament*. Eugene, Or., 1977.
———. *The Battle for the Mind*. Old Tappan, N.J., 1980.
———. *The Battle for the Family*. Old Tappan, N.J., 1982.
———. *Sex Education in the Family*. Grand Rapids, Mich., 1985.
——— (with Beverley LaHaye). *The Act of Marriage: The Beauty of Sexual Love*. Grand Rapids, Mich., 1976.
Lambton, Ann K. S. "A Reconsideration of the Position of the *Marja al-taqlid* and the Religious Institutions," *Studia Islamica* 20, 1964.
Langdon, Samuel. *Government Corrupted by Vice and Recovered by Righteousness*. Watertown, Mass., 1775.
Lawrence, Bruce B. *Defenders of God: The Fundamentalist Revolt Against the Modern Age*. London and New York, 1990.
Lea, H. C. *A History of the Inquisition in Spain*. 4 vols. New York, 1906–07.
Leone, Mark. *Roots of Modern Mormonism*. Cambridge, Mass., 1979.
Lewis, Bernard. *The Jews of Islam*. New York and London, 1982.
Liebman, Charles. *Deceptive Images*. New Brunswick, N.J., 1988.
——. "Jewish Fundamentalism and the Israeli Polity." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.
Lienesch, Michael. *Redeeming America: Piety and Politics in the New Christian Right*. Chapel Hill, N.C., and London, 1995.
Lindberg, David, and Ronald L. Numbers (eds.). *God and Nature: Historical Essays on the Encounter Between Christianity and Science*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1986.
Lindsey, Hal. *The Late Great Planet Earth*. Grand Rapids, Mich., 1970.
———. *The 1980s: Countdown to Armegeddon*. Grand Rapids, Mich., 1980.
Locke, John. *A Letter Concerning Toleration*. Indianapolis, Ind., 1955.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

———. *The Reasonableness of Christianity*. Ed. George W. Ewing. Washington D.C., 1965.
———. *Two Treatises of Government*. Ed. Peter Laslett. Cambridge, U.K. 1988.
Lockyear, Herbert. *Cameos of Prophecy: Are These the Last Days?* Grand Rapids, Mich., 1942.
Louth, Andrew. *Discovering the Mystery: An Essay on the Nature of Theology*. Oxford, 1983.
Lovejoy, David S. *Religious Enthusiasm in the New World: Heresy to Revolution*. Cambridge, Mass., and London, 1985.
Lovelace, R. C. "Puritan Spirituality: The Search for a Rightly Reformed Church." In Louis Dupré and Don E. Saliers (eds.), *Christian Spirituality: Post Reformation and Modern*. New York and London, 1989.
Lowenthal, David. *The Past Is a Foreign Country*. Cambridge, U.K., 1965.
Lustick, Ian S. *For the Land and the Lord: Jewish Fundamentalism in Israel*. New York, 1988.
———. "Jewish Fundamentalism and the Israeli-Palestinian Impasse." In Laurence J. Silberstein (ed.), *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology, and the Crisis of Modernity*. New York and London, 1993.
Lyotard, Jean-François. *The Postmodern Condition*. Manchester, U.K., 1986.
Maccoby, Haim (ed. and trans.). *Judaism on Trial: Jewish Christian Disputations in the Middle Ages*. Princeton, N.J., 1982.
MacQuarrie, John. *Thinking About God*. London, 1975.
———. *In Search of Deity: An Essay in Dialectical Theism*. London, 1980.
Magonet, Jonathan. *The Explorer's Guide to Judaism*. London, 1998.
Mahler, Raphael. *Hasidism and the Jewish Enlightenment: Their Confrontation in Galicia and Poland in the First Half of the Nineteenth Century*. Trans. Aaron Klein and Jenny Machlowitz Klein. Philadelphia, New York, and Jerusalem, 1985.
Marius, Richard. *Martin Luther, the Christian Between God and Death*. Cambridge, Mass., and London, 1999.
Marsden, George M. *Fundamentalism and American Culture: The Shaping of Twentieth-Century Evangelicalism, 1870–1925*. New York and Oxford, 1980.
———. "The Religious Right: A Historical Overview." In Michael Cromartie (ed.), *No Longer Exiles: The Religious New Right in American Politics*. Washington, D.C., 1993.
Marshall, Peter, and David Manuel. *The Light and the Glory*. Old Tappan, N.J., 1977.
Marsot, Araf Lutfi al-Sayyid. "The Role of the Ulema in Egypt During the Early Nineteenth Century." In P. M. Holt (ed.), *Political and Social Change in Modern Egypt: Historical Studies from the Ottoman Conquest to the United Arab Republic*. London, 1968.
———. "The Ulama of Cairo in the Eighteenth and Nineteenth Centuries." In Nikki R. Keddie (ed.), *Scholars, Saints and Sufis: Muslim Religious Institutions in the Middle East Since 1500*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1972.
Marty, Martin E., and R. Scott Appleby (eds.). *Fundamentalisms Observed*. Chicago and London, 1991.
———. *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.
———. *Fundamentalisms and the State*. Chicago and London, 1993.
———. *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.
———. *Fundamentalisms Comprehended*. Chicago and London, 1995.
Marx, Karl. *Karl Marx: Early Writings*. Trans. T. B. Bottomore. London, 1963.
Masterson, Patrick. *Atheism and Alienation: A Study of the Philosophic Sources of Contemporary Atheism*. Dublin, 1971.
Matin-Asgari, Afshin. "Abdolkarim Sorush and the Secularization of Islamic Thought in Iran," *Iranian Studies* 30, 1997.
Mawdudi, Abul Ala. *Islamic Law and Constitution*. Lahore, 1967.
———. *Jihad in Islam*. Lahore, 1976.
———. *The Economic Problem of Man and Its Islamic Solution*. Lahore, 1978.
———. *Islamic Way of Life*. Lahore, 1979.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Mayhew, Jonathan. *Practical Discourses Delivered on the Occasion of the Earthquakes in November 1755*. Boston, 1760.
McClelland, J. S. *A History of Western Political Thought*. London, 1996.
McGrath, Alister E. *The Intellectual Origins of the European Reformation*. Oxford and New York, 1987.
—— ——. *Reformation Thought: An Introduction*. Oxford and New York, 1988.
—— ——. *A Life of John Calvin: A Study in the Shaping of Western Culture*. Oxford, 1990.
McLoughlin, William G. *Revivals, Awakenings and Reform*. Chicago, 1978.
Mead, Sidney. *The Nation with the Soul of a Church*. New York, 1975.
Mergui, Raphael, and Philippe Simonnot. *Israel's Ayatollahs: Meir Kahane and the Far Right in Israel*. London, 1987.
Miller, Perry. *The New England Mind. from Colony to Province*. Cambridge, Mass., 1953.
—— ——. *Errand into the Wilderness*. Cambridge Mass., 1956.
Milton-Edwards, Beverley. *Islamic Politics in Palestine*. London and New York, 1996.
Mitchell, Joshua. *Not by Reason Alone: Religion, History and Identity in Early Modern Political Thought*. Chicago, 1993.
Mitchell, Richard P. *The Society of the Muslim Brothers*. London, 1969.
Mittleman, Alan L. "Fundamentalism and Political Development: The Case of Agudat Yisrael." In Laurence J. Silberstein (ed.), *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology, and the Crisis of Modernity*. New York and London, 1993.
Moin, Baqer. *Khomeini: Life of the Ayatollah*. London, 1999.
Momen, Moojan. *An Introduction to Shii Islam: The History and Doctrines of Twelver Shiism*. New Haven, Conn., and London, 1985.
Moore, James R. "Geologists and Interpreters of Genesis in the Nineteenth Century." In David C. Lindberg and Ronald L. Numbers (eds.), *God and Nature: Historical Essays on the Encounter Between Christianity and Science*. Berkeley, Los Angeles and London, 1986.
Moore, R. Laurence. *Religious Outsiders and the Making of Americans*. Oxford and New York, 1986.
Mottahedeh, Roy. *The Mantle of the Prophet: Religion and Politics in Iran*. London, 1985.
Murrin, John M. "Religion and Politics in America from the First Settlements to the Civil War." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.
Nash, Ron. *Poverty and Wealth: The Christian Debate Over Capitalism*. Westchester, Ill., 1986.
Negus, Steve. "Carnage at Luxor." *Middle East International*, November 21, 1997.
Newton, Isaac. *The Correspondence of Isaac Newton*. Eds. A. R. Hall and L. Tilling. Cambridge, 1959
Nieburg, H. L. "Agonistic— Rituals of Conflict." *The Annuals* 391, September, 1970.
Nietzsche, Friedrich. *The Gay Science*. New York, 1974.
Nolan, Alan T. *Lee Considered: General Robert E. Lee and Civil War History*. Chapel Hill, N.C., 1991.
Noll, Mark A. (ed.). *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.
North, Gary. *Unconditional Surrender: God's Program for Victory*. Tyler, Tex., 1981.
—— . *Honest Money*. Fort Worth, Tex., 1986.
—— . *The Sinai Strategy: Economics and the Ten Commandments*. Tyler, Tex., 1986.
—— ——. *In the Shadow of Plenty: The Biblical Blueprint for Welfare*. Fort Worth, Tex., 1986.
—— . *Inherit the Earth. Biblical Blueprints for Economics*. Fort Worth, Tex., 1987.
—— . *Is the World Running Down? Crisis in the Christian Worldview*. Tyler, Tex., 1988.
Numbers, Ronald L. *The Creationists: The Evolution of Scientific Creationism*. Berkeley and Los Angeles, 1992.
——, with Jonathan M. Butler (eds.). *The Disappointed: Millerism and Millennarianism in the Nineteenth Century*. Bloomington, Ind., 1987.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

O'Fahey, R. S. "Pietism, Fundamentalism and Mysticism: An Alternative View of the Eighteenth- and Nineteenth-Century Islamic World." Lecture delivered at Northwestern University, November 12, 1997.

Otis, George. *God, Money and You*. Van Nuys, Calif., 1975.

Otto, Rudolf. *The Idea of the Holy: An Inquiry into the Non-Rational Factor in the Idea of the Divine and Its Relation to the Rational*. Trans. John W. Harvey. Oxford, 1923.

Outler, Albert C. *John Wesley*. Oxford and New York, 1964.

Oz, Amos. *In the Land of Israel*. Trans. Maurice Goldberg-Bartura. London, 1983.

Paine, Thomas. *Common Sense and the Crisis*. New York, 1975.

Parsons, Jonathan. *Seven Discourses*. Portsmouth, N.H., 1756.

Partner, Peter. *God of Battles: Holy Wars of Christianity and Islam*. London, 1997.

Pascal, Blaise. *Pensées*. Trans. and ed. A. J. Krailsheimer. London, 1966.

Paton, Andrew A. *A History of the Egyptian Revolution*. 2 vols. Trubner, Germany, 1876.

Pelikan, Jaroslav. *The Christian Tradition: A History of the Development of Doctrine*. 5 vols. IV: *Reformation of Church and Dogma*, Chicago and London, 1985. V: *Christian Doctrine and Modern Culture (Since 1700)*. Chicago and London, 1989.

Peters, Rudolph. *Jihad in Classical and Modern Islam. A Reader*. Princeton, N.J., 1996.

Plath, David (ed.). *Aware of Utopia*. Urbana, Ill., 1971.

Qutb, Sayyid. *Islam and Universal Peace*. Indianapolis, Ind., 1977.

———. *Fi Zilal al-Koran*. 6 vols. Beirut, 1981.

———. *Milestones*. Delhi, 1988.

———. *This Religion of Islam*. Gary, Ind., n.d.

Rahman, Fazlur. *The Philosophy of Mulla Sadra*. Albany, N.Y., 1975.

———. *Islam*. Chicago, 1979.

———. *Islam and Modernity: Transformation of an Intellectual Tradition*. Chicago, 1982.

Raitt, Jill, with Bernard McGinn and John Meyendorff (eds.). *Christian Spirituality: High Middle Ages and Reformation*. New York, 1988; London, 1989.

Rajaee, Farhang. "Islam and Modernity." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.). *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.

Rauschenbusch, Walter. *Christianity and the Social Crisis*. New York, 1907.

———. *Christianity and the Social Order*. New York, 1912.

Ravitsky, Aviezer. *Messianism, Zionism, and Jewish Religious Radicalism*. Trans. Michael Swirsky and Jonathan Chipman. Chicago and London, 1993.

Renan, Ernest. *Histoire générale et système comparé des langues semitiques*. Ed. H. Pischiari. Paris, 1955.

———. *L'Islamisme et la science*. Paris, 1883.

Richard, Yann. "Ayatollah Kashani: Precursor of the Islamic Republic?" In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.

Riesebrodt, Martin. *Pious Passion: The Emergence of Modern Fundamentalism in the United States and Iran*. Trans. Don Reneau. Berkeley, Los Angeles, and London, 1993.

Rifkin, Jeremy, and Ted Howard. *The Emerging Order: God in the Age of Scarcity*. New York, 1979.

Robertson, Pat. *The Secret Kingdom*. Nashville, Tenn., 1982.

———. *America's Dates with Destiny*. Nashville, Tenn., 1986.

———. *The New Millennium*. Dallas, Tex., 1990.

———. *The New World Order*. Dallas, Tex., 1991.

———, with Jamie Buckingham. *Shout It from the Housetops*. Plainfield, N.J., 1972.

Robertson, Roland, and JoAnn Chirico. "Humanity, Globalization and Worldwide Religious Resurgence: A Theoretical Exploration." *Sociological Analysis* 46, 1985.

Robison, James. *Thank God I'm Free: The James Robison Story*. Nashville, Tenn., 1988.

Rose, Gregory. "Velayat-e Faqih and the Recovery of the Islamic Identity in the Thought of

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Ayatollah Khomeini." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., 1983.

Rose, Susan. "Christian Fundamentalism and Education in the United States." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.

Rosenak, Michael. "Jewish Fundamentalism in Israeli Education." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.

Ross, Andrew (ed.). *Universal Abandon: The Politics of Postmodernism*. Minneapolis, Minn., 1988.

Royster, Charles. *The Destructive War: William Tecumseh Sherman, Stonewall Jackson, and the Americans*. New York, 1991.

Rubinstein, Richard. *After Auschwitz: Radical Theology and Contemporary Judaism*. Indianapolis, Ind., 1966.

———. *The Coming of History*. New York, 1978.

Rudavsky, David. *Modern Jewish Religious Movements: A History of Emancipation and Adjustment*. Rev. ed. New York, 1967.

Rugh, Andrea B. "Reshaping Personal Relations In Egypt." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.

Rushdoony, R. J. *This Independent Republic: Studies in the Nature and Meaning of American History*. Nutley, N.J., 1964.

———. *Thy Kingdom Come: Studies in Daniel and Revelation*. Fairfax, Va., 1978.

———. *Politics of Guilt and Pity*. Fairfax, Va., 1978.

———. *God's Plan for Victory: The Meaning of Post-Millennialism*. Fairfax, Va., 1980.

Rutherford, Jonathan (ed.). *Identity, Community, Culture Difference*. London, 1990.

Ruthven, Malise. *A Satanic Affair: Salman Rushdie and the Rage of Islam*. London, 1990.

Sachedina, Abdulaziz Abdulhussein. *Islamic Messianism: The Idea of the Mahdi in Twelver Shiism*. Albany, N.Y., 1981.

———. "Ali Shariati: Ideologue of the Iranian Revolution." In John Esposito (ed.), *Voices of Resurgent Islam*. New York and Oxford, 1983.

Sacks, Jonathan. *The Persistence of Faith: Religion, Morality and Society in a Secular Age*. London, 1991.

Sadat, Anwar. *Revolt on the Nile*. New York, 1957.

Said, Edward W. *Orientalism: Western Conceptions of Orient*. New York, 1978.

Sandeen, Ernest. *The Roots of Fundamentalism*. Chicago, 1970.

Saperstein, Marc (ed.). *Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History*. New York and London, 1992.

Schaeffer, Franky. *A Time for Anger: The Myth of Neutrality*. Westchester, Ill., 1982.

Schlafly, Phyllis. *The Power of the Christian Woman*. Cincinnati, 1981.

Scholem, Gershom. *Major Trends in Jewish Mysticism*. London, 1955.

———. *On the Kabbalah and Its Symbolism*. New York, 1965.

———. *The Messianic Idea in Judaism and Other Essays on Jewish Spirituality*. New York, 1971.

———. *Sabbatai Sevi, the Mystical Messiah, 1626–1676*. London and Princeton, N.J., 1973.

Schultze, Quentin. "The Two Faces of Fundamentalist Higher Education." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and Society*. Chicago and London, 1993.

Schweid, Eliezer. *The Land of Israel: National Home or Land of Destiny*. Trans. Deborah Greniman. New York, 1985.

Scofield, C. I. *The Scofield Reference Bible*. New York and Oxford, 1917.

———. *Addresses on Prophecy*. New York, n.d.

Selengut, Charles. "By Torah Alone: Yeshiva Fundamentalism in Jewish Life." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Shariati, Ali. *Community and Leadership*. (n.p) 1972.
———. *The Sociology of Islam*. Berkeley, 1979.
———. *Hajj*. Tehran, 1988.
Shayyal, Gamal el-Din. "Some Aspects of Intellectual and Social Life in Eighteenth-Century Egypt." In P. M. Holt (ed.), *Political and Social Change in Modern Egypt: Historical Studies from the Ottoman Conquest to the United Arab Republic*. London, 1968.
Shriver, Peggy L. "The Paradox of an Inclusiveness-That-Divides." *Christian Century*. January 21, 1984.
Sick, Gary. *All Fall Down: America's Fateful Encounter with Iran*. London, 1985.
Sidahared, Abdel Salam, and Anonshiravan Ehteshani (eds.). *Islamic Fundamentalism*. Boulder, Colo., 1996.
Silberstein, Laurence J. (ed.). *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology, and the Crisis of Modernity*. New York and London, 1993.
———. "Religion, Ideology, Modernity: Theoretical Issues in a Study of Jewish Fundamentalism." In ibid.
Silverman, R. M. *Baruch Spinoza: Outcast Jew, Universal Sage*. Northwood, U.K., 1995.
Sloek, Johannes. *Devotional Language*. Trans. Henrik Mossin. Berlin and New York, 1996.
Smart, Ninian. *Beyond Ideology: Religion and the Future of Western Civilization*. London, 1981.
Smith, Wilfred Cantwell. *Islam in Modern History*. Princeton and London, 1957.
———. *Belief and History*. Charlottesville, Va., 1977.
———. *Faith and Belief*. Princeton, N.J., 1979.
Soloveitchic, Hayim. "Migration, Acculturation, and the New Role of Texts." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.
Sontag, Susan. *A Susan Suntag Reader*. New York, 1982.
Spinoza, Baruch. *A Theologico-Political Treatise*. Trans. R. H. M. Elwes. New York, 1951.
Sprinzak, Ehud. *The Ascendance of Israel's Radical Right*. Oxford and New York, 1991.
———. "The Politics, Institutions and Culture of Gush Emunim." In Laurence J. Silberstein (ed.), *Jewish Fundamentalism in Comparative Perspective: Religion, Ideology, and the Crisis of Modernity*. New York and London, 1993.
———. "Three Models of Religious Violence: The Case of Jewish Fundamentalism in Israel." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms and the State*. Chicago and London, 1993.
Stampp, Kenneth. *The Imperilled Union: Essays on the Background of the Civil War*. New York, 1980.
Steiner, George. *In Bluebeard's Castle: Some Notes Toward the Re-definition of Culture*. New Haven, Conn., 1971.
Stout, Harry S. "Rhetoric and Reality in the Early Republic: The Case of the Federalist Clergy." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.
Strauss, Leo. *Spinoza's Critique of Reason*. New York, 1982.
Strozier, Charles B. *Apocalypse: On the Psychology of Fundamentalism in America*. Boston, 1994.
Swierenga, Robert P. "Ethno-religious Political Behavior in the Mid-Nineteenth Century." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.
Szasz, Ferenc Morton. *The Divided Mind of Protestant America, 1880–1930*. University, Ala., 1982.
Tabari, Azar. "The Role of the Shii Clergy in Modern Iranian Politics." In Nikki R. Keddie (ed.), *Religion and Politics in Iran: Shiism from Quietism to Revolution*. New Haven, Conn., and London, 1983.
Taheri, Amir. *The Spirit of Allah: Khomeini and the Islamic Revolution*. London, 1985.
Tal, Uriel. "Foundations of a Political Messianic Trend in Israel." In Marc Saperstein (ed.),

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History. New York and London, 1992.

Talmon, J. L. *The Origins of Totalitarian Democracy*. London, 1953.

Tancoigne, J. M. *A Narrative of a Journey into Persia and Residence in Tehran*. Trans. William Wright. London, 1820.

Tarnas, Richard. *The Passion of the Western Mind: Understanding the Ideas That Have Shaped Our World View*. New York and London, 1991.

Tedeman, Richard. *Discourse/Counter-Discourse*. Ithaca, N.Y., 1985.

Thaiss, Custer. "Religious Symbolism and Social Change." In Nikki R. Keddie, *Scholars, Saints and Sufis: Muslim Religious Institutions in the Middle East Since 1500*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1972.

Thompson, Thomas L. *The Bible in History: How Writers Create a Past*. London, 1999.

Tibi, Bassam. *The Crisis of Political Islam: A Pre-Industrial Culture in the Scientific-Technological Age*. Salt Lake City, Utah, 1988.

———. *Arab Nationalism, A Critical Enquiry*. Trans. Marion Farouk Sluglett and Peter Sluglett. 2nd ed. London, 1990.

Tuveson, Ernest Lee. *Millennium and Utopia: A Study in the Background of the Idea of Progress*. New York, 1964.

———. *Redeemer Nation*. Chicago, 1968.

Viguerie, Richard A. *The New Right: We're Ready to Lead*. Falls Church, Va., 1981.

Voll, John. *Islam: Continuity and Change in the Modern World*. Boulder, Colo., 1982.

———. "Renewal and Reform in Islamic History." In John Esposito (ed.), *Voices of Resurgent Islam*. New York and Oxford, 1983.

———. "Fundamentalism in the Sunni Arab World: Egypt and the Sudan." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Fundamentalisms Observed*. Chicago and London, 1991.

Walton, Rus. *FACS! Fundamentals for American Christians*. Nyack, N.Y., 1979.

———. *One Nation Under God*. Nashville, Tenn., 1987.

———. *Biblical Solutions to Contemporary Problems: A Handbook*. Brentwood, Tenn., 1988.

Walvoord, John. *Israel and Prophecy*. Grand Rapids, Mich., 1962.

———. *Armageddon, Oil and the Middle East Crisis*. Grand Rapids, Mich., 1990.

Ward, Mrs. Humphry. *Robert Elsmere*. Lincoln, Neb., 1969 edn.)

Warfield, Benjamin B. *Selected Shorter Writings of Benjamin B. Warfield*. 2 vols. Ed. John E. Meeber. Nutley, N.J., 1902.

Weber, Max. *The Protestant Ethic and the Spirit of Capitalism*. New York, 1958.

Weber, Timothy. *Living in the Shadow of the Second Coming: American Premillennialism, 18–6. 1982*. Grand Rapids, Mich., 1983.

Weit, Gaston, ed. and trans. *Nicolas Turc, Chronique d'Egypte, 1798–1804*. Cairo, 1950.

Wells, H. G.. *The War of the Worlds*. London, 1898.

———. *Anticipations*. London, 1902.

Werblowsky, R. J. Zvi. "The Safed Revival and Its Aftermath." In Arthur Green (ed.), *Jewish Spirituality*. Vol. II. London, 1988.

———. "Messianism in Jewish History." In Marc Saperstein (ed.), *Essential Papers on Messianic Movements and Personalities in Jewish History*. New York and London, 1992.

Westfall, Richard S. "The Rise of Science and Decline of Orthodox Christianity: A Study of Kepler, Descartes and Newton." In David C. Lindberg and Ronald L. Numbers (eds.), *God and Nature: Historical Essays on the Encounter between Christianity and Science*. Berkeley, Los Angeles, and London, 1986.

Whitehead, John W. *The Second American Revolution*. Westchester, Ill., 1982.

———. *The Stealing of America*. Westchester, Ill., 1983.

———. *An American Dream*. Westchester, Ill., 1987.

———, with John Conlon. "The Establishment of the Religion of Secular Humanism and Its First Amendment Implications." *Texas Tech Law Review* 10, 1978.

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Willems, Emilio. *Followers of the New Faith*. Nashville, Tenn., 1967.
Williams, G. H. *The Radical Revolution*. Philadelphia, 1962.
Wilson, John F. "Religion, Government and Power in the New American Nation." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s*. Oxford and New York, 1990.
Wirt, Sherwood Eliot (ed.). *Spiritual Awakening: Classic Writings of the Eighteenth Century. Devotions to Inspire and Help the Twentieth-Century Reader*. Tring, U.K., 1988.
Wolfenstein, Martha. *Disaster: A Psychological Essay*. Glencoe, Ill., 1957.
Wood, Gordon S. *The Creation of the American Republic*. Chapel Hill, N.C., 1969.
Wright, Lawrence. *Saints and Sinners*. New York, 1993.
Wright, Melton. *Fortress of Faith: The Story of Bob Jones University*. Greenville, S.C., 1984.
Wuthnow, Robert, and Matthew P. Lawson. "Religious Movements and Counter Movements in North America." In James Beckford (ed.), *New Religious Movements and Rapid Social Change*. Paris, 1987.
———. "Quid Obscurum: The Changing Terrain of Church-State Relations." In Mark A. Noll (ed.), *Religion and American Politics: From the Colonial Period to the 1980s* (Oxford and New York, 1990).
———. "Sources of Christian Fundamentalism in the United States." In Martin E. Marty and R. Scott Appleby (eds.), *Accounting for Fundamentalisms*. Chicago and London, 1994.
Yovel, Yirmiyahu. *Spinoza and Other Heretics*. 2 vols. I: *The Marrano of Reason*; II: *The Adventures of Immanence*. Princeton, N.J., 1989.
———. *Dark Riddle: Hegel, Nietzsche, and the Jews*. Cambridge, U.K., 1998.

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

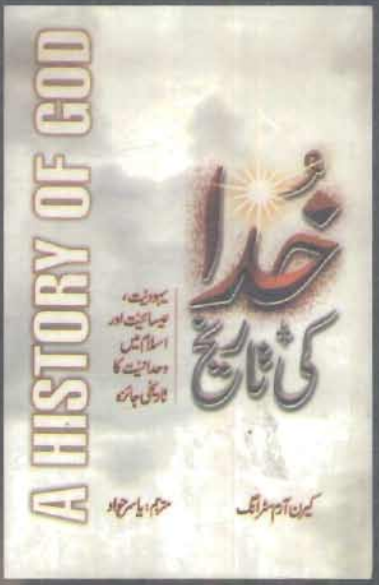

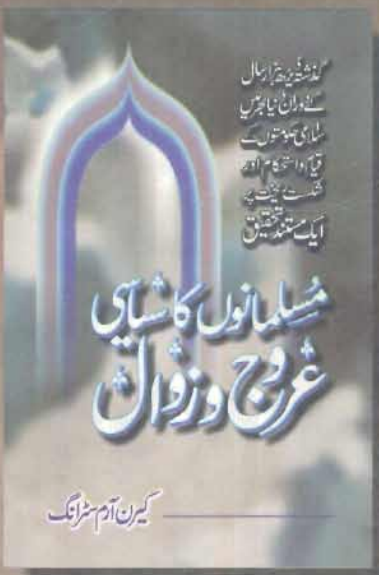

"کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب "خدا کے لیے جنگ" بنیاد پرستی کے حوالے سے منفی تاثر کو زائل کرتی ہے اور یوں ہمیں اس کو سنجیدگی سے لینے پر آمادہ کرتی اور اس سے نمٹنے کے لیے حکمت عملیاں وضع کرنے میں مدد دیتی ہے۔۔۔ یہ ہمدردانہ انداز میں لکھی گئی خیال آفریں کتاب ہے"۔

(دی ٹائمز، لندن)

"کیرن آرمسٹرانگ کی جزئیات نگاری اور دو رس وژن نے اس کتاب کو غیر معمولی بنا دیا ہے۔۔۔ بنیاد پرستی کو جبر کے ذریعے دبایا نہیں جا سکتا۔ اگر اس کو شکست دینی ہے تو پہلے اس کی تفہیم ضروری ہے۔ یہ بصیرت افروز اور متوازن کتاب اس نوع کی تفہیم میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے"۔

(ڈیلی ٹیلیگراف، لندن)

"بنیاد پرستی نے دنیا کو خوفزدہ کر رکھا ہے اور بیشتر لوگ نہ صرف خوفزدہ ہیں بلکہ اس کے حوالے سے الجھن کا بھی شکار ہیں۔۔۔ ہمیں ایک دانشمند رہنما" کی ضرورت ہے۔۔۔ کیرن آرمسٹرانگ ہماری رہنما ہیں"۔
"خدا کے لئے جنگ"۔ جیسی کتاب کی مغرب کے لوگوں کو تاریخ کے اس موڑ پر، بہت ضرورت تھی"۔

(ڈیلی میل، لندن)

"حالیہ تاریخ میں بنیاد پرستی کے کردار کے حوالے سے لکھی گئی یہ ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ سیاسی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے میں تھوڑی دلچسپی رکھنے والے قاری بھی یقیناً اس کتاب کو پسند کریں گے"۔

(سکاٹ لینڈ آن سنڈے)

"کیرن آرمسٹرانگ نے زیر نظر کتاب میں اپنے تمام علمی و ادبی جوہر دکھلائے ہیں۔ انہوں نے متنوع شہادتوں کو پیچیدگی سے پاک اسلوب میں بیان کیا ہے۔۔۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے واقعات کا بیان نہایت سحر انگیز اور اثر آفریں ہے"۔

(لٹریری ریویو، لندن)

Design - Angles - Khawaja Afzal 6307031-32

24 مزنگ روڈ، لاہور۔ پاکستان فون نمبر: 92-42-7322892
E-mail: nigarshat@wol.net.pk
E-mail: nigarshat@yahoo.com

THE SOURCE OF KNOWLEDGE
نگارشات